

روزگار

ضیاءتسنیم بلگرامی



روزگار

اسلام کے خاموش مبلغوں کے پاکیزہ واقعات

روشنی کے طیار

ضیاء نسیم بلگرامی

۴۱۶ حسین سنٹر
کتابت اپیلیکیشنز زیب النساء اسٹریٹ، کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

سال اشاعت ————— ۱۹۸۱ء
پبلشر ————— اعجاز رسول
سرورق ————— فرہنگ قمر
قیمت ————— ۱۰ روپے
مطبوعہ — کاشف پبلیکیشنز ناظم آباد کراچی ۱۸۱

تقسیم کار

مکتبہ نفسیات — پوسٹ بکس ۹۲۲ — کراچی ۱

فہرست

صوفیائے کرام بیرون پاک و ہند

حضرت ابوداؤد طائیؒ	-۵
فیصل بن عیاضؒ	-۵
ابوبکر شبلیؒ	-۵
ابوالقاسم نیشاپوریؒ	-۵
عبداللہ خفیفؒ	-۵
ابوالحمد حشمتیؒ	-۵
شیخ احمد رفاعیؒ	-۵
شمس تبریزیؒ	-۵

صوفیائے کرام پاک و ہند

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	-۵	حضرت ولایت شاہؒ	-۵
جمال الدین تبریزیؒ	-۵	شاہ بلاولؒ	-۵
حمید الدین ہاکمؒ	-۵	شیخ سلیم حشمتیؒ	-۵
نصیر الدین چیراغ دہلیؒ	-۵	شیخ احمد سرہندیؒ	-۵
شیخ جلال الدین کبیر لاویاؒ	-۵	شاہ نعمت اللہ دہلیؒ	-۵
سیدی مولاؒ	-۵	حاجی امداد حسین مہاجر مکیؒ	-۵

یہ تیرے پراسرار بندے

انسان نے وجود میں آتے ہی تجسس سے کام لینا شروع کر دیا تھا کیا، کون اور کیوں، سے اس کے شوقِ تجسس کا آغاز ہوا اور حیرت اور خوف نے اسے مختلف راہوں پر ڈال دیا حیرت سے فلسفے نے جہنم لیا اور خوف سے مذہب نے، فلسفے نے بہت سارے علوم کو جنم دیا اور انسان نے مادی اور خارجی دنیا میں دریافت اور ایجادات سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انسان نے آگ دریافت کی اور پہلیہ ایجاد کیا اور ان دونوں نے دنیا کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ از آدم تا ایں دم رزم اور نرم میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس کے پیچھے انسانی تجسس اور اس کا علمی اور ذہنی ارتقا کار فرما ہے۔ دنیا میں ایک طرف تو حیرت کے نتیجے میں بہت کچھ رونما ہو رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف خوف نے انسان کو باطنی دنیا میں اتار دیا ہے اور اس نے ایک ایسی شاہراہ پر سفر شروع کر دیا جو بہت دشوار اور مبہم تھی۔ یہاں کوئی قلاب نہ تھا نہ تھی جو اسے سمت کا پتہ دیتی۔ انسان نے اپنے اندر جہانِ نکلا تو اس کو دنیا اور کائنات اکبر نظر آئے اور انسان اصغر انسان نے دیکھا کہ آدمی میں تقریباً وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو کائنات میں دوسری شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔

یہ اپنی ذات اور باطن میں سفر کرنے والے لوگ صوفی کہلائے۔ انہوں نے دنیا اور علاقے دنیا کو ٹھوکر ماردی اور وہ روش اختیار کی جس میں حرص اور ہوس اور صل من مزید کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی۔ ریاضت اور نفس کشی کا شدید اختیار کیا۔ یہ بڑے حوصلہ مند، تابع اور دلیہ لوگ ہوتے ہیں۔ سیدھے، سچے اور بہادر جو دنیا کو لات مار چکا ہو اسے کون خوف زدہ کر سکتا ہے جس نے اپنے نفس کو غلام بنالیا ہو وہ کسی کا غلام کس طرح ہو سکتا ہے صحیح معنوں میں مردانِ حر یہی لوگ ہوتے ہیں۔ ماضی میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں محدود پیشے ہوتے تھے۔ انسانوں کی اکثریت

یا تو زراعت پیشہ ہوتی تھی یا فوجی۔ سب سے زیادہ مغز پیشہ سپاہ گری کا تھا۔ یہ لوگ درباروں پر برمی طرح اثر انداز ہوتے تھے۔ جہاں یہ لوگ شہروں اور ملکوں کو فتح کرتے تھے۔ وہیں یہ کبھی کبھی اپنے ہی ملک میں بادشاہ گری کے شعبدے بھی دکھاتے تھے۔ اسوگی بھی انہی کے حصے میں آتی تھی۔ لیکن وہ لوگ جو نہ تو زمینوں کے مالک ہوتے تھے اور نہ ہی سپاہ گری میں کوئی مقام رکھتے تھے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے کاروبار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ امراء اور بادشاہوں کو ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ صوفیائے کرام کو ان کی بڑی فکر ہوتی تھی۔ یہ ان کے لیے دونوں وقت کے کھانے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ جسے ان کی اصطلاح میں لنگر کہا جاتا تھا۔ سکیوں اور مجبوروں کی دست گیری کرتے تھے۔ زخموں پر مرہم رکھتے تھے۔ ٹوٹے دلوں کو جوڑتے تھے۔ دین کی تبلیغ اور اشاعت کا کام کرتے تھے۔ اپنے دور کے ظالموں اور جاہلوں کے درباروں میں اعلیٰ کلمہ حق کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ خود روکھا سوکھا کھاتے تھے یا فاقے کرتے تھے مگر دوسروں کو شکم میر دیا کرتے تھے۔

کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ جب صوفیاء میں باہمی عقائدی اور مسلکی اختلافات پایا جاتا ہے تو ہم دنیا دار لوگ کسی کی پیروی کریں اور کس کو حق پر سمجھیں، تو اس کا ایک ہی جواب ہے۔ میں صوفیائے عقائد اور مسلک کی گہرائی اور گیرائی میں نہیں جانا چاہیے۔ ہم ان کی چند باتوں پر توجہ دیں اور ہو سکے تو انہیں اپنائیں۔ کیوں کہ ان کی یہ چند باتیں سب میں پائی جاتی ہیں۔

سادہ اور حلال غذا، سادہ زندگی اور دردمندی اور غمگساری، علانی دنیا سے کنارہ کشی اور اپنی ذات میں گم رہ کر دوسروں کے عیوب سے بے خبری۔

تمام صوفیائے کرام میں یہ اقدار مشترک تھیں۔ یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔ اس میں احترام انسانیت پائی جاتی تھی۔ یہ دوسروں کی نفی کر کے آگے نہیں بڑھتے تھے۔

یہ کتاب ”روشنی کے مینار“ جلال و جمال کے انہی پیکروں کی برگزیدہ زندگی پر لکھی گئی ہے۔ اس میں فلسفے کا تحیر بھی ہے اور مذہب کا خوف بھی۔ جس طرح سائنسی ایجادات اور انکشافات دیکھنے کے باوجود غیر العقول ہوتے ہیں۔ اسی طرح صوفیاء کے واقعات ان کے تجربات اور مشاہدات بھی غیر العقول ہوتے ہیں۔ ان کی بہت ساری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ان کی سچائی پر شبہ کریں کیوں کہ جو چیز کسی کی سمجھ میں نہ آئے اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے عقل کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

صوفیائے کرام کا کام ابھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچا۔ یہ سفر جاری ہے۔ سائنس نے اس پر دقتی مگر کاری ضرب لگائی ہے لیکن ان کا سفر جاری ہے اور میرا ذاتی خیال ہے۔ کہ مستقبل میں انسان اپنی حیرت انگیز باطنی اور مخفی صلاحیتوں کا پتہ لگائے گا اور پھر ان سے اس طرح کام لے گا جس طرح آج سائنسی ایجادات اور انکشافات سے کام لے رہا ہے۔ شاید اس وقت مستقبل کا انسان ہم پر خوب ہنسے کہ سب کچھ تو انسان کے اندر ہی موجود تھا مگر یہ اسے خارجی دنیا میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ بغل میں لڑکا شہر میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

”روشنی کے مینار“ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھیے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جائیے جو ہماری دنیا سے یکسر مختلف اور حیرت انگیز ہے مشہور مصنفہ ”جینا تسیم ملگاری“ کے سحر نگار قلم نے اسے جدید اسلوب میں لکھا ہے۔ اس اسلوب میں سحر ہے، دلکشی ہے اثر آفرینی ہے، فنی مہارت اور زبان و بیان کی چاشنی سے پڑھیے اور مزے لیجیے۔

حضرت ابو داؤد طائیؓ

کوئی گویا بازار میں لگا کر لوگوں کو محفوظ کر رہا تھا اُسے لوگوں نے چاروں طرف سے
ٹھیس رکھا تھا۔ ان میں نوجوان داؤد طائی بھی موجود تھے۔ گویئے نے یہ شعر پڑھا۔

بائی خدیجۃ تبدی البلا دیاتی حینکۃ ضاذا سالا

کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی
اس شعر میں معلوم نہیں کیا جادو تھا یا کون سی کہہ بائی قوت تھی کہ داؤد طائی کی حالت غیر
ہو گئی وہ بے ہوش ہو کر گر گئے لوگوں میں پھیل بیٹھ گئی اور داؤد طائی کے چہرے پر پانی کے
پھینٹے مارے جانے لگے بمشکل جب انہیں ہوش آیا تو ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنے آپ سے
چل سکتے لوگوں نے پوچھا: تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟

داؤد طائی نے کمزور آواز میں جواب دیا ”میرا نام داؤد ہے اور قبیلہ بنی طے سے تعلق

رکھتا ہوں“

ایک تماشائی نے پوچھا ”یہ تمہیں ہو کیا گیا؟ تم بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟“
داؤد نے جواب دیا ”لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب تک میں بے ہوش تھا لوگ مجھے
ہوش مند سمجھتے رہے اور جبکہ میں ہوش میں آچکا ہوں لوگ مجھے بے ہوش کہہ رہے ہیں“
لوگوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں ایک نے کہا ”زمین پر بے اختیار گرنے
سے دماغ پر چوٹ آگئی ہے جس سے اس کا دماغی توازن جلا رہا ہے“

دوسرے نے کہا ”نہیں جناب یہ مصرع (مرگی) کا مریض معلوم ہوتا ہے اور شاید
کچھ دماغی حالت بھی خراب ہے“

آپ نے آہستہ سے کہا ”لوگو! نہ تو میں مرگی کا مریض ہوں اور نہ ہی میرا دماغی توازن بگڑا
ہے میں اچھا بھلا ہوں۔ ہاں تم لوگ یہ ضرور کہہ سکتے ہو کہ اب میں دنیا کے کام کا نہیں رہا“
ایک نے پوچھا ”جناب آپ کی حالت اس لائق نہیں ہے کہ اپنے پیروں سے چل کر

گھرتک جاسکیں، اس لئے ہمیں اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے تاکہ ہم پہنچا دیں۔
 داؤد طائی نے پوچھا: کیا تمہیں امام ابوحنیفہ کا پتہ معلوم ہے؟
 کئی نے ایک ساتھ جواب دیا: ہاں ہاں، کیوں نہیں اور ان کا پتہ کون نہیں جانتا۔
 آپ نے کہا:۔۔۔ مجھے ان کے پاس پہنچا دو، یہی میرا پتہ ہے۔

لوگوں نے سوال جواب تو کیے بند اور آپ کو گاڑی میں بٹھا کر امام ابوحنیفہ کے گھر
 پہنچا دیا۔ امام صاحب نے داؤد طائی کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا: ”نوجوان! میں نے
 تمہیں پہچانا نہیں؟“

داؤد نے جواب دیا: ہاں، آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میرے لئے یہی کافی ہے
 کہیں آپ کو جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔
 امام صاحب نے پوچھا: ”مجھ سے کوئی کام؟“

داؤد نے جواب دیا: ”یہی ابھی بازار میں نے ایک گویے سے یہ شعر سنا، کون
 سا چہرہ خاک میں نہیں ملا۔ اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی، بس اس شعر نے میری حالت ہی غیر
 کر دی، میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے ہوش میں آچکا ہوں
 اور میں پہلے واقعی بے ہوش تھا۔“

امام صاحب نے کہا: ”گویا اب تجھے عرفان ذات ہو رہا ہے۔“
 داؤد نے جواب دیا: ”شاید۔“

امام صاحب نے پوچھا: ”تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟“
 داؤد نے جواب دیا: ”یہ معلوم کرنے کہ اب میں کیا کروں؟“

امام صاحب نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا، کہا: یہ اس سلسلے
 میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ہاں میں یہ مشورہ دوں گا کہ تم گوشتہ نشینی اختیار کرو۔ فقر کی
 پہلی سیڑھی ترک دنیا ہے جب تم اس میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میں کچھ اور بتاؤں گا۔
 داؤد طائی نے درخواست کی: ”حضرت! آپ کا ارشاد سرائیچھوں پر، لیکن ایک
 درخواست کروں گا۔“

امام صاحب نے جواب دیا: ”مرو درخواست۔“
 داؤد نے عرض کیا: ”میں آپ کا تلمذ چاہتا ہوں آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے

”یعنی“

امام صاحبِ نجواب دیا ”میں نے تجھ اپنی شاگردی میں لے لیا، تو میری ہم نشینی اختیار کر سکتا ہے“

داؤد طائی سرِ آتشِ دُعا و اعتنان بن گئے بولے ”حضرت! آپ میری ہر درخواست بے چون و چرا مان لی، آخر کیوں؟“

امام صاحبِ نجواب دیا ”تو حاتمِ مخی کا ہم نسب ہے اور عدی میرے ہی خاندان کا ایک بزرگ فرد تھا، میں تبدیلِ بنی طے کی عزت کرتا ہوں کیوں کہ حاتم اور عدی بن حاتم بھی اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے“

داؤد طائی نے دنیا چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی یہ بیس سال تک امام ابو حنیفہ کے شاگرد رہے۔



ایک عرصہ تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے انہوں نے امام صاحبِ ریافت کیا ”حضرت! ابھی کتنے عرصے اور گوشہ نشینی میں رہنا ہے“

امام صاحبِ نجواب دیا ”تم گوشہ نشینی ختم کر دو اور لوگوں سے رابطہ قائم کرو لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود میں ضبط و تحمل پیدا کر لو“

داؤد طائی نے نرمی سے عرض کیا ”حضرت میں نے ایک عرصے کی گوشہ نشینی میں اپنے نفس کو ازیتیں پہنچائی ہیں اس لئے اب مجھ میں اتنا زیادہ ضبط و تحمل پیدا ہو چکا ہے کہ لوگ مجھے پریشان نہیں کر سکتے“

امام صاحب نے فرمایا ”اگر تم یہ سمجھتے ہو تو لوگوں سے ربط و ضبط بڑھاؤ“
داؤد نے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھا کر شروع کر دیا۔ اس عالم میں امام ابو حنیفہ نے آپ کو مشورہ دیا۔ کہ مشہور صوفی حبیبِ راحی سے بیعت کر لو چنانچہ یہ حبیبِ راحی کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اب آپ کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی سُن تو ضرور لیتے تھے لیکن خود بہت کم بولتے تھے۔
آپ کو ورثے میں بیس دینار ملے آپ نے انہیں احتیاط سے رکھ لیا کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور طنز آکھا ”جناب! آپ نے دینار محفوظ کر لئے ہیں حالانکہ فقر کی شان یہ ہے کہ انہیں خرچ کر کے بے نیازی اختیار کی جائے“

آپ نے جواب دیا ”لیکن میں انہیں نہیں خرچ کروں گا، کیوں کہ میں نے حساب لگایا کہ جو

دیکھا تو معلوم ہوا یہ بیس دینا مجھے زندگی بھر کے لئے کافی ہیں اور پھر ان دینار کی موجودگی سے میں ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتا رہتا ہوں اسی لئے میں انہیں زندگی بھر خرچ نہیں کروں گا۔“ معترض خاموش ہو گئے۔

آپ کی قناعت اور استغنا کا یہ حال تھا کہ آپ ہمیشہ روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے تھے ایک دن دوسرے ہم عصر صوفی ابو بکر آپ سے ملنے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ داؤد دہلوی اپنے ایک ہاتھ سے روٹی پھڑے زار و قطار رو رہے ہیں۔

ابو بکر نے پوچھا ”حضرت! کیا بات ہوئی؟ یہ روٹی پھڑے آپ رو کیوں رہے ہیں؟ آپ نے بدستور روتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابو بکر! میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اگر روٹیاں کھانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہ وقت بھی عبادت ہی میں صرف ہوتا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ لے کاش میرے اور خدا کے درمیان پیٹ نہ ہوتا۔“

ابو بکر نے دیکھا، داؤد کے پانی کا گھڑا دھوپ میں رکھا ہوا ہے انہوں نے کہا۔
”داؤد! یہ گھڑا دھوپ میں کیوں رکھ چھوڑا ہے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”جب میں نے یہ گھڑا یہاں رکھا تھا، دھوپ نہیں تھی، اب دھوپ آگئی ہے میں نے سوچا اگر میں اسے دھوپ سے سایہ میں رکھوں گا تو محض اپنی ذات کیلئے کچھ وقت ضائع کروں گا اس لئے میں خاموش بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہا۔“
ابو بکر نے کہا ”سبحان اللہ! اور ایک میں ہوں کہ ادھر ادھر ملاقا توں میں اپنا وقت ضائع کرتا پھرتا ہوں۔“

آپ نے امام صاحب کی اجازت کے باوجود لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی آپ کو لوگ مختلف مجلسوں میں لے جانا چاہتے مگر آپ ان سے عذر کرتے۔ آپ کی یہ بات لوگوں کو گرل گزرتی۔ آپ کی اس عادت کا سبھی کو علم تھا۔ ایک دن آپ کے پاس چند آدمی آئے بولے۔ ”حضرت! کیا بات ہے؟ آپ خدا سے تو محبت کرتے ہیں مگر اس کی مخلوق سے دور رہتے ہیں حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ ایک عاشق کو اپنے محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوتی ہے اس لئے اگر آپ کو خالق سے محبت ہے تو اس کی مخلوق سے بھی پیار ہونا چاہیئے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں مخلوق سے نفرت تھوڑی کرتا ہوں۔ مجھے اس کی مخلوق سے پیار ہے لیکن میں خالق کی یاد میں وقت دیتا ہوں ابھی میں خالق کی محبت کے مزے لے رہا ہوں۔“

اور اتنی فرصت کہاں کہ اس کی مخلوق کی طرف دیکھوں۔“

ایک شخص نے کہا، ”آپ اگر اپنے سے کم عمر لوگوں میں بیٹھیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کم عمر لوگوں کی باتیں آپ کے معیار سے کم ہوں گی اس لئے آپ انھیں حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کا اثر نہیں قبول کریں گے۔“

آپ نے جواب دیا، ”یہ بات نہیں ہے بلکہ میں ان کی محبت سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ دے نہیں سکیں گے اور جن سے میں کچھ حاصل نہ کر سکوں ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔“

اس شخص نے کہا، ”چھوٹوں سے اگر کچھ حاصل نہ ہوگا تو کوئی نقصان بھی نہ ہوگا۔“ آپ نے جواب دیا، ”نقصان تو ہوگا اور نقصان یہ ہوگا کہ وہ میرا احترام کریں گے اور اس احترام میں وہ مجھے کچھ سکھانہیں پائیں گے۔“

اس شخص نے کہا، ”تب پھر آپ عمر رسیدہ لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔“ آپ نے جواب دیا، ”وہ مجھے میرے محبوب آگاہ نہ کر سکیں گے اس لئے ان کی صحبت بھی میرے لئے بے کار ہے۔“

کسی اور شخص نے کہا، ”لیکن آپ کی باتیں ہیں بڑی عجیب۔ آپ نے اب تک شادی بھی نہیں کی، معلوم نہیں کیوں؟“

آپ نے جواب دیا، ”میں کیا شادی کروں، میری مالی حالت تو لوگوں کو معلوم ہی ہے اور یہ بات بھی سب پر ظاہر ہے کہ میرا ذریعہ معاش بھی کچھ نہیں پھر میں کسی عورت سے شادی کر کے اپنی ہی جیسی سخت حالت میں کیوں مبتلا کروں اور جس حالت کو میں بخوشی گوارا کئے ہوئے ہوں اسے ایک عام عورت پر کیوں مسلط کروں۔“

ایک اور شخص نے کہا، ”جناب! آپ جس مشکل زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں کوئی اور نہیں اختیار کر سکتا۔“

آپ نے جواب دیا، ”میری زندگی میرے لئے اور دوسروں کی زندگی ان کے لئے۔ کسی اور شخص نے کہا، ”کمال تو یہ ہے کہ آپ اپنی دارالہی میں لکھی۔۔۔۔۔ بھی نہیں کرتے، ہمیشہ بال اُٹھے اُٹھے رہتے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا، ”بھائی یہ ساری باتیں فرصت کی ہیں اور میں یاد الہی سے

فرصت ہی نہیں پاتا۔ پھر میں دارالمصی میں کنگھی کس طرح اور کب کیا کروں ؟
ایکے عرصہ بعد آپ کا نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی اُس وقت آپ چھت پر کھڑے
تھے چوہ دیویں کا چاند مرقع سے اُتھر رہا تھا اور اس کی کمزور چاندنی سیاہی میں ڈوبی ہوئی محسوس
ہوتی تھی گویا چاندنی تاریکی میں غوطہ لگا کر نمودار ہو رہی تھی آپ اس دلکش منظر میں کھو گئے
چاند کے اوپر ہر طرف تاروں کی محفل سجی ہوئی تھی اور وہ اس طرح چشمک زنی کر رہے تھے
گویا داؤد طائی کی طرف اشارے کر کر کے کہہ رہے ہوں کہ اس صوفی کو تو دیکھو، زہے نصیب
جو اس نے ہماری طرف نظریں تو اٹھائیں، ہمیں دیکھا تو۔ اے داؤد طائی ! تمہارا بہت
بہت شکریہ۔

داؤد طائی نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اے چاند ! کیا میں پوچھ
سکتا ہوں کہ تو نے یہ نور کہاں سے حاصل کیا ہے ؟ کیا توانوں۔ اے یے یہ پیغام
لے کر نہیں آیا کہ اس خاکی کو بھی نورانی ذات کا قرب اور اتصال حاصل کر کے نور بن جانا
چاہیئے۔

آپ پر جذبہ مدہوشی طاری تھی، اور آپ اس کیفیت میں اپنی چھت پر ادھر ادھر
ٹہلنے لگے آپ کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات جاری تھے ”اے آسمان کے دلکش ستارو !
تم مجھے دیکھ دیکھ کہ پلکیں کیوں جھپکاتے ہو ؟ کیا تم مجھ پر نہیں ہے ہو ؟ کیا تم میرا مذاق
اڑا رہے ہو ؟ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کیا تم بھی مجھے دیکھ رہے ہو ؟ میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر
یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا وہ خالق جس نے تمہیں پیدا کیا ہے جس نے تمہیں پلکیں جھپکاتے
اور سیلاب و ش کی کیفیت عطا کی ہے وہ کتنا عظیم اور اعلیٰ ہے۔ اے کاش میں تمہیں سے
ہوتا کہ خاموش وہی کچھ کر رہا ہوتا جس پر میرے رب نے مجھے مامور کیا ہوتا لیکن مجھے
انسان بنادیا اور انسان کے پیچھے اتنے بہت سارے آزار لگادیے گئے کہ یہ قدم قدم
پر ٹھوکریں کھا رہا ہوتا ہے اے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اے کاش اگر میں پیدا ہوا تھا تو مجھے
پیدائشی طور پر یہ توفیق ملی ہوتی کہ میں اپنے رب کے سوا کسی اور کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھاتا۔“

آپ پر وارفتگی طاری ہو گئی اور اس وارفتگی میں آپ بے ہوش ہو کر پڑوسی
کی چھت پر جا گرے۔ گرنے کے دھماکے سے پڑوسی یہ سمجھا کہ اس کی چھت پر شاید کوئی پور
چنانچہ اس نے تلوار نیام سے نکال لی اور آہستہ آہستہ چھت پر چڑھنے لگا اس کو چھت
پر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ آخر وہ چھت پر پہنچ گیا اور کسی کو منہ کے بل پڑا ہوا دیکھا۔ وہ سمجھا یہ کوئی

چور ہے جو اسے دیکھ کر بن کے پڑ رہا ہے۔ وہ داؤد طائی کے سر پر جا کھڑا ہوا، کڑک کو بولا: ”اے شیر! اٹھ اور دیکھ کہ موت تیرے سر پر کھڑی تیری گردن کا انتظار کر رہی ہے“ لیکن آپ پر تو بے ہوشی طاری تھی، آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس شخص نے آپ کو ٹھوکر لگائی اور غصے میں کہا: ”بن کے پڑے رہنے سے تجھے معاف تھوڑی کر دوں گا، اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے؟“ لیکن آپ پر اس کی ٹھوکر کا بھی اثر نہ ہوا آپ اسی طرح پڑے رہے۔ پڑوسی نے آپ کے سر پر ایک شدید دھچک لگائی۔ بولا: ”میں کہتا ہوں اب بننے کی ضرورت نہیں ہے اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے؟“

لیکن آپ بدستور پڑے رہے پڑوسی نے چاندنی میں آپ کے سر سے خون بہتے دیکھا تو ذرا چونکا، کیونکہ کسی آدمی میں کتنی ہی قوت برداشت کیوں نہ ہو، سر میں اتنی شدید چوٹ کی کراف یا سی سوں تو کتنا ہی ہے مگر یہ کیسا چور ہے کہ سر سے خون بہہ رہا ہے مگر خاموش پڑا ہے اس نے ایک ہاتھ سے آپ کو سیدھا کیا اور صورت دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا۔ حیرت سے بولا: ”اے یہ آپ! داؤد یہ آپ ہیں؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ میری چھت پر کیسے؟“

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پڑوسی نیچے گیا۔ پانی لے کر پھر چھت پر پہنچ گیا اور آپ کے منہ پر چھینٹے دئیے کچھ دیر بعد آپ میں حرکت پیدا ہوئی اور آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ پڑوسی نے خوش ہو کر پوچھا: ”داؤد طائی! یہ آپ میری چھت پر کس طرح لگے؟ خیریت تو ہے؟“

آپ نے آہستہ سے جواب دیا: ”میں نہیں جانتا کہ تمہاری چھت پر کس طرح آ گیا؟ لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں چاند ستاروں کے نظاروں میں کھویا ہوا تھا اور اس میں کچھ اتنا وارفتہ ہو گیا کہ تمہاری چھت پر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اب تم جو چاہو سزا دے لو، میں تمہارا مجرم یا گناہ گار ہوں۔“

پڑوسی نے شرمندگی سے کہا: ”حضرت! میں تو اس پر شرمندہ ہوں کہ لاعلمی میں میں نے نہ صرف یہ کہ آپ کو بُرا بھلا کہا بلکہ آپ کے ٹھوکریں بھی لگائیں اور آپ کو لہو لہان کر دیا۔ خدا کے لیے آپ مجھے معاف کر دیے جئے۔“

آپ نے کہا ”معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے کیوں کہ میں تیری چھت پر آگیا ہوں اور تیری اجازت کے بغیر، میں اس کو تاہی اور غلطی پر نام ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ پڑوسی رونے لگا، بولا ”میں اس وقت تک آپ کو جانے نہیں دوں گا، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے“

آپ نے جواب دیا ”اچھا چلو ہم دونوں ایک دوسرے کو معاف کر دیں“ چنانچہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کیا اور پڑوسی نے آپ کو نہایت احترام سے آپ کے گھر تک پہنچایا۔



آپ کے پاس ایک ہی چادر تھی، آپ اس چادر کو اوڑھ کر باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے بخدا کے لوگ آپ کو بعض وجوہ سے ناپسند کرتے تھے، انہیں آپ کے تَوَکُّل اور نامانوس باقول سے بڑی الجھن ہوتی تھی جب آپ نماز پڑھنے جاتے تو لوگ آپ پر ہنستے۔ آپ اپنی کوئی توجہ دیے بغیر نماز باجماعت ادا کرتے مسجد چلے جاتے اور نماز ادا کر کے فوراً ہی واپس آ جاتے۔

ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر آپ واپس آنے ہی والے تھے کہ چند لوگوں نے آپ کو روک لیا بولے ”حضرت! آپ سے ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں براہ کرم ہمیں بات چیت کا موقع دیجئے“

آپ نے جواب دیا ”میں تم لوگوں کو بات چیت کا بہت تھوڑا وقت دے سکتا ہوں۔ بولو، کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“

ایک نے دریافت کیا ”آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے کیا آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں یا کسی دربار سے وابستہ ہیں جہاں تاخیر سے پہنچنے پر آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا؟“

آپ نے جواب دیا ”بھائی! میں نے سب بڑے دربار کی ملازمت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں مجھے جواب دہ نہیں ہونا پڑے گا مگر پھر بھی میں اس سے اس لئے خوف زدہ رہتا ہوں کہ اگر وہ میری بات پر ناراض ہو گیا تو وہاں کسی کی سفارش بھی کام نہ آئے گی اور وہاں میری کوتاہیوں یا خامیوں کی تلافی کا ازالہ بھی ناممکن ہوگا“

وہ ہنسنے لگے۔ دوسرے نے کہا ”حضرت! کیا بات ہے جو آپ نے دنیا کو دیکھنا ہی ترک کر دیا اور معلوم نہیں کن خیالوں میں گم ہوتے ہیں کیا آپ تارک دنیا ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پوری دنیا غلط راہ پر جا رہی ہے اور صرف آپ نے صحیح راہ اختیار کر رکھی ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”نہیں بھائی! میں ایسا بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں کون غلط ہے اور کون درست؟ اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے میں اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں کیوں کہ میرے دل میں جیسی خشیت پائی جاتی ہے اگر تم میں سے کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو تمہاری بھوک پیاس اڑ جائے اور تم پر تمہاری نیندیں حرام ہو جائیں۔“

کسی نے طنزاً ہنس کر کہا ”بھائی تمہاری بھوک پیاس اور نیند تو آپ کو دیکھ کر اڑی ہوئی ہے ایک چادر، ٹوٹا پھوٹا مکان، سڑا گلا پانی کا گھڑا، گھر میں مستقل قحط سالی واللہ ہم جب بھی آپ کی بات سوچتے ہیں غم گین ہو جاتے ہیں۔“

آپ نے بڑے افسوس سے کہا ”افسوس کہ تم لوگ جبریت م کی باتیں کر رہے ہو اس میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، کیا تم لوگ مجھے معذور نہیں سمجھو گے؟“

لوگوں نے ہنس کر جواب دیا ”ہم لوگ آپ کا وقت نہیں ضائع کر رہے ہیں بلکہ ان سوال و جواب سے ہم کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیا آپ خیل بننے رہیں گے اور ہمیں کچھ بھی نہ دیں گے؟“

آپ نے کہا ”میں جانتا ہوں تم لوگ مجھ سے کچھ بھی نہیں حاصل کر سکو گے بلکہ مجھے ٹھٹھول کی غرض سے روک رکھا ہے۔“

ایک نے زوردار قہقہہ لگایا ”خوب! خوب! یاد تم تو بہت ہوشیار نیکلے میں تو تمہیں غبی سمجھ رہا تھا، اچھا تاؤ، تم اور کیا سمجھو؟“

دوسرے نے بھی قہقہہ لگایا ”یار وہ دنیا کو چھوڑ دیئے والے غبی نہیں ہوتے ذرا کم ہمت ضرور ہوتے ہیں اور دنیا کا مقابلہ کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ انہی میں یہ داؤد بھی شامل ہیں۔“

داؤد نے جواب دیا ”بھائی! اب میں تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں، ورنہ تم خود سوچو کہ یہ دنیا، جہاں قدم قدم پر ترغیب و تحریص کے جال بچھے ہوئے ہیں اور اگر اس

ایک قدم پیچھے ہٹاؤ تو یہ دس قدم آگے بڑھ کر کھڑکھڑاتی ہے اس سے پیچھا چھڑانا
 بڑے حوصلے کی بات ہے یہ تعجب کی بات؛ کہ تم لوگ ترک دنیا کو کم ہمتی پر محمول کر رہے ہو
 ایک نے اور زور کا ہتھیار لگایا بولا ”میں تو پہلے ہی داؤد کی عقل کا قائل تھا دیکھو تو
 کیسی عقل کی باتیں کر رہا ہے، اے کاش یہ شخص ہم میں شامل ہو جاتا اور ہم اس سے عقل کی باتیں
 کرنا سیکھ سکتے“

داؤد نے اپنی راہ لی بولے، ”گو! خدا کے لئے مجھے تنگ کر دو تم نے مجھے کس
 خرافات میں لگا دیا“

سب نے ملکر قہقہہ لگایا اور سٹیاں بجائیں، بولے ”یہ میاں! اس صوفی کو یوں ہی
 روز روک لیا کرو اور مختلف مسائل پر باتیں کیا کرو، واقعی مزہ آگیا اس سے باتیں کر کے“
 کسی نے آپ کی چادر پر کھینچ لی۔ آپ روہا لے ہو گئے تیر تیز قدم اٹھاتے گھر
 آئے اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا، سجدے میں گر کر گڑا نا شروع کیا ”خدا یا یہ
 تو مجھے کس بات کی سزا دے رہا ہے میں تو تیرے لئے زیادہ سے زیادہ وقت وقف
 کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ دنیا والے شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں مجھے چھوڑتے ہیں سلاتے
 ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ اور انہیں کس طرح منع کروں۔ اب تو ان
 لوگوں نے میرے خلاف ایسا منصوبہ بنایا کہ مجھے مسجد جاتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے
 میں مسجد میں باجماعت نماز کے لئے جاتا ہوں لیکن چند لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ مجھے
 ستائیں اگر ان حالات میں، میں مسجد میں جانا بند کر دوں تو اسے گناہ میں تو نہیں شمار کیا جائے گا؟
 میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں، میں تیری منشا کس طرح معلوم کروں اگر تجھے اس میں
 کوئی اعتراض نہ ہو کہ میں مسجد نہ جاؤں تو تو میری چادر چوری کر دے۔ کیوں کہ نہ یہ چادر
 ہو گی اور نہ میں عزائم مسجد جانے کی ہمت کروں گا اور اس طرح میں تیری مشیت سے
 بھی آگاہ ہو سکوں گا“

آپ عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آئے اور بیت الخلا چلے گئے۔ بیٹ میں قراقرم پور ہی
 تھی جب وہاں سے فارغ ہو کر نکلے تو سردی سی محسوس ہونے لگی، چادر اتار کر بستر پر
 ڈال گئے تھے لیکن واپس آکر چادر اوڑھنے کے لئے جو تلاش کی تو وہ غائب تھی اُسے کوئی
 چرالے گیا تھا سردی میں چادر کا گم ہو جانا آپ کے لئے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا لیکن پھر فوراً

ہی یہ خیال آیا کہ اس طرح انہیں حیرت انگیز طور پر خدا کی مشیت معلوم ہو چکی ہے آپ نے دوسرے ہی دن سے مسجد جانا بند کر دیا اور اپنے گوشے ہی میں نماز پڑھنا شروع کر دی، اب وہ زیادہ خشوع و خضوع سے عبادت کرنے لگے تھے۔

باہر بڑی سخت دھوپ پڑ رہی تھی آپ دھوپ میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو بڑا قلق ہوا وہ آپ کو ٹوکنا چاہتے تھے لیکن ٹوکنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ اس طرح اندیشہ تھا کہ آپ کی عبادت میں خلل پڑے گا پسینے نے آپ کو شرابور کر دیا تھا کپڑا بھیگ کر چپک رہا تھا اور پیشانی سے بہے ہوئے پسینے کے قطرات گالوں تک آچکے تھے آپ کے ایک انتہائی محبت کرنے والے مرید نے بلند آواز میں کہا ”حضرت! سائے میں آجائیے۔ کیا گرمی آپ کو نہیں پریشان کر رہی؟“ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے پھر کہا ”جناب! کیا میری آواز آپ نے نہیں سنی؟ میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ خود پر رحم کیجئے۔ کہیں آپ کو کچھ ہونے جاوے سائے میں آجائیے“ آپ نے جواب دیا ”اے شخص! مجھے پریشان نہ کر، میری مشغولیت میں غلغلہ نہ ہو“ مرید نے عرض کیا ”وہ میں آپ کی مشغولیت میں غلغلہ ہونے کی جرأت نہ کرتا لیکن میں آپ کو گرمی کی مصیبت میں مبتلا دیکھ رہا ہوں اس لیے آپ کو اس اذیت میں دیکھ کر اپنے دل میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں، اگر آپ وہاں سے نہیں ہیں گے تو ہم سب بھی بے چین رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم سب بھی دھوپ ہی میں آجائیں اور آپ جیسی اذیتوں میں خود کو بھی مبتلا کر لیں“

آپ نے جواب دیا ”نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے سائے میں آنے سے گریز کر رہا ہوں تم لوگ یہاں دھوپ میں ہرگز نہ آنا کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں نفش کشی سے زیادہ رضاۃ الہی کو دخل ہے شاید میرا خدا اسی طرح میری عبادت کو شرف قبولیت عطا فرمائے“ لوگ خوشامد کرتے رہے مگر آپ نے ان کی ایک نہ سنی آخر وہ اپنا سامنہ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

آپ ہر وقت اُداس اور غمگین رہا کرتے تھے دیکھنے والے یہ محسوس کرتے گویا داؤد

طا ئی کسی بڑے سانحے سے گزر چکے ہیں ۔

ایک دن آپ کے مریدوں نے سوچا کہ ان سے بحث و مباحثہ کر کے کوشش کریں گے کہ وہ خوش رہنے لگیں، آخر اس اُرداسی میں رکھا ہی گیا ہے چنانچہ انہوں نے ایک دن صبح ہی صبح آپ سے اس مسئلے پر بات چیت شروع کر دی ۔ پوچھا : ” حضرت! آج ہم آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں امید ہے کہ آپ اُن کے صحیح صحیح جواب مرحمت فرمائیں گے “

آپ نے جواب دیا ” پوچھو، بہر حال تم یقین کرو کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا “
ایک مرید نے پوچھا ” کیا آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے ؟ “
آپ نے جواب دیا ” ہاں میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز کا انتقال ہو چکا ہے
تم نے میرے حالات سے صحیح اندازہ لگایا “
مرید نے پوچھا ” کس عزیز کا ؟ “

آپ نے جواب دیا ” میرے نفس کا جسے میں نے خود ہی ہلاک کر دیا ہے “
مرید نے عرض کیا ” جب آپ نے اپنے نفس کو خود ہی ہلاک کر دیا ہے
تو اس کامیابی سے آپ کو بہت خوش ہونا چاہیئے لیکن ہم لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ
اپنے نفس کی ہلاکت سے خوش نہیں ہیں “

آپ نے جواب دیا ” نہیں یہ بات نہیں ہے میں اپنے نفس کو ہلاک کر کے بہت
خوش ہوا تھا مگر کچھ عرصے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ نفس انانی بہت ہی سخت جان ہوتا
ہے اور اس کا ہمیشہ امکان باقی رہتا ہے کہ یہ دوبارہ پیدا ہو جائے اور اس دوبارہ
پیدائش کے دھڑ کے نے مجھے ہمیشہ کیلئے ملول کر دیا ہے “

دوسرے مرید نے پوچھا ” میرا خیال یہ ہے کہ آپ پر کوئی بڑی مصیبت پڑی
ہے جس نے آپ سے آپ کی خوشیاں چھین لی ہیں “

آپ نے جواب دیا ” تیرا اندازہ بھی درست ہے اس سے بڑی مصیبت اور
کیا ہوگی کہ مجھے جس نے پیدا کیا ہے میں اس کا پوری طرح شکر نہیں ادا کر رہا ہوں دوسری
بات یہ کہیں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے ایک زمانہ ناراض ہے میں یہ سوچ سوچ کر کڑھتا
رہتا ہوں کہ جب میں ایک زمانے کو خوش نہیں رکھ سکا تو وہ ذات جس کی وجہ سے میں نے

ایک زمانے کو ناراض کیا ہے اگر مجھ سے ناراض رہی اور میں خوش نہ کر سکا تو میرا کیا حشر ہوگا اب تم خود ہی سوچو کہ جس پر اتنی بڑی مصیبت آپڑی ہو وہ کس طرح خوش رہ سکتا ہے ؟
تیسرے مرید نے پوچھا : مجھے تو آپ بیمار بیمار سے لگتے ہیں ؟

آپ نے جواب دیا : ” ہاں میں بیمار بھی ہوں اور یہ بیماری عصبیاں کی ہے تائب ہونے سے پہلے میں نے نہ معلوم کیسے کیسے گناہ کئے ہیں معلوم نہیں خدا انہیں معاف بھی کرے گا یا نہیں اور اس سوئے نے مجھے بیمار بنا رکھا ہے “

مرید نے مزید کہا : ” اور حضرت ! صاف بات تو یہ ہے کہ آپ رجائی نہیں ہیں قنوطی ہیں آپ ہر چیز سے مایوس ہی نظر آتے ہیں اگر آپ رجائی انداز فکر اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے چہرے پر مستقلاً بے لاشٹ نظر آنے لگے “

آپ نے جواب دیا : ” تجھے جو بات کہتی تھی ، کہہ چکا اب اپنی زبان بند کر لے کیونکہ یہ تو نہیں بول رہا ہے بلکہ یہاں مجھ سے وہ شخص ہمکلام ہے جس کے قبضہ و اختیار میں بہت کچھ ہے اور خدا نے اسے ڈھیل ڈے رکھی ہے کیا تجھ میں شیطان نے حلول نہیں کیا ہے اور تیرے سائے سوال اس کے مرتب کئے ہوئے ہیں ؟
آپ کے سائے مرید شرمندہ ہو کر چلے گئے ۔

لیکن ایک دن آپ کو گویوں نے اس حال میں دیکھا کہ آپ مسکرا رہے ہیں یہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے گریہ کی مصیبت میں مبتلا چاند اپنے پورے آب و تاب سے دنیا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر ایک درویش نے کہا : ” جناب ! آج کیا بات ہے کہ میں آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ رہا ہوں “
آپ نے کیف و مسرت میں جواب دیا : ” ہاں ! مجھے خدا نے شرابِ محبت پلا دی ہے آج میں اس کا غیر معمولی سُور و محسوس کر رہا ہوں اور اسی خماری نے مجھے مسرور کر رکھا ہے “

ایک دن آپ اپنے حجرے سے نکلے اور بازار کا رخ کیا ، لیکن ابھی وہ بازار میں چند لمحے ہی رُکے ہوں گے کہ وحشت زدہ ہو کر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے وہ اپنے حجرے کی جانب بھاگ رہے تھے کسی نے آپ کو روکنے کی کوشش کی پوچھا : ” یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے آپ بھاگ کیوں رہے ہیں ؟ “

آپ نے جواب دیا : ” ارے کیا تیری بنیائی تجھ سے چھین لی گئی ؟ وہ سامنے دیکھ

وہ کون آرہا ہے؟

اُس شخص نے سامنے دیکھا لیکن اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا بولا "جناب صاحب! تو کچھ

بھی نہیں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟

آپ نے جواب دیا "بس جناب! چل گیا پتہ۔ نہ تو تو کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سن سکتا ہے دیکھ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھ، وہ سامنے دیکھ، مردوں کا لشکر ہماری طرف بڑھ چلا آرہا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے آپ اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ جب یہ بات جنید بغدادی کے روبرو دھرائی گئی تو انہوں نے کہا "داؤد جھوٹ نہیں بول سکتا میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ اس نے مردوں کا لشکر ضرور دیکھا ہوگا۔"

اس کے کچھ عرصہ بعد شہر میں وبا چلی اور اس میں آبادی کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا۔



ایکے دن اُس عہد کے مشہور بزرگ ابوسعید آپ کے پاس ملنے آئے اور بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا "حضرت! میں آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔"

آپ نے جواب دیا "ابو سید! میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ ایک چادر تھی وہ بھی کوئی چرا لے گیا۔"

ابوسعید نے کہا "میں کچھ نہیں جانتا، میں تو آپ سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی چلوں گا۔" آپ نے کہا "کچھ مانگ کر تو بھی شرمندہ ہوگا اور نہ دے کر میں بھی ندامت محسوس کروں گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموش رہو اور ملاقات کا وقت پورا کر کے اپنی راہ لے۔"

ابوسعید بھی بڑے ضدی تھے بولے "آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں نے جو بات کہہ دی ہے اس پر عمل کروں گا اور آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔" آپ نے عاجز آ کر کہا "بھائی ابوسعید! تم معلوم نہیں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو، خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو۔"

ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت! میں نے آپ سے خوابات کہی ہے آپ کو اس کا اہل سمجھ کر کہی ہے آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے اپنے مطلب کی چیز مانگ لوں گا "

آپ نے عاجزاً کر کہا " اچھا! بھائی! اگر یہ بات ہے اور وہ چیز میرے پاس موجود ہے جو تم مانگنا چاہتے ہو ضرور مانگو موجود تھا ہوگی تو میں انکار بھی نہیں کروں گا ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت میں آپ کے پاس سے ایک ادھ نصیحت لے کر جاؤں گا اور وہ نصیحت بھی ایسی ویسی نہیں ہونا چاہیئے "

آپ نے مسکرا کر پوچھا " ابو ربیع! تم روزہ رکھتے ہو یا نہیں؟ "

ابو ربیع نے جواب دیا " ہاں میں روزے رکھتا ہوں "

آپ نے نصیحت کی " ابو ربیع! اب تم دنیا سے روزہ رکھو اور اس کی افطار آخرت سے کرنا "

ابو ربیع بھوم گئے بولے " حضرت! ایک نصیحت اور؟ "

آپ نے جواب دیا " ابو ربیع میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ تم بدگوئی سے پرستہ کرو، مخلوق سے کد رہ کشی اختیار کرو، ----- دین کو دنیا پر ترجیح دو اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ مخلوق کا خیال تم دل سے محو ہو جائے " ابو ربیع نے عرض کیا " کوئی اور نصیحت؟ "

آپ نے بڑے خوش میں کہا " ابو ربیع! کیا تمہیں معلوم ہے کہ مرنے سے پہلے انتظار کر رہے ہیں یعنی تمہیں بھی مرنا ہے اس لئے آخرت کا سامان کرو " ابو ربیع مائے خوشی کے رونے لگے، بولے " حضرت اور کچھ؟ "

آپ نے جواب دیا " ابو ربیع! تم دن سے بندہ خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے "

ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت! آپ نے یہ فرمایا تھا کہ آپ تہی دست ہیں اور یہ کہ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں لیکن میں جانتا تھا کہ آپ دولت مند ہیں اور آپ کے پاس گراں مایہ خزانہ موجود ہے میں اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لوں گا چنانچہ میں نے اس میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا ہے اور اب خوشی خوشی آپ کے پاس سے رخصت ہو رہا ہوں " ابو ربیع چلے گئے، آپ نے بڑے دھڑکے سے خود کو مخاطب کیا " داؤد! تو دنیا کو تو نصیحتوں کے خزانے دے رہا ہے لیکن ذرا یہ تو بتا کہ تو خود اس پر کس حد تک عمل پیرا ہے؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ خدا تجھ پر رحم کرے " "

حضرت ابراہیم بن ادہم کے مرشد فضیل بن عیاض آپ سے ملنے گئے

آپ ان سے ملکر بہت خوش ہوئے دونوں دین کی باتیں کرتے رہے دوران گفتگو فضیل بن عیاض نے کہا " داؤد میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر آپ اس چھت کے نیچے عبادت کرتے رہے تو یہ کمزور چھت کسی بھی دن آپ کے اوپر ڈھس جائے گی "

آپ نے جواب دیا: ”ابن عیاض! تم پر رحمت ہو کہ تم نے پہلی ملاقات ہی میں میری چھت کی بوسیدگی کا اندازہ لگالیا حالانکہ میں اس چھت کے نیچے برس بار برس سے بیٹھا ذکر و فکر میں لگا ہوا ہوں اور میں نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر اس چھت کی طرف نہیں دیکھا۔“

فضیل بن عیاض نے عرض کیا: ”حضرت! میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ چھت کی طرف نہ دیکھئے، آپ ہر اس طرف ضرور دیکھئے جہاں آپ کی نظر جاسکتی ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”واہ ابن عیاض! یہ مجھے کیا مشورہ دے رہے ہو تم؟“

فضیل بن عیاض نے کہا: ”جناب والا! آپ کو مسلسل غلط فہمی ہوئی ہے اب میں آپ سے کیا بات کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، خدا نے آپ کو وہ مرتبہ عطا کیا ہے کہ ہم لوگ آپ پر رشک ہی کرتے ہیں گے میرے لیے کوئی نصیحت؟“

آپ نے جواب دیا: ”فضیل! دنیا سے کنارہ کشی، دنیا سے حذر، دنیا سے پرہیز، دنیا سے گریز۔“

فضیل رونے لگے۔ بولے: ”داؤد! آپ کی باتوں میں کتنا سوز ہے بجز آپ نے میرے سینے کی آگ اور تیز کردی ہے خدا آپ کو جزائے خیر دے۔“

داؤد نے کہا: ”فضیل! تم مستجاب الدعوات ہو خدا سے دعا کرو وہ میرا انجام بخیر کرے۔“

فضیل نے جواب دیا: ”آپ میرے لئے دعا کیجئے میں آپ کے لیے کروں۔“

داؤد اس پر راضی ہو گئے اور ان دونوں نے ایک دوسرے کیلئے دعا کی آخرت بخیر کی۔

اس عہد کے ایک دوسرے بزرگ معروف کرخی نے آپ کی بات یہ خیال ظاہر کیا کہ میں نے داؤد و طال سے زیادہ دنیا سے نفرت کرنے والا کوئی اور انسان نہیں دیکھا۔

آپ کے بال بہت بڑھ گئے تھے آپ حجام کے پاس چلے گئے اور اس سے کہا: ”میری حجامت بنا دے۔“

اس نے دوسروں کی حجامت روک کر آپ کی حجامت بنانا شروع کر دی وہ بولتا

”ہا آپ خاموش رہے آخر اس کی بک بک سے تنگ آکر آپ نے کہا: ”اے شخص! تو اپنا کام کر، زبان کو ذرا آرام کرنے دے۔“

حجام شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ آخر میں آپ نے اسے ایک دینار دے دیا حجام کو اس اجرت پر حیرت ہوئی وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے انہوں نے آپ کو روک لیا۔ بولے

”جناب! آپ صبح سویرے بتائیے آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟“
 آپ نے جواب دیا ”ہاں میں اپنے ہوش میں ہوں، کیوں، میں نے کون سی بے ہوشی
 کی بات کی ہے؟“

کسی شخص نے کہا ”آپ نے حجام کو ایک دینار دیکر بہت زیادہ اجرت دے دی ہے“
 آپ نے جواب دیا ”اگر میں نے ایک دینار دیا ہے تو اس پر تو کیوں اعتراض کر رہا ہے؟“
 اس شخص نے کہا ”میرے خیال میں یہ اسراف ہے جا ہے“
 آپ نے جواب دیا ”میں اسے اسراف میں شمار نہیں کرتا کیونکہ دین میں مروت ضروری
 ہے اور اسے میں نے مروت سمجھ کر دیا ہے بے جا اسراف سمجھ کر نہیں دیا“
 وہ شخص خاموش رہا۔

امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام ابو محمد کا ایک زمانہ احترام کرتا تھا
 خلیفہ ہارون رشید نے ان دونوں کو قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا امام ابو محمد نے
 اپنے استاد امام ابو حنیفہ کی پیروی میں یہ منصب قبول نہیں کیا لیکن ابو یوسف نے قبول کر لیا
 آپ کو ابو محمد سے عقیدت ہو گئی لیکن امام ابو یوسف کی قدر و منزلت دل سے نکل گئی
 امام ابو یوسف نے آپ سے پوچھا ”حضرت! میں نے سنا ہے کہ آپ ابو محمد کو مجھ پر
 ترجیح دیتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”ہاں یہ درست ہے“
 امام ابو یوسف نے کہا ”آپ مجھے کیوں ناپسند فرماتے ہیں؟“
 آپ نے دو ٹوک جواب دیا ”صرف اس لئے کہ جب آپ کے استاد امام ابو حنیفہ کو خلافت
 کی طرف سے یہ منصب پیش کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے ٹھکرادیا تھا اور اس انکار کی انہیں
 سزا بھی دی گئی تھی اور تم نے اسی منصب کو قبول کر لیا ہے پھر میں تم کو کس طرح پسند کر سکتا ہوں
 مجھے امام ابو محمد زیادہ پسند ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے استاد کی پیروی میں یہ منصب نہیں
 قبول کیا“

امام ابو یوسف نے جواب دیا ”لیکن میں اس منصب کے ذریعے لوگوں کی خدمت کر رہا
 ہوں“

آپ نے طنز یہ کہا ”ہاں ایک طرف خلیفہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے دوسری طرف تم کر رہے“

ہو اور تم دونوں لوگوں کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو میں آج یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔
امام ابو یوسف خاموش ہو گئے۔

ایک دن امام ابو یوسف آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ”حضرت! امیر المومنین ہارون رشید آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب فرمائیں لے کر حاضر ہو جاؤں گا، آپ نے صاف انکار کر دیا بولے ”نہ نہ اسے میرے پاس ہرگز نہ لانا وہ میرے پاس کیوں آنا چاہتا ہے؟ میں اس سے نہیں ملوں گا، ہرگز نہیں ملوں گا۔“

امام ابو یوسف نے التجا کی، ”حضرت! میں نے امیر المومنین سے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ سے ان کی ملاقات ضرور کرادوں گا۔“

آپ نے جواب دیا ”مجھ سے ملے بغیر تو نے ہارون رشید سے وعدہ کیوں کر لیا؟“
امام ابو یوسف نے کہا ”اس لئے کہ میں جانتا ہوں آپ ایک خوش اخلاق انسان ہیں۔
میری بات ضرور مان لیں گے۔“

آپ نے جواب دیا ”تو نے سخت غلطی کی ہیں دنیا دار ظالموں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور ہارون رشید ان ہی ظالموں میں سے ایک ہے اسی لئے میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔“
امام ابو یوسف مایوس ہو کر چلے گئے جب ہارون رشید کو اس بات کا علم ہوا کہ داؤد نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بہت سٹ پٹایا، بولا ”اب کیا ہوگا؟ اور میں ان سے ہر قیمت پر ملوں گا۔“

آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ہارون رشید اپنی ماں خیزان کو آپ کے پاس بھیجے گا اور وہ خود شام در آمد سے آپ کو ہارون کی ملاقات پر آمادہ کر لیں گی۔

خیزان کوئی معمولی عورت نہیں تھی چنانچہ اس نے آپ کو ملاقات پر آمادہ کر لیا آپ نے سکایا کہا ”خیزان! ہارون تیرا بیٹا ہے کیا تو اپنی آخرت کی طرف سے فکر مند نہیں ہے؟“

اس نے جواب دیا ”میں تو مسووح سووح کر قدم اٹھاتی ہوں اسی لئے میں شرمندگی سے محفوظ رہتی ہوں۔“

آپ نے فرمایا ”اچھا اپنے بیٹے کے پاس جا اور اسے اس شرط پر میرے پاس بھیج دے کہ وہ مجھے کچھ دینے کی کوشش ہرگز نہ کرے، کیونکہ میں بادشاہوں کو ظالم اور جابر سمجھتا ہوں اور اسی لئے میں بادشاہ سے کچھ لینا بالکل پسند نہیں کرتا۔“

خیزران اپنے بیٹے ہارون رشید کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ان دونوں کے ساتھ امام ابو یوسف بھی تھے۔ ہارون رشید بڑے احترام سے پیش آیا۔
آپ نے کہا: ”ہارون! تمہیں پاس کس چیز کی کمی ہے پھر وہ کیا چیز تھی جو تجھے میرے پاس لائی؟“

ہارون نے جواب دیا: ”آپ کی بے نیازی، آپ کا استغنا۔ والدین جو چاہوں، خرید لوں، جسے چاہوں ملازم رکھ لوں لیکن آپ کے سامنے میری کوئی حیثیت ہی نہیں اور اس وقت تو مجھے اپنی اس کمزوری اور بے بضاعتی کا بہت زیادہ احساس ہوا جب میں نے آپ کی خدمت میں امام ابو یوسف کو بھیجا اور آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ مجھ سے نہیں مل سکتے۔“
آپ نے جواب دیا: ”ہاں ہارون! میں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جابر اور ظالم سمجھتا ہوں تم لوگ عوام کی امانت کو اپنے آپ پر خرچ کرتے ہو اپنی خواہشات میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے چنانچہ روز قیامت جتنا بڑا احساسِ سبتم لوگوں کا ہوگا کسی اور کا عشرِ عشر بھی نہیں ہوگا۔“

ہارون کچھ دیر آپ کی خدمت میں رکا رہا اس کے بعد کہا: ”حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔“
آپ نے جواب دیا: ”میں تجھے نصیحت نہیں، تجھ سے خواہش کروں گا۔“
ہارون نے پوچھا: ”وہ کیا؟“

آپ نے جواب دیا: ”اب آئندہ تو مجھے یا میرے جیسے کسی اور کو ملاقات کی زحمت سے محفوظ رکھو گا۔“

ہارون نے کہا: ”میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں آپ کو کچھ پیش کروں۔“
آپ نے جواب دیا: ”خواہش کو مار، نفس کشی کر یوں کہ وہ لاہوری ہیں جو انسان کو زندگی بھر سانپ کی طرح ڈستے رہتے ہیں۔“

ہارون کے ہاتھ میں ایک دینار تھا اُسے آپ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا: ”آپ زیادہ نہیں تو ایک دینار تو قبول ہی فرمائیں۔“

آپ نے ہارون کی ماں خیزران کی طرف دیکھا اور کہا: ”کیا میں نے ملاقات سے پہلے ہی یہ شرط نہیں رکھ دی تھی کہ میں ملاقات اس شرط پر کروں گا کہ بادشاہ سے کچھ قبول نہ کروں گا؟“
خیزران نے جواب دیا: ”ہاں یہ شرط آپ نے رکھی ضرور تھی لیکن میرے بیٹے کی معمولی

خواہش اگر آپ پوری کر دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

آپ نے کہا ”میرے پاس اپنے خرچ کے لئے جائز رقم موجود ہے اس لئے بادشاہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

ہارون نے کہا ”آپ یہ دینا رکھ لیجئے کیوں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، جب آپ کے پاس اپنی رقم خرچ ہو جائے گی اس وقت یہ میرا دینا آپ کے کام آجائے گا۔“

آپ نے جواب دیا ”اولیٰ تو یہ ہے کہ میرے پاس جتنی رقم موجود ہے وہ زندگی بھر کے لئے کافی ہے لیکن اگر یہ رقم ناکافی بھی ہوگی تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ میری اسی دن موت واقع ہو جائے جب یہ میری رقم میرے پاس ختم ہو جائے۔“

امام ابو یوسف نے ہارون رشید کو منع کیا ”امیر المومنین! آپ داؤد کو مجبور نہ کیجئے انہوں نے اگر ایک بار کچھ لینے سے منع کر دیا ہے تو یہ ہمارے لاکھ اصرار اور خوشامد کے باوجود کچھ بھی نہ لیں گے۔“

مجبوراً ہارون رشید کو یوں ہی واپس آجانا پڑا۔

آپ جس مکان میں رہتے تھے وہ آپ کا آبائی تھا اور خا صاً بڑا مکان تھا ایک مدت سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ مکان جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا آپ کے مریدوں نے آپ کو منع کیا کہ وہاں سے ہٹ جلیئے ورنہ یہ کسی دن سر پر آ رہے گا لیکن آپ نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور عبادت و ریاضت میں مشغول رہے آپ کے ایک مرید نے کہا ”حضرت آپ توجہ نہیں دے رہے ہیں اور مجھے بڑا خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں مکان کا یہ حصہ آپ پر نہ گر جائے۔“

آپ نے جواب دیا ”لیکن میں خوف نہیں محسوس کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اگر یہ گرا بھی تو مجھ پر ہرگز نہ گرے گا۔“

مرید نے کہا ”یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں یہ بوسیدہ عمارت ہر اُس شخص پر گر سکتی ہے جو اس کے نیچے موجود ہوگا۔“

آپ نے کہا ”اگر میرا رب یہی چاہتا ہے کہ میں اس کا ذکر کرتے کرتے دیوار تلے دب کر اس کے پاس پہنچ جاؤں تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے مرضی مولیٰ ازہمہ اولیٰ۔“

جب مریدوں نے یہ دیکھا کہ آپ پر نصیحتیں کارگر نہیں ہو رہی ہیں تو خاموشی اختیار کر لی۔

مگر خود احتیاط کرنے لگے وہ آپ کے پاس جاتے، آپ سے باتیں کرتے لیکن بوسیدہ دیوار سے دور رہتے کیونکہ وہ اس یقین کی دولت سے محروم تھے جو داؤد طائی کو حاصل تھی۔
ایک دن فجر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ جیسے ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے دیوار ہلنے لگی اور اس سے گرد و غبار چھڑنے لگا۔ مریدوں نے شور کیا، ”حضرت بیٹھے، دیوار لرز رہی ہے“
آپ نے دیوار کی طرف دیکھا اور فرمایا ”اے دیوار! میں نے تجھ سے اپنی پشت ہی تو ٹکائی تھی تجھ پر اپنا پورا بوجھ تو نہیں ڈالا تھا، پھر تو کیوں کانپ رہی ہے؟“
لوگوں نے دیکھا دیوار نے ہلنا بند کر دیا تھا، آپ اس سے پشت ٹکا کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

آپ نے اپنے مریدوں سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”لوگو! اگر ان خود کو اللہ کے حوالے کر دے تو اللہ کی مخلوق اسے گزند نہیں پہنچا سکتی، ہاں اگر اللہ ہی نہ چاہے تو دوسری بات ہے۔“

ایک مرید نے کہا ”حضرت! آپ کی بات میری سمجھ میں اس لئے نہیں آتی کہ چیزیں کسی کے لئے اپنا خواص کس طرح بدل سکتی ہیں؟ آگ کی گرمی، برف کی ٹھنڈک یہ تو قائم ہی رہیں گی۔“
”ہاں، بے شک ان کے خواص میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوگی۔“

مرید نے عرض کیا ”پھر جب یہ سب ہو گیا۔ کہ چیزیں اپنے خواص نہیں بدلتیں تب پھر یہ شکستہ دیوار اپنی ٹہریوں کی کر کے کس طرح کھڑی رہ سکتی ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”چیزوں کے خواص اللہ کے حکم سے ہی تو قائم ہیں ان خواص میں اللہ کے حکم ہی سے رد و بدل بھی ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح خدا کے حکم سے حضرت خلیل اللہ کے لئے آگ گھڑا بن گئی تھی۔“

آپ باتوں میں مشغول ہی تھے کہ دیوار لرزی اور لرز کر دوسری طرف گر گئی آپ بالکل محفوظ رہے آپ نے گری ہوئی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”دیکھ خدا نے شکستہ گی میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی، بس اس کے گرتے کا رخ بدل دیا۔ اور اس طرح اس نے اپنے بندے کو بچا لیا۔“

مریدوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی بولے ”بے شک خدا چاہے تو آگ گھڑا بن سکتی ہے۔“
آپ نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور دوسری دیوار کے سامنے جا بیٹھے۔

آپے کا پورا مکان ہی شکستہ و بوسیدہ ہو چکا تھا، جس دوسری دیوار کے سائے میں آپ جا کر بیٹھ گئے تھے، وہ بھی بہت کمزور تھی، مریدوں نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ آپ یہاں سے بھی ہٹ جائیں۔

آپ نے جواب دیا ”میں اس دیوار کے سائے سے ہٹ کر کہیں تو جاؤں گا ہی اور یہ پورا مکان بوسیدہ و خستہ ہو رہا ہے تم لوگ پورے مکان میں گھوم پھر کر وہ جگہ تو بتاؤ جو نسبتاً زیادہ اچھی اور مضبوط ہو میں وہیں منتقل ہو جاؤں گا“

مریدوں نے مکان کا ہر حصہ خوب غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی ہر جگہ ہر حصہ غیر محفوظ اور بوسیدہ ہے مجبوراً خاموشی اختیار کی اور آپ جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھا رہنے دیا۔

ایک دن ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کیا ”حضرت! مجھے آپ کا پاس امام ابو یوسف نے بھیجا ہے“

آپ نے پوچھا ”کس لیے؟ کوئی کام؟“

آدمی نے جواب دیا ”کام تو کوئی بتایا نہیں، بس یہ پوچھا ہے کہ آپ کے پاس اس وقت کتنی رقم موجود ہے؟“

آپ نے کہا ”اگر میں تیرے سوال کا جواب دے بھی دوں تو اس سے اُس کو یا مجھ کو کیا حاصل ہوگا؟“

آدمی نے کہا ”میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے آپ دونوں میں سے کس کو کیا حاصل ہوگا؟ لیکن انہوں نے مجھے بھیجا اس لئے کہ میں ان کے اس سوال کا جواب آپ سے لیں ان تک پہنچا دوں“

آپ مسکرائے، بولے ”امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ جس امام ابو حنیفہ کے تم شاگرد ہو اس کا بیس سال تک میں بھی شاگرد رہا ہوں، تم فقیہ ہو تو میں غریب درویش ہوں جو بات تمہارے دل میں ہے خدا نے اس کا کشف میرے دل پر کر دیا ہے تم امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ اس کے سہارے کسی کا احسان لئے بغیر اپنی بقیہ زندگی گزار دوں“

امام ابو یوسف کے آدمی نے کہا ”حضرت! مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ انہوں

نے یہ سوال کیوں کیا ہے اور اگر آپ پر یہ بات کشف سے منکشف ہو چکی ہے تو میں جواب

لے جانے کا پھر بھی پابند رہتا ہوں ۛ

آپنے جواب دیا ۛ امام ابو یوسف سے کہہ دینا ابھی میرے پاس چاندی کے دس درہم باقی ہیں ۛ

وہ آدمی یہ جواب لے کر چلا گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر واپس آیا اور کہا ۛ حضرت اب وہ یہ دریافت فرماتے ہیں کہ چاندی کا ایک درہم آپ کو کتنے دنوں کے لئے کافی ہوتا ہے؟ ۛ

آپ نے جواب دیا ۛ تقریباً دو ماہ کے لئے ۛ

جب یہ شخص آپ کا جواب لے کر چلا گیا تو آپ نے اپنے مریدوں سے دریافت فرمایا ۛ تم لوگوں نے کچھ محسوس کیا کہ ابو یوسف مجھ سے کیا معلوم کر رہے تھے؟ ۛ لوگوں نے جواب دیا ۛ ہمیں نہیں معلوم، کچھ آپ ہی وضاحت فرمائیں ۛ

آپ نے کہا ۛ میں نے ایک بار ابو یوسف سے یہ کہا تھا کہ میرے پاس جو رقم موجود ہے وہ پوری زندگی کے لئے کافی ہے اس طرح وہ یہ پوچھ کر کہ میرے پاس کتنی رقم باقی رہ گئی ہے اور چاندی کا ایک درہم مجھے کتنے دنوں کے لئے کافی ہوتا ہے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ابھی کتنے دن اور جیوں گا ۛ

مریدوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا، اس حساب سے آپ کو بیس ماہ اور زندہ رہنا تھا۔

جیسے جیسے رات پوری ہو رہی تھی لوگوں کی فکر و تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ جس دیوار کے سائے میں بیٹھے تھے وہ پہلی دیوار سے زیادہ کمزور تھی اور ہوا کے جھونکوں سے ہلنے لگتی تھی لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ اگر داؤد سابقہ گری ہوئی دیوار سے بچ گئے تھے تو اس دیوار تلے دبنے سے نہیں بچیں گے انہوں نے آپ کو ایک باپھر منع کیا ۛ حضرت! یہ دیوار پچھلی دیوار سے زیادہ کمزور ہے خدا کے لئے یہاں سے ہٹ جائیے ۛ

آپ نے جواب دیا ۛ لوگو! جس خدا نے مجھے پہلے بچایا تھا وہی اس وقت بھی میرا محافظ ہے ۛ

ایک مرید نے کہا ۛ ہمیں تو اس لئے زیادہ فکر ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا جو حساب

بتایا تھا اس کے اعتبار یہ دیوار طبری خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔

آپ نے جواب دیا ”تم جس خطرے کا اظہار کر رہے ہو، ہو سکتا ہے وہ اسی طرح رونما ہو جائے لیکن میں تقدیر الہی سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں۔“

مرید نے عرض کیا ”آپ میرے گھر تشریف لے چلیں، میں آپ کی خدمت بھی کروں گا اور سہنے کے لئے ایک اچھا سا کمرہ بھی دوں گا آپ کے لئے کیا کمی ہے؟“
 ”افسوس کہ میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا پھر ان آخری لمحوں میں کسی کا کیا احسان کروں گا۔“
 ”میرید نے کہا ”میں جو کچھ کروں گا وہ احسان کب ہوگا؟ آپ نے مجھے صراطِ مستقیم پر ڈال دیا ہے میں جو کچھ بھی کروں گا عقیدت کروں گا، آپ میرا دل نہ توڑیئے۔“

آپ نے جواب دیا ”میں تیرا دل نہیں توڑ رہا ہوں بلکہ وہی کر رہا ہوں جس کا میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔“

مرید کو بڑا قلق ہو رہا تھا، کمزور دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا ”خدا کے لئے اس پہنچ ہوئی دیوار سے ڈریئے۔“

آپ نے جواب دیا ”میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں اور کسی سے نہیں۔“

مرید نے عرض کیا ”ظاہر ہے میں آپ سے درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں۔“ لیکن آپ نے مرید کی بات نہیں مانی۔

آپ دیوار کے سامنے بیٹھے وعظ فرما رہے تھے ”لوگو! لمحے ساختوں میں

ساعتیں گھریوں میں اور گھڑیاں پیروں میں، پیر دنوں میں اور دن ہفتوں مہینوں اور

سالوں میں بدلتے جا رہے ہیں جو آیا ہے اُسے جانا بھی ہے جس نے زندگی کا مزہ

چکھا ہے اُسے موت کا مزہ بھی چکھنا ہے، لوگو! میں ان پر حیران ہوں جو ہنستے ہیں

اور اُن سے زیادہ اُن پر حیران ہوں جو قہقہے لگاتے ہیں واللہ اگر عرفانِ ذات اور

عرفانِ کائنات حاصل ہو جائے تو وہ مسکراتا اور قہقہے لگانا بھول جائیں گے۔“

ایک مرید نے پوچھا ”ہمیں زندہ رہنے کے لئے سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے اس لئے

یہ بتلیئے کہ ہم صاف ستھری زندگی کس طرح بسر کریں؟“

آپ نے جواب دیا ”اگر تم یہ سمجھ لو کہ تم پل صراط عبور کر رہے ہو تو تم زندگی اور

دنیا میں صحیح زندگی گزار سکو گے کیونکہ پل صراط پر پہنچنے والے نہ تو ہنس سکتا ہے اور نہ ہی

قمقمے لٹا سکتا ہے ۛ

اس وقت دیوار نے ہلنا اور گرنا شروع کر دیا۔ مرید بھاگ کر ادھر ادھر پہنچ گئے اور دیوار گرے گرتے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اس کا ایک حصہ بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف گر لیا۔ جہاں آپ بیٹھے تھے وہ جگہ محفوظ رہی آپ نے اپنا سامان سمیٹا اور صدر دروازے والے حصے پر منتقل ہو گئے یہاں چھت پڑی تھی مگر یہ بھی بہت زیادہ بوسیدہ تھی آپ کے مریدوں نے عاجزہ اگر عرض کیا وہ حضرت! آخر آپ ہماری بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آپ ہم میں سے جس کے گھر میں بھی رہنا چاہیں چل کر رہیں اور اس بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیں ۛ آپ نے جواب دیا ۛ افسوس کہ جیسا میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنا آبائی مکان نہیں چھوڑ سکتا ۛ

ایک مرید نے کہا یہ تب پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس حصے کی چھت نئی ڈلوں کیوں کہ یہ بہت بوسیدہ ہے اور اگر گری تو یہ آپ کے اوپر ہی گرے گی ۛ آپ نے جواب دیا ۛ اب میری زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے جو میں نئی چھت کی فکر کروں ۛ

ایک دن آپ کو ان کے مریدوں نے دیکھا کہ دھوپ میں بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ انہیں خوشی ہوئی کہ چلئے آپ نے محذوش چھت سے کنارہ کشی تو اختیار کی لیکن آپ کے بعض مریدوں کو اس پر بہت قلعی ہوا کہ آپ دھوپ میں بہت پریشان ہو رہے ہیں ایک مرید نے درخواست کی ۛ حضرت! آپ سائے میں تلاوت فرمائیں اس ضعیفی میں دھوپ آپ کی صحت بگاڑ دے گی ۛ

آپ نے جواب دیا ۛ میں نے زندگی بھر اپنے نفس کا کہا نہیں کیا۔ اس وقت بھی میرے نفس کی یہی خواہش ہے کہ میں سائے میں چلا جاؤں، یعنی میں زندگی کے ان آخری لمحوں میں نفس کی بات مان کر پوری زندگی کے اعمال برباد نہیں کروں گا ۛ آپ نے اپنے مریدوں سے کہا ۛ دیکھو جب میں مر جاؤں تو مجھے میرے اس مکان کی دیوار تلے دفن کر دینا ۛ

مریدوں نے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنا شروع کر دیں۔ وہ آپس میں چرمیکوٹیا کہہ رہے تھے ۛ کیا آپ رحلت فرمانے والے ہیں؟ ۛ

”شاید باتوں سے تو یہی معلوم ہو رہا ہے“

”لیکن کب؟ کیا دو چار دن میں، یا دو چار ہفتوں میں؟“

”کچھ پتہ نہیں لیکن شاید ایک آدھ ماہ میں“

اس دن آپ کے مرید آپ کے پاس نصف رات تک موجود رہے۔

اس رات ایک مرید نے خواب میں دیکھا کہ آپ فضا میں پرواز کر رہے ہیں، جاگنے

کے بعد اس نے سوچا کہ خدا نے آپ کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے وہ علی الصبح اپنا

خواب بتانے آپ کے پاس پہنچا، وہاں بہت سے مرید جمع تھے اور بوسیدہ چھت

کے نیچے یونان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ سسکیاں لے لے کر دودھ پیتے تھے، ایک

مرید نے اعلان کیا ”حضرت وصال فرما چکے ہیں“

خواب دیکھنے والے مرید نے دوسرے مریدوں کو اپنا خواب سنایا اور باوازا

بلند بتایا کہ ”مجھے میرے خواب کی تعبیر مل چکی ہے میں نے رات آپ کو پرواز کرتے

دیکھا تھا چنانچہ آپ نے عالم بالا کا سفر اختیار کیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے“

آپ کے مریدوں نے آپ کو وصیت کے مطابق ان کے آبائی مکان ہی کی ایک

دیوار کے نیچے دفن کر دیا۔

کہتے ہیں وہ بوسیدہ چھت بھی اسی دن زمین بوس ہو گئی۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

سکینۃ الاولیاء	تذکرۃ الاولیاء	طبقات الکبریٰ	خزینۃ الاصفیاء	تذکرہ اولیاء کرام
شہزادہ داراشکوہ	فرید الدین عطار	علامہ شعرائی	مفتی غلام سرور لاہوری	ریحانِ احمد جعفری

حضرت فضیل بن عیاضؓ

ٹاٹے کا لباس جسم پر تھا اور اونی ٹوپی سر پر وہ مصلے پر بیٹھے تسبیح پڑھتے ہیں
 مشغول تھے نورانی چہرے کی معصومیت ایسی نہ تھی کہ دیکھنے والے اس سے متاثر نہ ہوتے۔ ان
 کے چاروں طرف جنگل کی تنہائی تھی، سناتا تھا کسی کسی لمحے چڑیوں کی چہک سے سکوت و سکون
 تہہ وبالا ہو جاتا۔ قافلوں کے لیے یہ جنگل بہت مخدوش اور خطرناک تھا۔ جنگل کے بچوں بیچ
 قافلوں کی گزرگاہ کی جواکب پٹی سی پائی جاتی تھی اسے لوگ موت کی شاہراہ کہتے تھے کیونکہ اس
 شاہراہ کے اس پاس کہیں جنگل میں مشہور راہ زن فضیل بن عیاض اور ان کے ساتھیوں
 کا مسکن تھا اور اس راہ سے بہت کم قافلے صحیح سلامت بیچ کے نکل سکتے تھے جنہیں
 اپنا تحفظ عزیز ہوتا اور حدود و جد احتیاط پسند ہوتے وہ اپنی منزل مقصد تک پہنچنے کے
 لیے طویل طویل راہیں اختیار کرتے اور اس قریب کی راہ سے گزیر کرتے لیکن بعض کے
 لیے تو یہ جنگل گمراہ ناگزیر تھی اور وہ ہر حال میں اس موت کی شاہراہ پر چلنے کے لئے مجبور
 ہوتے۔ ایک ایسا ہی قافلہ خچروں اور اونٹوں پر سامان تجارت لادے ہوئے جنگل میں داخل
 ہو گیا اونٹوں کے گلوں کی گھنٹیاں آتا رہی گئی تھیں اور قافلے والوں نے ازراہ احتیاط اپنے
 اپنے ہتھیاروں کو ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ کیوں کہ انہیں صبح طلوع ہونے والے سورج
 کی ابدی حقیقت کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ فضیل بن عیاض اور اس کے ساتھی اہل
 قافلہ پر حملہ آور ہوں گے اور ان سے اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے باقاعدہ جنگ
 ناگزیر ہوگی اس قافلے میں ایک عمر رسیدہ بزرگ ضرورت سے زیادہ ہوشیار و پریش بین تھے
 انہوں نے سوچا کہ حملہ آور بہت زیادہ چالاک لوگ ہیں اور ان کی چالاکیاں اور جنگجو یا زہماتوں
 پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا اہل قافلہ نے سمجھ رکھا ہے انہوں نے جنگل میں داخل ہوتے
 ہی ایک نورانی شکل صورت کے بزرگ کو مصلے پر نماز اور تسبیح پڑھتے ہوئے دیکھا تو بہت
 متاثر ہوئے اور ان بزرگ کی اس شان بے اعتنائی اور بے نیازی نے ان تاجروں کو بہت

زیادہ مرعوب اور متاثر کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ جو شخص اتنی ہمت لیے باکی اور بے خوفی سے اس جنگل میں تنہا رہ رہا ہے وہ یقیناً کوئی چیز ہوگا اس تاجر نے اپنی قیمتی چیزیں اور اشرفیاں ایک بڑی چادر میں باندھ لیں اور انہیں لٹے ہوئے ان صاحبِ کُرد روبرو پہنچ گئے یہ صاحب کچھ دیر چپ چاپ کھڑے ہو کے ان بزرگ کی شکل دیکھتے رہے پھر جب انہوں نے سلام پھیرا تو یہ صاحب ان بزرگ کے سامنے پہنچ گئے اور خوشامداز عرض کیا ”حضرت!

میں ایک مسافر ہوں اور میرے پاس کافی مقدار میں سامان اور اشرفیاں موجود ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دیندار انسان ہو۔ اس لئے میری مدد کرو۔ میں تمہیں زندگی بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔“ ان بزرگ نے تسبیح کا وظیفہ ختم کر کے اس تاجر بوڑھے کو غور سے دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم ایک کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے جانتے ہو؟“

تاجر نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور میں کیا تمہیں جو شخص دیکھے گا پہچان لے گا تمہارے چہرے پر جو نورانی تقدس پایا جاتا ہے وہ ہر ایک کو صید کر سکتا ہے“

ان بزرگ نے پھر اپنے مخاطب تاجر کو نکھیریں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا اور آہستہ سے کہا ”تم میرے پاس جس مقصد سے آئے ہو میں جانتا ہوں بولو تم کیا چاہتے ہو؟“

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں اپنا قیمتی سامان اور اشرفیاں تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں کیونکہ جنگل کے قزاق ہم پر حملہ آور ہوں گے تو وہ تم جیسے قلندر اور مست دبے نیاز انسان سے کچھ پوچھنا بھی گوارا نہ کریں گے اور میرا مال اور نقدی محفوظ رہ جائیں گے حالات کے سدھرتے ہی میں اپنی امانت تم سے حاصل کر کے اپنے گھر کی راہ لوں گا۔“

ان بزرگ نے کہا۔ ”میں تمہاری درخواست ماننے پر مجبور ہوں تم اپنا قیمتی سامان اور اشرفیاں میرے حوالے کر جاؤ میں اپنی جان کی طرح ان کی حفاظت کروں گا، تم بے فکر رہو۔“ تاجر نے اپنا ضروری سامان اور اشرفیوں کی تھیلیاں اس بھولی بھالی شکل والے بزرگ کے حوالے کر دیں اور خود بھاگ کے قافلہ میں شامل ہو گیا۔

سُورج نکلنے سے ذرا پہلے قافلہ جنگل کی درمیانی راہ پر آہستہ آہستہ چوروں کی طرح رواں دواں تھا۔ لوگ نہایت ہوشیاری کے ساتھ، ڈاکوؤں سے بچکر نکل جانا چاہتے تھے لیکن عین اس جگہ جہاں اُملی اور برگد کے بڑے بڑے گھنیرے درختوں کی بہتات تھی سرسراٹ اور کھڑکھڑاہٹ کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی قافلہ والوں کے کان کھڑے ہو گئے پھر یکایک

ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے آدمیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا ہے۔ درختوں کی آڑ سے آدمی اس طرح نمودار ہوئے شروع ہو گئے گویا انہیں درخت جہنم سے ہے ہوں یہ ہاتھوں میں تنگی تلواریں اور نیزے لیے قافلے والوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے انہوں نے آتے ہی قافلے والوں کو رزنا سہانا شروع کر دیا۔ پہلے تو قافلے والوں نے اُن کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن ڈاکوؤں کی ہیبت اُن پر غالب آگئی اور جب قافلے کے چند آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے تو تاجروں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے چیخ چیخ کر ڈاکوؤں کو مطلع کیا کہ تم لوگ ہم سے ہمارا سب کچھ لے لو لیکن ہماری جانیں مت لو۔

کسی ڈاکو نے حکم دیا۔ ”تم سب لوگ اپنے مال اسباب کے پاس سے ہٹ کر دوڑ چلے جاؤ اور اپنی اپنی پشت ادھر کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر جب حکم دیں تو واپس آ کے اپنا بچا کھچا سامان لے کر فوراً دفعہ چکر ہو جاؤ۔“

دُور سے سہمے قافلے والوں نے یہی کیا اور اپنے سامان کے پاس سے دوڑ چلے گئے انہوں نے ڈاکوؤں کی طرف اپنی پشتیں کر لیں۔ اور ڈاکوؤں نے اُن کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا کچھ ڈاکوؤں نے قافلے والوں کو گھیرے میں لے کر ان کے ہتھیار چھین لئے اور ان کی جامہ تلاشی شروع کر دی اور ان کے نقد رقوم چھین لیں کافی دیر بعد انہیں حکم ملا کہ وہ اپنے بچے کھچے سامان کو لے کر اس جنگل سے فوراً نکل جائیں، لٹے ہوئے قافلے والے اپنے سامان کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ سٹو اور کھجور کے کچھ تھیلے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ ڈاکو ان کی بار بار ڈاری کے جانور تک لے گئے تھے ان افسردہ اور غمزدہ قافلے والوں کو کسی ڈاکو نے باوازا بلند حکم دیا۔ ”بزدلو! سٹو اور کھجور کے تھیلے اس لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ تم آبادیوں میں داخلے تک بھوکے پیاسے نہ رہو اور یہی یقین ہے کہ تم لوگ کتنے ہی ناشکرے کیوں نہ ہو، ہمارے اس احسان کو زندگی بھر نہ بھولو گے۔“

اس کے بعد ڈاکو سارا سامان لے کر جنگل کی گہرائیوں میں گم ہو گئے اور قافلے والے شکستہ و افسردہ اپنا بچا کھچا سامان لے کر چلنے کی فکر کرنے لگے۔ جس تاجر نے ڈاکوؤں کے دُور سے اپنا سامان اور اشرافیاں پہلے ہی ایک متقی پرہیزگار کے پاس امانت رکھوایا تھا وہ اب بھی مطمئن تھا اس نے قافلے والوں سے کہا ”بھائیو! تم لوگ تھوڑی دیر میرا انتظار کر لو میں ابھی آتا ہوں۔“

کسی دل چلے قافلے والے نے کہا۔ ”کیوں؟ کیا اس جنگل میں مزید بڑھ کر ہم سب کو جان ۳۵

سے مروادینا چاہتے ہو؟

تاجر نے جواب دیا: نہیں، مجھے اس جنگل میں ایک صاحب سے ملاقات کرنی ہے اور ان سے ملے بغیر میں نہیں جاسکتا۔

ایک دوسرے تلخ نے کہا: اس جنگل میں تیرا کون دوست ہے؟ تو کیسی پراسرار باتیں کر رہا ہے اپنی سمجھ میں تو تیری یہ بات آتی نہیں۔

تاجر نے سوچا کہ جب وہ اپنی امانت والی چیزیں لے کر قافلے میں واپس آئے گا تو لوگ اس کے بارے میں معلوم نہیں کیسی چیز میگوئیاں کریں اور وہ اس کی صفائی پیش کرتے کرتے پریشان ہو جائے، اس لئے اس نے سب کچھ صاف صاف بتا کے قافلے والوں سے کہا: اب ڈکو جا چکے ہیں اس لئے میں اپنی چیزیں اور اشرفیاں ان بزرگ سے لے کر واپس آتا ہوں۔

انتہائی سگوار ہونے کے باوجود چند آدمی اپنی ہنسی نہ روک سکے، زور زور سے ہنسنے لگے ایک نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا: ”بھائی! تم اتنے احمق ہو! کمال ہے۔ یعنی کیا تم واقعی یہ یقین رکھتے ہو کہ وہ پرستیزگار بہرہ و پیا تمہاری چیزیں تمہیں واپس کرنے کا ارادے بھائی تمہاری سمجھ میں اتنی سی بات نہ آئی کہ اس جنگل میں، جہاں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہو کوئی کس طرح رہ سکتا ہے اور پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ چلو کوئی تارک دنیا دنیا کو چھوڑ چھاڑ واقعی اس جنگل میں ان بسا ہے تو تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ جس شخص نے دنیا سے بیزار ہو کر اسے ٹھوکر ماری ہو، وہ اس مردود دنیا کی آزمائشی اور سختی چیزیں امانتاً اپنے پاس رکھ کر خواہ مخواہ کی فکر کیوں مول لے گا۔“

تاجر غریب ڈرگیا ساری باتیں اب اس کی سمجھ میں اچھی طرح آرہی تھیں اس کے ہوش و حواس اڑ گئے وہ فوراً بھاگا ہوا اس متقی کے پاس پہنچا لیکن اب تو وہاں کا منظر سی کچھ اور تھا، جس جگہ ایک پرستیزگار اور متقی انسان ٹاٹ کا لباس اور آونی بالوں کی ٹوپی پہنے تسلیع پڑھنے میں مشغول تھا اب وہاں لیٹروں کا ہجوم تھا ان کے سامنے ٹوٹا ہوا سامان ڈھیر تھا اور ڈاکوؤں کا سردار اسے اپنے ساتھیوں میں مساویانہ تقسیم کا کام انجام دے رہا تھا اس نے آنکھیں مل مل کے کئی بار ڈاکوؤں کے سردار کو دیکھا اور جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جسے اس نے اپنی چیزیں امانتاً رکھنے کو دی تھیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پریشانی اور مایوسی نے اخلاص کی سی کیفیت پیدا کر دی

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے اسے سکتہ سالک گی تھا جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب وہ نہ تو آگے بڑھ کر اپنی چیزیں مانگ سکتا تھا اور نہ ہی اسے شرم و ندامت کے اپنے قافلے میں واپس جاسکتا تھا وہ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ کسی ڈاکو نے اس عجیب و غریب آدمی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر مذاق کیا، پوچھا ”بھائی! تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ خیریت تو ہے؟“

کسی دوسرے ڈاکو نے مذاق کیا۔ ”اسے ہمارا پیشہ پسند آگیا ہے شاید یہ بھی ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔“

ان چرمیگوں پر ڈاکوؤں کے سردار نے بھی اس شخص کی طرف دیکھا اور اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ ہنسنے لگا، پوچھا ”کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے میرے پاس تو آؤ۔“ تاجر، ڈاکوؤں کے سردار کے پاس چلا گیا اور چپ چاپ اس کی صورت دیکھنے لگا۔ سردار نے پوچھا ”کیا بات ہے؟ تم میری صورت کیوں تک لے رہے ہو؟“

تاجر نے افسوس کے ساتھ جواب دیا ”میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا احمق انسان ہوں کہ صورت شکل اور وضع قطع دیکھ کر دھوکا کھا گیا اور اپنی دولت اپنے ہی ہاتھوں ایک قزاق کے حوالے کر دی۔“

قزاق نے تڑپتی سی کہا ”جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے یا اور کچھ بھی کہنا ہے؟“ تاجر نے جواب دیا ”مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ یہ دھوکا میں نے اللہ کے نام پر کھایا ہے اس لیے میں زیادہ افسوس بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے پاس جو کچھ بھی تھا اللہ کا دیا ہوا تھا اور شکر ہے کہ یہ بھی تو اسی کے نام پر۔“

قزاق نے حیرت، اور ندامت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ تاجر کی طرف دیکھا اور کسی فکر میں ڈوب گئے۔ لیٹرے ان کی شکل اور اندرونی کشمکش کو شدت سے محسوس کر رہے تھے تاجر نے سردار سے کہا ”سردار! اب میں واپس جا رہا ہوں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں جس کا جو پیشہ ہے وہ اس پر کاربند ہے اور جب خدا نے خود ہی یہ فرما دیا ہے کہ اس سے جو شخص جس طرح بھی روزی طلب کرے گا خدا اسی طرح دیگا تم خدا سے حرام کی روزی طلب کرتے ہو خدا تمہیں حرام کی روزی دے رہا ہے۔“

سردار نے کہا ”بہت بکواس کر چکے۔ تم اپنی جتنی چیزیں ماننا رکھو اگلے تھے وہ

ساری سامنے درخت کی آڑ میں رکھی ہیں، انہیں اٹھا لو اور رفوچکر ہو جاؤ۔“

تاجر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور وہ تذبذب اور شک کی نظروں سے سردار کی صورت دیکھنے لگا۔ سردار نے سختی سے کہا: ”کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ میں کہتا ہوں تم اپنی چیزیں منبھالو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

تاجر اس درخت کے پیچھے گیا تو وہاں واقعی اس کا سارا سامان جوں کا توں رکھا ہوا تھا اس نے اپنا سامان منبھالا اور اسے لے کر اپنے قافلے میں واپس چلا گیا۔ قافلے والوں کو اس واقعے پر یقین نہیں آیا۔ قزاق اور آتباڑا میں، لئیر اور اپنے قول و قرار کا اتنا زیادہ پابند، ڈاکو اور اخلاقی عہد و پیمان کا آسا میچا۔

دوسری طرف اپنے سردار کے رویے پر ڈاکو بھی کچھ کم حیران نہیں تھے انہوں نے سردار سے پوچھا: ”سردار! یہ کیا بات تھی؟ آپ نے اس شخص کا سامان الگ کیوں رکھ چھوڑا تھا اور اسے واپس کیوں کر دیا؟ کیا اس میں ہم سب کا حصہ نہیں تھا؟“ سردار نے جواب دیا: ”کیا تم نے اس تاجر کی باتیں نہیں سنی، اس نے مجھے جو کچھ دیا تھا، خدا کے اعتماد پر دیا تھا پھر کیا یہ بات مجھے زیب دیتی تھی کہ میں اس کے آٹے بڑے اعتماد کو ٹھیکس پہنچاتا؟“

ڈاکوؤں نے کہا: ”سردار! ہم سب اور تو کچھ جلتے نہیں، ہاں یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس جنگل میں قدر نے جس پیشے سے ہمیں وابستہ کر رکھا ہے اس پر پوری دیانت اور مستعدی سے ڈٹے ہیں، آپ کو وہ سامان اس تاجر کو نہیں واپس کرنا چاہیے تھا،“ سردار نے غصے میں کہا: ”تم لوگ میرے ماتحت ہو اس لئے کسی بھی معاملے میں آخری فیصلہ میرا ہی ہوگا اور اسے تم سب کو ماننا پڑے گا۔“

ڈاکو چپ ہو گئے لیکن سردار کی حالت کچھ متغیر ہوئی رہی سردار کے ایک عورت سے عشقیہ تعلقات تھے یہ اپنے حصے کا سامان اور نقدی لے کر اس عورت کے پاس پہنچ گئے اس کی خدمت میں بہت کچھ پیش کرتے ہوئے نہایت کرب سے کہا: ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح سکون حاصل کروں؟ میں بہت پریشان ہوں۔“

عورت نے پوچھا: ”آخر ہوا کیا؟ کچھ تفصیل سے بتاؤ تو شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں۔“

سردار نے عورت کو پورا واقعہ سنا دیا اور انکھیں بند کر کے کسی فکر میں گم ہو گیا عورت نے ٹھنک کر کہا: ”تم بھی عجیب آدمی ہو آخر اس میں کونسی ایسی بات تھی جس نے تمہیں اتنا پریشان کر دیا

ہے حالانکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے موجودہ پیشے اور زندگی میں ایسے بے شمار واقعات پیش آتے رہتے ہوں گے کہ تم ان پر اس واقعے سے زیادہ ماتم کر سکتے ہو، لیکن تم ان پر شاید کبھی غور بھی نہ کرتے ہو گے۔“

سردار نے جواب دیا: ”ہاں تم جو کچھ کہہ رہی ہو اس سے میں بھی واقف ہوں لیکن معلوم نہیں کیوں، اس واقعے نے میرے پوتے وجود کو ہلاک کر رکھا دیا ہے۔“

عورت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا: ”اگر تم کو یہ ذرا سا واقعہ اتنا پریشان اور خوفزدہ کر سکتا ہے تو مجھے ڈوبے کہ کسی دن کسی بات پر تم مجھ سے بھی متنفر ہو سکتے ہو۔“

”ہاں؟“ سردار نے کہا ”میرا دل اندر سے لرز رہا ہے اور یہ خوف کسی دن بھی میری دنیا کو بدل کے رکھ دے گا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟“

عورت نے ہنس کر کہا: ”دنیا کڑھنے جلنے کی جگہ نہیں ہے خوش و خرم رہو اور غموں کو پاس نہ پھینکنے دو، بس یہی کامیاب زندگی گزارنے کا راز ہے۔“

سردار کافی دیر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور عورت اسے تسلی دلا سے دیتی رہی۔

اس جھنگل سے ایک قافلہ اور گزرا اور اسے بھی لوٹ لیا گیا لٹے پٹے اہل قافلہ میں سے کسی نے ڈاکوؤں سے پوچھا ”تمہارا سردار کہاں ہے؟“

کسی ڈاکو نے کہا: ”سردار سے کیا کام ہے؟“

قافلہ والے نے کہا: ”میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکو زور زور سے ہنسنے لگا، بولا: ”ہمارا سردار تو ذرا اللہ والا ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ قافلہ کے تاجر نے پوچھا۔

ڈاکو نے کہا: ”وہ اس ڈاکے میں شریک نہیں تھا وہ ہمارا سردار تو ضرور ہے لیکن

ادھر کچھ دنوں سے اس میں بڑا فرق آگیا ہے چنانچہ ہم لوگ تو یہاں ڈاکہ مار رہے ہیں وہ

دیر کے کنا بے نماز پڑھ رہا ہوگا۔“

”نماز پڑھ رہا ہوگا؟“ قافلہ کے تاجر نے حیرت سے پوچھا ”کیا وہ نماز بھی پڑھتا

ہے؟“

”ہاں نماز بھی پڑھتا ہے اور روزے بھی رکھتا ہے چنانچہ وہ اس وقت بھی

روزے ہی سے ہے۔“

” لیکن یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے “

” ہاں یہ بھی صحیح ہے لیکن وہ عموماً روزه سے رہتا ہے “

” کمال ہے اگر کوئی اس سے ملنا چاہے تو ملاقات کس طرح کی جاسکتی ہے ؟ “

ڈاکو نے جواب دیا ” ان سے مل کر تم بات کیا کرو گے ؟ “

تاجر نے کہا ” یہ تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو ، تم لوگ قافلے کو تو لوٹ ہی چکے ہو میں اس سے ٹوٹا ہوا مال بھی نہیں مانگوں گا بلکہ میں اس عجیب و غریب شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ اور اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں “

” تب پھر تم میرے ساتھ آؤ “ ڈاکو نے کہا ” میں تمہیں اپنے سردار کے پاس

لے چلتا ہوں لیکن خبردار جو تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات کی “

ڈاکو اسے ساتھ لے کر دریا کے کنارے پہنچ گیا ، ڈاکوؤں کا سردار نماز پڑھ کر اسی

وقت فارغ ہوا تھا ، ڈاکو نے تاجر کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا بولا ” سردار ! آج

جو قافلہ لوٹا گیا تھا یہ اس قافلے کا ایک تاجر ہے اور معلوم نہیں کیوں یہ شخص اس بات پر

مصر ہے کہ اسے آپ سے ملوایا جائے ، میں مجبور ہو کر اسے آپ کے پاس لایا ہوں “

سردار نے تاجر کو گھورتے ہوئے پوچھا ” کیا بات ہے ؟ تم مجھ سے کیوں ملنا

چاہتے تھے ؟ “

تاجر اس عبادت گزار فراق کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھتا رہا اور منہ سے ایک لفظ

بھی نہ نکال سکا ۔

سردار نے اکتاہٹ سے کہا ” تم بتاتے کیوں نہیں کہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے ؟ “

تاجر نے پوچھا ” کیا تم واقعی نماز روزے کے پابند ہو ؟ “

سردار نے جواب دیا ” بحمد اللہ ۔ لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا ؟ “

تاجر نے کہا ” حیرت ہے کہ فراقی اور تقویٰ نے ایک ہی دل میں کیونکر گھر کر لیا ہے “

سردار نے کہا ” اس میں حیرت کی کیا بات ہے ؟ پھر پوچھا ” کیا تم قرآن پاک پڑھ سکتے ہو ؟ “

تاجر نے جواب دیا ” ہاں میں قرآن پاک پڑھ سکتا ہوں لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا ؟ “

سردار نے کہا ” ذرا اس آیت کا مطلب تو سمجھانا ! اس کے بعد آیت پڑھی ۔

تاجر نے جواب دیا ” اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ دوسروں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے عمل صالح کو اس کے ساتھ خلیط ملط کر دیا ۔“

سردار نے کہا ” ہاں اور اس لئے میں اپنے عمل صالح (نماز روزے) کو اپنے گناہوں سے الگ تھلگ رکھنے لگا ہوں ۔“

تاجر نے افسوس سے کہا ” سردار! میری خدا سے دُعا ہے کہ تم اس وقت جو کچھ نظر آ رہے ہو ہر جگہ ہی نظر آؤ ۔“

تاجر تو یہ کہہ کر چلتا بنا لیکن سردار نے اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو حکم دیدیا کہ آج سے لوٹ مار میں ایک احتیاط بھی روا رکھی جائے گی، اور کچھ نئے اصول بھی داخل رہزنی سمجھے جائیں گے ۔“

لیٹر سے اپنے سردار کی تبدیلی سے خوش نہیں تھے، پوچھا ” کوئسی احتیاط؟ کیسے نئے اصول؟“

سردار نے کہا ” اب تک تو یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جب کوئی قافلہ لوٹا جاتا تھا تو قافلے کا ہر فرد لوٹا جاتا تھا لیکن اب قافلے کی عورتوں کو نہیں لوٹا جائے گا اور قافلے کے ہر فرد کو اس طرح لوٹا جائے گا کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ رہنے ضرور دیا جائے گا ؛“

سردار کے حکم کے خلاف کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن سردار کا یہ حکم ان کو خوشی سے نہیں سنا ان کی سمجھ میں رہزنی کی یہ اخلاقیات بالکل نہیں آ رہی تھیں اور اس کے بعد واقعی اس اصول پر سختی سے عمل کیا گیا قافلے کی عورتوں کو لوٹنا ترک کر دیا گیا اور کسی بھی قافلے

کو پوری طرح نہیں لوٹا جاتا تھا جب قزاقوں کے اس اخلاقی عمل کا لوگوں میں زیادہ چرچا ہوا تو انہوں نے اپنے قافلوں میں عورتوں کی بڑی تعداد کو شامل کرنا شروع کر دیا اور تجارت کا زیادہ سے زیادہ مال ان عورتوں ہی کے سپرد کر دیا جاتا جو لیٹروں کی لوٹ مار سے صاف بچ جاتا ۔

ایک دن علی الصبح کسی مخبر نے سردار کو خبر دی کہ ایک بہت بڑا قافلہ شام تک وہاں پہنچنے والا ہے ۔

سردار نے پوچھا ” اس میں عورتیں کتنی ہیں؟“

مخبر نے جواب دیا ” شاید ایک بھی نہیں “

” اس کے مال تجارت کتنا ہے ؟ “

مخبر نے کہا ” شاید اتنا زیادہ کہ آج تک کسی قافلے میں اتنا سامان نہ رہا ہوگا “

سردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ دوستو! اپنے اسلحہ تیز کر لو اور گھوڑوں کو

خوب اچھی طرح کھلا پلا کے شام تک کے لیے آرام کی خاطر چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سب

میں جنگل میں ادھر اُدھر روپوش ہو جائیں گے اور وہ قافلہ جیسے ہی یہاں پہنچے گا

ہم سب اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر اس کا محاصرہ کر لیں گے اگر قافلے والوں نے کسی قسم کی

مزاہمت نہ کی تو ہم اُن کے مال کا کچھ حصہ ان کے حوالے کر دیں گے لیکن اگر انہوں نے ہمارا مقابلہ

کیا تو ہم انہیں بے دریغ قتل کر کے ان کا مال اسباب لوٹ لیں گے “

ساتھیوں نے خوشی میں ناچنا گانا شروع کر دیا اور سردار اپنے گھوڑے کو اڑاتا ہوا دیر

کے کدے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دھوکا اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ شام سے ذرا پہلے

سردار اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو وہاں یہ دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو گئی کہ ڈاکوؤں نے اپنے گھوڑوں

کو بھی ادھر اُدھر چھپا دیا تھا اور خود بھی ادھر اُدھر درختوں پر چھپے بیٹھے تھے۔

سردار نے اپنے ساتھیوں کی گھات کا جائزہ لے کر کھلی جگہ میں مضبوطی بچھایا اور

نفلیں پڑھنے لگا مغرب سے ذرا پہلے سامنے کے میدان سے گردوغبار اُٹا شروع ہوا جس

سے سردار نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ دیر بعد قافلہ ان کے قریب آئے والا ہی ہے چند لمحوں

کے بعد گردوغبار کے بادل میں سے آدمیوں اور جانوروں کا مجمع نمودار ہوا اور رفتہ

رفتہ ان کے قریب آنے لگا۔ پھر یہ لوگ اس متقی اور پرہیزگار لیڈر کے پاس آکر خیمے

نصب کرنے لگے انہیں اس بے خوف عبادت گزار کی موجودگی سے بڑی ڈھارس ملی تھی۔

قافلے کے ایک ذمہ دار فرد نے سردار کے قریب جا کر اس بات کا انتظار کیا کہ جب وہ

سلام پھیرے تو اس سے کچھ باتیں کرے۔ کچھ دیر بعد سردار نے سلام پھیرا تو قافلے کے

امیر نے قزاق سردار سے پوچھا ” بھائی! کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو یا پھر ہم سب کی طرح

تم بھی کسی قافلے سے تعلق رکھتے ہو ؟ “

قزاق سردار نے جواب دیا ” میں بھی تمہاری طرح ایک تجارتی قافلے سے تعلق رکھتا

تھا لیکن پوچھنا اب وہ قافلہ یہاں سے جا چکا ہے اور میں اس سے بچھڑ چکا ہوں اس لئے میں

مجھ کو اس انتظار میں یہاں بٹھرا ہوا تھا کہ ادھر سے کوئی اور قافلہ گزرتے تو میں اس کے ساتھ ہو لو اور کسی آبادی میں پہنچ کر کوئی منصوبہ بناؤں ۔

قافلے کے امیر نے پوچھا ”تم کب سے یہاں پڑے ہوئے ہو؟“

قزاق سردار نے جواب دیا ”چار دن سے“

”چار دن سے!“ قافلے کے امیر نے تعجب سے کہا ”کیا تمہیں یہاں ڈر نہیں لگا؟“

”ڈر کس بات کا؟“ قزاق سردار نے کہا ”مجھے تو یہاں کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہوا“

قافلے کے سردار نے کہا ”میں نے یہ سنا ہے کہ اس راہ میں کہیں فضیل نامی قزاق اور

اس کا گروہ رہتا ہے اور ہرگز نہ والے قافلے کو لوٹ لیا کرتے ہیں وہ قزاقوں کا گروہ کہیں بھی نظر نہیں آیا؟“

قزاق سردار نے کہا ”مجھے تو یہاں ایک شخص بھی نہیں دکھائی دیا میں فضیل قزاق

کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں ، ہاں یہ بات تم خود سوچ سکتے ہو کہ اگر اس جنگل میں فضیل اور

اس کا گروہ واقعی موجود ہوتا تو میں اتنے بہت سارے قیمتی سامان کے ساتھ تنہا نہ رہ جاتا“

قافلے کے امیر نے اطمینان کی سانس لی بولا ”خدا کا شکر ہے کہ یہاں کہیں فضیل

نہیں ہے ورنہ ہم سب کی جانیں خطرے میں ہوتیں“

قزاق سردار نے کہا ”اگر تم چاہو تو میری بتائی ہوئی جگہ پر پڑو ڈالو کی مجال جو

فضیل یا اس کا کوئی ساتھی یہیں سنانے آئے میں بالکل پسند نہیں کرتا کہ آدمی ضرورت سے

زیادہ محتاط اور ہوشیار ہو جائے اور جب آدمی اپنے خدا کے سوا اپنی عقل، تدابیر اور فکروں

پر بھروسہ کرنے لگتا ہے خدا سے وہیں شرمسار اور نادم کر دیتا ہے اس لیے میں تم لوگوں

کو یہ مشورہ دوں گا کہ کسی انسان یا کسی انسانی گروہ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی

طرح اپنے خدا سے تمہیں جو کچھ کہنا ہو سب سے میں کہ جاؤ اور زور و کر اس سے گریہ و زاری کرو

کہ وہ تمہیں فکروں اور الجھنوں سے نجات دے۔ یہی میں بھی کرتا ہوں یہی تم بھی کرو، اللہ نے

چاہا تو سکون ہی سکون میسر آ جائے گا۔ اور تم انسان سے ڈرنا چھوڑ دو گے“

قافلے کے امیر پر ان نصیحتوں نے بڑا اثر کیا اور اس نے قزاق سردار کے قریب

ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ لوگ پڑاؤ ڈال کے اطمینان سے آرام کرنے لگے اور قزاق سردار اپنے

ساتھیوں میں جا کے انہیں لوٹ مار کی ہدایات دینے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”میں

نے قافلے کے امیر پر خاصا اعتبار قائم کر لیا ہے اسی لئے میں اس کے پاس جا رہا ہوں اور میں اسے باتوں میں لگا کے جیسے ہی ایک زوردار سیٹی بجاؤں تم سب یکبارگی اس پر ٹوٹ پڑنا۔ اور قافلے کو جتنی جلدی لوٹ سکا، لوٹ لینا اور ہاں ایک بات اور یاد رکھنا، اس قافلے کے کسی بھی فرد کو معاف نہیں کرنا ہے۔“

ڈاکو اپنی اپنی جگہوں پر مستعد ہو کے جا بیٹھے اور ان کا سردار ایک بار پھر امیر قافلہ کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت امیر قافلہ قرآن پاک پڑھ رہا تھا یہ اس کے قریب جا بیٹھا اور قرآن پاک سننے لگا تھوڑی دیر بعد امیر قافلہ نے یہ آیت پڑھی - (اہل ایمان کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوفزدہ ہو جائیں)۔“

قزاق سردار کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں نشتہ آثار دیا گیا ہو۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا اور کئی بار اس آیت کو زیر لب دُھرتا رہا۔ پھر خیمے سے باہر نکل گیا اور خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”فضیل! یہ غارت گری اور لوٹ مار کا کھیل تو کب تک کھیلتا رہے گا۔ کیا تیرے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو اس سے باز آجا اور توبہ کر کے اللہ سے رجوع ہو جا۔“

اس کا دل بھرتا رہا اور وہ اپنے گھوڑے کے پاس جا کے چپکیاں لے لے کر رہا رہا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملے بغیر اس جنگل سے نکل گیا اور کسی صحرائی چلا گیا لیٹرے رات بھر اپنے سردار کی سیٹی کا انتظار کرتے رہے اور جب صبح تک سیٹی کی آواز نہ سنائی دی تو وہ خوفزدہ ہو کے اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے اور قافلہ صبح سلامت اس جنگل سے نکل گیا۔



جس صحرائی یہ سردار پہنچا تھا وہاں بھی ایک تجارتی قافلہ پڑاؤ ڈالنے پڑا تھا قزاق سردار نے ایک خیمے سے آواز سنی، کوئی شخص کہہ رہا تھا ”لوگو! سننے میں آیا ہے کہ اس راہ میں فضیل ڈاکو اور اس کا گروہ ڈاکو کے ماترہ ہوتا ہے ہمیں چاہیئے کہ اپنا راستہ بدل دیں۔“

قزاق سردار نے آواز بلند خیمے والوں کو مخاطب کیا ”خیمے والو! مجھے اندر

بلالو، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک شخص خیمے سے باہر نکلا اور قزاق سردار سے پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کس سے باتیں کرنا چاہتے ہو؟“

قزاق سردار نے کہا ”میں خیمے کے اس شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں جس نے ابھی ابھی فضیل ڈاکو سے پناہ مانگی تھی میں اس کے لئے ایک خاص خوشخبری لایا ہوں۔“ وہ شخص دوبارہ خیمے میں چلا گیا اور ذرا دیر بعد واپس آ کے کہا۔ ”چلو، خیمے کے اندر چلو، امیر قافلہ نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔“

قزاق سردار نے خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی حاضرین سے کہا۔ ”لوگو! فضیل ڈاکو کے ڈر سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ سننے میں آیا ہے کہ اس نے راہ زنی سے توبہ کر لی ہے اور اب وہ کسی کو بھی نہیں لوٹتا۔“

امیر قافلہ نے فکر و تشویش سے قزاق سردار سے پوچھا۔ ”تمہیں یہ خبر کس نے پہنچائی اور تم خود کون ہو؟“

قزاق سردار نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ بات خود فضیل نے بتائی ہے کیونکہ فضیل میں خود ہوں!“

امیر قافلہ اچھل پڑا اور حاضرین خیمے نے حیرت اور گھبراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

فضیل نے روتے ہوئے کہا۔ ”لوگو! تم میری بات کا یقین کر دو میں نے لوٹ مار سے توبہ کر لی ہے اور اب میں ایک ڈرا ہوا خوفزدہ انسان ہوں اللہ کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔“

فضیل اپنے فضیل ہونے کا انہیں یقین دلانے لگا اور قافلہ والے دیر تک ان کے فضیل ہونے پر شک شبہ کا اظہار کرتے رہے اور انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر یقین آیا۔

فضیل قافلہ کے ساتھ ہی بغداد پہنچ گئے اور وہاں کے قاضی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ قاضی لوگوں کے مقدمات نمٹانے میں مشغول تھا۔ یہ دیر تک ایک کونے میں بیٹھے رہے کافی دیر بعد جب قاضی کو کچھ فرصت ملی تو اس نے فضیل سے دریافت کیا ”تم کون ہو؟“

اور تمہارا مدعا علیہ کہاں ہے؟

فضیل نے جواب دیا۔ ”میں خود ہی مدعی ہوں اور خود ہی اپنا مدعا علیہ“

قاضی نے حیرت سے فضیل کو گھورا اور دریافت کیا ”اے شخص! تو کیسی واہی

تباہی یک رہا ہے تو خود ہی اپنا مدعی ہے اور خود ہی مدعا علیہ بھی۔ آخر تو ہے کون اور
کہنا کیا چاہتا ہے؟

فضیل نے جواب دیا۔ ”قاضی صاحب! میں فضیل ڈاکو ہوں وہ فضیل جس نے

سینکڑوں قافلے لوٹے ہیں اور قافلوں کی گزرگاہوں کو برسوں محذوش اور پُرخطر بنائے
رکھا جس نے سینکڑوں انسانوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا اور ہزاروں کو خون کے آنسو

رلا دیا“

قاضی جی چونک پڑے۔ فضیل کی شخصیت ایسی نہیں تھی جس سے قاضی ناواقف

ہوتا اور بغداد کے قرب و جوار میں دُور دور تک فضیل کا نام خوف و دہشت کی علامت بنا

ہوا تھا قاضی جی کو یقین نہیں آیا کہ اتنا نامی گرامی ڈاکو خود کو اس طرح قانون کے حوالے

کرے گا قاضی نے کہا ”بھائی! میں کس طرح یقین کر لوں کہ مشہور زمانہ فضیل قزاق

تم ہو اور پھر اگر فضیل واقعی تم ہی ہو تو بصریہ خود کو قانون کے حوالے کرنا، کیا معنی رکھتا ہے؟

فضیل نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنے پیشے سے توبہ کر لی ہے اور چاہتا ہوں کہ تم

مجھے میرے اعمال کی سزا دو“

قاضی ان کی حالت زار سے مرعوب ہو گیا اس نے کہا ”جب تک وہ لوگ مدعی نہ

بنیں جنہیں تم نے لوٹا اور ستایا ہے میں اپنے طوہر تمہارے مقدمے کی کس طرح سماعت

کر سکتا ہوں“

فضیل نے بے چینی سے کہا ”میں جو کہہ رہا ہوں کیا میں اپنے بارے میں اتنے

مذموم اور گندے اعمال کا غلط مدعی ہو سکتا ہوں میرا ضمیر مجھے کچھ کے لگا رہا ہے،

شدت انفعال سے میرا دل پگھلا جا رہا ہے“

قاضی نے جواب دیا ”وہ سب کچھ صحیح لیکن میں بھی مجبور ہوں کیونکہ تمہیں

دوہری سزا دینے کا مجھے اختیار نہیں دیا گیا“

فضیل نے پوچھا ”دوہری سزا کیسی؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“

قاضی نے جواب دیا ”خدا نے تمہیں جس انعام میں مبتلا کر دیا ہے یہ ایک بدترین عذاب ہے جو تمہیں مل سکتی ہے اور میں اس سے بڑی سزا تمہیں نہیں دے سکتا۔“
 فضیل کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی بولے ”قاضی! اگر تم واقعی مجھے سزا نہ دے سکے
 تو میں ہمیشہ ایک ایسے کرب میں مبتلا رہوں گا کہ میرا جینا حرام ہو جائے گا میرا سونا جاگن کھا پینا بے
 مزہ ہو جائے گا۔“

قاضی نے جواب دیا ”اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب ہے لیکن وہ
 دشوار بہت زیادہ ہے۔“

فضیل کی جان میں جان اُٹی جلدی سے پوچھا ”کون سی ترکیب؟ مجھے جلدی
 بتاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس اذیت ناک صورتحال سے میں بہر قیمت نجات حاصل کرنے
 کی کوشش کروں گا۔“

قاضی نے کہا ”تم نے اب تک جن لوگوں کو سنا یا ہے یا ٹوٹا ہے ان کی ایک فہرست
 تیار کرو اور پھر ان کے گھروں پر جاؤ اور ان سے مل کر معافی مانگو اگر وہ تمہیں معاف کر دیں گے
 تو تم اس کرب اور اذیت سے نجات حاصل کر لو گے۔“
 فضیل نے فکر مند لہجے میں کچھ سوچتے ہوئے کہا ”کام تو بہت مشکل ہے لیکن میں
 کوشش کروں گا کہ اس پر عمل کروں۔“

قاضی نے احترام کی نظروں سے فضیل کو دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں کہا ”فضیل!
 جاؤ اور اس ترکیب پر عمل کرو۔ مجھے یقین ہے کہ جس خدا نے تمہیں اس بہترین کیفیت سے
 دو چار کیا ہے وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔“

فضیل شکستہ و بے مائدہ قاضی کے پاس سے چلے آئے اور لڑکھڑاتے قدموں سے
 گھڑک پہنچے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی اور کہتے ہوئے بیوی کو آواز دی ”بیوی
 دروازہ کھولو۔“

بیوی کو خیال گزرنا شاید ان کا شوہر زخمی ہو کر آیا ہے اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا
 اور فضیل کے اندر داخل ہوتے ہی بے چینی سے سوال کیا ”آپ کے کہاں زخم آیا ہے! لائیٹ
 زخم دکھائیے تاکہ میں مرہم لپی کر دوں۔“

فضیل نے آہستہ سے جواب دیا ”بیوی زخم جسم پر نہیں دل پر لگا اگر کسکو تو اس

کی مرہم پٹی کر دو ۛ

بیوی نے شوہر کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان کے دماغی توازن پر
شک کر رہی ہو پوچھا: ”دل پر زخم آیا ہے؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، میں اس زخم کی کن
طرح مرہم پٹی کر سکتی ہوں؟“

فضیل نے کہا: ”تب پھر تم خد سے دعا کرو کہ مجھے اس اندرونی سوزش اور یکطرف
سے نجات دے جس نے میرے پورے وجود کو درہم برہم کر رکھا ہے۔“
بیوی نے کہا: ”میں دعا کر رہی ہوں، کاش خدا میری دعا سُن لے۔“

فضیل نے کہا: ”ہاں اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی اس اذیت سے نجات حاصل
کرنے کی ہے لیکن وہ بہت دشوار ہے لیکن میں یہ دوسری کوشش بھی کروں گا۔“
بیوی نے حیرت سے پوچھا: ”لیکن یہ بات کیا ہوئی جس نے تمہیں اتنا پریشان کر رکھا
ہے کچھ۔ کچھ بھی بتاؤ۔“

فضیل نے سلاوا واقعہ بیوی کو سنایا اور قاضی تک کی باتیں بتا کے کہا: ”اب تم ہی
بتاؤ میں ان سلسلے ہوئے آدمیوں کو کہاں کہاں تلاش کروں؟ اور پھر یہ بھی کیسے معلوم ہو
کر وہ مجھے معاف بھی کریں گے یا نہیں۔ اس کوشش میں یہ امکان بھی موجود ہے کہ کوئی دل جلا
مجھے قتل ہی کر ڈالے۔“

بیوی نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ بولی: ”قاضی نے جو ترکیب بتائی ہے اس
سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی اور تم اس ترکیب کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے اس
در دکا دربان نہیں حاصل کر سکتے۔“

فضیل نے اجازت طلب نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: ”میرا یہ سفر ذرا
طویل ہوگا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کب تک واپس آؤں اور یہ بھی کیسے معلوم کروا پس
بھی آؤں گا یا نہیں، تم ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھ کر یہ فیصلہ کرو کہ تم میرے ساتھ چلنا
پسند کرو گی یا یہیں رہ جاؤ گی۔“

بیوی نے کہا: ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ میں بھی ساتھ ہی چلوں لیکن یہ بھی تمہاری
مرضی اور پسند پر منحصر ہے کیا تم مجھے اپنے ہمراہ لے جانا پسند کرو گے؟“
فضیل نے جواب دیا: ”نہیں، تم یہیں گھر میں رہو اور میری واپسی کا انتظار کرو۔“

بیوی نے پوچھا۔ ”انتظار کروں؟ کب تک؟“
 فضیل نے جواب دیا۔ ”کم از کم چار سال تک، کیونکہ میں اس عرصے میں اپنا کام انجام دے لوں گا۔“

بیوی نے بھرائی آوازیں کہا۔ ”تم چار سال کہتے ہو میں تمہارا دس سال انتظار کروں گی۔“
 فضیل نے حیرت سے پوچھا۔ ”اس کے بعد کیا کروں گی؟“
 بیوی نے جواب دیا۔ ”دس سال انتظار کروں گی اس کے بعد زندگی بھر تمہارا ماتم کروں گی۔“
 فضیل نے فرط غشی میں کہا۔ ”تم ایک بہترین شوہر پرست بیوی ہو، میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کہ ہے۔“

اس کے بعد فضیل نے اپنے حافظے اور یادداشت کے بھروسے سے ان لوگوں کی فہرست تیار کرنا شروع کر دی جن کو فضیل نے ٹوٹا تھا یا ستایا تھا کام بہت دشوار تھا لیکن پھر بھی انجام دیا گیا۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکل گئے اور شہروں اور قصبوں کی خاک چھلانے لگے۔ یہ جس شخص کے پاس پہنچے اسے فضیل کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ کیونکہ وہ گوشت فضیل کو پہچانتے نہیں تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ کوئی خطی انسان ہے جو ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا ہے ان میں سے بیشتر نے اس خطی سے بچھا چھڑانے کی خاطر معاف کر دیا لیکن انہی میں چند ایسے بھی نکل آئے جو فضیل کو پہچانتے تھے انہیں ایک ایسے دبدبے اور خوفناک حرکات کے متحجب انسان کو بے بسی کی حالت میں دیکھ کر دم سا آگیا اور انہوں نے بھی معاف کر دیا لیکن ان میں سے ایک ایسا یہودی بھی تھا جو انہیں کسی طرح بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ تھا فضیل جب بھی اس سے معافی چاہتے وہ یہی کہتا کہ تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے میں تمہیں اس وقت معاف کروں گا جب تم میری لوٹی ہوئی رقم اور سارا سامان واپس کر دو گے۔

فضیل نے کہا۔ ”میں بالکل تنگابھوکا انسان ہوں، میں نے جو کچھ بھی ٹوٹا تھا اسے پسے، ساحتیوں میں مساوی تقسیم کر دیا تھا اور میرے حصے میں جو کچھ آیا تھا وہ بھی خرچ ہو گیا اب تم بتاؤ میں وہ ساری چیزیں کہاں سے لاؤں؟ میں دوبارہ ڈلے مائے سے رہا۔ ان مجبور یوں کے پیش نظر اگر تم مجھے معاف کر دو گے تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا اور خدا سے تمہارے لیے دعا کروں گا ورنہ میں یہیں تمہارے دہر پر پڑے پڑے اپنی جان دیدوں گا اور اس وقت تک نہ اٹھوں گا جب تک تم مجھے معاف نہ کر دو گے۔“

یہودی نے کہا: ”واہ بھئی واہ، یہ بھی خوب رہی تم نے جو کچھ لوٹا تھا اسے میں نے اپنے کھاتے میں تمہارے نام قرض کے بطور اندراج کر لیا تھا، اپنا یہ قرض بے باقی کر دو معافی وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں“

فضیل نے مجبوری سے کہا: ”کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا؟ اگر میرے پاس تمہاری چیزیں اور رقم موجود ہوتی تو میں انہیں فوراً پیش کر دیتا۔“

یہودی نے کہا: ”میں اپنے قرضداروں کی مجبوریاں اور غمناکیاں سننے سنتے سنتے عاجز آ گیا ہوں اور اب میری سماعت اور دل کا یہ حال ہے کہ ان پر کسی کی خوشامدوں سے نہ نہیں ہوتا تم جب تک چاہو، بجے جاؤ اور جتنے عرصے تک چاہو میرے در پر پڑے ایڑیاں رگڑتے رہو تم زندگی بھر اپنی خوشامدوں اور التجاؤں کا ایک ہی جواب سنو گے میرا سامان واپس کر دو اور رقم بے باک کر دو میں تمہیں معاف کر دوں گا اس کے علاوہ معافی حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے بھی یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تم میری رقم واپس نہیں کرو گے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا“

فضیل یہودی کے دروازے پر بیٹھ گئے اور بولے ”میں بھی مجبور ہوں، میں تمہاری ہر ممکنہ شرط پوری کرنے پر آمادہ ہوں لیکن رقم کی ادائیگی سے معذور ہوں“

یہودی نے بے نیازی سے کہا ”پھر پڑے رہو، میں بھی مجبور ہوں۔“

فضیل اس کے در پر بیٹھنے لگے۔

یہودی کچھ دنوں تک تو اس صورت حال کو برداشت کر گیا لیکن پھر اس کا چرچا ہونے لگا اور جب محلے کے لوگوں کو واقعات کی تفصیل معلوم ہوئی تو انہوں نے یہودی پر ملامتیں بھیجنا شروع کر دیں اور اسے ہر طرف سے طعنے ملتے لگے۔

یہودی پریشان ہو گیا وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتا، فضیل کو دیکھ کر واپس ہوجاتا پھر اسے ہول سا اٹھنے لگا۔ فضیل بے نیازانہ پڑے رہتے اور اس سے آنکھیں تک نہ ملاتے رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ لوگ اس یہودی پر آوازے کستے لگے وہ جدہ سے گزرتا۔ کوئی نہ کوئی پیکار کے کہتا یہ اے او ظالم! اب تو خدا کے اس نیک بندے کو معاف کرے آنا تو شاید خدا بھی نہ سناٹے“

کوئی دوسرا کہتا ”سو خود را انسان! کچھ اس دنیا کے لئے بھی کر لے

سارا مال اسباب یہ ہیں اسی دنیا میں دھرا رہ جائے گا دنیا ہی کی تجارت میں پھنسے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے ۔

یہودی بھینچلا کے کہتا دو یہ معاملہ میرا ہے اس میں کوئی دوسرا کیوں دخل دے یہ قرضہ دار میرا ہے میں اسے معاف کروں یا نہ کروں ۔ کوئی دوسرا کیوں دخل دے ۔

فضیل اپنا سارا وقت نماز و روزے میں صرف کرنے لگے پھر اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ دُور دُور سے لوگ تماشا دیکھنے آنے لگے یہودی جلدھر سے بھی گزرتا لوگ اس کی طرف اشارہ کر کے اس کا مذاق اڑاتے ۔ آخر اس صورتحال سے یہودی بھی عاجز آگیا اور اس نے فضیل سے تلخ لہجے میں دریافت کیا ۔ آخر تم چاہتے کیا ہو ؟

فضیل نے جواب دیا ۔ یا تو تم مجھے یوں ہی معاف کر دو یا پھر تم مجھ سے کوئی ایسا کام لے لو کہ اس کے معاوضے میں اپنا حساب محبوب کر لو ۔

یہودی نے کہا ۔ کچھ بھی ہو میں تمہیں یوں نہیں معاف کروں گا تم اپنے آپ کو کتنا ہی عقلمند کیوں نہ سمجھو لیکن میں بھی کوئی بیوقوف انسان نہیں ، میں تمہیں کسی بھی کام میں اس بُری طرح الجھا سکتا ہوں کہ تم ایک ایک ٹکڑا کے بھی اسے پورا نہ کر سکو گے ، ہو تو تم کیا چاہتے ہو ؟ کسی دُور سے طریقے سے اپنا حساب بے باقی کر دینا یا کسی ایسے کام میں پھنس جانا جو تمہاری زندگی میں روک کی طرح لگ جائے ؟

فضیل نے جواب دیا ۔ میرے پاس رقم تو ہے نہیں کہ تمہارا حساب بے باقی کر دوں اس لئے پہلی صورت نامنظور ہے یہی دوسری صورت تو میں اس کے لئے پوری طرح آمادہ ہوں ۔ تم مجھ سے کوئی بڑے سے بڑا کام لے سکتے ہو میں اسے انجام دینے کی کوشش کروں گا اس کا معاوضہ تم رکھتے رہنا اور جب تمہارا حساب بے باقی ہو جائے تو مجھے مطلع کر دینا ۔

یہودی کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر بعد بولا ۔ اچھا اگر یہ بات ہے تو تم کل میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ۔ میں تمہیں کام بتا دوں گا جس دن وہ کام ختم ہو جائے گا ، میرا حساب کتاب بھی چمکتا ہو جائے گا ۔

فضیل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی بولے ”میں آمادہ ہوں کام کتنا ہی دشوار اور اور محنت کا کیوں نہ ہو، میں اسے انجام دوں گا“

یہودی نے لوگوں سے کہا ”اب تم لوگ میرا مذاق مت اڑاؤ میں اس شخص کے واجبات کی ایک معاف کر دوں گا“

لوگ ہنسنے لگے، بولے ”تم معاف کر دے! خوب۔ جب فضیل تمہارے در پر نظر نہیں آئیں گے ہم اس وقت یہ یقین کریں گے کہ تم نے انہیں معاف کر دیا ہے“
دوسرے دن علی الصباح یہودی، فضیل کو اپنے ساتھ لے کر ایک صحرائ میں نکل گیا۔ وہاں جگہ جگہ ریت کے توبے پھیلے ہوئے تھے بالکل کوہستانی سلسلہ تھا یہودی نے فضیل کو ایک بہت بڑے توبے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اس توبے کے سامنے ایک وسیع میدان تھا یہودی نے اس توبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم اس توبے کی ریت اٹھا اٹھا کے اس میدان میں منتقل کر دو جس دن یہ ٹیلہ ادھر سے ادھر منتقل ہو جائے گا ہم دونوں کا حساب کتاب بھی یہی بات ہو جائے گا“

فضیل بہت پریشان ہو گئے کیونکہ یہ آنا بڑا ٹیلہ تھا کہ اسے ادھر سے ادھر کرنے میں سالوں کا عمل درکار تھا انہوں نے پریشان ہو کر دریافت کیا ”تمہارا حساب تو بے باقی کرنا ہی ہے لیکن اس میں میرے لئے ایک بات ذرا پریشانی کی ہے“
یہودی نے دریافت کیا ”کون سی بات؟“

فضیل نے کہا ”اگر میں دن رات یہیں موجود رہ کر یہ کام انجام دوں گا تو میرے کھانے پینے کی فکر کون کرے گا؟“

یہودی ہنس دیا۔ بولا ”جس اللہ پر تم بھروسہ کئے ہوئے ہو وہی تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرے گا“

فضیل کو اس سوال اور اس کے جواب سے بڑا دکھ پہنچا کیونکہ اس میں خدا کے خلاف عدم اعتمادی پائی جاتی تھی انہوں نے خدا کے رازق ہونے پر شبہ کیا تھا روتے ہوئے یہودی سے کہا ”میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں آج سے میں تمہارے اس کام کا آغاز کرتا ہوں، کھانے پینے کا معاملہ میں اپنے خدا پر چھوڑتا ہوں“

یہودی نے ہنسنے ہوئے کہا ”میں وقتاً فوقتاً تمہاری خبر لینے آتا ہوں گا“

فضیل نے یہودی سے پھاوڑا منگایا اور توڑے کی ریت برابر کے میدان میں منتقل کرتے لگے۔ یہودی نے سوچا کہ چلو اس مندری جن کو ایک ایسے کام سے لگادیا ہے کہ اب شاید یہاں سے ٹکرہ ہی بچھا پھڑکے۔ وہ فضیل کو کام میں لگا ہوا دیکھ کر وہاں سے چلا آیا۔



فضیل ہر پھاوڑے پر خدا سے یہی التجا کرتے کہ اللہ العالمین! تیرا یہ گناہ گار بندہ ہر قیمت پر اپنے نامہ اعمال کے سیاہ دھبوں کو دھو ڈالنے کا تہیہ کر چکا ہے میں اس معاملے میں تیری ہی اعانت کا طالب اور امیدوار ہوں تو مجھے دینا میں جتنا بھی ذلیل کرنا چاہے کر لے لیکن آخرت کی دولت سے محفوظ رکھ۔

یہ کام آنا دشوار اور تو اتر طلب تھا کہ فضیل کی عبادت و ریاضت میں بھی فرق آنے لگا انہیں اس کا بڑا قلق تھا، رات کو عشا کی نماز پڑھی اور دعا مانگتے ہوئے عرض کیا ”اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں تیری بارگاہ میں پابند رہا ہوں۔ میرا دل ترس صلوٰۃ پر کڑھتا ہے لیکن یہ بھی تیرا ہی حکم ہے کہ جس کا جو بھی واجب الادا ہوا ہے ادا کیا جائے اور قرض کی ادائیگی کے بغیر حج و نمازیں وہ مرنے نہیں رہتا جس کا تیرا کوئی عاجز اور مخلص بندہ امیدوار ہوتا ہے تو مجھے اس سلسلے میں معاف فرما دے کیونکہ تو سب سے بڑا معاف کرنے والا ہے۔“

کافی رات گئے تک وہ ٹیلے کی ریت میدان میں منتقل کرتے رہے لیکن رات کے پچھلے پہر یہ کام انجام دینا مشکل ہو گیا کیونکہ مشرق سے ایک ایسا ہوائی طوفان اٹھا کہ فضیل کو اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا وہ زمین پر لیٹ گئے اور ہوا کے تند و تیز جھونکے ان کے اوپر سے گزر کر مغرب میں تباہ کاریاں مچانے لگا فضیل زمین سے چمٹے ہوئے اس طوفان کے تھم جانے کی دعا کر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی دعاؤں کا اثر اٹا ہو رہا ہے اور طوفان میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

صبح ہوتے ہوئے طوفان بھٹما تو فضیل نے سوچا دو گھنٹی آرام کر لیا جائے لیکن آرام پر عبادت کو ترجیح دی اور وہ خدا کی بارگاہ میں جھک گئے صبح طلوع آفتاب کے بعد یہودی کے پاس پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شرط والا ٹیلا ہولے اڑ کر مقابل کے میدان میں منتقل ہو چکا ہے فضیل خدا کی اس مہربانی پر بار بار نماز شکر ادا

کہ ہے تھے یہودی کے آجملے پر انہوں نے سلام پھیرا اور اس سے کہا۔ ”میرے خدا نے میری مشکل آسان کر دی ہے اور ریت کا تودہ تمہاری مقرر کردہ جگہ پر منتقل ہو چکا ہے اس لئے اب تم بھی اپنا حساب کتاب یساق سمجھ کر مجھے معاف کر دو۔“

یہودی کھسایا ہوا تھا، بولا۔ ”واہ، ریت کا تودہ کوئی تم نے تو ادھر سے ادھر کیا نہیں ہے پھر میں تمہیں معاف کیوں کر دوں، ہاں میں اتنی مہربانی ضرور کروں گا کہ اس شرط کے پورا ہونے کو لوٹے جانے والے مال و اسباب کے عوض قبول کر لوں۔ لیکن نقد رقم کا مسئلہ اب بھی باقی رہتا ہے تم وہ رقم مجھے دیدو، میں تمہیں بالکل معاف کر دوں گا۔“

فضیل نے بے بسی سے کہا۔ ”نقد رقم تو میرے پاس ہے نہیں اس لئے اس کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

یہودی نے جل کر جواب دیا۔ ”اگر اس کی ادائیگی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تو پھر میری طرف سے معاف کر دینے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تم بھی مجبور ہو میں بھی مجبور ہوں۔“

فضیل نے روہلے ہو کر کہا۔ ”بندہ خدا! اب مجھے زیادہ دستاؤں میں بہت پریشان ہوں۔“

یہودی نے کہا۔ ”میں بھی بہت پریشان ہوں، کیا کروں، میری رقم ادا کر دو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔“

فضیل نے کہا۔ ”تب پھر مجھے ایک بار تمہارے دروازے پر بیٹھ جانا پڑے گا۔“

یہودی کو اس تنبیہ سے وحشت ہوئی۔ بولا۔ ”نہیں، میں تمہیں اپنے دروازے پر ہرگز نہ بیٹھنے دوں گا۔“

لیکن یہودی کے منع کرنے پر فضیل نہیں مانے، وہ ایک بار پھر یہودی کے دروازے پر بیٹھ گئے اور لوگوں نے ایک بار پھر یہودی کے خلاف چرچا شروع کر دیا اس بار یہودی بہت جلد عاجز ہو گیا۔ بولا۔ ”فضیل! تم خدا کے لئے میرا بیچا چھوڑ دو جاؤ اندر جاؤ وہاں ایک طاق میں اشرفیوں کی تھیلی رکھی ہوئی ہے اسے اٹھاؤ اور میرے حوالے کر دو، اس طرح میری یہ قسم پوری ہو جائے گی کہ جب تک تم میرا حساب نہیں چکاؤ گے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا میں اپنی اشرفیوں کی تھیلی کو تم سے وصول شدہ رقم کے کھاتے میں لکھ لوں گا اور تمہیں یہاں سے چلے جانے کی اجازت دیدوں گا۔“

فضیل ہنسی خوشی یہودی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے اور وہاں کی طاق سے اشرفی کی تھیلی اٹھائے اُسے یہودی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے میری خاطر یہ سب کچھ کیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اتنے بڑے احسان کا بدلہ چکلیا نہیں جاسکتا۔“

یہودی نے تھیلی کا منہ کھولا تو اس میں سے اشرفیاں اُبل پڑیں یہودی نے جلدی جلدی انہیں سمیٹا جب وہ ساری اشرفیاں اپنے دامن میں بھر چکا تو فضیل نے درخواست کی ”تو اب تم مجھے معاف کر دو!“

یہودی نے کہا ”میں تمہیں اب بھی معاف نہیں کروں گا، اب ایک شرط اور ہے اسے پورا کر دو تب معاف کروں گا۔“

فضیل کو غصہ تو بہت آیا لیکن انہیں اپنے خطا کار ہونے کا شدید احساس تھا اس لئے صبر و ضبط سے کام لیا۔ نہایت نرمی سے کہا: ”اپنی نئی شرط سے آگاہ کرو تا کہ اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کروں۔“

یہودی نے کہا ”نئی شرط یہ ہے کہ پہلے تم مجھے مسلمان کرو، اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گا۔“

فضیل نے گھبرا کر پوچھا: ”کیا مطلب؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“
یہودی نے کہا: ”میرا مطلب واضح اور صاف ہے، پہلے تم مجھے مسلمان کرو اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گا۔“

فضیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ”لیکن یہ مسلمان ہو جانے کا خیال اچانک تمہارے دل میں کس طرح آیا؟“

یہودی نے جواب دیا: ”دو غیر معمولی واقعوں کے پیش آنے سے۔ پہلا واقعہ تو تو دے کے اُدھر سے اُدھر آ جانے کا تھا اور دوسرا اہم واقعہ تھا کہ میں نے تھیلی میں ریت بھر کر رکھی تھی لیکن جب اُسے اُلٹا تو اس میں سے اشرفیاں نکلیں، میں حیران ہوں کہ آخر ایسا ہوا کیوں کر۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تو ریت میں کسی جگہ یہ پڑھنا تھا، کہ اگر کوئی صدق دل سے ریت میں ہاتھ لگا دے تو وہ سونا بن جائے آج اس کا عملی تجربہ ہو گیا تم نے اس ریت کی تھیلی کو ہاتھ لگا کے سونا کر دیا۔ کیا اس واقعے سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ تم

حق پر مجاہد اسلام سچا مذہب ہے تو میں مسلمان کیوں نہ ہو جاؤں ؟
 یہودی ، فضیل کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا ، اور فضیل کو معاف کر دیا ۔



ادھر سے نجات حاصل کرتے ہی یہ سیدھے بیوی کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا ۔
 ”بیوی ! میں خانہ کعبہ جانا چاہتا ہوں ، سفر بڑا پرخطر اور دشوار ہے راستے میں معلوم نہیں
 کیسی کیسی صعوبتیں پیش آئیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ان صعوبتوں سے بچاؤں اور
 اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں طلاق دیدوں “

بیوی کو رونا آگیا ۔ بولیں ” میں نے آپ کی رفاقت میں ایک عرصہ گزارا ہے پھر میں
 اب کس طرح آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گی ، میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی “

فضیل نے کہا ” تمہاری مرضی “

اس کے بعد یہ دونوں مکہ معظمہ روانہ ہو گئے ۔

مکہ معظمہ میں آپ نے کعبہ کی مجاورت اختیار کی ۔ وہیں آپ نے امام اعظم ابوحنیفہ
 کی خدمت میں رہ کر علوم روحانی اور ظاہری حاصل کئے ۔ یہاں آپ کا شہرہ ہونے
 لگا اور لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہونے لگے آپ انہیں مواعظِ حسنہ سے مستفیض فرماتے
 جب آپ کا شہرہ دور دور پھیل گیا تو خاندان کے کچھ لوگ ملاقات کی غرض سے کعبۃ اللہ
 پہنچ گئے آپ نے ان سے گریز اختیار کیا اور منہ پھپھپاے پھرتے رہے لیکن رشتہ داروں
 نے ان کا ہر جگہ پیچھا کیا ، آخر آپ کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے انہیں
 مخاطب فرمایا ۔ کہا ” لوگو ! کیا تمہاری عقلوں نے تمہیں لاوارث چھوڑ دیا ہے جو
 ایک فضول مقصد کے لیے اپنا وقت ضائع کرتے پھر رہے ہو ، فضیل کیا ہے ایک
 گناہگار اور خطا کار انسان ، پھر تم اس سے ملاقات کیوں کر ناچاہتے ہو ؟ جاؤ اپنے
 اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور کسی معقول کام میں مصروف ہو جاؤ ۔ خدا تمہیں عقل سلیم
 عطا فرمائے ! “

انہی دنوں ہارون رشید نے فضل برمکی سے کہا ” فضل ! میں شان و شوکت
 سے اکتا گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی درویش سے ملاقات کروں کیا تم مجھے کسی اہل
 دل کے پاس لے چلو گے ؟ “

فضل برمکی نے جواب دیا۔ ”ابھی اسی وقت، میں آپ کو سفیان عینیہ کے پاس لئے

چلتا ہوں۔“

یہ دونوں اسی وقت سفیان عینیہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ فضل برمکی نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے سفیان عینیہ نے دریافت کیا ”کون ہے؟“

فضل برمکی نے جواب دیا ”امیر المومنین!“

سفیان نے کہا ”افسوس کہ اگر مجھے امیر المومنین کا علم پہلے ہی حاصل ہوتا تو میں ان کے استقبال کو حاضر ہوتا۔“

ہارون رشید کو سفیان کی یہ بات بہت ناگوار گزری اس نے فضل سے کہا ”میں ایسے درویش سے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ کوئی کہہ اس میں کسی اور ہی شے کے آداب پائے جاتے ہیں“ فضل برمکی نے ذرا حافطے پر زور دیکر کہا ”میں امیر المومنین کو ایک دوسرے درویش کے پاس لئے چلتا ہوں امید ہے کہ امیر المومنین اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔“ ہارون رشید نے سفیان عینیہ سے پوچھا ”آپ کے دے کسی کا قرض تو واجب اللہ

نہیں ہے؟“

سفیان نے جواب دیا ”ہاں امیر المومنین! میں واقعی مقروض ہوں!“ ہارون رشید نے کہا ”یہ رقوم کس کس کو دینا ہیں۔ مجھے بتاؤ تاکہ میں اسے ادا کر دوں“ سفیان نے ان لوگوں کے نام بتا دیئے اور ہارون رشید نے اسی وقت اس کی ادائیگی کا حکم صادر کر دیا اس نے ایک بار پھر یہی بات کہی ”فضل! بات کچھ زیادہ ہی بڑھ چکی ہے اب مجھے تم کسی اور کے پاس لے چلو۔“

فضل نے کچھ دیر حافطے پر زور دیا، اس کے بعد کہا ”اچھا اب میں آپ کو فضیل بن عیاض کے پاس لئے چلتا ہوں۔“

ہارون رشید نے پوچھا ”یہ کون بزرگ ہیں؟“

فضل برمکی نے جواب دیا ”یہ صاحب پہلے رہزن تھے لیکن اب توبہ کر کے دولتی اختیار کر چکے ہیں۔“

ہارون رشید نے بے دلی سے کہا ”ان کے پاس جائیداد کی طبیعت تو نہیں چاہتی لیکن تم کہتے ہو تو چلا چلا ہوں۔“

جب یہ دونوں فضیل کے دروازے پر پہنچے اس وقت آپ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے یہ دونوں دروازے سے کان لگائے کھڑے ہو گئے اندر سے آواز آرہی تھی،
- کیا لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ انہوں نے بے کام کئے، ہم ان کو نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے (ہارون رشید نے فضل برمکی سے سرگوشی میں کہا ”فضل! اس سے بڑی اور کونسی نصیحت ہو سکتی ہے؟“

اس کے بعد دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ”کون؟“

فضل نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین ہارون رشید“

اندر سے کہا گیا ”ان کا میرے پاس کیا کام اور مجھے اُن سے کیا واسطہ؟ اس لئے آپ لوگ میری مشغولیت میں حارج نہ ہوں“

فضل برمکی نے کہا۔ ”اُرْوے قرآن پاک امیر کی اطاعت آپ پر فرض ہے“

فضیل نے اندر سے کہا ”تم لوگ مجھے اذیت نہ دو“

فضل برمکی نے کہا ”ہم دونوں آپ کی اجازت لے کر اندر داخل ہونا چاہتے

تھے لیکن اگر آپ نے اجازت نہ دی تو ہم اجازت کے بغیر ہی اندر داخل ہو جائیں گے“

اندر سے جواب ملا۔ ”میں اجازت تو نہیں دوں گا بلا اجازت داخلے میں تم مختار ہو“

یہ رات کا وقت تھا دونوں جیسے ہی اندر داخل ہوئے فضیل نے چراغ بجھا دیا

وہ ہارون رشید کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے ہارون رشید کا ہاتھ

فضیل کے ہاتھ سے ٹکرا گیا آپ نے کہا ”کتنا نرم ہاتھ ہے لے کاش یہ جہنم کی آگ سے

محفوظ ہے“

اس کے بعد آپ نمازیں مشغول ہو گئے۔ ہارون رشید ان کی اس بے نیازی

کی دل ہی دل میں داد دیتا رہا، جب یہ نماز پڑھ چکے تو ہارون رشید نے کہا۔ ”حضرت!

کوئی نصیحت فرمائیے۔“

آپ نے کہا ”تمہارے جد امجد حضرت عباسؓ رسول اللہؐ کے چچا تھے ایک بار

انہوں نے حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ انہیں کسی علاقے میں امیر بنا دیا جائے تو رسول

اللہؐ نے جواب دیا۔ ”تھا کہ میں تمہیں تمہارے نفس کا امیر بنانا ہوں کیونکہ دنیا کی حکومت

قیامت کے دن ندامت کسب بن جائے گی “

ہارون رشید نے کہا ” کچھ اور ارشاد فرمائیں “

آپ نے جواب دیا ” پوری مملکت اسلامیہ کے باشندوں کو اپنی اولاد تصور کرو بزرگوں پر مہربانی کرو اور چھوٹوں سے بھائیوں اور اولادوں کی طرح پیش آؤ “ پھر فرمایا ” ہارون! مجھے ڈر ہے کہ تمہاری حسین و جمیل شکل کہیں جہنم کا ایندھن بن جائے کیونکہ محشر میں بہت سی حسین صورتیں جہنم کا نواز بن جائیں گی بہت سے امیر اسیر ہو جائیں گے اللہ سے غمزدہ رہو اور محشر کی جو ابیدہی کے لئے ہر وقت آمادہ ہو، وہاں تم سے ایک ایک مسلمان کی باز پرس ہوگی اگر تمہاری حکومت میں ایک بھوک عورت بھی سوئی ہوگی تو اس کا تم سے جواب طلب کیا جائے گا اور وہ عورت تمہارا اگر بیان پچھڑے گی “

ہارون رشید پر ان نصیحتوں کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ مہوش سا ہونے لگا فضل برمی کے کہا ” جناب آپ نے تو امیر المومنین کو نیم مردہ کر کے رکھ دیا ہے “

فضیل نے ترشی سے کہا ” ہا مان! تو خاموش رہ، میں نے نہیں بلکہ تو نے اور تیرے ہی جیسے تیرے دوسرے ساتھیوں نے ہارون کو زندہ درگور کر دیا ہے “

اس نوک جھونک نے ہارون رشید کو اور زیادہ مضحک کر دیا اور اس پر وقت طاری ہو گئی اس نے فضل برمی کو ڈانٹا اور کہا ” فضل! تم خاموش ہو جاؤ کیونکہ ہا مان کہہ کے مخاطب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ مجھے فرعون تصور کر رہے ہیں “ پھر فضیل سے پوچھا ” حضرت! آپ کو کسی کا کوئی قرض تو نہیں دینا ہے؟ “

فضیل نے جواب دیا ” ہاں میں قرض دار ہوں کیا تم اس قرض کو اتار سکو گے؟ “ ہارون رشید نے کہا ” آپ حکم دیں، پھر دیکھیں کہ وہ قرض اُترتا ہے یا نہیں “ فضل نے جواب دیا ” میں اللہ تعالیٰ کا مقروض ہوں اور یہ قرض اطاعت و بندگی ہی سے اتر سکتا ہے، اسے تم کس طرح اتار سکتے ہو؟ “

ہارون رشید نے آہستہ سے کہا ” میرا مقصد دنیاوی قرض سے تھا۔ “

آپ نے کہا ” میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں پیش

آئی “

ہارون رشید نے ایک ہزار دینار کی ایک تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کی اور عرض کیا۔ ۵۹

”یہ معمولی ساندلہ قبول فرما کر شکریہ گزار فرمائیں“ اس کے بعد کہا ”یہ رقم مجھے اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی تھی اس لئے حلال ہے اور اسے قبول فرمانے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے“

آپ نے افسوس سے کہا ”ہارون! مجھے افسوس ہے کہ تم پر میری نصیحتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ میری ساری نصیحتیں برباد گئیں۔ ذرا سوچو تو کہ میں تو تمہیں دعوتِ نجات دے رہا ہوں اور تم مجھے ہلاکت میں ڈبو دینا چاہتے ہو“

ہارون نے پوچھا ”وہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ جو مال مستحقین کو ملنا چاہیئے اسے تم غیر مستحقین میں تقسیم کر دینا چاہتے ہو۔“

ہارون رشید لا جواب ہو کر فضل برہمکی کے ساتھ باہر نکلا اور اس سے کہہ دیا۔ ”ان کا تو کوئی جواب ہی نہیں، اس وقت میں بہت خوش ہوں کہ خدا کے ایک نہایت برگزیدہ بندے سے ملاقات ہو گئی“



میدانِ عزفات میں آپ نے لوگوں کو گریہ و زاری کرتے دیکھا تو آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ العالمین! اتنی گریہ و زاری کے ساتھ اگر لوگ کسی بخیل سے کچھ طلب کریں تو وہ بھی انکار نہ کر سکے اس لئے اے اللہ! تو ان سب کو اس گریہ و زاری کے طفیل معاف فرما دے“

آپ بھیڑ بھاڑ سے نفرت کرتے تھے اور دُعا مانگا کرتے تھے کہ وہ بیمار پڑ جائیں کسی نے اس دُعا کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا ”اگر میں بیمار پڑ جاؤں گا تو میں باجماعت نماز کی ادائیگی سے بچ جاؤں گا۔ نہیں باجماعت نماز پڑھوں گا اور نہ بہت سارے انسانوں کی شکلیں دیکھوں گا“

ایک بار کسی نے آپ سے پوچھا ”دنیا اور آخرت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ آپ نے جواب دیا ”اس سلسلے میں میں مختصر سا جواب دوں گا۔ اس دنیا میں بعض لوگ قہقہہ مار کر ہنستے ہیں حالانکہ غریب نہیں جانتے کہ دنیا ہنسنے کی جگہ نہیں ہے بالکل آخرت کی طرح کہ وہاں رونا حرام ہوگا“

فضیل کے ایک نپٹے کا پیشاب بند ہو گیا تھا اس کا نہایت تن دہی سے علاج کر لیا گیا

لیکن افادہ نہیں ہوا۔ آخر میں فضیل نے دعا کی کہ اے اللہ! اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ فضیل کے دل میں تیری لکھن پائی جاتی ہے تو میرے بچے کا مرض دفع فرما دے۔

یہ سچ کچھ ہی دنوں بعد حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گیا۔

کوئی قاری نہایت خوش الہامی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا آپ نے فرمایا۔

”اے میرے بچے کے قریب جا کر بیٹھو۔“

قاری نے پوچھا ”کوئی خاص بات ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”ہاں، وہ اس سے لذت و سرور حاصل کرے گا پھر قاری

کو نصیحت کی ”اور ہاں تم اس کے روبرو القار عہ ہرگز نہ بیٹھنا“

قاری نے لڑکے کے قریب جا کے القار عہ ہی بیٹھنا شروع کر دیا۔ لڑکے نے ایک

بیچ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ قاری ڈر گیا۔ پوچھا ”یہ بے ہوش ہو کر گر کس طرح گیا؟“

آپ نے جواب دیا ”اس کے دل میں اللہ کا خوف پہلے ہی سے جاگزیں ہے اس

لئے وہ اس آیت کو برداشت نہیں کر سکا۔“

اس کے بعد آپ مسکرا کر لگے لوگوں نے آپ کو نہایت حیرت سے دیکھا اس کے

بعد آپ نے کچھ کیچھ ہنسنے میں لگ گئے جب ادھر سے فارغ ہو گئے تو کسی نے دریافت

کیا ”جناب آپ کا تو بچہ ہلاک ہو گیا اور آپ اس پر ہنس رہے تھے، آخر یہ کیوں؟“

آپ نے کہا ”موت اللہ کی مرضی سے واقع ہوئی تھی اس وقت میں اللہ

کی رضا پر غور کر رہا تھا کیا ایک مجھے خیال آیا کہ میرے بچے کی موت میں خدا کی مرضی شامل

ہے تو میں بھی خوش ہو گیا اور بچے کی موت پر مسکرا کر لگا کیونکہ جس کام سے خدا خوش

ہے مجھے بھی خوش ہونا چاہیئے۔“

کسی نے دریافت کیا ”حضرت! دین کی بنیاد کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”عقل۔“

اُس نے پوچھا ”عقل کی بنیاد کیا ہے؟“

جواب دیا ”حلم!“

اس نے پھر سوال کیا ”اور علم کی بنیاد؟“

فرمایا ”صبر!“ پھر قد سے سکوت کے بعد فرمایا ”تمام دنیا کی برائیوں

کو ایک جگہ جمع کر کے اس کی کبھی دنیا کی دوستی کو بنا دیا جائے۔
اس شخص نے کہا: ”حضرت! دنیا، حلم اور صبر کے بائے میں تو یہیں معلوم ہو گیا کہ
یہ کیا ہیں اب یہ بتائیے کہ توکل کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”توکل کا مطلب ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے کسی
قسم کی بھی اُمید نہ رکھے اور متوکل اسے کہتے ہیں کہ انسان ظاہر و باطن میں راضی بہ رضا ہے الہی
سے ہے۔“

آخر عمر میں جب انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ان کا آخری وقت آگیا ہے تو انہوں
نے اپنے اس پاس جمع ہونے والوں کو بڑی نصیحتیں کیں ان ہی میں ان کے بالکمال مرید سلطان
ابراہیم بن ادہم، شیخ محمد بن زید الشیرازی، خواجہ بشیر حالی، حضرت شیخ ابی رحمان العطار
اور خواجہ عبداللہ سیاری بھی موجود تھے آپ نے پند و نصائح کے دوران فرمایا: ”لوگو
مجھے پیغمبروں پر ذرا بھی رشک نہیں آتا کیونکہ ان کے لئے بھی قبر و قیامت اور جہنم و پل صراط
کا مرحلہ ہے اور انہیں بھی نفس نفس کی منزل سے گزرنا پڑے گا اسی طرح مجھے فرشتوں
پر بھی رشک نہیں آتا کیونکہ وہ انسانوں سے زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں۔“

کسی مُرید نے پوچھا: ”پھر آپ کو رشک کس پر آتا ہے؟“
آپ نے جواب دیا: ”ان پر جنہوں نے شکم مادر سے جنم ہی نہیں لیا۔“
بالکل آخری ایام میں انہوں نے بیوی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے مغموم بیٹھی تھیں
فضیل نے پوچھا: ”بیوی! تم اداس اور غمزدہ کیوں ہو؟“

بیوی نے جواب دیا: ”میں سوچتی ہوں کہ آپ کے بعد، ان دونوں بچیوں کا کیا
ہوگا جو نخلستان کے کچھو کی طرح اپنی نشوونما کی خاص عمر میں داخل ہو گئی ہیں؟“
انہوں نے کہا: ”ان کی فکر تمہیں کیوں ہے؟“

بیوی نے کہا: ”پھر ان کی فکر کون کرے گا؟“

آپ نے جواب دیا: ”انہیں خدا کی مشیت پر چھوڑ دو۔“

بیوی نے خاموشی اختیار کی۔ آپ نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کئے رکھی اور
بیوی کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر جب بیوی کی حالت زار نہیں دیکھی گئی تو کہا: ”اچھا تو
میرے بعد تم ان دونوں لڑکیوں کو کوہ ابقیسیس پر لے جاؤ اور وہاں آسمان کی طرف منہ

اٹھا کے خدا سے کہنا کہ جب تک فضیل زندہ رہا ، ان کی پرورش کرتا رہا لیکن وہ اب قبر میں منہ
چھپا چکا ہے اور ان دونوں کو تیرے سپرد کر گیا ہے اب یہ دونوں لڑکیاں ہیں اور تو ہے ان
سے جیسا سلوک چاہے کر ۔

تین مہینے الاؤل ۸۷ھ کو آپ کا وصال ہو گیا اپنی تجہیز و تکفین کے کئی دن بعد نبوی
نے دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑا اور کوہ البقیس پر پہنچ گئیں اور انہیں اپنے آگے کھڑا کر کے ادھر
اُدھر دیکھنے لگیں ۔ دونوں لڑکیاں حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھیں البقیس پر سنا چھایا ہوا تھا
اور سر پر نیلا آسمان حد نظر تک پھیلا ہوا تھا انہوں نے دونوں ہاتھ دعا مانگا اور زمین اٹھا دیئے
اور خدا سے عرض کیا ۔ خداوند! تیرا بندہ اور میرا شہر و فضیل اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر کے
تیرے پاس جا چکا ہے جب تک وہ زندہ رہا تو اس کے ذریعے اس کی دونوں بیٹیوں کی پرورش
کرا رہا لیکن اب اس کے بعد اس کی وصیت کے مطابق میں دونوں لڑکیوں کو یہاں لے کر آگئی
ہوں اب تو یہی ان کا پالنے والا اور نگران ہے میں نہیں جانتی ان کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر
نہیں ہے تو ان کے حق میں جو بہتر سمجھ کر میں کچھ نہیں جانتی ؟

ابھی یہ مناجات میں مصروف ہی تھیں کہ گھوڑوں کے ہنہانے اور اونٹوں کے بیلانے
کی صدائیں آنے لگیں ، انہوں نے گھبرا کر نیچے جو دیکھا تو ایک قافلہ ان کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا
کچھ سوار گھوڑے دوڑاتے ان کے قریب آگئے اور گھوڑوں کو نیچے چھوڑ کر اوپر پہنچے
اور پوچھا ۔ اے عورت! تو کون ہے ؟ اور کیا چیز چاہتی ہے ؟

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ لیکن ایک شخص نے ان کے قریب جا کر کہا یر عورت!
یہ سلطان یمن کا قافلہ ہے اور ہم لوگ اپنے سلطان کے حکم پر یہی تمہارے پاس آئے ہیں وہ
تمہیں بلارہے ہیں ۔

وہ اپنی دونوں لڑکیوں کو لے کر سلطان یمن کے پاس پہنچ گئیں ، سلطان
نے ان کا حال سُن کے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور کچھ دنوں بعد دونوں لڑکیوں کی شادیاں
اپنے بیٹوں سے کر دیں ۔ خانہ کعبہ میں بیت الحرام کے قریب جنت معلیٰ میں جہاں حضرت خدیجہ الکبریٰ
کا مزار اقدس ہے وہیں قریب ہی فضیل بن عیاض بھی ابدی نیند سو رہے ہیں اور مکہ معظمہ میں
داخل ہو نیا لے جہاں اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہیں وہیں اس مزار پر بھی حاضری
مسکون قلب حاصل کرتے ہیں ۔

حضرت ابو بکر شبلیؓ

خلافت عبا سے عبا سے ضرورت محسوس کی کہ بغداد کے قریب اور دور علاقوں کے عاملوں اور سرداروں کو طلب کیا جائے، خلیفہ کو ان میں سے بعض کی شکایتیں موصول ہوئی تھیں اور بعض کے حسن انتظام نے اسے متاثر کیا تھا۔ خلیفہ ان میں سے ایک کی سزنش اور دوسرے کی عصبانہ افزائی کو ناپاگاہتا تھا۔ فرمان جاری ہو گیا اور عاملوں اور سرداروں کی جانب بغداد والی عملی میں آگئی، بغداد میں داخل ہونے والی شاہراہیں آباد ہو گئیں، گھوڑوں پر سوار عامل اور سردار اپنے سپاہیوں اور دوسرے منصب داروں سے باتیں اور ہنسی مذاق کرتے بغداد سے قریب ہوتے جاتے تھے ان خدام کے پیچھے اونٹوں اور مستورات محمولوں میں سوار ہچکولے کھاتی اور شمل کے پردوں سے جھانکتی ہوئی مناظر فطرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ان کے بھی پیچھے بار بار اونٹ اور چتر تھے جنہیں اُجداد اور درشت مزاج غلاموں نے کچھ اس طرح اپنی محکمائی میں لے رکھا تھا گویا ان پر ڈاکا ہی تو پڑنے والا ہے اور یہ اجداد اور درشت مزاج اور غوغا غلام ڈاکوؤں کا قلع قمع کئے کیلئے ہر وقت تیار اور مستعد ہیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے قصر خلافت سے درافاصلے کے میدانوں میں خیموں کی فصل سی آگ آئی چاروں طرف مختلف جسامت اور رنگوں کے خیمے اس طرح لہا ہاتے لگے گویا دامن کہسار میں رنگوں کی بہار اُٹھ گئی ہو۔

خلیفہ بھی محل سے باہر آگیا اور اپنے غیر معمولی طویل و عریض خیمے میں عاملوں اور سرداروں کو طلب کیا۔ خلیفہ ان سب کو فردا فردا اپنے قریب بلاتا رہا اور ان سے طرح طرح کے سوالات اور محاسبہ کرتا رہا۔ کسی کو ڈانٹ دیا کسی کو خوش ہو کر دست بوسی کی سعادت سے نوازا دیا۔ یہ کاروبار کئی دن جاری رہا۔ آخر ایک دن خلیفہ نے ان سب کی دعوت کی اور یہ سب امیر المومنین کے ساتھ ہم طعامی کی عزت سے نوازے گئے۔ یہ امر اور عمال ان خلعوں کو زیب بدن کئے ہوئے تھے جو دو دن پہلے انہیں عطا ہوئی تھیں ان میں سے ایک امیر کو بغداد کا موسم راس نہیں آیا تھا اور زکام نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا امیر المومنین کی موجودگی نے اسے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا اندر کوئی چیز مسلسل سرسرا رہی تھی اور وہ بدقت تمام چھینک رہے ہوئے تھا آخر بات قابو سے باہر ہو گئی اور پے درپے کئی چھینکیں اس طرح آئیں کہ پوری محفل اس امیر کی طرف متوجہ ہو گئی، ان چھینکیوں نے خیموں کا پرزہ بالا جاری

کر دیا اور یہ دوسری مشکل تھی جس سے اس امیر کو اور زیادہ پریشان کر دیا، اس نے نہایت ہوشیاری سے رد مال کا کام شاہی خلعت کی آستین سے لیا، اس نے یہ کام اپنی دانست میں دوسروں کی نظروں سے بچا کے انجام پایا تھا لیکن بد قسمتی سے اس وقت عباسی خلیفہ کی نظریں بھی امیر کا یہ عمل دیکھ رہی تھیں۔ اہلئے خلافت پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے اپنے حاجب (سکرٹری) کو حکم دیا۔

”اس جاہل گستاخ امیر نے خلعت شاہی کی توہین کی ہے اور یہ ہماری خلعتِ ناخرہ کا ہرگز مستحق نہیں، اسے اُتار لیا جائے۔“

حاجب دو قدر آدمیوں کو لے کر آگے بڑھا ایک امیر کو شانوں سے پکڑ لیا دوسرے نے شاہی خلعت اُتار لی، حاضرینِ دربار امیر کی بے عزتی پر خوف زدہ ہوتے رہے اور دس عبرت لیتے رہے۔

جب یہ امیر اور عمال اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے لگے تو نہاد و نکاح سردار قصر خلافت میں داخل ہوا اور امیر المؤمنین سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس معزز سردار کو خلیفہ کی اجازت پر اس کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ سردار نے رستما السلام علیکم کہا اور دوسری شاہی رسوم کی بجا آوری سے مختصر رہا۔ خلیفہ کو یہ بات ناگوار گزری، اس نے حاجب سے کہا: ”اس سردار سے معلوم کیا جائے کہ یہ شاہی رسوم کی بجا آوری سے احتراز کیوں برت رہا ہے؟“

نہاد و نکاح سردار نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا: ”امیر المؤمنین! مجھ سے براہِ راست گفتگو کیوں نہیں کرتے، براہِ کرم درمیان سے حاجب کو ہٹا دیا جائے کیونکہ میں اس وقت امیر المؤمنین سے جس قسم کی باتیں کرنا چاہتا ہوں اس میں حاجب کی شخصیت خواہ مخواہ باتوں کو طول دے دے گی۔“

خلیفہ اس سر مست و جبری سردار سے کچھ مرعوب سا ہو گیا سردار کے انداز بے نیازی اور روش ہم کلامی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسرے سرداروں سے الگ کرتی تھی۔ خلیفہ نے حاجب کو حکم دیا: ”تم خاموش رہو، ہم خود گفتگو کریں گے۔“

حاجب نے خاموشی اختیار کی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

خلیفہ نے کہا: ”ہاں اب تم بتاؤ ہم سے کس قسم کی گفتگو کرنا چاہتے ہو؟“

نہاد و نکاح سردار نے پوچھا: ”جس امیر کی پھینکوں نے مزاجِ خلافت میں انعام پیدا کر دیا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ اپنی پھینکوں کے معاملے میں واقعی صاحب اختیار تھا؟“

خلیفہ نے تیوریوں پر بل ڈال کے جواب دیا: ”تم نہاد و نکاح کے ایک معمولی سردار ہم سے اس قسم کا معمولی سوال کس طرح کر سکتے ہو؟ اس سوال میں محاسبے کی بویائی جاتی ہے کوئی اور بات؟“

سردار نے دوسرا سوال کیا در اُس سردار کو بھرے دربار میں جس طرح رسوا اور ذلیل کیا گیا ہے کیا وہ واقعی اس کا مستحق تھا؟

خلیفہ نے ذرا ترش لہجہ اختیار کیا بولا ”کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو؟ تمہیں ہم سے اس نوع کے سوالات کا حق کس نے دیا، تم نہادند واپس جاؤ اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ آئندہ ایسی جارتیں سرزد نہ ہوں“

سردار نے پیشیانی اور ندامت کے انداز میں گردن جھکا لی اور اُنسو بہانے لگا اس نے رک رک کے زلزلہ مچائی آواز میں کہا۔

”امیر المومنین! میں نہادند واپس نہیں جا رہا۔ آپ دہاں کی سرداری کسی اور کے حوالے کر دیجئے“
 خلیفہ نے حیران ہو کر سوال کیا ”یہ کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ تم رو کیوں ہے ہو؟“
 سردار نے جواب دیا ”امیر المومنین! آپ کا تاریکی کا ڈرائی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میرے دل کی دنیا میں آپ کے حکم نے جو انقلاب برپا کر دیا ہے اس کا تو آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے“
 خلیفہ اس عجیب غریب سردار کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا کہ اسے یہ کیا ہو گیا ہے؟
 یہ کیا کہہ رہا ہے؟

سردار نے یکایک دوسرا طرزِ مخاطب اختیار کیا چہرے پر ایک قسم کی درشتی آگئی اُس نے سخت لہجے میں کہا ”تو مخلوق ہو کہ جب یہ ناپائیدار ہے کہ تیری عطا کردہ خلعت کی بے ادبی نہ کی جائے تو خدا اس بات کو کب پسند کرے گا کہ میں اس کی عطا کردہ خلعت کو ذلیل کر رہا ہوں۔ تو ایک معمولی اور اذنا حاکم اپنے اختیار کو کس نظامِ انداز میں رو بہ عمل لایا ہے؟ اس پر جتنا غور کرتا ہوں پریشان ہو جاتا ہوں“ اس کے بعد شاہی خلعت اُتار کے خلیفہ کی طرف پھینک دی۔ اور اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا ”میں نے نادانی اور غفلت میں اسے پہن لیا تھا لیکن اب میں ہوش میں آچکا ہوں اور اس خلعت کے ادب و احترام کی طرف رجوع ہو رہا ہوں، جو میرے خدا نے مجھے عطا کی ہے“

خلیفہ ان کی صورت ہی دیکھتا رہ گیا اور یہ وہاں سے چلے آئے اس عہد کے مشہور صوتی خیر نساج بعض حیثیتوں سے کافی شہرت رکھتے تھے یہ انہی کے پاس پہنچ گئے اور کہا ”حضرت! میری طرف دیکھئے اور توجہ دیجئے میں نے نہادند کی سرداری خلعت اتار پھینکی اور فقر کی خلعت پہن لی، بتائیے آپ میری کس حد تک بہنائی کر سکتے ہیں؟“

خیر نساج نے جواب دیا ”میں تمہیں اس راہ پر ڈال دوں گا بقید رہنائی تم جلد بغداد سے

انہوں نے کہا: ”اچھا یہی سہی، جنید بغدادی کو بھی دیکھ لوں گا۔“

خیر نشانجے اس کی تربیت شروع کر دی لیکن کچھ ہی عرصے بعد تند و تیز اور سرکش دبے باک مرید سے پریشان ہو گئے بولے: ”شبلی! تم نہاوند کے سردار چکے ہو اور ایسا لگتا ہے کہ تمہارے مزاج کی تندگی اور تیزگی میرے جیسا سیدھا اور دنیا سے نااہل انسان نہیں نکال سکتا۔ شاید جگرانی کی خوشبو نے ایک قسم کی گچی پیدا کر دی ہے تم جنید بغدادی کے پاس جاؤ، ان کے پاس ایک گوسہزایا اب ہے کوشش کرو کہ وہ حاصل ہو جائے خالق کائنات نے جنید بغدادی ہی کو تمہاری تعلیم و تربیت کے لئے مقرر فرمایا ہے اب تم ان کے پاس جاؤ اور اپنا گوسہزایا مقصود حاصل کر لو۔“

یہ اس مجلس سے اٹھ کے جنید بغدادی کی محفل میں پہنچ گئے۔ پہنچتے ہی جنید بغدادی سے کہا: ”مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے پاس ایک گوسہزایا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یا تو آپ اسے قیمتاً دے دیں ورنہ مفت عطا فرمادیں۔“

جنید بغدادی نے اس عجیبے غریب طرزِ تکلم پر سراٹھاکے انہیں دیکھا اور مسکرا کر کہا: ”اچھا تو تم سو شبلی! خوب کہو یہ سرداری چھوڑ کے تجارت کب سے اختیار کی؟“

انہوں نے جواب دیا: ”جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ صوفیائے کرام نے بھی دکانیں سجا لی ہیں، میں خریدار بن کر اس بازار میں داخل ہو گیا۔“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”تم جس گوسہزایا کی خریداری کی بات کر رہے تھے تم اس کی قیمت نہیں دے سکو گے، ہماری دکانوں میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔“

انہوں نے کہا: ”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس گوسہزایا کی قیمت نہیں ادا کر سکوں گا تو پھر وہ دُرِ نایاب مجھے مفت عطا فرمادیں۔“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”یہ اس سے بھی مشکل سوال ہے اگر میں وہ موتی تمہیں بے قیمت دے دوں تو تم اس کی قدر نہیں کر سکو گے کیونکہ جو شے مفت مل جاتی ہے ناقدِ ری کا سکار ہو جاتی ہے۔“

شبلی نے بے چینی سے سوال کیا: ”پھر میں اسے کس طرح حاصل کروں؟“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”اگر تم اس دُرِ نایاب کی حصولِ یابی پر بصد ہی ہو تو تمہیں پہلے توحید میں غرق ہو کر فنا ہو جانا پڑے گا۔ کیونکہ ابھی تم پر خدا نے صبر و انتظار کے دروازے نہیں کھولے ہیں پہلے انہیں کھول کے کشادہ کرواؤ جب یہ دروازے کھل جائیں گے اور خدا انہیں کشادہ بھی کرے گا تو وہ گوسہزایا تمہیں خود بخود حاصل ہو جائے گا۔“

شبلی نے پوچھا ”صبر و انتظار کے دروازے کس طرح کشادہ ہو گئے؟“ اُس کے لئے مجھے
 کیا کرنا ہو گا؟

جنید بغدادی نے جواب دیا ”کسی عذر اور حیلے کے بغیر ایک سال تک گندھک
 فروخت کرو، اس کے بعد میرے پاس آؤ“

شبلی نے نیازمندی سے سر جھکا دیا اور ذرا دیر تک کے جنید بغدادی کے حکم کی تعمیل
 میں نکل گئے۔

کہاں نہاوند کی سرداری اور کہاں گندھک کی حقیر سی دکان داری اس کام میں ان کا کیسے
 کیسے کمتر دے جس کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے شبلی کو کتنا حقیر و ذلیل کیا کچھ وہی جانتے
 تھے ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہباج کھڑا ہوتا لیکن وہ خلعت باری کے تحفظ اور اس کے شرف و
 عزت کی بحال کی غرض سے اس راہ پر چل پڑے تھے، ایک سال تک سب کچھ برداشت کرتے رہے ایک
 سال کے بعد وہ دوبارہ جنید بغدادی کے پاس پہنچے اور عرض کیا ”جناب! میں ایک سال گندھک کی
 دکانداری کر کے آگیا ہوں، ہسیر لے لے اور کوئی حکم؟“

جنید بغدادی نے انہیں غور سے دیکھا اور افسوس سے کہا ”میں تم پر صبر و انتظار کے دروازے
 کشادہ کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہاری بے چینی یہ بتا رہی ہے کہ تم نے ایک سال کی مدت بس جیسے تیسے پوری
 کر کے کسی طرح پیچھا پھڑالیا ہے اس بے چینی اور مفروری کیفیت کے ساتھ صبر و انتظار کے دروازے
 پر دست کرنے کی کوشش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟“

شبلی نے بے بسی سے جنید بغدادی کی طرف دیکھا اور کسی دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔
 جنید بغدادی نے کہا ”چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں؟“

شبلی نے جواب دیا ”اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں گندھک کی دکانداری کرنے
 دوبارہ جارہا ہوں اور یہ کام اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک کہ آپ مجھے خود نہ طلب فرمائیں۔“
 جنید بغدادی نے بدستور یاوسی کا تاثر قائم رکھا بولے ”لیکن اس عمل سے تمہارے اندر
 کی اصلاح کس طرح ہوگی؟ میرا خیال ہے اس حالت میں بھی تمہیں جس بات کا انتظار ہو گا وہ یہ ہو گا
 کہ میں تمہیں واپس کب بلاتا ہوں۔ اس فکر و ترو کی موجودگی میں صبر و انتظار کا دروازہ کس طرح کشادہ
 ہو گا۔“

شبلی نے عرض کیا ”پھر حکم آپ دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا۔“
 جنید بغدادی نے نیازت آمیز حکم دیا ”تمہیں ایک سال در یوزہ گری کرنی ہوگی۔“

شبلی نے تلملکے جنید بغدادی طرف دیکھا۔ جنید بغدادی مسکرا کر پوچھا۔
 ”سرداری کی انا ابھی زندہ ہے نفس امارہ کا افغی پھن اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے،
 ہے یا یہ بات؟“

شبلی رحم طلب نظروں سے جنید بغدادی کو دیکھنے لگے جنید بغدادی نے سر جھکا لیا
 بولے۔ ”دریوزہ گری، ایک سال تک بھیک مانگو اور وہ بھی اس طرح کہ تمہیں ہر روز میرے
 پاس آنا ہوگا اور یہ بتانا ہوگا کہ تمہیں بھیک سے کیا حاصل ہوا ہوسرداری کا طنطنہ اور نفس امارہ کا موزی
 سانپ اسی طرح ہلاک کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں، کوئی متبادل راستہ نہیں۔“
 شبلی بدستور خاموش جنید بغدادی کا چہرہ دیکھ رہے تھے جنید بغدادی نے کٹھپوں سے
 انہیں دیکھا اور درشتی سے کہا۔ ”تامل اور پس پیش کس لئے؟ کیا تم وہیں واپس جانا چاہتے
 ہو جسے چھوڑ کے یہاں آئے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اسی وقت واپس چلے جاؤ اور بلاوجہ اپنا وقت
 زبرد کر دیا تو تامل اور پس پیش کرنے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔“

شبلی نے جواب دیا۔ ”میں تامل اور پس پیش کا شکار نہیں ہوں، میں ہر وہ کام کروں گا
 جس کا آپ حکم دیں گے اور بالکل اسی طرح انجام دوں گا جس طرح آپ چاہیں گے کیا میں اسی وقت چلا جاؤں؟“
 ”ہاں اسی وقت ابھی اور پس پیش کے بغیر۔ خدا حافظ۔ رات گئے ملنا اور بھیک سے جو کچھ
 ملے وہ ہمارے حوالے کر دینا کیونکہ اس کے ختم کا اختیار تمہیں نہیں دیا جا رہا ہے۔“
 شبلی نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی، اسی وقت مرشد کے حکم کی تعمیل میں نکل گئے۔



نہادند کا سردار بغداد کے گلی کوچوں اور بازاروں میں بھیک مانگنے لگا جو اسے جانتے تھے
 انہیں عبرت ہوتی تھی اور شبلی کو کچھ دینے کے بجائے ان سے حذر کرتے تھے وہ جس دروازے پر گئے
 انہیں کچھ دیے بغیر ہٹا دیا گیا جس مکان پر دست سوال دراز کیا دھتکار دیا گیا لوگ انہیں دیکھ کر مذاق
 اڑاتے نہادند کا سردار بغداد کے عوام و خواص کے گائے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا تھا اور لوگ انہیں کچھ نہ دیکر
 اپنے حدود و شہادت کا اظہار کر رہے تھے، شبلی ہر شب کو جب جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچتا اور یہ
 بتاتے کہ وہ بھکری مشقت میں کچھ بھی نہیں ملا تو جنید بغدادی مسکراتے جب مہینوں یہ کیفیت برقرار رہی
 تو شبلی کو جنید بغدادی کی خدمت میں جاتے ہوئے نہایت محسوس ہونے لگی۔ جنید بغدادی نے
 ان کی خجالت محسوس کر لی کہا۔ ”شرملے کی کوئی ضرورت نہیں، کام جاری رکھو!“

شبلی کی ہمت بندھی اور اسی تنہی اور چپختی سے دیوڑھ گری شروع کر دی، سال کے ختم ہوتے ہوتے انہیں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ بغداد کے لوگ یا تو مفلس ہو چکے ہیں یا بخیل، اس بار شبلی نے شب دیوڑھ لگتی نہیں کی تھی انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کی دیوڑھ گری کا سال کب ختم ہو رہا ہے ایک رات جب وہ دن بھر کی دیوڑھ لگا کر کے بعد تھکے ہوئے جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے تو خلاف معمول جنید بغدادی نے سوال کیا: ”آج کیا ملا؟“

شبلی نے مایوسی سے جواب دیا: ”کچھ بھی نہیں، بغداد کے لوگ شاید میرے معاملے میں بے حس اور بخیل ہو گئے ہیں۔“

جنید بغدادی نے کہا: ”تم نہاوند کے سردار تھے لوگ تمہاری مصاحبت اور دیوڑھ داری میں شہرے روز خوشامدیں کرتے رہتے تھے اس سے تم نے اپنا جو مرتبہ کر رکھا تھا سال بھر کی دیوڑھ گری نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا، تمہاری اپنی ذاتی حیثیت کا بھرم کھل چکا ہے تمہاری اپنی کوئی قیمت نہیں۔“ شبلی اس نئے انکشاف اور اپنی حیثیت کی صحیح قدر و قیمت سن کر پریشان ہو گئے بولے: ”بے شک! ابھی تک میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ میں نہاوند کا سردار رہ چکا ہوں اور بغداد کے واقف حال حضرات مجھے دیکھ کر یقیناً میری عزت و تکریم کریں گے اور اگر عزت و تکریم نہیں کریں گے تو سوائہ حیثیت کے پیش نظر دھمکاکے کچھ نہ کچھ دے میں گئے لیکن نتیجہ خلاف امید نکلا۔“ جنید بغدادی نے مایوسی سے کہا: ”ابھی مزید اصلاح کی ضرورت باقی ہے تمہارے اندر کے میل کجیل کو نکال پھینکنے کے لئے کچھ اور رگڑائی کی ضرورت ہے۔“ شبلی معصومیت سے جنید بغدادی کو سمجھنے لگے:۔۔

جنید بغدادی نے کہا: ”تم نے اپنی سرداری کے زمانے میں کتنوں ہی کا دل دکھایا ہوگا۔“

شبلی نے جواب دیا: ”ہاں ایسا بھی ہوا ہے۔“

جنید بغدادی نے کہا: ”اچھا پھر تم اپنی یادداشت اور حافظے کی مدد سے ان لوگوں کی فہرست تیار کرو جن سے تم زیادتی کے مرتکب ہوئے ہو۔“

شبلی نے کس مندی سے کہا: ”یہ بہت مشکل کام ہے۔“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”لیکن تمہیں ہر مشکل پر قابو پانا ہے۔“

شبلی نے کہا: ”اچھا میں فہرست تیار کرنے کی کوشش تو کرتا ہوں لیکن اگر کوئی نام یادداشت اور حافظے سے نکل چکا ہو تو اس کا کیا ہوگا؟“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”اس کی نگرمت کرو فہرست کی تیاری کے بعد بھی حافظہ پر زور دیتے رہو اور بھولے ہوئے نام جیسے جیسے یاد آتے رہیں انہیں لکھتے رہو۔“

شبلی نے اس فہرست کی تیاری میں کئی دن لگا دیے اور جب یہ تیار ہو گئی تو جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنید بغدادی نے فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور حکم دیا: ”تم نہاد واپس جاؤ اور فہرست کے ہر آدمی سے مل کر معافی مانگو۔“

شبلی کو ایک دھکسا لگا۔ اپنی سرداری کے علاقے میں جا کے سابقہ رعایا سے معافی مانگنا کتنی بے عزتی کی بات ہے شاید بغداد کی دیوڑھ گری سے بھی زیادہ۔ وہ جنید بغدادی سے اچھوٹاتے گھبرا رہے تھے کیونکہ ان کی آنکھوں کا پس و پیش اور تامل ایک بار پھر جنید بغدادی پر ظاہر ہو جاتا۔

جنید بغدادی نے پوچھا ”کیا سوچنے لگے؟“

شبلی نے کہا ”اس فہرست کے کتنے ہی لوگ وہاں موجود نہ ہوں گے ان کا کیا ہوگا؟“

جنید بغدادی نے جواب دیا ”ان کا پتہ لگانا ہوگا اور وہ جہاں بھی ہوں وہیں پہنچ کے ان سے معافی مانگنی ہوگی۔“

شبلی نے محسوس کیا۔ مفرک کوئی راہ باقی نہیں رہی بولے ”میں نہاد و مذکب چلا جاؤں؟“

جنید بغدادی نے جواب دیا ”بابا یہ تمہاری درویشی کا نصاب ہے اس میں دن اور وقت کا تعین نہیں ہوتا، تم جتنی جلدی اس نصاب کو پورا کر لو گے کامیابی حاصل کر لو گے یہاں سستی اور کامی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔“

شبلی نے کسی رخت سفر اور سامان کے بغیر نہاد و مذکب راہ اختیار کی۔



جیسے جیسے نہاد و مذکب آ رہا تھا شبلی کے دل کا عجیب سی حالت ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ

دل کی کیفیت پر ہر طرح قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے یہ بے سرو سامان نہاد و مذکب سابق حکمران جیسے ہی اپنے علاقے میں داخل ہوا چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگا لیکن اب یہ چرچا قدر و منزلت اور تعریف و توصیف کا چرچا نہ تھا بلکہ طنز و استہزا، طعن و تشنیع اور مذاق اڑانے کا چرچا تھا درویشی پر نہاد و مذکب سرداری قربان کر دینا کہاں کی عقل مندی تھی اور لوگ شبلی کی اس کم عقلی کا مذاق اڑا رہے تھے اور شبلی ان سب کی باتیں سن سن کر صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے مہنسی مذاق اڑانے والوں کی

ایک جمعیت ان سے ملنے پہنچی اور سوال کیا ”حضرت! نہاد و مذکب سرداری پر اپنے علاوہ کسی اور کو فائدہ

دیکھ کر آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے ؟

شبلی نے جواب دیا : ” میں تہاوند کی عارضی سر داری کا دریشی کی مستقل سر داری سے سودا کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی معمولی سودا نہیں ہے ۔“

لوگ اس پرجوش، درویشی کا راہ پر گامزن نئے رہرو کی بات پر دل ہی دل میں مکر رہے ۔

شبلی اپنی فہرست کے ایک ایک آدمی کے در پر گئے اور ان سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں لیکن ان میں بعض ایسے نیکو جو کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے شبلی نے ان کی خدمت میں کس، خوشامدیں کیں، آہ و زاریاں کیں تب کہیں ان کے دل پیسے اور انہوں نے معاف کیا ۔ ان میں کئی ایسے تھے جو تہاوند میں موجود نہیں تھے شبلی کو ان کی تلاش میں کئی دور دراز مقامات پر بھی جانا پڑا اور وہاں بھی یہی مشکلات پیش آئیں کہ وہ لوگ ملے بھی تو انہیں کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے شبلی کا بہت زیادہ وقت خوشامد در آمد اور خدمت و آہ زاری میں صرف ہو گیا اور بمشکل معافی حاصل کر کے ہی دم لیا لیکن سب کے آخر میں ایک شخص باقی رہ گیا جس کا صحیح پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں چلا گیا اور کس جگہ مقیم ہے ؟ یہ تک بار کے تہاوند واپس پہنچے وہاں ان کی جائداد بھی عزیز رشتے دار تھے جو اس خیال سے شبلی سے دور دور رہتے تھے کہ کہیں وہ اپنی جائداد اور دولت پر دوبارہ نہ قبضہ کر لیں ۔ شبلی جس شخص سے معافی نہیں مانگ سکے تھے اس کے لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دولت میں سے ایک لاکھ درہم لے کر خیرات کر دیں جو شاید اس معافی کا بدلہ ثابت ہو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بغداد روانہ ہو گئے، راستے بھر ایک لاکھ درہم اور معافی نہ حاصل کر سکنے کا احساس ستا تا رہا، ان کا ضمیر بار بار ان سے پوچھتا کیا یہ ایک لاکھ درہم خیرات میں دے دینے سے معافی کی تلافی ہو گئی ہے ؟ کبھی دل کہتا : ” کہاں ہو گئی اور کبھی کسی گوشے سے آواز ابھرتی، ” نہیں ہوئی ۔ یہ دل میں ایک کاٹنا سا لیے ہوئے بغداد میں داخل ہو گئے اور حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچ گئے مرشد نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور پوچھا ” کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آئے ہو ؟“

شبلی نے مذہب لہجے میں جواب دیا : ” کچھ کہہ نہیں سکتا، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے ۔“

جنید بغدادی نے کہا : ” سفر کی تفصیل بیان کرو ۔“

شبلی نے کم و کاست پوری تفصیل عرض کر دی اور آخر میں سوال کیا : ” اب یہ فیصلہ آپ

خود فرمائیے گے کہ جس شخص سے معافی نہیں مانگ سکا، اس کی تلافی میں، میں نے ایک لاکھ درہم

خیرات کر دیے ہیں تو خدا کی نظر میں میرا یہ عمل کیسا ہوگا ؟“

جنید بغدادی نے جواب دیا: ”یہ ایک لاکھ درہم کی خیرات تمہارے نامہ اعمال کی نیکی میں تو لکھی جاسکتی ہے لیکن اس سے وہ گناہ معاف نہیں کئے جاسکتے جو ایک بندے کی دل آزاری کی وجہ سے تمہارے نامہ اعمال میں لکھے جاپچکے ہیں شبلی! یہ معاملہ حقوق العباد کا ہے اس میں اللہ کیوں دخل دے گا؟ تمہیں مکتور، بہر قیمت اس شخص کو تلاش کر کے معافی مانگنا ہے اسی وقت واپس جاؤ اور اس سے تلاش کر کے معافی مانگو۔“

شبلی نے کہا: ”میں اسے کئی جگہ تلاش کر آیا لیکن وہ نہیں ملا، اب میں کہاں جاؤں؟“
 جنید بغدادی نے نفرت سے کہا: ”تمہارے مزاج میں اتنی تکبر و دند کی سرداری کی خوبیاں باقی ہے تمہیں اپنی جائدا اور دولت کا اب بھی احساس ہے اب بھی گھمنڈ اور گمان ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کبھی بھی ایک لاکھ درہم خیرات کر دینے کی طرف مائل نہ ہوتے، جاؤ اس گھمنڈ اور گمان کو نکال کے واپس آؤ۔“
 شبلی نے کہا: ”حضرت! جو شخص مجھے بعد تلاش بسیار بھی نہیں مل سکا اس کے لئے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید وہ زندہ نہیں ہے اور اگر وہ واقعی مر چکا ہے تو میں اس سے کس طرح معافی حاصل کروں گا؟“

جنید بغدادی نے زحمت ہو کے کہا: ”اچھا چلو یہی سہی پھر بھی تمہارے دل و دماغ کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی سرداری کی خوب تو نکالنی ہی پڑے گی۔“ پھر ذرا سکوت اختیار کیا اور حکم دیا ”ایک سال کی دیوڑھ گری اور؟“

شبلی اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے بولے: ”بہتر ہے جیسا حکم مرشد!“
 یہ کہا اور باہر نکل گئے جنید بغدادی کھلے ہوئے دروازے پر نظریں جمائے کچھ سوچتے رہے پھر خود سے مخاطب ہوئے۔

”دل کا میل کچیل ابھی اچھی طرح تو نکلا نہیں اس رنگ کی موجودگی میں دل پر جلا کاری کس طرح ممکن ہے۔“

لیکن اس مرتبہ لوگوں نے شبلی کو کچھ نہ کچھ دینا بھی شروع کر دیا۔ دن بھر کی بیک سے جو کچھ حاصل ہوتا، جنید بغدادی اسے لے کر خیرات کر دیتا اور اس میں ایک پائی بھی خود پر یا شبلی پر نہ خرچ کرتے شبلی کو پیٹ بھر غذا بھی نہ دی جاتی، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور شبلی کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا، جنید بغدادی کو ان کے کھانے پینے کی نہ تو فکر تھی نہ پروا۔ شبلی اپنے مرشد کے اس رویے کی شکایت بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں تو صبر و انتظار کا راہ پر چل کر اس کے دروازے کشادہ کرنے تھے۔

لوگ انہیں دھمکاتے۔ جھڑکیاں دیتے اور سخت سُست کہتے لیکن یہ سیکر تسلیم و رضا بنے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ دن بھر کے تھکے ہارے جب یہ مرشد کی خدمت میں پہنچتے تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیتے اور کہتے۔ ”خوئے سرداری اور انکا میل کچیل صاف ہو رہا ہے، آئینے کا رنگ کھرچا جا رہا ہے جلاکار کا الف مقام بنا چکا“ اور جلاکار کا یہی الف ایکٹ ایکٹ ایک دن پھیل کے پوسے دل کو جلا کر دے گا۔“ شبلی نے صبر و تحمل سے پورا سال درویشوں کی خدمت میں گزار دیا۔ اس بار انہوں نے نہ تو کسی قسم کا شکوہ کیا اور کوئی عذر، ایک دن جنید بغدادی نے انہیں خود ہی اس کام سے منع کر دیا، کہا۔ ”شبلی! بس کرو تم اپنا انصاف پورا کر چکے، اب تم میری صحبت میں رہ سکتے ہو۔“

شبلی جس کیفیت میں مبتلا ہو چکے تھے اس میں اب شکوہ یا شکریے کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں تھا، اسلاطینی سے مرشد کی بات سنی اور ان کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ جنید بغدادی نے ان کے ذمے یہ خدمت کر دی کہ آئے جانے والے درویشوں کی خدمت کیا کریں، شبلی نے، کام بھی پوسے ایک سال انجام دیا۔ ایک دن حضرت جنید بغدادی نے انہیں طلب فرمایا اور پوچھا۔ ”شبلی! اب تم خود کو خلافت میں کیسا سمجھتے ہو؟“

شبلی نے جواب دیا۔ ”تمام مخلوق میں کمتر۔“

جنید بغدادی نے خوش ہو کر بشارت دی۔ ”اب تمہارے ایمان کی تکمیل ہو چکی ہے۔“

رفعتہ زتان کا یہ حال ہو گیا کہ لوگوں کے لئے شمشیر بن گیا۔ ان کے جلال و جمال سے لوگ ڈرنے لگے وہ لوگوں کو مغرب دیتے کہ میرے سامنے تم لوگ بار بار خدا کا نام لو، میں تمہیں اپنی مقدرت کے مطابق کچھ عطا کروں گا۔“

لوگ نفع اندوزی کے خیال سے انہیں دیکھتے ہی اللہ اللہ کہنا شروع کر دیتے اور یہ خوش ہو کر انہیں اشرفیوں سے نواز دیتے، یہ اشرفیاں ان کے پاس کہاں سے آتی تھیں کسی کو پتہ نہ تھا بغداد کے بچوں کو جب اس مشغلے کا علم ہوا تو وہ ہجوم کی شکل میں آپ کے پاس آتے اور اللہ اللہ کا درود شروع کر دیتے۔ شبلی ان میں شیرینی تقسیم کرنے لگے۔ ان کا یہ عمل ایک مدت تک جاری رہا، خلاف معمول ایک دن جب بچے اور بڑے اللہ اللہ کا ورد کرتے حاضر ہوئے تو دیکھا، شبلی برہنہ شمشیر لیئے ان کے قتل پر آمادہ ہیں لوگ انہیں اس حال میں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے کچھ شناسا شبلی کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ ”شبلی! یہ کیا بات ہے؟“

شبلی نے جواب دیا۔ ”رب کعبہ کی قسم، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اگر کسی نے

میرے سلسلے خدا کا نام لیا تو میں اسے قتل کر دوں گا“

شنا سائے عرض کیا یہ لیکن جناب کل تک تو آپ اللہ اللہ کے ورد پر انہیں اشرافیوں اور شیرینی سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔“

شبلی نے جواب دیا: ”ہاں میں یہی کرتا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ لوگ خدا کا نام اس کی محبت میں ڈوب کر لیا کرتے ہیں لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ لوگ خدا کا نام یا تو عادتاً لیتے ہیں یا پھر سوداگری میں اور میں اسے ناجائز بلکہ حرام سمجھتا ہوں۔“

ایک دن لوگوں نے دیکھا، شبلی ہاتھوں میں آگ لیے ایک طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں کسی نے انہیں روک لیا اور پوچھا ”شبلی! کہاں کا قصد ہے؟“

جواب دیا: ”خانہ کعبہ جا رہا ہوں!“

اس شخص نے سوال کیا: ”اس آگ کیا کرو گے؟“

جواب دیا: ”اس سے خانہ کعبہ کو پھونک دوں گا۔“

سوال کرنے والا لرز گیا ”سہم کر بولا: ”شبلی! تم اپنے ہوش و حواس میں تو سو؟“

آپ نے جواب دیا: ”افسوس کہ جو خود اپنے ہوش و حواس میں نہیں وہ میرے ہوش و حواس پر

شبہ کر رہے ہیں۔“

اس شخص نے کہا: ”آپ کیسی بھیجی بھیجی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ نے اس پر بھی کچھ غور کیا؟“

شبلی نے ہوش میں جواب دیا: ”میں ہوش مندی کی باتیں کر رہا ہوں لیکن تمہاری عقل و حواس پر

غفلت کے پڑے پڑے پڑ چکے ہیں اس لئے تم میری بات نہیں سمجھ سکتے۔“

اس شخص نے پھر سوال کیا ”یہ آگ آپ کہاں لئے جا رہے ہیں؟“

شبلی نے اسی بے باکی سے جواب دیا: ”خانہ کعبہ لیے جا رہا ہوں اور اس آگ سے اسے پھونک دینا

چاہتا ہوں۔“

اس شخص نے سوال کیا: ”آخر کیوں؟ کیا رب کعبہ اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرھے گا؟“

”تہیں کرے گا۔“ شبلی نے جواب دیا: ”کیونکہ میں اس کے گھر کو اس لیے پھونک دیتا چاہتا

ہوں کہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے کعبے والے کی طرف رجوع ہو جائیں۔“



عید کا دن تھا لوگ زرق برق، رنگ برنگے اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس ادھر

ادھر عید ملے پھر رہے تھے لیکن اس دن شبلی نے بطور خاص سیاہ کپڑے پہن لیے، دیکھنے والوں نے ان کا مذاق اڑایا کیا، دیکھا ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری ہو گئے ہو؟

شبلی نے اللہ کا نعرہ مارا اور جواب دیا: ”میں اس کی ذات میں گم ہو گیا ہوں!“ کسی نے ہنس کر کہا: ”لیکن آتنا ہوش باقی رہا کہ عید کے دن قصداً سیاہ کپڑے پہن لیے۔“ آپ نے جواب دیا: ”لوگو! میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو، میں نے یہ لباس تم سب کے ماتم میں پہن لیا ہے۔“

ایک شخص غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا: ”ہم زندوں کے ماتم کا مطلب؟“ آپ نے جواب دیا: ”تم نے اپنے معبود حقیقی کو بھلا دیا اور ماسوا میں غرق ہو گئے پھر تم زندہ کہاں رہے ہو؟“

بچوں نے آپ کا مذاق اڑایا اور انہوں نے شور بلند کیا یہ شخص غصے میں تو اللہ کا نام لینے سے منع کرتا ہے اور خود بار بار ایک نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔“

شبلی نے غصے میں انہیں دیکھا، بچوں نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی۔ ”دیوانہ ہے!“ شبلی نے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کی، پتھروں کا مار سہتے رہے اور کہتے رہے: ”اتم ابھی نیچے ہوں، نادان نا سمجھ، تمہیں کوئی سزا کس طرح دی جاسکتی ہے؟“ پھر انہیں بطور خاص مخاطب کیا: ”میرے بچو! ادھر آؤ! ذرا میرے قریب آؤ، میں تمہیں ماروں گا نہیں، میں تم سے بدلہ نہیں لوں گا، دیکھو تم نے میرا جسم لہو لہان کر دیا ہے اور ایسا تم نے خود نہیں کیا، اس میں خدا کا حکم بھی شامل تھا پھر میں تمہیں مورد الزام کس طرح ٹھیل سکتا ہوں؟“

نیچے خوف زدہ ہو کے دور سے کھڑے رہے، اب انہوں نے سنگ باری موقوف کر دی تھی۔

لہو لہان شبلی آہستہ آہستہ چل کے خود ہی ان کے پاس پہنچ گئے نیچے، بوڑھے اور جوان سبھی تصویر حیرت بنے یہ منظر دیکھتے ہی شبلی نے کہا: ”کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں اس کا نام لے رہا ہوں یہ تو خود معبود حقیقی ہے چو اپنے نام کا ورد کر رہا ہے، ذرا میرے قریب آ کے بہتے ہوئے خون کی زبان سنو، دیکھو ہر قطرہ خون کیا کہہ رہا ہے؟“

چند آدمیوں نے ہمت کی اور بھکے کان بہتے ہوئے لہو کے قریب کر دیے وہاں سے پھر اڑ آوازیں آ رہی تھیں ”اللہ، اللہ، اللہ!“

ان کے چہرے سفید پڑ گئے اور ذرا سی دیر میں شبلی وہاں تنہا رہ گئے۔

شبلی کی عبادت و ریاضت میں اتنا اضافہ ہوا کہ راتوں کی نیند اڑادی اللہ ان کے رک پے میں جاری و ساری تھا اور وہ اس سے ایک لمحے غافل نہ ہونے کو بھی گنہ سمجھتے تھے انہوں نے بہت سارا نمک پیس کے حجرے میں رکھ لیا اور جب بھی نیند ساتی ایک چٹکی آنکھوں میں بھر لیتے۔ جب لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوا تو انہوں نے شبلی کو ڈرایا کہا ”یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟ اس طرح تو بنیائی جاتی ہے گی“

شبلی نے جواب دیا ”میں نے اپنی چشم باطن روشن کر لی ہے اس لئے چشم ظاہر کی بنیائی کی میں پروا نہیں کرتا۔“

ایک دن جنید بغدادی کو کسی نے بتایا کہ شبلی لوگوں کو جمع کر کے وعظ کہنے لگے ہیں اور اس میں ایسی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جن پر کفر کا فتوہ لگایا جاسکتا ہے۔

جنید بغدادی نے کہا ”اچھا اب جس دن وہ کہیں وعظ کہہ رہے ہوں مجھے مطلع کیا جائے میں ان کی تقریر خود سننا چاہتا ہوں تاکہ اس کے مطابق انہیں تنبیہ کی جائے۔“

ایک دن لوگوں نے انہیں رصافہ بازار میں تقریر کرتے دیکھا فوراً جنید بغدادی کو مطلع کیا گیا، ”وہ بھلے بھلے کے رصافہ بازار پہنچے وہاں شبلی محو گفتار تھے وہ کہہ رہے تھے ”لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا کے گھر کا طواف تمہیں جہنم سے بچالے گا تم خدا کے گھر کو بھونک کر خدا کی طرف راغب ہو جاؤ اور یاد رکھو جہنم کی آگ کا خوف تمہاری اطاعت و ریاضت میں شامل نہ ہونے پائے میں نہیں سمجھتا وہ معبود حقیقی جو اپنے بندوں سے ماؤں کی ستر کی محبت سے زیادہ چاہ رکھتا ہے اسے بندوں کے لئے جہنم کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ خدا معلوم نہیں کیوں اپنے بندوں میں جنت کا لالچ اور جہنم کا خوف پیدا کر کے اپنی طرف راغب کرنا چاہتا ہے کیا ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم خدا کی عبادت بس خدا کے لئے کریں اور قیامت کے دن اس کے دیدار کے علاوہ دوسری کوئی خواہش نہ رکھیں؟“

جنید بغدادی نے باواز بلند شبلی کو بکارا ”شبلی! اپنی تقریر مندر کر۔“

شبلی خاموش ہو گئے۔ جنید بغدادی نے انہیں قریب بلایا ”یہاں آؤ میرے قریب میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

شبلی ان کے قریب پہنچ گئے جنید بغدادی نے کہا ”تم یہ کیسی تقریر کر رہے تھے؟“

شبلی نے جواب دیا ”میری تقریر جب خود آپ نے بھی سن لی ہے تو آپ کا یہ سوال فضول ہے۔“

جنید بغدادی نے غصے میں کہا ”ہم نے جن چیزوں کو مدفون کر رکھا ہے انہیں تم برسرِ عام“

کیوں بیان کرتے پھر رہے ہو؟“

شبلی نے تلخی سے جواب دیا: ”جن حقائق کا میں اظہار کرتا ہوں، وہ لوگوں کے ذہنوں سے بالاتر ہیں کیونکہ میری باتیں حق کی جانب سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور دورانِ تقریر شبلی کا وجود باقی نہیں رہتا۔“

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا: ”افسوس ہے کہ تم بھی اسی قسم کی باتیں کر رہے ہو جیسی ابن منصور کرتا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں میں خون آلود شمشیر نظر آتی ہے۔“

شبلی نے جواب دیا: ”جب درمیان میں شبلی کا وجود باقی ہی نہیں رہا تو پھر شمشیر اور اور خون کا خوف کیا معنی رکھتا ہے۔“

جنید بغدادی نے عاجز آ کر کہا: ”شبلی! میں تمہارے قول کی تردید نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کے مجمع میں اسی قسم کی باتیں کرتے پھرو۔“

شبلی نے ذرا ناگواری سے کہا: ”جو لوگ ایک ہی وقت میں دین بھی چاہتے ہیں اور دنیا بھی، ان کے لئے ہماری مجلس نشینی حرام ہے۔“

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا: ”جب تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری باتیں حق کی طرف سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف واپس جاتی ہیں تو اس کا ایک دن یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ یہی سامعین تمہیں پاگل اور دیوانہ قرار دے دیں گے۔“

شبلی نے جواب دیا: ”پاگل ہوش مندی کی کیفیت سے واقف ہی کب ہوتے ہیں؟ یہ خود پاگل ہیں کسی پاگل کی سند دیوانگی کس حد تک معتبر ہو سکتی ہے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔“

جنید بغدادی نے عاجز آ کر کہا: ”تو مندی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تو وہی کرے گا جس کا تو ارادہ کر لے گا، میں تجھے تیرے حال پہ چھوڑتا ہوں۔“

جنید بغدادی یہ کہہ سکھر واپس آگئے۔

کچھ عرصے بعد انہیں واقعی دیوانہ قرار دے دیا گیا۔ فقیہانِ شہر اور اطباء نے بغداد نے انہیں پاگل قرار دے دیا اور یہ دارالمجانین (پاگل خانے) میں داخل کر دیے گئے۔ جنید بغدادی کو اس خبر سے مدد پہنچا اور ان کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی آزرہ ہو گئے جنہیں شبلی سے محبت تھی اور ان کے مرتبے سے واقف تھے یہ لوگ پاگل خانے میں شبلی سے ملنے گئے۔

جب انہیں شبلی کے روبرو پیش کیا گیا تو شبلی نے ان سے پوچھا: ”تم لوگ کون ہو؟ اور

میرے پاس کیوں آئے ہو؟

دوستوں نے جواب دیا: ”ہم سب آپ کے دوست ہیں اور آپ کی مصیبت پرستی دلا سادینے

آئے ہیں۔“

شبلی نے بیزاری سے کہا: ”خوب تم کیسے دوست ہو کر وہ نہیں چاہتے جو تمہارا دوست اپنے لئے پسند کرتا ہے دوست تو اسے کہتے ہیں جو رخصتے دوست میں خوش رہتا ہے۔ مجھے میرے شیخ نے صبر و انتظار کی تلقین کی تھی اور اب میں اس راہ کا ایک مستقل مزاج مسافر ہوں کوئی مصعبت کوئی مصیبت مجھے اس راہ سے جھٹکا نہیں سکتی اور ایک تم ہو، تم لوگ کہ خود کو میرا دوست ظاہر کرتے ہو لیکن میری راہ پر چلے نہیں، آخر تم لوگ بھی میری مصیبت پر میری ہی طرح صبر کیوں نہیں کرتے؟“

دوست حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے شبلی نے انہیں جھگانے کیلئے فوراً ہی سنگ باری شروع کر دی کہا: ”او محبت کے بھڑے مٹوے دارو! تم سب اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں پتھر مار مار کے ہلاک کر دوں گا کیونکہ جھوٹ کی میرے ہاں یہی سزا ہے۔“

دوست احباب خوفزدہ ہو کے اسی وقت بھاگ کھڑے ہوئے۔



پگال خانے میں ان کی ملاقات کو عباسی وزیر حاصر ہوا اس نے سن رکھا تھا کہ شبلی کہتے ہیں کہ جس صدیق سے معجزے کا اظہار نہ ہو، وہ صدیق نہیں کچھ اور ہوگا نہایت قیمتی لباس اور خدکم کے ساتھ جب وزیر ان کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا: ”تم کس سے ملاقات کرنے آئے ہو“

وزیر نے جواب دیا اور تم سے۔“

شبلی نے پوچھا: ”کس لئے؟“

وزیر نے جواب دیا: ”یہ پوچھنے کہ تم کو یہ کہتے تھے کہ جس صدیق کو معجزہ نہ ہو وہ بھڑا ہے لوگ تمہیں اس بھڑکا صدیق کہتے ہیں پھر تم سے کسی معجزے کا اظہار کیوں نہ ہوا؟“

شبلی نے کہا: ”کیا میں خدا کے ادا مرد ہوں؟ میں موافقت نہیں کر رہا ہوں؟ اگر کر رہا ہوں تو یہ میری حدیثیت ہے اور یہ میرا معجزہ، کسی مرید کے لئے وقف، سارف کو تعلق، عاشق کو گلہ، صادق کو دعوا، خائف کو تراد اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ سے فراق کسی حال میں بھی جائز نہیں کیا میں ان میں سے کسی ایک کا بھی تارک ہوں کیا میرے حال میں یہ ساری باتیں موجود نہیں ہیں۔“

وزیر اس طرز تکلم سے خوفزدہ ہو گیا وہ واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ آپ اس کے قیمتی لباس کو حواریت

سے دیکھتے ہوئے فرمایا: ”تم قبر میں ہو اور ایک قبر کا آدمی زندوں سے مخاطب ہو، حیرت ہے“
 ذریعے خوف زدہ لہجے میں عرض کیا: ”مقصود والا! میں زندہ ہوں، خدا کے لئے میرا شمار
 زندوں میں کیجئے۔“

شبلی نے جواب دیا: ”تم اپنے شاندار لباسوں میں دفن رہتے ہو“
 ذریعے جاتے جاتے پتا گل خانے کے ننگراں کو حکم دیا: ”انہیں رہا کر دو، ورنہ ڈس ہے
 کہ ان کی باتیں بغداد کو پھرنے کے رکھ دیں۔“
 شبلی رہا کر دیے گئے۔

جب یہ رہا ہو کر جاتے تھے تو کسی ارادت مند نے انھیں ہاتھ سے ہی روک لیا اور
 گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا: ”شبلی! خدا کے لئے آپ میرے حق میں کشائش روزی کی دعا کیجئے
 کیونکہ میری ساری تدبیریں بیکار ہو چکی ہیں۔“
 شبلی نے جواب دیا: ”یقیناً میرے حق میں دعا ضرور کروں گا لیکن پہلے گھر جا کے تو ایک
 کام کراؤ۔“

اس شخص نے کہا: ”ارشاد“ میں ابھی گھر جانے کو تیار ہوں۔“
 شبلی نے کہا: ”گھر کے جتنے افراد کا رزق تم سے ذمے ہے انہیں نوہ گھر سے نکال دے
 اور جتنوں کا رزق خدا کے ذمے ہے انہیں گھر ہی میں رہنے دے اس کے بعد میرے پاس آ، میں دعا کروں گا۔“
 وہ شخص توبہ کرتا ہوا شبلی سے جدا ہو گیا۔

لوگوں میں چرمیگوٹیاں پورے تھیں کہ شبلی پورا کلمہ نہیں پڑھتے بس اللہ اللہ کرتے رہتے
 ہیں ایک درویش نے اس کا ذمہ لیا کہ وہ شبلی سے پورا کلمہ پڑھو اسکے پھوٹے گا، یہ شبلی کے پاس
 پہنچا اور سختی سے پوچھا یہ شبلی! تم ہمیشہ اللہ اللہ کہتے رہتے ہو، آخر تم لا الہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟
 شبلی نے جواب دیا: ”میں اللہ سے پہلے لا (نہیں) کہہ کے اس کی نفی نہیں کر سکتا کیونکہ
 اگر لا کہنے کے بعد زندگی نہ وفانہ کی تو میں مقام نفی میں رہ جاؤں گا۔“

نوجوان درویش نے کہا: ”آپ کا جواب خوب ہے لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔“
 شبلی نے کہا: ”خدا نے قرآن پاک میں اپنے رسول سے کہا: ”اے رسول! فرمائیے کہ
 میرے لئے بس اللہ ہی کافی ہے اور دوسروں کو لہو و لعب میں مشغول رہنے دیجئے۔ آپ ان سے
 کوئی سہوار نہ کیجئے۔“ اتنا کہہ کے شبلی نے درویش سے کہا: ”پس اللہ کہنے کیلئے امر الہی صادر

ہو گیا اور میں جیہڑا اور جہاں دیکھتا ہوں اللہ ہی نظر آتا ہے میں تو غیر اللہ یا سوا اللہ کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتا۔ پھر لا، اپنی زبان سے کیوں کہوں؟

جادو جیبا اثر رکھنے والے کلمات نے نوجوان درویش کی دل پھونک کے رکھ دیا اس کی حالت غیر ہونے لگی اس نے بمشکل تمام رک رک کر کہا: ”شبلی! بھراک اللہ جو کچھ تم نے کہا میرے لئے بہت کافی ہے۔“

اس کے بعد وہ بے حال ہو گئے گر گیا لوگ اسے گرتا دیکھ کے اس کے قریب پہنچے اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے لاش اس کے رشتے داروں کو پہنچا دی گئی انہوں نے شبلی کے خلاف قتل کا مقدمہ قائم کر دیا۔ تاحضی نے یہ مقدمہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مرحوم کے دشا اس مقدمے کو خلیفہ کے پاس لے گئے خلیفہ نے اسی وقت شبلی کو طلب کر لیا، وارفتہ و سرشار بے نیاز و مستغنی، شبلی خلیفہ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔

خلیفہ نے شبلی سے سوال کیا: ”کیا اس نوجوان درویش کو تم نے ہلاک کر دیا؟“
شبلی نے جواب دیا: ”نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔“

خلیفہ نے پوچھا: ”واقعے کی تفصیل بیان کرو اور بتاؤ کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“
شبلی نے اپنے خاص لب لہجے میں جواب دیا: ”اس درویش کی روح پہلے ہی سے مشامق دیدہ تھی میرے سامنے آکے رونے لگی، فریاد کی، باری تعالیٰ کی طرف سے دعوت آئی، یہ بلیک کہتا ہوا جان بچی ہو گیا برق مشاہدہ جمال نے اس کا کام تمام کر دیا، اس میں میرا کیا قصور؟“

خلیفہ کی حالت غیر ہونے لگی اس کے رگڑے پے میں خون کی گردش اتنی تیز ہو گئی اور دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ خلیفہ کو خدشہ محسوس ہوا کہ درویش کی طرح شاید وہ خود بھی جان بچی ہوئے والا ہے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خدام دربار کو حکم دیا: ”شبلی کو اسی وقت یہاں سے لیجاؤ کیونکہ ان کا کلام مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری کر رہا ہے جیسی درویش پر طاری کر کے اسے ہلاک کر چکا ہے۔“
پھر درویش کے مدعیان خون سے کہا: ”تم لوگ بہت نادان ہو بخدا! مجھے یقین ہے کہ اگر شبلی فرما فرما تم سب سے مخاطب ہو جائیں تو تم میں سے ہر ایک اسی درویش کے حال کو پہنچ جائے، شبلی میں معلوم نہیں کون گویا ہے، ان بچو اور مت الجھو۔“

مدعیان خون نے اپنا دعوہ واپس لے لیا۔



شبلی کے حاسد اور مخالف ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ شبلی باقاعدہ مسجد میں جا کے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ شبلی نے انہیں جواب دیا: ”لوگو! تم مجھے ایسا مت سمجھو میں اس کی یاد سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا۔“

کسی معترض نے کہا: ”ہم دنیا دار لوگ تو ظاہری دیکھ کے فیصلہ کریں گے۔“
شبلی نے عاجزی سے کہا: ”خدا نے مجھے مسجد کے معاملے میں کچھ ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے اس لئے میں اگر میں اپنی زبان کھولوں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔“
حاسد نے کہا: ”اس کا ہم پر بھی اظہار ہو جائے تو بڑا کرم ہو گا۔“
شبلی نے مجبوراً جواب دیا: ”اچھا تب پھر تم میرے ساتھ آؤ اور مسجد تک پہنچنے کے دوران میرے قریب ہی رہو اور اس کیفیت کو خود دیکھ سن لو۔“

وہ شخص آپ کے ساتھ ہولیا۔ آپ نے وضو کیا اور مسجد روانہ ہو گئے ابھی یہاں تھے ہی میں تھے کہ ایک آواز سنائی دی: ”گستاخانہ وضو کے ساتھ ہمارے گھر آ رہا ہے۔“

اس آواز نے شبلی کے قدم روک دیے اور واپسی کی نیت سے پلٹے تو دوسری آواز سنائی دی۔
”بس کر دیا ارادہ ترک؟ یہ تو سوچ کر ہمارے گھر سے واپس ہو کے تو اور کہاں جائے گا؟“
شبلی نے حالت وجد میں اللہ کی ضرب لگائی تو دوسری طرف سے جواب ملا: ”ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے؟“

شبلی خاموش ہو کر مسجد کے ایک کونے میں جا بیٹھے تو کسی نے طنز کیا: ”تو صبر ضبط کا بھی دوسرا ہے؟“

شبلی رونے لگے اور پچکیاں لیتے ہوئے کہا: ”اللہ! تو یہ جو کچھ میرے ساتھ کر رہا ہے میں تجھی سے اس کی فریاد چاہتا ہوں۔“ پھر اپنے حاسد سے کہا: ”اب تم بتاؤ کہ جو شخص ایسی الجھنوں میں مبتلا کر دیا گیا ہو کس طرح مسجد کا حاضری پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟“
حاسد لاجواب ہو کے چپ ہو رہا۔



گلی میں چند بچے آپس میں جھگڑ رہے تھے ادھر سے شبلی گزرے اور انہیں جھگڑا دیکھ کے پوچھا: ”تم لوگ آپس میں جھگڑا کیوں رہے ہو؟“

ایک بچہ نے جواب دیا: ”ہمارے چاند خروٹ ہیں انہیں آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن مسامی

تقسیم کرنے سے قاصر ہیں۔“

شبلی نے کہا: ”لاؤ وہ اخروٹ مجھے دو، میں تقسیم کرتا ہوں۔“

بچوں نے وہ اخروٹ شبلی کے حوالے کر دیئے شبلی نے اس کے حصے کرنا شروع کر دیے ایک بچے کو بڑی عجلت تھی جیسے ہی اخروٹ ملے انہیں توڑنا شروع کر دیا اور اتفاقاً ہی بات کہ وہ ساک ہی خراب نکلے بچے نے شکر کیا: ”میں تو دوسرے اخروٹ لوں گا یہ تو ساک ہی خراب ہیں۔“
شبلی نے پریشان ہو کر کہا: ”میں ان کے اندر کے حال سے تو واقف نہیں تھا۔“
کسی بچے نے معصومیت سے کہا: ”جب تم ان کے اندر سے واقف نہیں تھے تو تم نے یہ تقسیم اپنے ذمے کی کیوں؟“

شبلی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بات بچے کے ذریعے خدا کا کہہ رہا ہے بے اختیار رو دیے اور مست و بے حال ہو کر ایک طرف چل دیے، وہ پریشان اور بے حال چلے جا رہے تھے کہ کسی نے انہیں روک کر پوچھا: ”شبلی تم پریشان کیوں ہو؟“
شبلی نے جواب دیا: ”کوئی ایک بات ہو تو عرض کروں میںوں ایسی باتیں ہیں جن کا فکر نے مجھے ہلکان کر دیا ہے۔“

اس شخص نے کہا: ”تمہاری حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو تم خود خدا کے ساتھ نہیں ہو یا پھر یہ ہے کہ خدا تمہارے ساتھ نہیں ہے ورنہ اتنی بے چینی اور پریشانی میں تم نہ مبتلا ہوتے۔“
شبلی نے جواب دیا: ”اگر میں خدا کے ساتھ ہوتا تو میری ایک الگ حیثیت بھی ہوتی لیکن میں تو اس ذات میں گم ہو گیا ہوں اور اب ہم دونوں ہی ایک ہیں۔“ پھر قہرے افسوس سے کہا: ”میں ہمیشہ اس بات سے خوش ہونے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھے خدا کا مشاہدہ اور اُنس حاصل ہے لیکن جسے تم لوگ خوشی کہتے ہو، ویسی خوشی اپنی ہی جنس سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔“

اسی عالم کیف و مستی میں وہ جنید بغدادی کے پاس پہنچ گئے اس وقت جنید بغدادی کی بیوی لنگھی کر رہی تھیں وہ شبلی کو دیکھتے ہی پرے سے مل جانے لگیں تو جنید بغدادی نے فرمایا: ”وہ تم شبلی سے پردہ کر لے ہو حالانکہ یہ جس کیف و مستی کے شکار ہیں اس میں دوسرے وجہ کی بھی پرواہ نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایک عورت کا خیال!“

بیوی رک گئیں۔ شبلی دیر تک جنید بغدادی کو دیکھتے رہے۔ آخر وہ رونے لگے انہیں ہچکیاں لیتے دیکھ کر جنید بغدادی نے بیوی سے کہا: ”اب تم اندر چل جاؤ کیونکہ اب یہ ہوش میں آ رہے ہیں۔“

بیوی خود ہی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

جنید بغدادی نے پھیرنے کے انداز میں کہا: ”شبلی! مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں ذکر الہی میں صدق حاصل نہیں ہے اگر میری یہ بات درست ہے تو میں پریشان ہوں کہ تم خدا کو کس طرح یاد کرتے ہو؟“ شبلی نے جواب دیا: ”آپ نے درست فرمایا۔ جب میں مجازی اعتبار سے اس کلمے حد ذکر کرتا ہوں تو ایک بار وہ بھی مجھے حقیقت کے ساتھ یاد کر لیتا ہے اور میرے لئے یہ بہت کافی ہے۔“ شبلی کا اس مکالمے نے جنید بغدادی کو اتنا مضطرب کر دیا کہ وہ اللہ کا نعرہ لگا کے مدہوش سے ہو گئے:

صبح کی خنک اور خوش گو اور فضا میں شبلی نے ایک پُر سر آواز سنی: ”شبلی! تو اسم ذات کے ساتھ کب تک خود کو وابہ کر رکھے گا، مسمیٰ کو کیوں نہیں تلاش کرتا؟“ اس آواز نے تازیانے کا کام کیا، شبلی پریشان تھے کہ مسمیٰ کو کہاں تلاش کریں؟ یہ اضطراب اتنا بڑھا کہ وارفتہ اور شرارہ دیاٹے درجوں کو دھنسنے لگے لیکن موجوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں دوبارہ کنا سے پر پھینک دیا گیا۔ ادھر سے یایوس ہو کے شبلی نے جنگل کا رُخ کیا اور خود کو درندوں کے درمیان کھڑا کر دیا کہ وہ انہیں چیر بھاڑ کے کھا جائیں لیکن دندے انہیں دیکھتے ہی دم دبا کے ادھر ادھر منہ چھپانے لگے۔ یایوس ہو کے یہ پھر آبادی میں آگئے اور آگے اللہ روشن کر کے اس میں داخل ہو گئے لیکن آگے انہیں جلائے سے معذوری ظاہر کر دی، شعلے سانپ کی زبانوں کی طرح ان کے جسم کو یوں مس کرتے جیسے شفیق کاٹے پائے نو مولود بچے کو نیاں سے چاٹ چاٹ کے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے عاجز آئے یہ اللہ سے باہر نکلے اور زار و قطار روتے لگے اب ان کے سامنے ہلاکت کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور اس پر چھلانگ لگا دی ہوئے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور یہ کسی ہلکے پھلکے پرند کی طرح آہستہ آہستہ نیچے سبزے پر آگرے ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی مجروح نہ ہوا تھا یہ اُلٹے اود آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”تو خود ہی یہ کہتا ہے کہ اسم ذات کے بجائے میں مسمیٰ کو تلاش کروں اور یہ ظاہر ہے کہ تو اپنی مرضی سے جب چاہتا ہے میری ذات میں حلول کر جاتا ہے لیکن اگر میں خود تجھ میں شامل ہونا چاہوں تو اس وقت تک شامل نہیں ہو سکتا جب تک میں اپنے مادی جسم سے رُخ جدا نہ کر دوں، میں مستقل وصال چاہتا ہوں مستقل اور دائمی اتصال۔“

یہ کہہ کر وہ زار و قطار روتے لگے اور کچھ دیر بعد پھر گویا ہوئے: ”اللہ! میں کتنا یایوس

ان ہوں کہ میں نے تجھ سے اتصال وصال دائمی کی خاطر خود کو دجلہ میں گرا دیا لیکن اس نے میری کوئی مدد نہ کی، میں نے خود کو درندوں کے حوالے کر دیا وہ مجھ سے گینزاں ہے میں نے اپنے تئیں آگ میں ڈال دیا، آگ نے اپنی فطرت بدل دی، میں نے خود کو پہاڑ کی بلندی سے گرا دیا، ہواؤں نے مجھے اپنی گود میں لے کر آہستگی سے سبزے پر لا ڈالا، آہ میں کتابے پس اور مجبور انسان ہوں میں تجھے کس طرح اور کہاں حاصل کروں؟ مستقل وصال اور دائمی اتصال کی خواہش کس طرح پوری کروں؟

ایک بار پھر وہی پرسراوازا سنائی دی۔ شبلی: جو بندہ مقبول الہی ہوتا ہے اسے کوئی عزت نہ پہنچا سکتا۔

شبلی پریشان دہر ماندہ جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا ”خدا کے لئے مجھے زنجیروں سے جکڑ دو، میں اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“

جنید بغدادی لمحوہ انہیں دیکھتے رہے پھر کہا: ”یہ تمہیں ہو گیا کیا ہے شبلی؟“
شبلی نے جواب دیا: ”صبر و انتظار کی راہ بہت کٹھن ہے مجھے زنجیروں سے جکڑ دو،
ورنہ میں بکھر جاؤں گا۔“

انہیں ان کی خواہش پر زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔

جنید بغدادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا: ”هَكَذَا طَلَبَ وَجَدَ“ جس نے طلب

کیا پایا۔

شبلی نے تردید کی ”نہیں جس نے پایا اُس نے طلب کیا۔“

جنید بغدادی نے نصیحت کی ”شبلی! تم میری ایک بات مانو۔“

شبلی ہانپ رہے تھے پوچھا: ”کون سی بات؟“

جنید بغدادی نے کہا: ”اگر تم اپنے امور خدا کے سپرد کر دو تو تمہیں سکون مل سکتا ہے۔“

شبلی غماختے ہوئے جواب دیا: ”تہیں! اب نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر خدا میرے

امور مجھ پر ہی چھوڑ دے تو مجھے سکون مل سکتا ہے۔“

جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا، بولے ”شبلی! تمہاری باتوں میں تلوار جیسی کاٹ

ہے اور اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔“

جب طبیعت اعتدال پر آگئی اور لوگوں سے پرسکون بہج میں باتیں کرنے کے قابل ہو گئے۔

تو ایک دن انہوں نے کسی تہن فروش کی آواز سنی جو باہر آواز لگا رہا تھا۔ ”بس ایک پیالہ بچلے ہے صرف ایک“
شبلی کی حالت پھر متغیر ہو گئی بمشکل قابو پا کے کہنے لگے ”یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے لوگو! آگاہ
ہو جاؤ بس ایک ہی باقی ہے وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا“

کسی کی میت میں شبلی کو بھی لے جایا گیا اور انہیں اس وقت بڑی مشکل پیش آئی جب ان سے
میت کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کہا گیا۔ شبلی نے انکار کیا۔ لیکن لوگ نہیں باز آئے اور شبلی کو نماز پڑھانی
ہی پڑی انہوں نے اس میں چار تکبیروں کے بجائے پانچ تکبیریں کہہ دیں نماز ختم ہونے کے بعد لوگوں نے
انہیں گھیر لیا اور پوچھا ”کیوں جناب! جب نماز جنازہ میں شریعت نے چار تکبیریں رکھی ہیں تو آپ نے پانچ
تکبیریں کیوں کہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”میں نے چار تکبیر مرنے والے کے لئے ادا کی تھیں اور ایک تکبیر دنیا
اور اہل دنیا کے لئے کہی تھی کیونکہ یہ بھی مر چکے“
لوگ اپنا سامنہ لے کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ایک بار آپ سخت بیمار پڑ گئے۔ اطباء نے انہیں گھیر لیا اور دوائیں تجویز کرنے کے بعد جب
والپس جانے لگے تو بعض چیزوں کے کھانے سے منع کیا۔ شبلی نے کہا ”مجھے معلوم نہیں کہ میں ان
چیزوں سے پرہیز کر بھی سکوں گا یا نہیں؟“

کس طبیب نے کہا۔ ”تمہیں معلوم کیوں نہیں جبکہ تم تمہیں ان کے کھانے سے منع کر رہے ہیں تو
تمہیں ان سے ضرور پرہیز کرنا چاہیئے“

شبلی نے مسکرا کر کہا ”بے وقوفو! جو رزق میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے ان کے کھانے
سے مجھے کون منع کر سکتا ہے اور جو رزق قسمت میں نہیں لکھا گیا وہ میں کس طرح کھا سکتا ہوں“
طبیب اپنا سامنہ لے کر واپس چلے گئے۔

شبلی کے زہد و نفیس کشی کا چرچا عام تھا لوگ شال میں ان کا نام لیتے انہیں جہاں کہیں
دیکھتے ان کا احترام کرتے لیکن یہ کسی بات کی پروا کئے بغیر اپنی دُصن میں مست رہتے۔ جنید بغدادی
کی مجلس میں مریدوں اور درویشوں کا ہجوم تھا جنید بغدادی توحید، صدق و شوق اور علو ہمتی پر وعظ فرما رہے
تھے اس وقت شبلی بھی شریک مجلس ہو گئے لوگوں نے انہیں دیکھا تو جذبہ احترام میں کسی درویش
نے کھڑے ہو کر عرض کیا ”حضرت! جس صدق و شوق اور علو ہمتی کا آپ ذکر فرما رہے اس میں شبلی مثالی
حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں ان کا کوئی مثال نہیں“

جنید بغدادی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا غیظ و غضب میں حکم دیا۔ ”درولش! تیرا یہ قول درست نہیں ہے تو غلط کہہ رہا ہے شبلی کی حقیقت مجھے معلوم ہے وہ مردود اور خدا سے بہت دور ہے وہ اس لائق بھی نہیں کہ میری مجلس میں جگہ دی جائے اسے اسی وقت میری مجلس سے نکال۔ باہر کر دو۔“ جنید بغدادی کے مریدوں نے تامل سے کام لیا۔ انہوں نے پھر حکم دیا۔ ”میں کہتا ہوں شبلی کو اسی وقت میری مجلس سے نکال دو۔“

چند مہینے اور شبلی کو دھکے دے کے مجلس سے نکال دیا۔ اس کے بعد جنید نے اس درویش کو مخا طب کیا جس نے شبلی کی تعریف کی تھی کہا۔ ”نوجوان! تو نے شبلی کے سامنے اس کی تعریف کر کے اسے ہلاک کر دینا چاہا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے تعریفی جملے شبلی کے حق میں تلوار تھے کیونکہ اگر ان کا اس پر معمولی سا اثر بھی ہو جاتا تو اس کے نفس کی سرکشی عود کر آتی اور اس کا قفا خرا و زکبر اسے ہلاک کر دیتا لیکن میرے مجلس سے دھکے دے کر نکلا دینے کا عمل اس کے حق میں ڈھال بن گیا اور وہ ہلاکت سے بچ گیا۔“

اسی زمانے میں حسین ابن منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا، شبلی نے عیش میں کہا ”میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا۔“ لیکن جب منصور کو شبلی کے ارادے کا علم ہوا تو کہا۔ ”شبلی کو یہ لازم پانے سرنہیں لینا چاہیے یہ کام دوسرے لوگ انجام دے لیں گے۔“ شبلی نے کہا ”ابن منصور کو ایسی باتیں علی الاعلان نہیں کرنا چاہئیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ایک دنیا کو فتنہ و فساد کے حوالے کر دیں؟“ لیکن جس دن ابن منصور کو قتل کیا گیا شبلی نے ابن منصور کے مقتل میں پوری رات عبادت میں گزار دی۔

شبلی فقہ مالکی کے پیرو تھے اور فقہ واجتہاد میں بھی بے مثل تھے لیکن ان کی دانشمندی اور عشق الہی میں دیوانگی نے انہیں دنیا کے ظاہری علوم سے بے نیاز کر دیا تھا۔
انتقال سے پہلے لوگوں سے کہا۔ ”مجھے وضو کرا دو۔“
ارادت مندوں نے انہیں وضو کرایا۔ آپ چند اشعار پڑھے۔

کَلَّ بَلَدٌ اَنْتَ سَاكِنُهُ	اَیْنِ مَحْتَا جِ اِیْنِ السَّوَا جِ
جس گھر میں تو قیام پذیر ہو جائے	اسے چراغ کی حاجت نہیں رہتی
بِحُكِّ الْمَاهُولِ مَحْبَتًا	یَوْمَ تَأْتِی الدَّائِسُ بِالْاَلْحِجِّ
تیرا جین چہرہ ہی میرے لیے محبت ہے	اُس دن کے لیے جب لوگ حجتیں پیش کریں گے

لوگوں کو ان کے انتقال فرمانے کا یقین ہو چکا تھا وہ عیادت کے بجائے نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے جمع ہونے لگے شبلی انہیں دیکھ کر تنہا دیے۔ بولے ”لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ زندہ کی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں!“

شبلی اس وقت بھی اللہ اللہ کر رہے تھے کسی نے کہا ”آپ لا الہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟“ شبلی نے بے چینی سے جواب دیا ”جب غیر موجود ہی نہیں تو میں نفی کس کی کروں؟“

لوگوں نے کہا ”یہ شریعت کا حکم ہے“

شبلی نے جواب دیا ”میرے کان سن رہے ہیں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں رشوت قبول نہیں کروں گا“

لیکن کسی ظاہر دار نے پھر اصرار کیا ”کلمہ پڑھیے۔“

شبلی نے ضبط و تحمل سے جواب دیا ”خوب مردہ زندہ کو نصیحت کر رہا ہے“

لوگوں نے خاموشی اختیار کی، کچھ دیر کسی نے پوچھا ”اب آپ کی کیسی حالت ہے؟“

شبلی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا ”ٹھیک ہوں دوست اپنے دوست سے مل گیا۔“

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد لوگوں نے آپ کو پھر مخاطب کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ سوال فرما چکے ہیں۔

انتقال کے ایک عرصے بعد ان کے ایک عقیدت مند نے شبلی کو خواب میں دیکھا، اس نے شبلی سے

پوچھا ”کیا قبر میں یحیرین آپ سے کچھ پوچھا تھا؟“

شبلی نے جواب دیا ”ہاں پوچھا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟“

عقیدت مند نے سوال کیا ”پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“

شبلی نے کہا ”میں نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس نے تمہیں اور دوسرے ملائک کو یہ حکم دیا

تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس وقت بھی میں آدم کی پشت میں موجود تمہیں سجدہ کرتے دیکھ رہا تھا اس

پر یحیرین نے آپس میں کہا ”اس شخص نے تو پوری اولاد آدم کی طرف سے جواب دے دیا، یہ کہا اور

والپس چلے گئے۔“

عقیدت مند نے ایک سوال کیا ”آپ نے بازار آخرت کو کیسا پایا؟“

شبلی نے جواب دیا ”نہایت پھیکا بے مزہ بے لطف اور بے کیف۔“

عقیدت مند نے حیرت سے کہا ”یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟“

شبلی نے کہا : ” میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، درست کہہ رہا ہوں، یہاں سوختہ جگہ اور شکستہ قلب آتے ہیں اور انہیں نادیدہ شے کا جلوہ دکھانے کے درست کر دیا جاتا ہے جو چیز ان کو ” لذت“ اور کیف بخشتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی، یعنی لذتِ آشنائی اور جب لذتِ آشنائی ہی میسر نہ ہو تو رونق، لطف اور کیف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جس دل میں داغِ آرزو پایا جاتا تھا وہ یہاں کہاں ہے؟
علامہ اقبال مرحوم نے اس کیفیت کی بابت یوں اظہار کیا تھا۔ ایک داغِ دلدل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لئے علامہ نے کہا تھا۔

جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی۔

اور دوسری جگہ لذتِ آشنائی کا اس طرح اظہار کیا تھا۔

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو محبت چیز ہے لذتِ آشنائی

یہ لذتِ آشنائی تھی جس نے ابن منصور کو زار پر چڑھوا دیا اور وہ ساری اذیتیں منہسی

خوشی جھیل گئے اور یہ بھی لذتِ آشنائی کا ایک کرشمہ تھا جس نے نہاوند کے حاکم کو درویشی اختیار

کرنے پر مجبور کر دیا اور اس راہ کی ساری ذلتیں اور رسوائیاں جھیلنے کے بعد بھی صبر و شکر اور

برداشت و تحمل کا پابند اور قانع رکھا۔ یہ بلند مرتبہ جسے ملنا تھا مل گیا ورنہ ہر مدعی کے واسطے دادرین

کہاں؟



حضرت ابوالقاسم نیشاپوریؒ

ابوالقاسمؒ کی خاموشی نے ان کے نیشاپوری ہم وطنوں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ آپ کی عزت کریں۔ نیشاپوریوں کو اس کا اعتراف تھا کہ ابوالقاسمؒ کی علمیت کا کوئی جواب نہیں وہ علم حدیث، تاریخ اور بعض دوسرے علوم پر اپنے عہد کے سب سے زیادہ لائق ان تھے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے فیض حاصل کرتے لیکن آپ ان سے کم سے کم باتیں کر کے رخصت کر دیتے۔ پھر لوگوں نے یہ تبدیلی محسوس کی کہ آپ مطالعہ میں تو مشغول رہتے ہی تھے مگر اپنے مطالعہ ترک کر دیا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور عبادت اور ریاضت نے ان پر معلوم نہیں کیا اثر کیا کہ انہوں نے بات چیت بالکل ترک کر دی پھر ایک دن انہوں نے اپنا سامان سفر اکٹھا کیا اور ایک قافلے کے ساتھ بغداد روانہ ہو گئے قافلہ آگے چلا گیا مگر آپ بغداد ہی میں رُک گئے۔ ان دنوں بغداد میں مشہور زمانہ صوفیائے کرام جمع تھے، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، حسین بن منصور حلاج اس طرح اور دوسرے نامی گرامی صوفیوں کے وجود سے بغداد اور اس کے گرد پیش کی فضا منور تھی۔ یہاں ابوالقاسم کو ابوبکر شبلی سے ارادت ہو گئی اور آپ اُن کی صحبت میں رہنے لگے۔ شبلی، ابن منصور حلاج کی طرح مست اور نڈر انسان تھے۔ ان کا اثر ابوالقاسمؒ میں بھی آگیا۔ انہیں دوسرے صوفی سمجھاتے کہ دنیا اُن کی صاف گوئی اور سچ کو برداشت نہیں کر سکے گی اس لئے وہ تصوف کی پرستار اور ناقابل فہم زبان استعمال کریں۔ پھر انہوں نے ابن منصور حلاج کا ہنر بھی اپنی آنکھ سے دیکھ لیا جو انا الحق، کانفرہ لگا کے دار پر چڑھ چکے تھے۔ لیکن آپ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا آپ جواب میں کہتے یہ ہمارے لئے موت کی کیا حقیقت ہے میں موت سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ میں جسم کو اپنے لئے قید خانہ سمجھتا ہوں اور آدمی جب تک قید میں رہتا ہے پریٹان اور اس رہتا ہے اس طرح میں بھی جب تک جسم کی قید میں ہوں اُس اس اور پریٹان ہی رہوں گا۔

شبلی نے لوگوں کو منع کیا کہ ابوالقاسم کو نصیحتیں مت کرو کیونکہ تم ان کے مقام اور مرتبہ سے لاعلم ہو، ان کے سامنے تمہاری حیثیت ویسی ہی ہے جیسی کسی عالم کے سامنے جاہلوں کی۔“

لوگوں نے آپ سے بولنا ترک کر دیا۔

ایک دن آپ نے کسی واعظ کی تقریر سنی جو آپ نے سامعین کو بتا رہا تھا کہ نیکیاں کرو، عبادت کرو کیونکہ اس کا اجر تمہیں اس دنیا میں ملے یا نہ ملے لیکن دوسری دنیا میں تم مالا مال کرو گے جاؤ گے۔ اور وہاں ایک ایک کے عوض ستر ستر پاؤ گے۔“

آپ نے واعظ کے پاس جا کے اسے ڈانٹ دیا، کہا۔ ”یہ تو انسانوں کو صحیح راہ دکھا رہا ہے یا انہیں تاجر بن رہا ہے؟“ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! تم اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ تم نیکیاں کرو۔ اور عبادت کرو، لیکن اپنے دل میں یہ خیال ہرگز نہ لاؤ کہ ان نیکیوں اور عبادت کے عوض تمہیں ایک ایک کی جگہ ستر ستر ملیں گی۔“

واعظ نے غصے میں کہا۔ ”تو کون ہے جو انسانوں کو گمراہ کرنے آگیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرا نام ابوالقاسم ہے اور میں نصر آباد خراسان کا رہنے والا ہوں یہاں ابو بکر شبلی کے مریدوں میں داخل ہو گیا ہوں۔“

واعظ نے کہا۔ ”تو میرا رشداً ابو بکر شبلی بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو ان کی پیروی چھوڑ دے اور اپنے ہوش و حواس میں رہ۔ ورنہ اللہ تجھے وہی سزا دے گا جو اس نے منصور حلاج کو دی ہے۔“

آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”خوب۔ تو تو مجھے اس اذیت سے ڈرا رہا ہے جس سے ابن منصور حلاج ہنستے کھیلتے گزر گیا، حالانکہ تجھے اپنی ان باتوں سے ڈرنا چاہئے کہ تو ان لوگوں کو جنت اور عروج کالالچ دے دے کہ خدا سے غافل کر رہا ہے اور میں نے کسی لالچی کو سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، نہ وہ اس دنیا میں خوش رہتے ہیں اور نہ اُس دنیا میں خوش رہیں گے۔“

واعظ کو غصہ آگیا۔ ”چھم سے کہا۔ تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ یہ ایک بے دین ہم میں گھس آیا ہے اُسے دھکے دے کر نکال دو۔“

مجمع میں سے چند طاقتور جو ش و خروش میں آپ کی طرف بڑھے۔ آپ نے ان

کے تیور ہی سے یہ اندازہ لگالیا کہ وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ان سے فرمایا۔ ۹۱۔

”اگر تم اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ نازیبا سلوک کرو، ورنہ مجھے اس فضول گوئی کرنے والے سے بچنے دو، اگر یہ سچا ہے اور میں جھوٹا ہوں تو اس حق کے داعی کو مجھ جھوٹے کے ساتھ زد و کوب میں پہل کرنی چاہیئے۔ تم اس کے آکر اکیسوں بن رہے ہو؟“

ان میں سے ایک نے کہا: ”تو جناب واعظ کو غلط میں خلل ڈالنے والا کون ہوتا ہے؟“
 آپ نے جواب دیا: ”جس خدانے اُسے لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے لئے پیدا کیا ہے، اس خدانے مجھ اس پر مامور کیا ہے کہ میں اس کی غلط بیانی پر اُسے ٹوکتا رہوں“
 واعظ نے چیخ کر کہا: ”یہ صوفی حضرات دین میں خلل ڈال رہے ہیں۔ اسے اس مجلس سے نکال دو“

لوگوں نے مشتعل ہو کر آپ کو پکڑ کر، مارنا بیٹیا شروع کر دیا اور کچھ نے آپ کو ہاتھوں پیروں سے پکڑ کر اٹھالیا اور باہر سڑک پر پھینک آئے۔ آپ نے آسمان کو رخ دیکھا اور خدا سے شکایت کیا کہ دیکھا تو خود بھی یہی چاہتا ہے کہ لوگ تیرے بجائے وراور قصور کی محبت میں مبتلا رہیں؟ آخر تو ان واعظوں کی زبان سے اترتے ہیں کیوں نہیں لیتا۔“
 آپ اپنے پیر و مرشد ابوبکر شبلی کے پاس گئے اور لوگوں کے اس سلوک کا ذکر کیا۔ ابوبکر شبلی نے جواب دیا: ”ابوالقاسم! یہ تو کوئی بات نہیں، یہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں جس سے ابنِ منصور گز رہا ہے، جاؤ، ان لوگوں میں واپس جاؤ جہاں ملامتوں کے سوا کچھ بھی نہیں، جب جھوٹا واعظ اپنے جھوٹ پر شرمندہ نہیں ہے تو تم اپنے حق پر کیوں شرمندگی محسوس کر رہے ہو؟“

ابوالقاسم اپنے پیر و مرشد کی جھڑکی سن کر باہر نکل گئے۔
 لوگوں میں آپ کی اس بات کا بڑا شہرہ ہو رہا تھا کہ آپ موقعِ مصلحت کے بغیر ہی صاف صاف بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
 لیکن اب آپ نے کسی کی پرواہ کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

جج کا زمانہ قریب تھا۔ لوگ قافلوں کی شکل میں مکہ معظمہ کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے ایسے ہی ایک قافلے میں آپ بھی شامل ہو گئے اور حج کے لئے چل پڑے۔ آپ راستے بھر خاموش رہے اگر کسی نے بولنے کی کوشش بھی کی تو آپ نے اس کی کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ یہاں ۹۲۰ھ تک کہ آپ خانہ کعبہ تک پہنچ گئے آپ نے خانہ کعبہ میں کچھ لوگوں کو مصروف گفتگو دیکھا۔ یہ

چند آدمی بھی حور و قصور اور جنت دوزخ کی باتوں میں الجھے ہوئے تھے ان میں ایک صاحب کہہ رہے تھے ۔ ایک حج کر رہا ہے اس طرح اب تک میرے تین حج ہو چکے ہیں اللہ نے چاہا اور زندگی رہی تو پتا نہ چلے اور ادا کروں گا اور پھر دیکھوں گا کہ خدا میرے گناہوں کو کس طرح نہیں معاف کرتا ۔

دوسرے نے کہا ۔ ” میں تو حج کے ساتھ ہی خدا کے نام پر دیتا دلاتا رہتا ہوں اور اس طرح میں نے اپنے اعمال میں اتنی نیکیاں اور اتنے ثواب درج کر لئے ہیں کہ اب مجھے دوزخ کا دھڑکا ہی نہیں رہا ۔ اب میں بڑے اطمینان سے مسکوں گا ۔“

تیسرے صاحب نے بڑے ذوق اور اعتماد سے کہا ۔ ” میں نے حرم کعبہ میں اب تک پچاس ہزار نوافل اور سو قرآن پڑھے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ خدا مجھے جنت میں کوئی اعلیٰ مقام ضرور دے گا اور جو میں میرے انتظار میں ہوں گی ۔“

چوتھے نے عرض کیا ۔ ” جناب آپ لوگ اپنی اپنی تو کہہ چکے میری بھی تو سنئے خدا گواہ ہے کہ جنت کے تصور میں ہر وہ کام کیا ہے جس سے میں حور و قصور کا مستحق ٹھہروں ۔ واہ کیا سکھئے ہوگی جنت بھی ، دودھ کی نہریں ، شہد کے حوض اور بے مثال جن رکھنے والی حویں کہ اگر ان کا ہماری عورتوں پر یہ تو سی پڑ جائے تو پوری دنیا دیوانی ہو جائے ۔“

آپ ان کی باتیں سنتے رہے اور جب ضبط نہیں کر سکے تو ان کو ڈانٹ دیا بولے دو لوگو! کچھ تو شرم کرو ، یہ حرم کعبہ ہے اور تم لوگ یہاں کاروباری باتیں کر رہے ہو ۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم یہاں سے اٹھ کر باہر چلے جاؤ اور یہ باتیں کہیں اور جا کر کرو ۔“

ان میں سے ایک نے کہا ۔ ” تو کون ہے ہماری باتوں میں مغل ہونے والا یہ خدا کا گھر ہے تیرے باپ کا گھر تو نہیں ۔“

آپ نے جواب دیا ۔ ” ارے خدا کے بندو! اگر یہ خدا کا گھر ہے تو یہاں خدا کی باتیں کرو ۔ یہ تجارتی منڈی تو نہیں ہے جو کاروباری باتیں کر رہے ہو ۔“

دوسرے نے کہا ۔ ” بیوقوف انسان! میں خدا کی اتنی عبادت کی ہے اور اتنے حج کئے ہیں کہ تو نے تو اتنی عبادت اور حج کا تصور بھی نہ کیا ہوگا ۔“

آپ نے جواب دیا ۔ ” تم لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہو بیشک میں نے تم لوگوں جتنی نہ تو عبادت کی ہے اور نہ ہی تمہارے جتنے حج کئے ہیں پھر بھی میں نے جو کچھ کیا ہے حور و قصور اور جنت دوزخ کے خیال سے نہیں کیا ۔ میں نے خدا کو خدا کے لئے یاد کیا ہے ۹۳

اور میں اس پر بالکل مطمئن ہوں۔“

چاروں نے مل کر کہا: ”اچھا اب تو یہاں سے چلا جا اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔“ آپ حرم کعبہ سے باہر آ گئے اور حرم کعبہ سے قریب ہی لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ اب آپ کے پاس بس یہی کام رہ گیا تھا کہ لکڑیوں کا ڈھیر لگاتے رہیں۔ لوگ اس فضول اور بے مقصد کام میں آپ کو مشغول دیکھتے تو ہنستے۔ ان چاروں نے بھی آپ کو لکڑیاں جمع کرتے دیکھا تو آپ میں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوب خوب تہقیر لگائے۔ ایک نے دوسروں سے کہا: ”ملاحظہ فرمایا آپ نے اس پاگل کو۔ یہ وہی ہے نا جو کل ہماری باتوں میں دخل دے رہا تھا۔“

دوسرے نے کہا: ”یہ ہاں یہ وہی ہے اور آج میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شخص پاگل ہے شاید اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔“ آپ نے جواب دیا: ”میرا دماغی توازن تو بالکل درست ہے لیکن تم لوگوں کا دماغی توازن الیہ درست نہیں ہے چونکہ تم لوگ دیوانے ہو اس لئے ہوش مند لوگ بھی دیوانے لگ رہے ہیں۔“

ایک نے کہا: ”اگر تم دیوانے نہیں ہو تو پھر یہ لکڑیاں کیوں جمع کر رہے ہو؟“ آپ نے جواب دیا: ”میں نے تم لوگوں کی باتیں سن سن کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں لکڑیاں جمع کر کے کعبہ کو نذر آتش کر دوں، کیوں کہ نہ یہ ہوگا اور نہ لوگ خدا کو اس کے ذریعہ یاد کریں گے، میں چاہتا ہوں، تم لوگ خدا کو خدا کے لئے یاد کرو۔ یہ کعبہ، حور و قصور۔ جنت و دوزخ۔ انہیں اس کی یاد میں شامل کر کے اپنی عبادت کو رائے گال کیوں کرتے ہو؟“ لوگ سنائے میں آ گئے اور آپ نے اپنے طرز عمل کی معافی مانگی۔

ایک دن آپ حرم کے اندر تھے کہ تند و تیز ہواؤں کے جھونکوں نے حرم کے پردوں کو اڑانا شروع کر دیا۔ آپ کو یہ منظر بہت ہی اچھا لگا۔ آپ بے خود و بے اختیار دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے پھر ایک دم اٹھ اڑے اور پردہ کچڑیا۔ بڑے جذبات میں بولے: ”وگفت اے رعنا عروس سرفراز درمیاں تو کہ بنشستہ بناز (اے پردے تو بنے جو یہ خود کو دُلہن کی طرح آراستہ کر رکھا ہے بتا کہ تیرے اندر کون صاحبِ ناز جلوہ فرما ہے) اس کے بعد آپ نے خدا سے شکایت کی۔

”و بارالہا! کیا تو نہیں جانتا کہ تیری مخلوق شدتِ پیاس اور گرمی کی وجہ سے بول کے پتوں کی طرح تباہ ہے۔ اے حرم اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ بیٹی فرمایا ہے تو سو

جج کے بعد آپ نیشاپور چلے گئے اور وہاں یاد الہی میں مشغول ہو گئے۔

آپ کی صاف گوئی کا یہاں بھی وہی حال تھا۔ نیشاپور والے بھی آپ کی باتیں برداشت نہیں کرسکے اور آپ کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ آپ لوگوں کو جمع کر کے ایسی باتیں کیا کرتے جو لوگوں کے لئے ذرا عجیب و غریب ہوتیں اور وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر کہتے۔ ”یہ ابوالقاسم! کچھ عجیب باتیں کرتے ہیں، اُن کی کچھ باتیں تو سمجھ میں آجاتی ہیں مگر اکثر باتیں نہیں سمجھ میں آتیں کیونکہ اُن کی باتیں دوسروں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔“

آپ دعوٰی فرماتے تھے۔ ”دو لوگو! بندہ دونیسوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک نسبت آدم ہے جس کا تعلق شہرت سے ہے اور یہ نسبت بشریہ ایسی ہے جو عشر میں منقطع ہو جائے گی اور دوسری نسبت، نسبت الہیہ ہے اور یہ حق تعالیٰ سے منسلک ہو جانے کی صورت میں ظاہر اور قائم ہوتی ہے اور اس نسبت سے انسان کو کشف و ولایت حاصل ہوتی ہے اس کا تعلق عبودیت سے ہے اور یہ نسبت کبھی بھی منقطع نہیں ہوتی کیونکہ جب باری تعالیٰ کسی بندے کی نسبت اپنی جانب مبذول اور منسوب کر لیتا ہے تو پھر بندے پر کسی قسم کا غم اور خوف باقی نہیں رہتا۔“

ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا ”آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، عموماً دعوٰی جس قسم کی باتیں کرتے ہیں آپ ویسی نہیں کرتے کیا ہم اس سے یہ سمجھیں کہ آپ اپنے نفس کو ابھی تک ادب نہیں سکھا سکے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں وہی باتیں کرتا ہوں، جو مجھے کرنا چاہئیں لیکن لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ انہیں نہیں کرنا چاہئے اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ لوگ اپنے نفس کو مؤدب نہ بناسکے اس کو واقف ادب نہیں کہا جاسکتا۔ لوگو! آدمی کو قلب کے آداب سے آشنا ہونا چاہئے اور جو نا آشنائے ادب قلب ہوا اسے واقف ادب کہنا جہالت ہے۔“

کسی نے پوچھا ”و ادب کی کوئی اور قسم؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں ادب کی ایک قسم اور ہوتی ہے اور وہ ہے ادبِ روح اور جو شخص روح کے ادب سے نا بلند ہوگا وہ کبھی قرب خداوندی نہیں حاصل کرسکتا۔ اس محفل و عظمٰی میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا، جو قص و سرود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اس پر آپ کے دعوٰی نے ایسا اثر کیا کہ اس کی حالت ہی غیر معینہ لگی، وہ ہنس مکھ

آپ کی مجلس سے اٹھا اور سیدھا اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی اندر اس کی ماں موجود تھی اس نے پوچھا ”کون ہے؟“

”اُسی شخص نے جواب دیا۔“ میں ہوں آپ کا بیٹا عارف؟“

ماں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ ماں نے اس کی حالت جو خیر دیکھی

تو گھبرا کے پوچھا ”بیٹے عارف! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”آج میں اتفاق سے ابوالقاسم نصر آبادی کے وعظ میں

پہنچ گیا تھا، اُس شخص نے بڑی دل سوزی سے ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرا دل ایک

بجیب سی آگ میں جلنے لگا اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا یہ

یہ آگ مجھے خاک تر کر کے رہے گی۔“

ماں نے بیٹے کو چارپائی پر لٹا دیا اور کہا۔ ”یہ تجھے ہو گیا ہے عارف؟ تو تو

گھر سے اچھا بھلا گیا تھا۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ہاں میں اچھا بھلا گیا تھا لیکن ابوالقاسم کی باتوں میں معلوم نہیں

کیا جادو تھا کہ میرا پورا جسم اور دل اس کی آگ میں سلگ رہا ہے جل رہا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! اپنے دل کو قابو میں رکھ۔ اللہ نے چاہا تو حالت جلد ہی

قابو میں آجائے گی۔“

بیٹے نے کہا۔ ”نہیں ماں، میں جانتا ہوں کہ اب نہیں ہوگا بلکہ مجھے اپنی موت سامنے

نظر آ رہی ہے اب میں نہیں بچوں گا، شاید جلد ہی مر جاؤں گا۔“

ماں بہت پریشان ہو گئی، گھبرا کے کہا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے عارف؟ میں کہتی ہوں

اپنے دل کو قابو میں رکھ اور اللہ کی رحمت پر نظر رکھ۔“

بیٹے نے افسوس سے کہا۔ ”ماں! آپ نے میرا نام عارف رکھا تھا، اور میں اب

یہ سوچتا ہوں کہ میں کیا عارف ہوں جو آج تک عرفان ذات سے محروم رہا۔ نہ تو مجھے آداب

نفس کا علم ہے نہ ہی آدابِ قلب سے اور نہ آدابِ روح کا شعور، تو اس کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ میں نے اب تک جیسی زندگی گزار دی ہے وہ سرتاپا جہالت اور عدم آگہی کی زندگی

تھی، میں نے ابوالقاسم کے وعظ سے کیا حاصل کیا؟ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اتنا علم ضرور

حاصل ہو گیا ہے کہ اگر مجھے کچھ بھی معلوم نہیں اور میں ایک جاہل اور بے شعور انسان ہوں تو

مجھے اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ میں سیج کو اپنا کر خود کو پاک صاف کروں ۛ

ماں کو شبہ ہوئے لگا کہ عارف پاگل ہو گیا ہے اُس نے کہا ”بیٹے! میں طیب کو بلواتی ہوں، تم آرام کرو، علاج سے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے ۛ

بیٹے نے بڑی مایوسی سے کہا ”ایسا نہیں ہوگا ماں میں چند ساعتوں بعد مر جاؤں گا، آپ میرا پہلے تین تو غسل کے حوالے کر دیجئے گا اور میری قبائ کو دے دیجئے گا، اور رہا میرا استاد تو اس کا مضراب میری آنکھ پر چلا کر دیجئے گا کیونکہ میں اپنے رب کے حضور جب حاضری دوں گا تو اس سے کہہ دوں گا کہ میں نے زندگی رقص و سرور میں گزاری ہے اور میرے اعمال نامے میں کرامات کا تین نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں جا بجا کوئی ضرورت نہیں میری آنکھ پر چسپاں مضراب اس بات کا پتہ ثبوت ہے کہ میں رقص و سرور کا آدمی ہوں ۛ

ماں بیٹے کو تسلیاں ہی دیتی رہی اور وہ چند ساعتوں بعد واقعی چل بسا، ماں نے بین کر کر کے پورے گھر کو سر اٹھالیا وہ اپنے بین میں کہتی رہی کہ میرے بیٹے کو ابوالقاسم کے وعظ نے کھالیا ۛ

جب اس کے بین کی خبر ابوالقاسم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا ”عارف کو اس کے عرفان نے ہلاک کیا ہے اور میری اس بات کی گواہی خود خدا دے گا ۛ

چنانچہ اسی رات ماں نے خواب میں دیکھا اس کا بیٹا عارف کہہ رہا تھا ”ماں! آپ نوح و بین کیوں کر رہی ہیں؟ کیا اس کام سے خدا اور خدا کے رسولؐ نے منع نہیں فرمایا ہے اور پھر عرفان ذات کا جو فائدہ میں اب یہاں اٹھا رہا ہوں اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں میں یہاں بہت خوش ہوں ۛ

حضرت کو کسی سلسلے میں بوزہ خریدنے کی ضرورت پیش آگئی لیکن آپ کے پاس رقم نہ تھی۔ آپ نے رقم کے سلسلے میں ایک مالدار بیوہ دی کا انتخاب کیا۔ آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور عرض کیا ”بھائی! مجھے چند درہم درکار ہیں، بوزہ خریدنا ہے عنایت فرمادیں شکر گزار ہوں گا ۛ

بیوہ دی نے جواب دیا ”تو چند درہموں کی بات کر رہا ہے میں ایک درہم نہیں دوں گا ۛ آپ نے کہا ”لیکن میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو میں یہ درہم بھی سے لوں گا ۛ بیوہ دی نے اپنے ملازم کو آواز دی ”وہ ارے، کوئی ہے؟“

یہودی کی آواز پر ایک قد آور ملازم اس کے سامنے اکھڑا ہوا - یہودی نے حکم دیا وہ اسے نکال باہر کر - چند درہم اس طرح مانگ رہا ہے جیسے یہ میرے پاس جمع کر گیا ہے ۔

ملازم نے آپ کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسی طرح کھینچتا ہوا باہر لے گیا - یہودی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دیر تک بیٹھتا رہا -

دوسرے دن صبح ہی صبح یہودی سود پر رقبہ تقسیم کر رہا تھا ، اس قطاریں آپ بھی بیٹھ گئے یہودی آپ کو دیکھ نہیں سکا - لوگوں میں درہم و دینار سود پر تقسیم کرتے ہوئے اس کی نظر اچانک آپ پر پڑ گئی ، وہ ایک دم مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا بولا - ارے تو پھر آگیا ؟

آپ نے جواب دیا - مجھے بوزہ خریدنے کے لئے چند درہم درکار ہیں اور یہ درہم میں بھی سے لوں گا ۔

یہودی نے کہا - ”جب میں دول کا تھی تو تو لے گا“

آپ لبزد ہے اور کہا - ”میں بھی دیکھوں گا کہ تو کب تک اپنی ”نہیں“ پر قائم رہتا ہے“

یہودی نے ایک بار پھر اپنے ملازم کو آواز دی - ”اے کوئی ہے ؟“

وہی گرنڈیل ملازم پھر حاضر ہو گیا ، یہودی نے حکم دیا اُس مسلمان صوفی کو

دھکے دے کر نکال دے ۔

لیکن اس ملازم پر آپ کی بزرگی اور عظمت کا اثر ہو چکا تھا ، اس نے جواب دیا -

”افسوس کہ میں ملازمت تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن اس بزرگ انسان کو دھکے دے کر نہیں

نکال سکتا ۔“

یہودی اس جواب کے لئے تیار نہیں تھا غصے میں کہا - ”میں نے تجھے ملازم

کس لئے رکھا ہے ؟“

ملازم نے جواب دیا - ”اس لئے ملازم نہیں رکھا ہے کہ میں شریف انسانوں کو دھکے

دے کر نکال باہر کیا کروں ۔“

یہودی نے عاجز آ کر پھر حکم دیا - ”کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ یہ شخص بُری

۹۸ طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور بار بار چند درہم مانگے جا رہا ہے - اسے آج تو نکال

ہی دے یہاں سے تیسری بار میں تجھے یہ حکم نہیں دوں گا “
 ملازم نے کہا ”تیسری بار حکم دینے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ میں تیرا یہ دوسرا
 حکم نہیں مانوں گا کیونکہ جب تو دوسروں کو قرض دے رہا ہے تو ان بزرگ کو دینے
 میں کیوں تاامل ہے؟“

یہودی نے بڑے بے بسی سے کہا ”یہ قرض حصہ چاہتا ہے جب کہ میں سود
 پر دیتا ہوں“

ملازم نے کہا ”جہاں تو سینکڑوں ہزاروں کو سود پر قرض دیتا ہے وہیں سے
 ان بزرگ کو بے سودی قرض کیوں نہیں دیتا“

یہودی نے غصے میں ملازم کو بھی ڈانٹ دیا ”و تو کون ہوتا ہے مجھے ہدایت
 دینے والا۔ میں ان کو کس شرط پر قرض دے رہا ہوں تو اس پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈال سکتا۔
 اگر تو میرا حکم نہیں مان سکتا تو ایسی وقت یہاں سے چلا جا“

ملازم نے کوئی جواب دے بغیر باہر کا رخ کیا اور ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔
 آپ نے یہودی سے کہا ”تو نے یہ کیا کیا؟“

یہودی نے لال پیلے ہو کر جواب دیا ”بس تو چلا جاتا ہوں سے، کیونکہ میرا یہ ملازم
 تیری ہی وجہ سے گیا ہے!“

آپ نے کہا ”مجھ سے پیچھا چھڑانا تیرے لئے بہت ہی آسان کام تھا جسے تو نے
 دشوار بنا رکھا ہے“

یہودی نے پوچھا ”وہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا ”میں بوزہ خریدنے کے لئے تجھ سے چند درہم چاہتا ہوں اگر
 تو یہ درہم مجھے دے دیتا تو میں تجھے اس طرح پریشان نہ کرتا“

یہودی نے کہا ”تو ہے بڑا فندی۔ قرض کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے جسے لوگ
 جبراً وصول کریں“

آپ نے بڑی نرمی سے کہا ”میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ میں مطلوبہ چند درہم تجھ سے جبراً
 وصول کروں گا“

”تب پھر جب میں نے ایک بار انکار کر دیا ہے تو پھر اس طرح مجھے بار بار تنگ کرنے“

سے کیا حاصل ہے؟

آپ نے جواب دیا۔ دیکھو بھائی! میں نے بھی تمہاری ہی طرح یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو میں یہ چند دسم بطور قرض تم ہی سے لوں گا اور میں تمہاری تاب نفس کو دیکھوں گا کہ یہ کب تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔

یہودی عاجز اچکا تھا۔ بولا اچھا، اس وقت تو تو چلا جا۔ میں ذرا اس پر غور کر لوں کہ اگر میں چند دسم تجھے بطور قرض دے دوں تو انھیں وصول کس طرح کروں گا؟

آپ نے پوچھا۔ تو کیا میں کل حاضر ہو جاؤں؟

یہودی نے جواب دیا۔ ”کل تو نہیں پرسوں آجا۔ اس وقت تک میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“

آپ نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم کیا فیصلہ کر کے مگر میں ایک بات واضح کر دوں

وہ یہ کہ میں تمہارے جواب کو نفی میں نہیں مننا چاہتا، میں یہ چند دسم لے کر ہی ٹلوں گا۔“

یہودی نے ٹالنے کے لئے کہا۔ ”اچھا اس وقت تو میرا بیچا چھوڑے، پرسوں دیکھا

جائے گا۔“

آپ اپنے گھر چلے گئے اور وعدے کے مطابق دو دن خاموش رہے اور تیسرے

دن پھر پہنچ گئے اس دوران یہودی نے ایک نئے آدمی کو رکھ لیا تھا اور اسے ہدایت کر دی

تھی کہ وہ ابوالقاسم کے سوا ہر ایک کو آنے دے چنانچہ اس نے آپ کو دیکھا تو دروازے

ہی پر روک دیا۔ بولا۔ ”جناب آپ کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے اس لئے میں اندر نہیں

جانے دوں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”کیون اس نے تو آج مجھے بلایا تھا اور میں اس سے ملے بغیر واپس

نہیں جاؤں گا۔“

ملازم نے کہا۔ ”لیکن افسوس کہ میں آپ کو اندر نہیں جانے دوں گا۔“

آپ نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ ”میں کب اصرار کر رہا ہوں کہ تو مجھے اندر جانے

دے میں یہیں دروازے پر بیٹھا جاتا ہوں، وہ جب باہر نکلے گا میں اس سے بات کر لوں گا۔“

ملازم نے آپ کو سر سے پیر تک بڑے نور سے دیکھا اُسے آپ پر حیرت تھی

کیونکہ اُس نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا تھا وہ آپ کے سامنے سے ہٹ گیا اور آپ

دروازے پر بیٹھ کر یہودی کا انتظار کرنے لگے۔

اندر یہودی کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں لکھتے تو بہت پریشان ہوا اور دل ہی دل میں آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ دوپہر ہو گئی مگر آپ نہیں اُٹے۔ یہودی اندر بند ہو کر رہ گیا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اُسے پیچھا چڑانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں چند درہم بطور قرض حسنہ دے دئے جائیں۔

سہ پہر کو وہ باہر نکلا اور آپ کو دیکھ کر کہنے لگا: ”ارے یتیم! تم کب آئے؟ میں تو صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا: ”میں تو صبح کا آیا ہوا ہوں، تمہارے ملازم نے ملنے ہی نہیں دیا۔“

یہودی نے پوچھا: ”تم کو کتنے درہم درکار ہیں؟“

آپ نے جواب دیا: ”دس درہم۔“

وہ اُن کی واپسی کی کیا صورت ہوگی؟

”میں انہیں جلد از جلد واپس کر دوں گا لیکن میں ان پر کوئی سود نہیں دوں گا۔“

یہودی نے کہا: ”کیا یہ رقم تم ایک ہفتے کے اندر واپس کر سکتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا: ”ایک ہفتہ تو بہت ہے ہو سکتا ہے میں ایک دن میں ہی

واپس کر دوں۔“

”ایک دن میں؟ یہ ایک دن میں تم کس طرح واپس کر دو گے؟“

”یہ میرا دوسرا ہے کہ میں ایک دن میں کس طرح واپس کروں گا لیکن اس

کا پورا پورا امکان موجود ہے کہ میں تمہارا قرض ایک ہی دن میں آتا کر دوں۔“

یہودی نے طنزاً کہا: ”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا قرض ایک ہی دن میں آتا کر دے گے

تو پھر مجھ سے قرض لینا ہی کیا ضروری ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”اے شخص! میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

یہودی نے کہا: ”اچھا میرے ساتھ اندر آؤ، میں تمہیں دس درہم دیتا ہوں

لیکن اس سلسلے میں تم کو مجھے ایک تحریر دینا ہوگی جس میں تم مجھ سے یہ وعدہ کر دو گے کہ

میں مہری رقم ایک ہفتے کے اندر واپس دے دوں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں تم سے دہم قرض لوں گا تو ادائیگی کے سلسلے میں وعدہ کرنے میں کیا حرج ہے؟“

یہودی آپ کو اندس لے گیا وہاں اس نے آپ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے آپ کو دس دہم سات دن میں واپس کر دینا تھے۔

جب آپ دس دہم لے چکے تو یہودی نے آپ سے پوچھا: ”اچھا اب آپ مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ یہ تو آپ کو خوب اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آپ کو میں دس دہم دینا نہیں چاہتا تھا۔“

اب یہودی کے لب و لہجے میں ادب اور احترام پیدا ہو گیا تھا، اس کے سوال پر آپ نے کہا: ”جو بات تو اس وقت کر رہا ہے اگر پہلے ہی کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

یہودی نے جواب دیا: ”میں پہلے ہی کیا کر لیتا؟“
 آپ نے کہا: ”یہی کہ تو مجھے ملنے کی کوشش تو کر کے گا لیکن میں ٹلنے والا نہیں، لے کر ہی ٹلنے والا انسان ہوں میں اور میری یہ عادت ملاحظہ کر لی تم نے؟“
 یہودی نے کہا: ”ہاں، مگر تم سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں میرا خیال ہے اس کا صحیح صحیح جواب دو گے؟“

”پوچھو۔ کیا بات ہے؟“ اس وقت آپ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو چکی تھی۔

یہودی نے پوچھا: ”جب میں نے تم سے بار بار انکار کیا تھا تو تم ضد کیوں کر رہے تھے؟ حالانکہ تم میرے انکار کرنے سے بہت ذلیل ہو رہے تھے، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ادھر کا دوبارہ سُخ ہی نہ کرتا۔“

آپ نے اپنا سر ہٹ لیا اور یہودی کے سامنے بیٹھ گئے، بولے: ”دیکھ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سن۔“

یہودی گوش برآواز ہو کر آپ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

آپ نے کہا: ”بات صرف اتنی سی ہے کہ میں ایک مدت سے خدا سے رو بگاڑے

ہوئے ہوں اور اس سے معلوم نہیں کیا کیا مانگتا رہتا ہوں جو کچھ میں نے مانگا تھا اس میں

کچھ مل گیا، کچھ نہیں ملا، مجھے جو نہیں ملا تھا، اسے دوبارہ مانگتے ہوئے میں شرمندگی اور ندامت سی محسوس کرنے لگا، ایک دن میں نے یہ سوچا کہ خدا سے مانگتے ہوئے میرا نفس شرم اور ندامت کیوں محسوس کر رہا ہے، میں نے اپنے نفس کی شیطانت کو کچلنے کے لئے یہ منہ توجیز کی تھی کہ کسی انسان کے آگے ہاتھ پھیلا کر نفس کو ذلیل و خوار کروں، چنانچہ تو نے میرے نفس کو جی بھر کے ذلیل و خوار کر لیا اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجھے تنگ نہیں کرے گا۔

یہودی حیرت سے آپ کی باتیں سن رہا، پھر پوچھا ”کیا یہ جو کچھ آپ نے کہا درست ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”میں تجھ سے بھوٹ کیوں بولوں گا۔ ذرا تو خود سوچ کر میں ٹھہرا درویش، میں بوزہ (جو کی شراب) خرید کر کیا کروں گا، میں شراب پی تو سکتا نہیں۔ اور رہے تیرے دس دہم تو یہ حاضر ہیں انہیں واپس لے لے، اب میں انہیں لے کر کیا کروں گا۔“

یہودی کو یہ حدافسوس ہوا، بولا ”ابوالقاسم! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو کئی بار بہت شرمندہ اور ذلیل کیا۔ میں آپ سے معافی کا طلبگار ہوں۔“

آپ نے جواب دیا ”معافی کی کوئی ضرورت نہیں بھائی۔ اگر فقر ان باتوں سے خوف زدہ ہو جایا کریں تو پھر یہ ملا رج اعلیٰ حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہیں تم مجھ سے معافی کیوں مانگو، معافی تو میں مانگ رہا ہوں اور میں تم سے اب ایک درخواست کروں گا۔“

یہودی نے کہا ”آپ مجھ سے درخواست نہ کیجئے، حکم دیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں اس کی کس طرح تعمیل کرتا ہوں۔“

آپ نے کہا ”تم نے میری وجہ سے ملازم کو نکال دیا تھا اسے دوبارہ لکھ لو۔“

”میں اسے کج ہی واپس بلا لوں گا، لیکن آپ کو بھی میرا ایک کام کرنا ہو گا۔“

آپ نے جواب دیا ”میں تمہارا ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔“

یہودی نے بجا جت سے عرض کیا ”میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، آج سے میں سودی کاروبار ختم کر رہا ہوں اور میرے پاس جو کچھ بھی ہے یہ حاجت مندوں کا ہے میں چاہتا ہوں کہ جو آگ آپ کے سینے میں جل رہی ہے وہی میرے دل میں بھی روشن ہو جائے۔“

آپ نے یہودی کو اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس کے حق میں دعا کی۔ اور اس دعا کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ نو مسلم یہودی نے اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دیا اور آپ کی خدمت میں رہنے لگا۔

آپ نے بار بار حج کئے۔ اور شوق کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں اگر حرم کعبہ میں موجود دیکھ کر تھتھے آپ کے وجدان میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس نے کچھ ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ آپ سے لوگ دُور دور رہنے لگے اس جذب و کیفیت میں آپ کبھی تشریف لے گئے وہاں گھنٹوں مودب کھڑے رہے اور جب باہر نکلے تو ایک جگہ اللہ روشن دیکھا۔ آپ اللہ کے پاس پہنچے اور کچھ دیر کھڑے اُسے دیکھتے رہے پھر حالت جذب اور وجد میں آگ کا طواف شروع کر دیا۔ لوگ حیرت زدہ آپ کی یہ حرکت دیکھتے رہے۔ آخر ایک شخص برداشت نہ کر سکا۔ اس نے پوچھا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس چیز کا طواف فرما رہے ہیں؟

آپ نے جواب دیا: ہاں، میں خوب جانتا ہوں میں تجلی الہی کا طواف کر رہا ہوں اس شخص نے کہا: حضرت! یہ تجلی الہی نہیں آگ ہے آپ ہوش میں تو آئیں۔

آپ نے جواب دیا: اے شخص! تو نہیں جانتا۔ میں نے خدا کو کبھی میں برسوں تلاش کیا، مگر نہ پاسکا۔ اب میں اس کی طلب اور جستجو میں کوچہ و بازار کی خاک پھان رہا ہوں اور جہاں اس کا پرتو نظر آجاتا ہے طواف شروع کر دیتا ہوں۔ اس آگ کو بھی تجلی الہی سمجھ کر میں یہاں آگیا ہوں کہ شاید وہ یہاں مل جائے۔ میں نے اپنے رب کی تلاش اور طلب میں اپنے ہوش و حواس گنوا دیے ہیں اس لئے میں نہیں جانتا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ درست ہے یا غلط۔

لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے شروع کر دیے اور آواز بلند کرنا شروع کر دی

”یہ گمراہ ہے، کفر کی باتیں کرتا ہے، بھگادو اسے“

آپ زخمی ہو کر وہاں سے ہٹ آئے آپ کے پیچھے پیچھے ایک بچی بھی بھاگتا ہوا آیا۔ اور اس نے آپ کو بڑی تسلی دی، بولا: ”رجاء! مجھے بہت افسوس ہے کہ لوگوں نے آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ میں آپ کا مرتبہ سمجھ گیا ہوں، آپ مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہا کروں“

آپ نے جواب دیا: ”میں اگر اجازت دے بھی دوں گا، تب بھی تو میری صحبت اور ہم نشینی سے بہت جلد عاجز آجائے گا“

عجی نے عرض کیا ”ممکن ہے آپ جو کچھ فرما رہے ہیں ددست ہو لیکن مجھے اپنی خدمت کا موقع ضرور دینی چاہیے“

آپ نے کہا ”اگر تو ساتھ رہنے پر مصر ہے تو میرے ساتھ رہ۔“
وہ عجی آپ کے ساتھ ہی رہنے لگا، سفر حضر ہر جگہ وہ آپ کا ہم نشین ہو گیا۔
آپ اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جبل رحمت پر پہنچ گئے وہاں آپ کے اُس عجی دوست نے کہا ”حضرت! آپ کی کوئی خواہش؟ آپ کی طبیعت کسی چیز کو چاہتی ہے؟“
آپ نے جواب دیا ”ہاں ایک چیز کے لئے میں بے تاب ہوں اگر مل جائے تو بہت خوب، ورنہ کوئی شکایت نہیں۔“

عجی دوست نے دریافت کیا ”تو فرمائیے کس چیز کی طرف آپ کی طبیعت راغب ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”ٹھنڈے پانی کی خواہش مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔“
عجی نے فوراً جواب دیا ”اس میں کون سی خاص بات ہے میں ٹھنڈے پانی کی تلاش میں جاتا ہوں اور یہ جہاں بھی ملے گا، آپ کے لئے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔“
عجی آپ کے جُدا ہو گیا، اور ادھر ادھر پانی کی تلاش میں پھر نے لگا، گرمی اپنے شباب پر تھی اُس نے آپ سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب وہ یہ موقع بہانہ تھا کہ اسے ٹھنڈا پانی ملے گا کہاں؟ اور ٹھنڈا پانی حاصل کئے بغیر اس کا آپ کے پاس جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ آنسو وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور نظریں ادھر ادھر پانی کی تلاش اور فکر میں بھٹک رہی تھیں۔ عجی اپنے دل میں پشیمان تھا کہ اُس نے ٹھنڈے پانی کا ناقص وعدہ کر لیا۔ جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا، اچانک دھوپ غائب ہونے لگی اور فضا بادلوں سے تیرہ و تارہ ہوتے لگی۔ عجی پناہ کی تلاش میں بھاگا ایک چٹان کے نیچے بیٹھ کر بارش کا انتظار کرنے لگا۔
کچھ دیر بعد بارش شروع ہو گئی اور پھر یہ بارش اولوں میں تبدیل ہو گئی عجی نے آنسوؤں میں اگلے بھرنا شروع کر دئے۔ اسے خوشی تھی کہ وہ ٹھنڈا پانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا جب بارش رُک گئی تو یہ اولوں سے بھرا ہوا پیالہ لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا، اسے حیرت تھی کہ جہاں آپ بیٹھے تھے وہاں بارش نہیں ہوئی تھی۔ عجی نے اولوں والا پیالہ

آپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”حضرت! خدا نے میری شرم رکھ لی۔ درنہ میں سوخت رہا تھا کہ میں نے وعدہ تو ٹھنڈے پانی کا کر لیا ہے مگر میں یہ لالوں کا کہاں سے؟“

آپ نے پوچھا: پھر ٹھنڈا پانی ملا کہاں سے؟

جی نے جواب دیا: ”اب میں کیا بناؤ، بس میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں اور یہ اولوں کی بارش بھی آپ ہی کی کرامت سے ظہور میں آئی ہے۔“

آپ نے کہا: ”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ اس کے بعد اپنے آپ سے کہا: ”تو نے ٹھنڈے پانی کی خواہش کی خدا نے تیرا خیال کیا اور ازلے برسا کر تیری خواہش پوری کر دی، لیکن میرا خیال ہے تو نے اپنے رب کے ساتھ گستاخی کی ہے اور تجھے تو کھولنا ہوا گرم پانی ملنا چاہیے تھا۔“

آپ نے کئی حج کر کے تھے اور لوگوں کو آپ پریشک آتا تھا کہ آپ کتنے خوش قسمت انسان ہیں جو اتنے سارے حج کر ڈالے ایک بار جو آپ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ایک کتے کو بھوک سے نڈھال کر کھڑتے کرتے دیکھا آپ کو اس پر بڑا رحم آیا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا، آپ نے کئی آدمیوں سے کتے کے لئے روٹیاں مانگیں، لیکن لوگ انکار کرتے رہے آپ نے پوچھا۔

”لوگو! کیا اس شہر میں ایک بھی ایسا فارغ البال شخص نہیں، جو اس کتے کا پیٹ بھر سکے؟“ کسی نے جواب دیا: ”اس شہر میں روٹیوں کی کوئی کمی نہیں لیکن کتے کے لئے روٹی نہیں ہے ہاں آپ کو اپنے لئے درکار ہو تو روٹی ہی روٹی۔“

آپ نے کہا: ”مجھے اپنے لئے نہیں اس کتے کے لئے روٹیاں درکار ہیں۔“ جواب ملا: ”افسوس کہ کتے کے لئے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔“

آپ نے اعلان کیا: ”میں نے اب تک جتنے بھی حج کئے ہیں ان کا ثواب میں اس شخص کو دیتے پر تیار ہوں جو اس کتے کا پیٹ بھر دے۔“

لوگوں نے آپ کا یہ اعلان بڑی حیرت سے سنا اور ایک شخص نے قریب آکر دریافت کیا: ”کیا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”بالکل سچ ہے۔“

اس شخص نے کہا: ”میں اس کتے کا پیٹ بھرنے کیلئے تیار ہوں تم اپنے تمام حقوں

کا ثواب میری نذر کر دو۔

آپ نے جواب دیا: ”تو اس کتے کا پیٹ بھرے میں ابھی وقت اپنے جھول کا ثواب تیری نذر کر دوں گا۔“

وہ شخص اپنے گھر سے بہت ساری روٹیاں لایا اور کتے کو کھلانے لگا۔ کتے میں توانائی آگئی اور وہ اچھلنے کودنے لگا۔ آپ کا چہرہ خوشی سے دھنکے لگا۔ آپ قبلہ ہو کر مسجد سے گئے اور گرگڑا کہ خدا سے التجا کی: ”یا اللہ العالمین! اس شخص نے میری درخواست پر بھوکے کتے کا پیٹ بھر دیا ہے میں اس کے عوض اپنے جملہ جھول کا ثواب اس شخص کو نذر کر رہا ہوں، تو میری دعا قبول فرما۔“

آپ کی اس بات کا بڑا چرچا ہوا، بہتوں نے آپ کا مذاق اڑایا اور کہا: ”ابوالقاسم بھی عجیب آدمی ہیں کہ ایک کتے کی خاطر اپنے جھول کا ثواب ایک گناہگار کو بخش دیا یہ بھی کوئی دانا ٹی کی بات ہوئی۔“

کسی بزرگ نے جب یہ واقعہ سنا تو آپ سے ملاقات کی اور کہا: ”ابوالقاسم یہ تم نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا: ”میں نے وہی کیا جو انسانیت کا تقاضا تھا۔“
بزرگ نے پوچھا: ”کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح تم نے کوئی بہت بڑا کاڑھ انجام دیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”میں نے جو کچھ کیا اس سے میری یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ یہ واقعہ مشہور ہو اور لوگوں کی چیمگیوں کا مرکز قرار پائے اور نہ ہی میں اسے کوئی کارنامہ خیال کرتا ہوں۔“

ان ہی بزرگ نے کہا: ”ابوالقاسم! جو غلطی تم نے کی ہے اس قسم کی ایک غلطی حضرت آدم بھی کر چکے ہیں۔“

آپ نے پوچھا: ”آدم نے کیا غلطی کی تھی؟“

بزرگ نے جواب دیا: ”آدم نے گیتوں کے عوض اپنی جنت فروخت کر دی تھی۔“
آپ نے کہا: ”آدم نے جنت فروخت کر کے شرمندگی اور ندامت محسوس کی تھی اور ایک مدت تک توبہ استغفار کرتے رہے تھے لیکن میں نے کچھ کیا ہے اس پر شرمندہ۔“

یا نادم نہیں ہوں اس لئے میں توبہ استغفار بھی نہیں کروں گا۔

آپ کے خلاف شہر بھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں نے آپ کو شہر بدر کر دیا ان بزرگ نے کہا یہ ابوالقاسم کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو آدم کے ساتھ ہوا تھا، آدم کو خدا نے ان کی غلطی پر جنت سے نکال دیا تھا، ابوالقاسم کو ان کی غلطی پر لوگوں نے شہر بدر کر دیا آپ نے کہا ”میں خوش ہوں کہ مجھے انسانوں نے شہر بدر کیا ہے خدا نے نہیں، اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔“

مدینے میں جنت البقیع کے سامنے ایک واعظ کھڑا ہوا تھا۔ ”حضور نے فرمایا تھا کہ اس دنیا میں چند ایسے قبرستان بھی ہیں جن کے چاروں گوشوں پر فرشتوں کے کاندھوں پر سوتے ہیں چنانچہ ان میں جو لوگ دفن کئے جائیں گے فرشتے انہیں جنت میں پہنچا دیں گے۔“

آپ نے جنت البقیع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اے شخص! یہ جنت البقیع انہی میں سے ایک ہے۔ سامعین ٹھٹھکی کر آپ کی طرف دیکھنے لگے واعظ نے تائید کی ”ہاں ان میں جنت البقیع کا نام سرفہرست ہے۔“

کئی دن بعد آپ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں ایک قبر دیکھی جو کئی دن کی کھدائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور میت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گورکنوں سے پوچھا۔ ”وہ میت کہاں ہے جن کے لئے یہ قبر کھودی گئی ہے؟“

کسی گورکن نے جواب دیا ”اسے مشہور صوفی ابو عثمان نے اپنے لئے کھدوایا ہے اور ہدایت کی کہ انہیں مرنے کے بعد اس میں دفن کیا جائے۔“

آپ نے مٹی اٹھا کر سونگھی اور کہا ”مجھے اس مٹی سے بوٹے رفاقت اُتر رہی ہے اس لئے اس میں ابو عثمان کے دفن ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ میری جگہ ہے میری آخری آرام گاہ۔“

آپ توبہ کبہ کر وہاں سے چلے آئے آپ کی یہ باتیں کسی نے ابو عثمان تک پہنچا دیں، وہ ابوالقاسم کے پاس بھاگے ہوئے آئے اور پوچھا ”کیوں ابوالقاسم! کیا تم نے گورکنوں سے اس قسم کی باتیں کی ہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”ہاں میں نے یہ باتیں کی تھیں۔“

ابو عثمان نے کہا: لیکن وہ میری جگہ ہے اور وہاں میں دفن ہوں گا۔

آپ نے جواب دیا: ”ابو عثمان! الفوس کہ تم اس سختی سے واقف نہیں ہو کہ اگر جنت البقیع میں کوئی ایسا شخص دفن ہونا بھی چاہتا ہے جو اس کا سختی نہیں ہوتا تو جنت البقیع کے فرشتے اسے وہاں سے نکال پھینکتے ہیں۔“

ابو عثمان نے کہا: ”ابو القاسم! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔“
آپ نے کہا: ”ابو عثمان! رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جنت البقیع کے مردے ہوا میں پرواز کر رہے ہیں، میں نے کسی سے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ جو شخص اس جگہ دفن ہونے کا اہل نہیں ہوتا اس کو اگر یہاں دفن کر بھی دیا جاتا ہے تو فرشتے اسے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔“

ابو عثمان مہم گئے، پوچھا: ”تو کیا میں جنت البقیع کا سختی نہیں ہوں؟“
ابو القاسم نے جواب دیا: ”ابو عثمان! تمہاری آخری آرام گاہ نیشاپور کے قریب حیر نامی جگہ ہے اور میں جنت البقیع میں دفن کیا جاؤں گا۔“

ابو عثمان خاموش ہو گئے۔ اُن ہی دنوں نیشاپور میں استاد اسختی ایک مخصوص نشست میں موت کی دشواری اور سختی کا حال بیان کر رہے تھے آپ نے کسی سے یہ سنی تو کہا: ”استاد اسحاق سے جا کر کہہ دو کہ موت کے بجائے محبت کی باتیں کیا کریں۔“
استاد اسحاق نے جواب میں کہہ لایا: ”ابو القاسم! موت کی سختی اور دشواری محبت کی سختی اور دشواری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور اس کا تم اپنے آخری لمحوں میں تجربہ بھی کر لو گے۔“

آپ مستقلاً مدینہ ہی میں قیام فرما ہو گئے۔ ایک دن آپ نے خلوت میں سنا، کوئی غیبی آواز کہہ رہی تھی: ”ابو القاسم! تو بہت زیادہ باتیں کرنے لگا ہے تم تجھ پر اس کا عذاب نازل کریں گے۔“

آپ نے جواب دیا: ”اگر میں غلط باتیں کرتا ہوں تو مجھ پر اس کا عذاب ضرور نازل ہونا چاہیئے لیکن اگر میں اپنی باتوں میں سچا ہوں تو میں انہیں جاری رکھوں گا اور میں جو کچھ کہتا ہوں سچ سمجھ کر ہی کہتا ہوں۔“

آپ کو جواب ملا: ”ہمیں تیری یہ بات پسند آئی اس لئے تجھ پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔“

ایک دن اپنے دیکھا، ایک جگہ انسانوں کا ہجوم ہے اور اس ہجوم میں کسی شخص کی پٹائی لگا رہی ہے آپ صدمت حال سمجھنے کے لئے اس ہجوم میں تشریف لے گئے دیکھا لوگ ابو عثمان کو مار رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ خواہ مخواہ ابو عثمان کو کیوں مار رہے ہو؟

لوگوں نے جواب دیا۔ ابو عثمان کی باتیں ہمارے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اس لئے ہم انہیں نہیں معاف کریں گے۔“

مجمع میں سے کسی نے کہا۔ ”ابو عثمان کو مارنے کے بجائے انہیں مدینے سے نکال دو، یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم لوگ ابو عثمان کو مار مار کر ہلاک کر دو۔“

لوگوں نے یہ مشورہ مان لیا اور ابو عثمان کو اسی وقت مدینے سے نکال دیا ابو القاسم نے ابو عثمان سے ملاقات کی اور پوچھا در ابو عثمان! اب تم کہاں جاؤ گے؟ ابو عثمان نے جواب دیا در ابو القاسم! میں نیشاپور جا رہا ہوں اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں گزار دوں گا۔“

اپنے انہیں خدا حافظ کہا۔ ابو عثمان نے کہا۔ ”ابو القاسم! اب میں شاید مدینے والی نہیں آسکوں گا اس لئے جنت البقیع کی قبر، جو میں نے اپنے لئے کھدائی تھی۔ اسے تم اپنے لئے وقف کر لو۔“

ابو عثمان نیشاپور چلے گئے۔

ابو القاسم نے چند آدمیوں کو آپس میں اس طرح باتیں کرتے دیکھا کہ ان کے درمیان چند عودتیں بھی تھیں اور یہ لوگ دعویٰ کر رہے تھے کہ ان پر عورتوں کی قربت اور صحبت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے انہیں ڈانٹا در لوگو! تم یہ کیسا دعویٰ کر رہے ہو؟ کی تم میں نفس موجود نہیں ہے جو اس قسم کا دعویٰ کر رہے ہو؟ ان لوگوں نے آپ کا مذاق اڑایا، بولے۔ ”ہمیں اپنے آپ پر اعتماد ہے تبھی تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“

آپ نے لوگوں سے کہا۔ ”میں نے جیسا کہ تم سے کہا کہ جب تک تم میں نفس موجود ہے اس قسم کی باتیں مت کرو۔ اور نفس کی موجودگی میں امرئناہی سے کسی کو بھی بری الذمہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ پھر عورتوں سے کہا۔ تم خود بھی گمراہی میں پڑو گی ان مردوں

کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کر دی ۛ مرد اور عورتیں آپ کا تین کر شرمندہ ہو کر الگ ہو گئے
 آپ کا آخری وقت آیا تو جنت البقیع کے قریب ہی پہنچے گئے۔ نیشاپور سے
 جو لوگ آتے تھے آپ ان سے ان کا حال پوچھتے رہتے تھے آپ نے انہی میں سے کسی سے
 پوچھا ۛ آج کل ابو عثمان وہاں کیا کر رہے ہیں ؟

اس شخص نے جواب دیا ۛ ان کا انتقال بھی ہو گیا ۛ
 آپ نے دریافت کیا کیا ۛ ان کا انتقال کہاں ہوا اور وہ کہاں دفن ہوئے ؟
 جواب ملا ۛ انتقال نیشاپور میں ہوا اور دفن حیرہ میں ہوئے ۛ
 آپ نے آہستہ سے کہا ۛ خدا ابو عثمان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ مجھے
 ان کی آخری آرام گاہ کا علم تھا ۛ

آخری لمحوں میں موت کی سختی اور شدت نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ آپ کے
 اس پاس ارادت مندوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے ان میں سے ایک نیشاپوری سے کہا ۛ اے
 شخص ! جب تم نیشاپور جانا تو اس تاج و اسحاق سے کہہ دینا کہ وہ موت کی سختی اور شدت
 کا ذکر کیا کرتے تھے وہ درست تھا، اب میں اس کی گواہی دے رہا ہوں ۛ
 انتقال کے بعد آپ کو جنت البقیع کی اس قبر میں دفن کیا گیا جسے ابو عثمان نے
 اپنے لئے کھدایا تھا۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

طبقات الکبریٰ ، سکنۃ الاولیاء ، تذکرۃ الاولیاء ، خزینۃ الاصفیاء ، انوار الاولیاء ، انوار اصفیاء
 علاء شعلانی شہزادہ دارکھو ، شیخ فرید الدین عطار ، مفتی غلام مرتضیٰ ، رئیس احمد جعفری ،

حضرت عبداللہ خفیفؒ

لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شیراز کے شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہؒ تکلفات اور تعیشتات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نفکشی اور چلوں میں مشغول رہتا ہے۔ ٹاٹ کا لباس زیب تن کئے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے: ”عبداللہؒ! یہ تمہاری کیا سوجھی ہے؟ اللہ نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفران نعمت نہیں ہے؟“

عبداللہؒ نے جواب دیا: ”کفران نعمت یہ نہیں ہے کہ میں نے اپنے جسم کو دیبا و حریر اور زرد کارلباسوں سے محروم رکھا ہے بلکہ کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضا جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکرگزاری سے محروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور آخری نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔“

انہوں نے اپنے کاموں کے لئے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم گن کر سات منفقہ دے دیا کرے ایک غرصے تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نیم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف و نقاہت کا خیال تک نکال دیا تھا۔ نصف رات گزری تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ و فزاری میں مشغول

تھے لیکن آج روز جیسی لذت اور کیفیت سے محروم تھے وہ جب بھی اپنی زبان سے ”اللہ“ کہتے تو دل میں وہ چمک اور لذت پیدا نہیں ہوتی، جو ہمیشہ کا خاصہ تھا ان کا دل سوز

درونی سے محروم ہو چکا تھا۔ عبداللہؒ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو گویا متاع حیات ہی چھن چکی تھی اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں بلکہ اس میں مشغول تھا کہ اس سقم کا پتہ

چلایا جائے جس نے ان کی لذت و کیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آکھڑا ہوا ادب سے عرض کیا ”خلاف معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور غورزدہ ہے اس ناچیز سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوگئی؟“

آپ نے دریافت کیا ”میں تجھ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تجھوٹ نہیں بولے گا۔“

خادم نے عرض کیا ”یہ میری مجال کر میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ کے مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔“

آپ نے کہا ”آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی سی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منقہ دیئے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی؟ کوئی تغیر؟“

خادم سناٹے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپ کی صورت دیکھنے لگا، بولا ”میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے اور ضعف و نقاہت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا لصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتدبہ اضافہ حضور کی کمزوری اور نقاہت پر غالب آجائے گا۔“

آپ نے غصے میں پوچھا ”تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منقہ دیئے تھے؟“

خادم نے جواب دیا ”آٹھ منقہ۔ آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔“

آپ کو رونا آگیا، گلہ گرفتہ آواز میں بولے ”ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منقہ نے میرے جسم میں کیا فتور کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل و دماغ سو جانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہِ نیم شبی کی لذت اور کیفیت چھین گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان۔“

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپ بھی بڑی دیر تک سر جھکاٹے کچھ سوچتے رہے
آخر فرمایا: اب جا، آرام کر۔ میں تجھ سے صبح بات کروں گا۔ لیکن صبح مجھ سے
یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کروں گا۔ تو مجھے جسمانی اذیت پہنچاتا تو میں تجھے
معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کمائی چھین لی، میرا سوز چھین لیا
میری آہ کی لذت لوٹ لی، پھر میں تجھے کس طرح معاف کروں گا؟
خادم نے لجاجت سے عرض کیا: میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے
میشن نظر کیا تھا۔

آپ نے جواب دیا: وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ
نہیں رکھنا ہے تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان
پہنچ گیا۔ کل ایسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے
میں بالکل ہی تباہ و برباد ہو گیا تو کیا ہو گا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا۔
خادم غور فرما رہا تھا۔ اس نے ہٹ گیا اور آپ پوری قوت ارادی سے
خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کسی لمحے سوز
درونی کی شمعیں جھلکتی تھیں اور پھر بجھ جاتی۔ وہ رننے لگے۔ انہوں نے بارگاہ
ایزدی میں عرض کیا: اے اللہ العالیین! ایک منٹ کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی
لذت آہ نیم شبی ہی سے محروم ہو جاؤں۔ اپنے حبیب کے صدقے میں اس غلطی کو
کو نظر انداز فرما۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔

صبح آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ آپ نے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا
آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپ کو خفیف کہنے لگے۔

تو کل اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے
ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں
سے اتنی بے تعلقی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پرواہ نہ
کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے
ہوئے۔ قافلے والوں کی اتباع، پیروی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ
کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہوئے
۱۴۴ بھوک لگتی تو چند منٹ کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر

پاس بچھا لیتے۔

دوران سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا۔
پراس آپ کو تنگ کرنے لگی آپ چشمے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے
آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکاٹے کھڑے دیکھا۔ اس کے
کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل
پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے پٹاٹ کھڑا ہوا۔ آپ نے
اگے بڑھ کر جو دیکھا تو شب میں ایک چشمہ رواں تھا پانی کی سطح اتنی باند تھی کہ ڈول رستی
کی ضرورت ہی نہ تھی اگر سطح نیچی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بچھا سکتا آپ نے دونوں ہاتھوں
کو چلو بنا کے پلٹا چا لیا لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف
لے جاتے تھے پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے
بل کا نی جھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے
آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی
طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ”میرے مولا! یہ کیا اسرار ہے کہ اسی چشمے سے ہرن نے
بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اونچی تھی لیکن جب میں پانی پینا چاہا تو اس کی سطح
حیرت انگیز طور پر نیچی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟ خفا ہے؟“
یہ خاموش ہو کر رونے لگے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے
تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے ”اے اللہ! میں اپنی گمراہی کا جواب چاہتا ہوں
مجھے صرف یہ بتانے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟“
انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا ”عبداللہ! ہرن کے
پاس ڈول رستی نہیں تھی اس لئے اس کے لئے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے
ڈول رستی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گمراہی کیوں کر رہا ہے؟ رستی میں
ڈول پھنسا اور بھر لے پانی، ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟“
آپ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رستی پھینک کر آگے روانہ ہو گئے
بولے ”میں پیاسا رہ لوں گا لیکن اب ڈول رستی کا سہارا نہ لوں گا“
ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی ”عبداللہ! کہاں جاتے ہو؟
کیا ناراض ہو گئے؟“

عبداللہ رزگے ہوئے ”اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے“

آواز آئی ”پھر تو پانی پئے بغیر ہی کیوں چل پڑا۔ جیکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے“

عبداللہ نے کہا ”مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ میں یہ پانی ہرگز نہ پیوں“

جواب ملا ”نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ دراصل اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا۔ آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور رستے جلتے تھے جب خوب شکم سیر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپ حج وغیرہ سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب سے بڑے صوفی جنید بغدادی سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا واقعہ دہرایا۔ جنید نے جواب دیا ”عبداللہ! اگر تم ذرا سا صبر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں بہنے لگتا“

آپ خاموش ہو گئے، کچھ دیر بعد فرمایا ”جنید! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آ جاتا آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا“

کچھ دن بغداد رہنے کے بعد آپ کو کبھی بتایا ”عبداللہ! تم کیا مراقبہ کرو گے میں نے مصر میں ایک نوجوان کو کچھ ایسا مراقبہ میں دیکھا کہ حیران رہ گیا اسے اپنے اس پاس کی کوئی خبر بھی نہیں“

آپ نے تڑپ کر پوچھا ”کیا تو مجھے اس شخص کا پتہ بتا سکتے ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا ”کیوں نہیں“

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتہ بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر

۱۱۴ روانہ ہو گئے کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیوں جھیل کر جب آپ مصر میں اس

نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع و خشوع، انہماک اور مراقبہ میں کوئی فرق نہیں آ رہا، عبداللہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور باواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔

عبداللہ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار پھر کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار بھی سلام کیا اور ساتھ ہی کہا ”اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ کس کام کا؟ کہ میں تو سنت رسول ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا ہے۔“

نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا: ”اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیئے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے ثمرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بے کار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔“

اتنا کہہ کر اس نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبہ میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت بُرا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھے گئے اور کہنے لگے ”اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نمازیں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔“

آپ اطمینان سے اس کے پاس بیٹھ گئے ظہر سے ذرا پہلے یہ شخص مراقبہ سے بیدار ہوا اور آہستہ سے کہا ”اے خفیف! آؤ ہم دونوں ظہر کی نماز پڑھ لیں۔“

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ

نے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ”میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش ۱۱۵

پوری کی اور، دو نمازیں میسر ساتھ ادا کیں، اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے،
نوجوان نے پوچھا: ”کون سی خواہش؟“

اپنے جواب دیا: ”میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے“
نوجوان نے کہا: ”مذخیف! جو شخص خود ہی گرفتار بلا ہو، اس کی زبان اس
لذت کہاں کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگا رہا ہوں
ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔“

عبداللہ نے کہا: ”اے شخص! میں کوئی نصیحت سے بغیر واپس نہ جاؤں گا
نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا: ”مذخیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک
ہی نصیحت کروں گا، وہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی
یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تلقین نہ کرتے ہوں بلکہ صریح
معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنادیں۔“

آپ اس نصیحت پر زار و قطار روئے اور کہا: ”آہ میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے
عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود ابھی اس راہ کا ایک ادنیٰ ساما فر ہوں۔
اپنے واپسی میں ایک جنگل سے گزرتے ہوئے ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے
اُس پاس آہستہ آہستہ لوگ آکر جمع ہوئے تھے آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور
پوچھا: ”یہ کس شخص کی لاش ہے؟“

کسی نے جواب دیا: ”یہ ہمارا رہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد
میں گزار دی۔“

آپ نے دریافت کیا: ”اب اس لاش کا تم کیا کر گئے؟“

جواب ملا: ”اس رہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر
عمل کرنے جا رہے ہیں۔“

آپ نے تعجب سے پوچھا: ”اس نے کیا وصیت کی تھی؟“

جواب دیا گیا: ”اس نے کہا تھا کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے
جلا دیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سُرنے
کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔“

آپ نے کہا : لیکن اس عمل کا فائدہ ؟
 کسی نے جواب دیا : اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کور
 چشم بننا ہو جائیں گے ۔

آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا ۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے
 لگے لوگوں نے واقعی راہب کی راگھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کر لیا ۔ آپ ان کی خوش عقیدگی
 پر افسوس کرتے رہے ۔ آپ نے پوچھا : کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راگھ سے خراب
 آنکھیں درست اور نابینا بننا ہو جائیں گے ؟

ایک کڑمسیحی نے طنزاً کہا : وہ تم مسلمان ہو اس لئے تمہیں ہماری باتوں پر یقین
 نہیں آ رہا ۔ لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کر ادوں ؟
 وہ مسیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیئے اس کے بعد
 اس نے پستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا ۔ جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان
 کی بینائی رخصت ہو چکی تھی ، بمشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے ان میں تین کی تو آنکھیں
 خراب تھیں اور ایک اندھا تھا ۔

اس مسیحی نے ان چاروں کو عبداللہ کے سامنے کھڑا کر دیا ۔ کہا : حضرت !
 ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمائیں ۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ہے ۔
 اب میں اس راگھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں ۔
 آپ دم بخود حیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے ۔

اس مسیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راگھ کی سلامیاں بھیریں ۔ اور
 انہیں ایک تاریک کمرے میں لے جا کر چھوڑ دیا بولا : ” جب تک میں بلاؤں نہ تم تنہا اندر ہی
 رہو گے ۔ ”

یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے ۔ آخریں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راگھ کی
 سلامیاں بھیر کر انہیں پی سے باز دھ دیا اور کہا : ” تم یوں ہی بیٹھے رہو یہ پی میں خود ہی کھولوں گا ۔ ”
 عبداللہ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے ۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں
 ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا ۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں
 گزارا ۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی

کو رات کی چادر نے پلیٹ کر ان فی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس رات آسمان پر بارہویں
 کچاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کمزور کر چکے تھے۔ مسیحی
 عبداللہ سے بتاتے کہ تیرے اپنے جگہ سے اٹھا اور کہا: ”شاید اب وقت آگیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ
 کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھا دوں“

آپ نے پوچھا: ”کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی؟“
 مسیحی نے کہا: ”جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ

کہیں“

آپ نے آہستہ سے کہا: ”اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا تو میں معذرت

خواہ ہوں“

مسیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر
 رکھی تھیں مسیحی نے ایک شخص کو عبداللہ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا: ”اے شخص!
 آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور ہمیں بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں؟“
 اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں
 پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی سے چیخ اٹھا: ”آہ! اب میں بالکل ٹھیک ہوں میری آنکھیں
 بالکل درست ہو چکی ہیں“

آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس شخص نے کہا: ”اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے
 وہ درست ہے یا اپنے مذہب اور عقائد کی طرف زاری میں ایسی بات کر رہا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا: ”میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کر رہا ہے
 لیکن میں اب مسیحی کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں،
 تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر۔“

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوائی گئیں اور ان دونوں نے
 بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کر چکا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں بھی درست ہو چکی تھیں۔

آپ نے اس مسیحی سے کہا: ”بھائی! میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر
 یقین نہیں آ رہا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راکھ دو اکا کام دے،“

مسیحی نے جواب دیا: ”اے مسلمان درویش! مردے کی راکھ کہہ کر ہمارے مقدس

بزرگ کا بے حرمتی نہ کیجئے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی راکھ میں یہ اثر نہ ہوتا۔
 آپ نے کہا: ”اب اس نابینا کی پٹی تو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا بینا ہو چکا ہوگا۔“
 ”بے شک، مسیحی نے جواب دیا۔“ مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے۔
 اس کے بعد وہ مسیحی اس نابینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔
 ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا: ”اے شخص! اپنی آنکھ کے گوشے سے
 دنیا دیکھنے کی کوشش کر۔ کیا تجھے کچھ نظر آیا؟“

اس شخص نے جواب دیا: ”ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا
 جھنڈ دیکھ رہا ہوں۔ یا پھر ایسا ہے کہ میں کمر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔“
 مسیحی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا ”اور اب؟“
 ”بادل بدستور موجود ہے، کمر آلود فضا۔“

اس کے بعد مسیحی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نابینا کی بینائی واپس آچکی تھی۔ بعد ازاں
 حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد عجوق کے
 لئے آتما مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔
 رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول کو دیکھا، آپ نے فرمایا: ”اے خفیف تم الجھنوں
 کا شکار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راکھ نے تمہیں آتما پریشاں کیوں کر دیا ہے؟ ان
 باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں
 میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے اگر دین حق والے بھی صدق ریاضت سے کام لیں تو ان میں
 اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی
 ہوں، ظاہر ہو کر پہنتے ہیں۔“

آپ کے دل کو قرار آگیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر شیراز کے لئے روانہ ہو گئے۔
 آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے بعد ازاں سے فرمایا۔
 ”اے خفیف! اگر راہِ طریقت کا واقف بھی اس راستہ پر گامزن نہ ہوگا تو محشر میں یہ شخص
 عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔“

آپ نے اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباع سنت میں انگوٹھوں کے بل پر
 کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے زار و قطار
 ۱۲۱

رہتے ہوئے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن اس میں ناکام رہا۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ میں راہِ طریقت پر کس طرح چلوں کہ محشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذاتِ مکہ مخصوص تھی تبھی اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیے۔

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم ہے لوگ حیران و سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں پل صراط پر لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر سے گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کو ہاتھ پکڑ لیا، بولا: ”اباجان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ ادھر آئیے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو پل صراط کے اُس پار پہنچا دوں۔“

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے پل صراط کے اُس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنت تھی، لڑکے نے کہا: ”اباجان! آئیے میرے ساتھ، میں آپ کو جنت میں داخل کرا دوں۔“

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنت میں پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوتے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی چیخیں مار مار کر رونے لگی آپ بھی بہت ادا اس تھے آہستہ آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا: بی بی! اتم اتنا مت رہو خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم مار سکتا ہے۔ رضائے الہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے۔“

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا: کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کروں۔“

آپ نے جواب دیا: تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی رفیق نے

تمہارے لئے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے مجھے اجازت دیجئے۔ میں کہیں اوچلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ بڑے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیئے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں نے طلاق لینے کے لئے یہ شادی نہیں کی تھی۔ میں طلاق کیوں لوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم اب بھی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا شوہر کو اس اور ملول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

آپ کے مریدوں میں سے دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد مرہ رکھ دیا۔ لیکن آپ کو احمد کہہ سے بڑی انیت تھی حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد مرہ کا کوئی جواب ہی نہ تھا دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر درجے کے دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جرات کر رہا ہوں اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت خشوع و خضوع سے یا د الہی میں مشغول رہ سکوں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”وہ کیا؟ پوچھو۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد مرہ میں جو زیادہ عبادت گزار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہتے ہیں جو نسبتاً کم عبادت گزار ہے اس کی کیا وجہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا اس کیلئے تجھے انتظار کرنا ہوگا۔“

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے آپ کے دلکش اندازِ وعظ گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمہ پر آپ نے احمد مرہ سے کہا۔ ”احمد مرہ! میرا ایک ۱۲۳

کام تو کر دے ۔

احمد نے ادب سے عرض کیا : ارشاد ، ایک کیا دس کام ارشاد فرمائیے ، میں بدل
وجہان اس کی تعمیل کروں گا ۔

آپ نے کہا : میرے اونٹ کو ، جو باہر بندھا ہوا ہے ، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے ۔
احمد آپ کی صورت دیکھنے لگا ، آپ نے پوچھا : میری صورت کیا دیکھ رہا ہے میں
نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے ۔
احمد نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا : ” حضرت ! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا کہ کیا حکم
دے رہے ہیں ؟ “

آپ نے جواب دیا : میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح ” رتج سمجھ دیا ہے
اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے “

احمد نے کہا : ” حضرت ! ذرا غور تو فرمائیے ، اونٹ کو ٹی بکری یا بیٹر کا بچہ تو ہے
نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر پہنچا دوں “

آپ نے احمد کہہ کر آواز دی : ” احمد کہہ ! ذرا میرے پاس آؤ نا “

احمد کہہ بھاگا بھاگا آپ کے روبرو اکھڑا ہوا ” ارشاد ! “

آپ نے فرمایا : ” ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے “

احمد کہہ نے گردن جھکا کر بصداد عرض کیا : ” بہتر ہے ابھی لیجئے “

احمد کہہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں
سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اگر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے
انصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا ۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھالے
لیکن ناکام رہا ۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کہہ کے پاس پہنچ گئے ۔

ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت
گزار احمد کہہ کے مقابلے میں نسبت کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں ۔ آپ نے
اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ احمد کہہ پسینے میں تر تر اونٹ کو اٹھالنے کی کوشش
میں ملہکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جنبش تک نہیں دے پا رہا ۔ آپ نے احمد کہہ سے کہا

وہ اب بس کر۔ اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا منشا پورا ہو چکا۔
مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کہہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں کوشش
کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔“

آپ نے کہا۔ ”میرا حکم تو تو بجالایا اب مرید ملکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ
تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔“

جس مرید نے کچھ عرصہ پہلے اعتراض کیا تھا، اُس نے کہا۔ ”آپ کو خود بھی اس کا
پہلے ہی علم ہو گا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر سے خواہ مخواہ ملکان فرمایا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”تھا اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لئے کہ میں عبادت
گزار احمد کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔“
مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی
نہیں آئی۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے ایک ہی حکم دووں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار
تھا وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا
کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس کے برعکس احمد کہہ، جو تم سب
کی نظروں میں احمد کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے میرا زیادہ فرمانبردار ہے چنانچہ
جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ چھت باندھ دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض
نہیں کیا بلکہ تعمیل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو
حکم کی بجا آوری میں احمد کہہ جیسا ہو۔“

معتز مرید اور اسی جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک شبہات کا جواب مل
چکا تھا۔ وہ اپنا سامنہ لے کر گئے۔



ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے
کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے
اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ ”مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔“

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا تک چکا تو وہ آپ کو بلانے آگیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا ”حضرت! کوئی خاص بات؟“
آپ نے اس کی پردہ پوشی کی ”نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں۔“
اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبت سے عرض کیا کہ حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔
آپ نے پوچھا ”وہ کیا؟“

اس نے عرض کی ”میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا چاہتا ہوں۔“
آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، بولے ”تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔“
اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا شروع کر دیا جیسے جیسے وہ لقموں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور سرانہ کا شدید احساس ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹالیا تو آپ کے چہرے پر کراہیت کی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں اور جب وہ دیکھنے لگا تو آپ مضبوط احتیاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو جائے۔
لیکن آخر کار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہو گیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں سے سرانہ محسوس ہو رہی ہے اس نے شرمندگی سے منہ چھپا لیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادام ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج پر روانہ ہو گئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے وہ قادیسیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا۔ یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے پاس کھانے کو جو کچھ تھا، ختم ہونے لگا۔ اس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی یہ کئی دن بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کر بیٹھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے کھانے کیلئے بڑی دودھوپ کی لیکن بڑی یا بوسہ رہی اور بھوک حد سے تجاوز کرتی رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے بھوک نے ان سب کو جاں بلب کر رکھا تھا۔ قافلے کے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے آخر شام کے وقت قافلے کے ایک آدمی انہیں

اطلاع دی کہ اس ویرانے میں ایک گھر بسا مل گیا ہے جس کے پاس ایک ہی جانور ہے جسے وہ چالیس دینار سے کم خریدنے کو تیار نہیں۔

آپ نے جواب ”اسے فوراً حاصل کر لیا جائے کیونکہ اہل قافلہ کی بھوک حالت اضطراری میں داخل ہو چکی ہے۔“

خبر دینے والے نے ذرا تامل سے کہا ”لیکن یہ بھی تو سنئے کہ وہ جانور کون سا ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”وہ کوئی سا بھی ہو اس حالت میں حرام بھی حلال کر دیا گیا ہے۔“

اس شخص نے قافلے والوں سے پوچھا ”آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟“

اہل قافلہ نے متفقہ عرض کیا ”عبداللہ خفیف صحیح کہہ رہے ہیں۔“

اس شخص نے آنکھیں بند کر لیں اور دانت بھینچ کر عرض کیا ”حضرات! وہ جانور

موٹا تازہ، خاصے تن و توش کا دنبے جیسا ایک کتا ہے۔“

قافلے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اس شخص نے کہا ”آپ لوگ جلدی فیصلہ کر لیجئے۔ کیا اس بھوک کو کتے کے

گوشت سے مٹانے کی ہمت رکھتے ہیں آپ لوگ؟“

ان میں سے بیشتر کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ صبح تک ہلاک ہو جانے کا

خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا ”بھوکے مر جانے کی نسبت یہ زیادہ

اچھا ہے کہ کتے کا گوشت کھا کر زندہ رہا جائے اس طرح ہمیں زندگی کے کچھ دن تو بول

جائیں گے اور ہم ان دنوں میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کر سکیں گے جس سے اس

حرام کے گناہ کو دھو دیں گے۔“

اس شخص نے عبداللہ خفیف سے پوچھا ”اور آپ کیا فرماتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”میں حالت اضطراری میں حرام کو حلال قرار دیتا ہوں۔“

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آ رہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی سرانڈ

کا علم ہو جانے کے بعد شرمندہ اور نادام ہو کر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی

ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ کچھ بھی بد رہا

ہے اس عذاب میں ہو رہا ہے آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور

کرنا چاہیئے تھا شاید کتے کا گوشت اسی سزا میں کھلایا جا رہا ہے۔

چالیس دینار میں قریب کا خرید لیا گیا۔ اسے ذبح کر کے بھونگیا اور قافلے والوں نے خوب مزے لے لے کر اپنی بھوک مٹائی لیکن عبداللہ خفیف ان سب سے دور بیٹھ کر ان کے کھانے کا منظر دیکھتے رہے وہ اس وقت کفارہ ادا کر رہے تھے وہ مزید بھوکے رہ کر خود کو سزا دے رہے تھے آنتیں کھرتج رہی تھیں اور سارے جسم میں سنساناٹھی سی دور رہی تھی لیکن انہوں نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کیا اور کھانے کا ایک لقمہ بھی زبان پر نہیں رکھا۔

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے تھے کسی نے احمد کہہ کر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھے کہ آپ نے بادشاہ کی دربار داری کیوں شروع کر دی ہے؟ لیکن احمد کہہ نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔

آپ دربار جا رہے تھے اور آپ کے مرید گو مگو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان کی ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کر رہا تھا جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی میں دو درویش نہایت دور دراز سے سفر کر کے آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے انہوں نے پوچھا۔ ”وہ عبداللہ خفیف کہاں ہیں؟“

کسی مرید نے جواب دیا ”وہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔“
 درویشوں نے حیرت سے کہا ”وہ عبداللہ خفیف اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 مرید نے جواب دیا ”ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شاہی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔“
 ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا ”یہ کیسے بزرگ ہیں جو شاہی دربار جایا کرتے ہیں حالانکہ درویشوں کو شاہوں اور ان درباروں سے کیا تعلق؟“
 دوسرے درویش نے جواب دیا ”خدا عالم الغیب ہے وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔“

دونوں درویش آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیف کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خالقاہ میں یا کہیں اور۔ پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھر

لیا جائے یہ طے کر کے دونوں بازار کی طرف نکل گئے وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے
 ہے اچانک ان کی نظریں ایک درزی پر پڑیں۔ ایک درویش کے خرچے کی جیب بھیٹی ہوئی تھی
 اس نے اپنے ساتھی سے کہا ”میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے کیوں نہ میں اپنے خرچے کی
 جیب سلوا لوں “

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا ”بے شک وقت غنیمت ہے“
 دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرچہ اتار کر درزی
 کے حوالے کیا اور کہا ”اوجھائی درزی! ذرا میری یہ پچھی ہوئی جیب توسی دے“
 درزی نے خرچہ لیا اور جیب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قینچی کی ضرورت
 پیش آگئی اس نے اپنا سامان میں قینچی تلاش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ اس نے ان درویشوں کی
 طرف دیکھا۔ کوسوں کی مسافت طے کئے ہوئے یہ درویش پرانہ و پریشان عجیب بے اعتبار
 سے محسوس ہوئے درزی نے ان سے پوچھا ”تم دونوں نے میری قینچی تو نہیں دیکھی؟“
 دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا ”بابا! ہم دونوں اس شہر میں نوار دیں اور بھلا
 ہمیں تیری قینچی کا کیا علم؟ یہ سوال تو ان سے کر جو تیری دکان پر اٹکتے بیٹھتے ہیں“
 درزی کا شک اور بڑھا، بولا ”سیدھی طرح بتا دو کہ میری قینچی کہاں ہے
 ورنہ دوسرا طریقہ اختیار کروں گا“

ایک درویش نے کہا ”تو دوسرا نہیں تیسرا طریقہ اختیار کر، جب ہمارے پاس
 تیری قینچی موجود نہیں تو تیرا دوسرا یا تیسرا طریقہ اسے کہاں سے فراہم کر دیگا“
 درزی نے کہا ”تم دوسرا تھی ہی میری دکان پر آئے تھے یا تمہارے ساتھ
 کوئی تیسرا بھی تھا؟“

ایک درویش نے جواب دیا ”ہم دوسرا تھی ہیں، بہت دور سے دو ہی آئے ہیں
 اور تیری دکان پر بھی ہم دو ہی آئے ہیں تیسرے ساتھی سے تیری کیا مراد ہے؟“
 درزی نے کہا ”تم دونوں کا کوئی تیسرا ساتھی ضرور ہو گا اور تم دونوں نے میری
 قینچی اس کے حوالے کر کے چلا کر دیا ہو گا“

دونوں درویشوں کو غصہ آگیا، ایک نے ذرا جوشیلے لہجے میں کہا ”تیرا دماغ
 تو صحیح ہے تو ہم دونوں کو چور بٹھراتا ہے تجھے شرم آنی چاہئے ہم درویشوں کو چوری چکاری

سے کی تعلق؟

درزی نے کہا: ”میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا بس سیدھی طرح میری قینچی فراہم کر دو، ورنہ میں پولیس بلوالوں گا“

ایک درویش نے عاجزی سے کہا: ”بھائی! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے جو ہم کو چور بناتا ہے کچھ تو خدا کا خوف کر“

درزی نے جواب دیا: ”میں خدا کا خوف کیوں کروں؟ تم چوری کر کے خدا سے ڈر نہیں لے رہے اور مجھے خدا کے خوف سے ڈرا رہے ہو، کمال کے ہونے والے“

دوسرے درویش نے کہا: ”بھائی! یہ تکرار بعد میں کر لینا، پہلے میرے خرقے کی

جیب تو سی دو“

درزی نے خرقہ اٹھا کر دوکان کے اندر پھینک دیا، کہا: ”اب یہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم دونوں قینچی نہیں دو گے“

ایک درویش نے اپنا سر پکڑ لیا، پیشانی دہاتا ہوا بولا: ”بھائی! تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ ہم دونوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور خدا کے غضب سے ذرا بھی نہیں ڈرتا“

درزی نے ہنسنے لگا کہا: ”دیکھو۔ مجھے بار بار خدا کے غضب سے مت ڈراؤ۔ میں

بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک پولیس آچکی ہوتی“

درویشوں نے کہا: ”دیکھو تنگ نہ کر، ہم چور نہیں ہیں“

درزی نے کہا: ”تم چور اگر نہیں ہو تو پھر میری قینچی کہاں چلی گئی؟“

درویشوں نے گرم ہو کر کہا: ”ہم کیا جانیں تیری قینچی کہاں چلی گئی؟“

درزی نے کہا: ”واہ جناب! ایک تو میری قینچی غائب کر دی دوسرے مجھی کو

اتکھیں بھی دکھاتے ہو“

ایک درویش نے نرمی سے کہا: ”بابا! کیسی باتیں کرتے ہو تم ہمیں کس طرح

یقین دلائیں کہ ہم نے تمہاری قینچی نہیں لی“

درزی نے جواب دیا: ”تمہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ میں

یقین کرنے کو تیار ہی نہیں۔ مجھے یا تو قینچی واپس کر دو، ورنہ میں سپاہیوں کو بلاتا ہوں“

درویش نے کہا: ”تم ہمیں برابر سپاہیوں کی دھمکی دیتے جا رہے ہو۔ اگر تم واقعی

سہری بے گناہی پر یقین نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں اور وہی کہ وجہ پر تمہارا دل راغب ہے ۛ
 درزی نے اسی وقت سپاہیوں کو بلایا اور ان دونوں درویشوں کو قلعہ چھلانے
 کے جرم میں گرفتار کر دیا۔ سپاہیوں نے انہیں حکمران کے دربار میں پیش کر دیا۔ وہاں عبداللہ
 خفیف پہلے ہی موجود تھے آپ نے دونوں درویشوں کو دیکھا اور مسکرائیے۔ اور ان سے
 سوال کیا ۛ درویشو! میں تمہیں بتاؤں کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیوں آتا ہوں؟
 دونوں درویش بہت پریشان تھے بولے ۛ اس وقت تو ہم دونوں مصیبت میں
 گرفتار ہیں اس سے نجات ملے تو کچھ عرض کریں ۛ

عبداللہ خفیف نے بادشاہ سے کہا ۛ تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا ۛ میں آپ کو انتہائی بزرگ سمجھتا ہوں ۛ

آپ نے پوچھا ۛ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟

بادشاہ نے جواب دیا ۛ آپ سچے ہیں ۛ

آپ نے جواب دیا ۛ اگر تو مجھے سچا سمجھتا ہے تو میری بات کا یقین کر یہ دونوں

درویش دور دراز سے میری ملاقات کو آئے ہیں یہاں بے وجہ چوری کے الزام میں گرفتار
 کر کے تیرے دربار میں لاکھڑے کئے گئے ان بے گناہوں کو چھوڑ دے ۛ

بادشاہ نے ان دونوں کو اسی وقت رہا کر دیا۔ آپ ان دونوں کو لے کر دربار
 سے باہر نکلے اور سیدھے درزی کے پاس پہنچے، درزی سے پوچھا ۛ کیا تو ان دونوں کو چور
 سمجھتا ہے؟

درزی بہت ڈرا سہما تھا، اس نے جواب دیا ۛ نہیں تو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں ۛ

آپ نے پوچھا ۛ تیری قینچی ملی یا نہیں؟

درزی نے جواب دیا ۛ مل گئی، وہ کپڑوں میں بندھ گئی تھی ۛ

آپ نے کہا ۛ تب پھر تو نے اپنے کپڑوں میں پہلے ہی اسے اچھی طرح کیوں نہیں

تلاش کر لیا تھا؟

درزی نے عاجزی سے جواب دیا ۛ حضرت! میں حیران اور پریشان ہوں کہ

میں نے ان دونوں درویشوں پر چوری کا الزام لگایا کیوں؟ میں اپنی اس حرکت پر بہت زیادہ

یشیمان ہوں ۛ

آپ نے دونوں درویشوں سے کہا یہ میں شاہی دربار کیوں جاتا ہوں؟ یہ تو تم دونوں کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا آج اگر میں دربار میں موجود نہ ہوتا تو تم دونوں کا معلوم نہیں کیا ہوتا۔ پھر درزی سے کہا یہ کیا ان کے خرچے کی جیب سل گئی؟ اگر سل گئی ہو تو وہ بے دے۔
 درزی نے خرچہ آپ کے حوالے کر دیا، کہا۔ ”اسے تو میں نے سب سے پہلے ہی دیا تھا۔“
 آپ نے اس کی سلائی دریافت کی، لیکن درزی نے اس کی سلائی نہیں لی۔ آپ
 دونوں درویشوں کو اپنی خانقاہ لے گئے وہاں ان دونوں نے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی۔



ایک مسافر نے آپ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہ بہت تھکا ہارا تھا۔ معلوم نہیں اس
 نے ناقص کھانے یا شیراز کے پانی کی ناموافقت سے اپنے پیٹ میں گر بڑھوس کی، پھر
 اجابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ اس کی تیمارداری میں لگ گئے اس کی حالت نازک ہوتی چلی
 گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تک اسے پچاس بار رفع حاجت کے لیے جانا پڑا۔ رات
 کے آخری حصے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، مہمان کو ایک بار پھر رفع حاجت کی ضرورت پیش آگئی
 اس نے آپ کو آواز دی۔ لیکن نیند اتنی گہری آئی ہوئی تھی کہ آپ کی آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے پھر
 آواز دی، لیکن آپ سوتے رہے۔ مہمان پر کمزوری اتنی غالب تھی کہ اس کا دماغی توازن خراب
 ہو چکا تھا اس نے آپ کو پوری قوت سے پکارا اور جب یہ محسوس کیا کہ آپ بیدار نہیں ہوئے ہیں
 تو اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا ”اوشیح! تجھ پر خدا کی لعنت، کہاں چلا گیا؟“
 مریدوں نے آپ سے کہا یہ حضرت! آپ نے اس کے گستاخانہ کلمات سنے؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں نے اس کے کلماتِ رحمت سُن لیے۔“
 اس کے بعد آپ مہمان کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب واپس آئے تو مریدوں نے کہا
 ”گستاخانہ کلمات کو کلماتِ رحمت کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟“
 آپ نے جواب دیا۔

”خدا نے مجھے خراب بات سننے کے لئے کان نہیں دیئے میں نے تو اُسے یہ کہتے سنا
 اوشیح! تجھ پر خدا کی رحمت، کہاں چلا گیا؟“

مریدوں نے عرض کیا۔ ”آپ اس گستاخ کی بے جا طرد داری فرماتے ہیں۔“
 آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں اپنے منصب کا حق ادا کر رہا ہوں۔“

مریدوں نے خاموشی اختیار کی ۔

ایکے مسافر آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا سیاہ تھا۔ گویا ماتم کدے کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا ”تو نے یہ سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”اے خفیف امیرے حکمراں یعنی نفس اور ہوا، دونوں فوت ہو چکے ہیں اس لئے میں نے مٹی لباس پہن لیا ہے“

آپ نے حکم دیا ”اس شخص کو فوراً باہر نکال دو“

مریدوں نے حکم کی تعمیل کر دی اور اس شخص کو نکال باہر کیا لیکن ذرا دیر بعد دیکھا کہ وہ شخص پھر آگیا ہے آپ نے اسے پھر نکلوا دیا لیکن وہ پھر آگیا۔ اس طرح آپ نے اس شخص کو ستر بار نکلوا دیا اور ستر بار واپس آیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر نہ آئے آخر آپ نے فرمایا ”اے شخص! واقعی یہ لباس تجھے زیب دیتا ہے کیونکہ ستر بار کی تذلیل بھی تجھے آزدہ نہیں کر سکی“

آپ نے ایک بار دورانِ وعظ فرمایا ”لوگو! اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل ملائکہ اور انس و جن کو تخلیق فرمایا۔ ان کے بعد عصمت، کفایت اور جبلت کو تخلیق فرما کر حکم دیا کہ تینوں ان میں سے ایک ایک شے اپنے لئے پسند کر لیں۔

چنانچہ ملائکہ نے عصمت کو اختیار کیا، اجنہ نے کفایت کو اور انسانوں نے جبلت کو منتخب کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کثرت سے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے عہد گزشتہ میں انسان اجنہ پر غالب رہتے تھے لیکن پھر معاملہ الٹا ہو گیا“

کسی مرید نے دریافت کیا ”حضرت افقیر کی خوبیاں بیان فرمائیے“

آپ نے جواب دیا ”وہ تو میں بیان کر دوں گا، لیکن یہ اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے اظہار فقر معیوب شے ہے“ پھر فرمایا ”جو کچھ میسر آجائے کھا کر خدا کا شکر ادا کرے اور میسر نہ آئے تو صبر سے کام لے۔“

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا ”لوگو! کچھ جانتے ہو، عبادت کسے کہتے ہیں؟“

لوگوں نے جواب دیا ”نہیں، آپ اس کی وضاحت فرمائیے“

آپ نے کہا ”عبادت نام ہے دائمی غم اور خوشی کو ترک کر دینے کا“

پھر پوچھا ، اور وصل کیا ہوتا ہے ؟

لوگوں نے جواب دیا : آپ ہی ارشاد فرمائیں ، ہم نہیں جانتے ۔

آپ نے کہا : وصل نام ہے محبوب سے اس اتصال کا جس کے بعد کچھ بھی یاد نہ ہے ۔

پھر پوچھا ، اور تقویٰ کیا ہے ؟

لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا ، حضرت ! اس سوال کا جواب بھی آپ ہی مرحمت فرمائیے ۔

آپ نے کہا : نفس ، دنیا اور ابلیس سے بیک وقت کن رہ کشی اختیار کرنے کا نام

تقویٰ ہے ۔

دو اور سی ریاضت ؟ تو اس کے معنی ہیں ، عبادت الہی سے نفس کو شکست دینا ۔

اسی چیز کو ریاضت کہتے ہیں ، آخری عمر میں جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے فرمایا ۔

دو اے خادم ! ادھر میرے پاس آؤ ۔

خادم آپ کے دربار آکر کھڑا ہو گیا ۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ موت کے بعد میرے ہاتھوں

میں رسی باندھ کر اور گلیں طوق ڈالو اگر قبلہ رو بٹھا دینا ۔ شاید اسی طرح میری مغفرت ہو جائے

آپ کے انتقال کے بعد خادم نے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو کسی نے اسے

ڈانٹ دیا ، خبردار ! او بے ادب ! جو تو نے خفیف کی وصیت پر عمل کیا ! کیا تو ہمارے محبوب

کو رسوا کرنا چاہتا ہے ؟

خادم نے خوف زدہ ہو کر آپ کی وصیت پر عمل نہیں کیا ۔

آپ کے بعد کسی نے آپ کے مزار پر لکھ دیا : قابو یافتہ شے سے اعراض اور غلبہ یافتہ شے

کو طلب نہ کرنا قناعت ہے زندہ نام ہے زرو مال کو نظر انداز کر دینے کا اور اپنے تمام امور کو خدا کے

سپر دکر کے مصائب پر صبر کرنے کا نام ہے عبودیت ۔

آپ کو آپ کے ہم عصر بزرگوں نے مشائخین کے شیخ کا لقب دیا تھا جو آپ کے نام کے

ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

خزینۃ الاصفیاء	سکینۃ الاولیاء	طبقات الکبریٰ	ریاض الیاحین	سفینۃ الاولیاء
مفتی غلام اور	نارکدہ دارالکلام	علامہ شمس الدین	ابن حجر	شہزادہ دارالاشرف

حضرت ابو احمد چشتیؒ

چشت کا رئیس سلطان فرساقہ ہر وقت شراب و شاہد میں مشغول رہتا تھا ۔ سلطان فرساقہ جتنا سیر و شکار اور شراب کا شوقین تھا اس کی بہن اتنی ہی پاک باز اور ولیہ تھی بھائی کی صحبت میں شکاریوں اور خوشامدی مصاحبوں کا جگمگاٹکا رہتا مگر بہن کی صحبت میں میں ذکر و فکر کا چرچا رہتا۔ اس وقت کی صاحب کمال شخصیات اس عارفہ کی خدمت میں حاضری کو باعث فخر سمجھتیں۔ اس عہد کے نامی گرامی بزرگوں میں خواجہ ابواسمٰعی شامی کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کا یہ قاعدہ تھا کہ جب بھی چشت تشریف لاتے ، سلطان فرساقہ کی بہن کے پاس ضرور جاتے اور وہاں ذکر و فکر گفتگو شروع ہو جاتی ۔

شام سے ذرا پہلے عصر کی نماز پڑھنے کے دوران سلطان فرساقہ کی بہن کو مطلع کیا گیا کہ مشہور صوفی ابواسمٰعی شامی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں ۔ ولیہ بہن نے سلام پھیرنے کے بعد کثیر کو ہدایت کی ” انہیں خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے میں ابھی حاضر ہوتی ہوں “

کثیر چلی گئی اور ابواسمٰعی شامی اور ان کے چند ساتھیوں کو خاص شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا کچھ دیر بعد یہ خود بھی وہیں پہنچ گئیں اور خواجہ ابواسمٰعی شامی کو سلام کیا ۔ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا ” اے پاک بار عورت ! کیا تو جانتی ہے کہ میں اس وقت کیوں آیا ہوں ؟“

سلطان کی بہن نے جواب دیا ” حضرت مجھے کیا علم ۔ میں تو حضور کے عقیدت مندوں میں شامل ہوں “

ابواسمٰعی شامی نے کہا ” میں یہاں قیام نہیں کروں گا مجھے اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھ جانا ہے میں سنہا ہے ان دنوں تیری بھانج حمل سے ہے کیا یہ درست ہے ؟“ سلطان کی بہن نے جواب دیا ” حضور نے صحیح سنہا ہے “

ابو اسحق نے کہا ”اے پاک باز عورت! میں یہ بشارت دینے آیا ہوں کہ تیرے بھائی
فرساقہ کے گھر میں جو ولایت ہونے والی ہے وہ ایک بلند مرتبہ فرزند ہوگا۔ خدا نے تجھ جیسی
دلیر کو اس کی پیشوائی کی خاطر اس گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔“
سلطان کی بہن نے دریافت کیا ”جب وہ بچہ پیدا ہو جائے گا تو مجھے
کیا کرنا ہوگا؟“

ابو اسحق شامی نے جواب دیا ”تو اپنی بھالوج کا خاص خیال رکھنے لگی۔ پھر جب
وہ بچہ پیدا ہو جائے گا تو اس کی پرورش اور نگہداشت میں تو خاص دلچسپی لے گی اور کوئی بھی
مشتبہ غذا اس کے حلقے کے نیچے نہیں جانے دے گی۔“
بہن نے جواب دیا ”بہتر ہے میں آپ کی ہدایات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی خدا
مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے۔“

ابو اسحق شامی یہ ہدایات دے کر چلے گئے سلطان کی بہن نے اپنی بھالوج
سے کہا ”بھابی! میں آپ کے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“
بھالوج نے پوچھا ”کیا؟ پوچھو۔“
انہوں نے پوچھا ”آپ کے حمل کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟“
بھابی نے جواب دیا ”بیس چند دن۔ کیوں؟“

مند نے ابو اسحق شامی کا پورا واقعہ سنا دیا اور کہا ”مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اس
بچے کی خاطر آپ کے حلقے سے کوئی مشتبہ ذائقہ نہ اترنے دوں۔“
بھابی نے حیرت سے پوچھا ”پھر تم کیا کرو گی؟“
مند نے جواب دیا ”میں یہ کروں گی کہ سوت کا تون اور اس سے جو آمدنی ہو اس سے
آپ کے کھانے پینے کا انتظام کروں۔“

بھابی نے کہا ”لیکن یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟“
”چشت کے حکم سلطان فرساقہ کی بہن سوت کات رہی ہے کیا لوگ ہمارا مذاق نہیں
اڑائیں گے؟“

مند نے جواب دیا ”میں مذاق یا استہزاء سے ذرا نہیں ڈرتی۔ میں محنت کروں گی،
چوری تو نہیں کروں گی اور محنت کا کون مذاق اڑا سکتا ہے میں نے یہ ساری باتیں اس لئے آپ
سے کہیں کہ ان کا تعلق آپ کی ذات سے ہے میری محنت کی کمائی پر آپ کو گزر کر نلے میں چاہتی ہوں

آپ راضی ہو جائیں آپ ہمیں خوشی میری محنت کی کمائی پر زندہ رہنے کا وعدہ کر لیں پھر میں کسی کی بھی پرواہ نہیں کروں گی۔

بھابی سوچ میں پڑ گئیں، وہ کچھ دیر سر جھکاکٹے سوچتی رہیں۔ پھر پوچھا۔

”میرے شکم میں پرورش پانے والا بچہ کیا کوئی عظیم اٹان انان ہوگا؟“

نند نے جواب دیا۔ ”اس عہد کے مشہور صوفی خواجہ ابوالفتح شامی نے یہ بشارت دی ہے اور وہ جھوٹ کیوں بولنے لگے؟ وہ یہ بشارت دینے آئے تھے اور ہدایات دے کر چلے گئے۔“

بھابی نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ جس زندگی کی توقعیں کر رہی ہے کتنی مشکل زندگی ہوگی لیکن میں اس عظیم انان کی خاطر یہ تکلیفیں جھیل لوں گی جو فردا کا بزرگ و برتر ان ہوگا۔“

نند نے بھابی کو اپنے سینے سے لگالیا۔ بولی۔ ”بھابی! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ میری باتوں کو ہمیں میں نہ اڑا دیں اور مجھ سے تعاون نہ کریں۔“

بھابی نے تردید سے کہا۔ ”بس فدا سا ڈرتی ہے بھابی کی طرف سے ہے میں سوچتی ہوں کسی دن وہ اپنے ساتھ مجھے اپنے دسترخوان پر نہ بٹھالیں اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں مجبور ہو جاؤں گی۔“

نند نے جواب دیا۔ ”اس کی فکر آپ کریں آپ کا شوہر میرا بھائی ہے اسے میں سنبھال لوں گی۔“

اس کے بعد نند نے سوت کا تنا شروع کر دیا اور اس کی آمدنی سے دونوں گزر بسر کرنے لگیں چشت کے حاکم کی بہن کا سوت کا تنا راز میں کس طرح رہ سکتا تھا لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ کہ آخر سلطان فرسناؤ کی بہن پر کون سی افتاد اپڑی ہے جو وہ گزران کے لیے محنت مشقت پر مجبور ہو گئی ہے جب یہ بھنگ سلطان فرسناؤ کے کان میں پڑی تو وہ متعل ہو کر بہن کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔ ”بہن! یہ میں تیری بات کیا سن رہا ہوں؟ کیا میں کنگال ہوں جو تو سوت کات کات کر گزر بسر کر رہی ہے؟ کیا میں نادار اور مفلس انسان ہوں جو اپنی بہن کا خرچ پورا نہیں کر سکتا؟“

بہن نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”بھائی! میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے اس

موضوع پر بات کریں، کیونکہ میں خود اپنے طور پر یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔“

بہن نے ابواسحق شامی کی آمد اور بشارت کا پورا قصہ سنادیا۔ سلطان یہ سب بڑی
توجہ سے سن رہا تھا۔ ”کیا تو یہ سچ کہہ رہی ہے؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”اول تو مجھے خود ہی جھوٹ سے نفرت ہے اور پھر جب خواجہ
ابواسحق شامی کی ذاتِ بابرکات درمیان میں آجائے تو پھر جھوٹ کا خیال تک دل میں نہیں
لا سکتی۔“

سلطان نے کہا۔ ”بہن اگر ایسی بات ہے تو میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ
جس طرح چاہے اپنی بھائی کو رکھ، میں کوئی دخل نہ دوں گا اور اس سلسلے میں جو بھی لب کثائی کرے
گا اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔“

بہن نے عرض کیا۔ ”نہیں بھائی کسی کی خبر لینے کی ضرورت نہیں، زمانہ تو بچا رہا ہے
بچا رہے گا، اس کی پردہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

بھائی کو مطمئن کر دینے کے بعد وہ بڑے اطمینان اور تنہا ہی سے سوت کا تنہ
لیگیں اور اس سے اپنا اور اپنی بھائی کا خرچ چلانے لگیں۔

یہ ہارون رشید کے بیٹے محمد مصمم باللہ کا دور تھا چھ رمضان ۲۶۰ھ کو یہ بچہ پیدا ہو گیا۔
بچے کا ابو احمد رکھا گیا ابوالاحمد کی پرورش بھی پھوپھی نے اپنی نگرانی میں کی۔ کچھ عرصہ بعد خواجہ
ابواسحق شامی بھی تشریف لائے اور سلطان کی بہن سے کہا۔ ”اے پاک باز عورت! میں تیری
محنت اور مشقت کی داد دیتا ہوں، تو نے جس دیانت اور ذمے داری سے اپنا فرض انجام دیا،
اس کی تعریف ممکن نہیں۔“

انہوں نے بچے کو ابواسحق شامی کی گود میں دے دیا۔ اپنے ابو احمد کی پیشانی
کو بوسہ دیا اور چہرے پر نظریں جھکا کر فرمایا۔ ”ابو احمد! میں تیرے بارے میں یہ پیش گوئی کرتا ہوں
کہ تو ایک بہت بڑے بزرگ خانوادے کا آغاز ثابت ہوگا اور اس خانوادے سے عجیب و غریب
احوال اور آثار ظہور پذیر ہوں گے۔“

ابو احمد نے ابواسحق کو دیکھ کر قسم فرمایا۔

سات برس کے میں ابواسحق شامی سے اُن کی محفلِ سماع میں ملاقات ہو گئی۔

ابو احمد کھیلنے کودتے ابواسحق شامی کی طرف جا کھلے۔ اس وقت مجلس میں بڑے پائے
۱۳۸ کے لوگ موجود تھے ابواسحق شامی نے ابو احمد کو اپنی طرف ہوا تے دیکھا تو احتراماً کھڑے

ہو گئے اور جس طرح کسی بزرگ سے مخاطب ہوا جاتا ہے ، ابو احمد کو مخاطب کیا ” ابو احمد !
آپ کہاں تشریف لے گئے تھے ؟“

ابو احمد نے جواب دیا ” میں کیا کہیں بھی نہ تھا میں تو آپ سے ملاقات کرنے آیا گیا

تھا “

ابو اسحق شامی نے حیرت سے ابو احمد کی طرف دیکھا اور کہنے لگے ” یعنی میرے پاس ! میری محفل میں ! میں کتنا خوش نصیب ہوں ، ابو احمد ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے بلائے بغیر ہی تشریف لے آئے اس سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کروں یا اپنے رب کا ؟“

ابو احمد نے جواب دیا ” آپ میرا شکریوں ادا کریں شکریہ تو رب العالمین کا ادا کیجئے جو ان نوز کو کام کی توفیق عطا فرماتا ہے “

ابو اسحق شامی سات سالہ بچے کی زبان سے یہ جواب سن کر دنگ رہ گئے فرمایا ” میں نے عالم رویا میں ابو احمد کو جیسا دیکھا تھا اس مادی اور کثیف دنیا میں بھی ویسا ہی دیکھ رہا ہوں “

سلمنے سامانِ سماع موجود تھا اور قوالوں نے ابھی قوالی شروع نہیں کی تھی ۔

ابو احمد نے ابو اسحق شامی سے پوچھا ” جناب یہ سب کیا ہے ؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ساز ساز و سامان کیا ہے اور یہاں کیوں لایا گیا ہے ؟“

ابو اسحق شامی نے جواب دیا ” یہ سامانِ سماع ہے اور ہم جس محفل میں اس وقت بیٹھے ہیں ، یہاں زور دار محفل سماع منعقد ہونے والی ہے آپ خود سے تشریف لائے ہیں یہی بات میرے لئے موجب فخر و انتباہ ہے “

اس کے بعد قوالوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا کلام شروع کر دیں ۔ قوالوں نے ساز بجانا شروع کر دیا کچھ دیر بعد حقانی کلام شروع کر دیا گیا اس کلام نے ہر کسی کو مست و بے خود کر دیا لیکن ابو احمد پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا حاضرین محفل سماع حیران تھے کہ یہ پتھر کہاں سے آگیا اور اس کی اتنی عزت و تکریم کیوں کی جا رہی ہے ؟

کسی حاسد نے ابو اسحق شامی سے پوچھا ” حضرت ! کیا اس محفل میں اس بچے

سے زیادہ بزرگ اور محترم کوئی اور نہیں ہے ؟“

ابواسحق شامی نے جواب دیا۔ ہاں میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اس محفل کا سب زیادہ محترم اور بزرگ ہی بچہ ہے جب اس کی شہرت اور بزرگی کا آفتاب چمکنے کا تو بہتوں کے چہرے پر چمک جائیں گے۔

حامد نے غصے سے کہا۔ ”اس طرح آپ ہم سب کی توہین کر رہے ہیں۔“

ابواسحق شامی نے جواب دیا۔ میں کسی کی توہین کیوں کرنے لگا میں نے تو ایک واقعہ بیان کر دیا ہے۔“

کچھ لوگ ناراض ہو کر محفل کے باہر چلے گئے ابواسحق شامی نے آپ کو گود میں اٹھا لیا اور سیٹے سے لگا کر فرمایا۔ ابوالاحمد! میں علم لدنی کو بیدار کر رہا ہوں، کیونکہ اندھی دنیا کو اس وقت تیری بزرگی اور مرتبہ کا کوئی علم نہ ہوگا جب تک کہ تو ان پر اسے ظاہر نہ کر دے گا۔“

سیٹے سے لگنے کے بعد جب ابوالاحمد جلا ہوئے تو انہیں ایر۔ محسوس ہوا گویا وہ علم و عرفان سے دبے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ابوالاحمد نے ابواسحق شامی کی خدمت میں حاضری کو فرض سمجھ لیا اور جب تیرہ سال کے ہو گئے تو انہوں نے ابواسحق شامی سے درخواست کی دو حضرت! میں کب تک اس کا انتظار کروں گا کہ آپ مجھے اپنی مریدی میں لے لیں؟

ابواسحق شامی نے جواب دیا دو ابوالاحمد! انتظار کس بات کا؟ تو آج ہی میری مریدی میں آ سکتا ہے۔“

چنانچہ اسی دن آپ کو ابواسحق کے حلقہ مریداں میں داخل کر لیا گیا مُرشد نے اُسی دن سے آپ کو خلوت میں بٹھادیا اور مجاہد سے اور ریاضت کی ابتدا ہو گئی۔ ابھی چالیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ ابوالاحمد کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال و جمال نمایاں ہو گیا۔ جو بھی آپ کی طرف دیکھتا دہشت زدہ ہو جاتا اور آخر کار آپ کے چہرے سے نور سامتِ رخ ہونے لگا ایسا نمایاں اور واضح نور کہ اندھیرے میں اس نور کی مدد سے تلاوت بھی ممکن ہو گئی۔

ابوالاحمد کے باپ کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ وہ اپنی بیوی اور بہن سے جھگڑاتا رہتا کہ میرے بیٹے کو حکمران ہونا چاہیے، یہ کیا درویشی میں لگا دیا ہے۔

بہن نے جواب دیا۔ ”وہ تو پیدائشی درویش ہے اور پیدائشی ہی کیوں بشارتی درویش۔ بھائی! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے آپ کو اتنا عظیم الشان فرزند عطا فر

سلطان نے بدرنگی سے کہا ”میں اسے سیر و شکار میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں لیکن تم لوگوں نے اُسے خانقاہ کی نذر کر دیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی پوری دُنیا کو چھوڑ کر ذرا سے گوشے میں اپنا منہ چھپا لے“

بہن نے جواب دیا ”بھائی! پوری دُنیا میں ایک سے ایک دنیا دار مل جائے گا اس بھری پُرمی دنیا میں ابوالاحمد جیسے انسان نہیں ملیں گے۔ آپ ابوالاحمد کے حال پر رحم کیجئے اور اسے سیر و شکار پر لے جانے کی کوشش نہ کیجئے“

سلطان نے کہا ”یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابوالاحمد کو آج ہی سیر و شکار میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا“

ابنہول نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ابوالاحمد جہاں کہیں بھی ہو، اسے فوراً حاضر کیا جائے۔

ابوالاحمد ابواسمٰعی شامی کی خانقاہ میں تھے خدمت گار بھی وہیں پہنچ گئے اور ابوالاحمد کو ان کے باپ کا حکم سنا دیا۔

ابوالاحمد نے اپنے پیر و مرشد ابواسمٰعی شامی سے پوچھا ”آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟“

ابواسمٰعی شامی نے جواب دیا ”سلطان فرسناؤ تمہارا باپ ہے تمہیں اس کا یہ حکم ماننا ہی پڑے گا“

ابوالاحمد نے افسوس سے کہا ”لیکن میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا“

مرشد نے جواب دیا ”عارضی فراق میں کوئی حرج نہیں، ہم دونوں بہت جلد پھر مل جائیں گے“

ابوالاحمد نے پوچھا ”بہت جلد کب اور کہاں؟“

مرشد نے جواب دیا ”کہیں بھی یہ اپنے خدا پر چھوڑ دو“

ابوالاحمد مجبوراً باپ کے پاس چلے گئے سلطان اپنے بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ

کر بہت خوش ہوا۔ انہیں گلے سے لگالیا۔ بولا ”بیٹے! تو کہاں غائب رہتا ہے؟“

ابوالاحمد نے ادب سے جواب دیا ”میں کہاں رہتا ہوں آپ واقف ہیں اس لیے میں

آپ کے سوال کا کیا جواب دوں۔ بہر حال میں آپ کے حکم پر حاضر ہو گیا ہوں“

سُلطان فرسناد نے کہا ” میں تجھے حکمران دیکھنا چاہتا ہوں لیکن تو معلوم نہیں کیا بن رہا ہے بہر حال اب تو میرے ساتھ سیر و شکار کو چلا کرے گا میرا خیال ہے تو بہت جلد سیر و شکار کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھو جائے گا “
ابو احمد نے کراہت سے جواب دیا ” ہو سکتا ہے آپ بجا فرماتے ہوں لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ میرا خیر کسی اور ہی مٹی کا ہے میں مادی اور دنیاوی حکومت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا “

باپ نے پر امید لہجے میں کہا ” تو اس کی فکر نہ کر۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو دس پانچ سال تک کے لئے گوشہ نشین کر دیا جائے تو وہ دنیا سے بے زار ہو جاتا ہے لیکن اگر اسے دس پانچ سال تک دنیا میں مشغول رکھا جائے تو وہ پھر دنیا کے لالچی بن جاتا ہے “

ابو احمد نے خاموشی اختیار کی اور باپ اُن کو اسی دن اپنے ساتھ لے کر سیر و شکار کو چلا گیا۔

شکار کے لئے جو جگہ پسند کی گئی تھی، وہ ایک کوہستانی وادی تھی سلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتا پھرتا تھا ابو احمد بھی ایک گھوڑے پر سوار مہمیز لگاتے پھرتے تھے ایک بار سلطان کو ہرنوں کی ایک ڈان نظر آئی اس نے اس ڈار کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیا۔ ساتھ ہی سلطان کے ہمراہی بھی اپنے اپنے گھوڑے سر پیٹ بھاگتے لگے ابو احمد نے بھی ان سب کا ساتھ دینا چاہا لیکن نہ دے سکے اور ابھی ان کا گھوڑا کچھ ہی دور بھاگا ہو گا کہ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ آگے جلنے والوں کی مگر بھی نہ پاسکیں گے پھر بھی انہوں نے اپنے والد کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
پہاڑی سلسلوں میں گردوغبار بھی نہیں ہوتا جس کو دیکھ کر جلنے والوں کی راہ کا پتہ چلا لیا جائے۔

ابو احمد اپنے باپ اور ان کے ساتھیوں سے سمجھ کر ادھر ادھر بھٹکتے رہے پچھڑنے والوں کے نقش پا بھی نہیں مل رہے تھے یہ کوہستانی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے اوپر تک چلے گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک جگہ انہوں نے چالیس چاس آدمیوں

کو کھڑے دیکھا۔ آپ اُن کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کی لیکن ان کے لئے ہر چہرہ اجنبی تھا آپ نے اُن سے پوچھا: ”حضرات! کیا آپ میں سے کسی نے کچھ آدمیوں کو سیر و شکار میں بھاگ دوڑ کرتے دیکھا ہے؟“

ان میں سے کسی شناسا آواز نے جواب دیا: ”ابو احمد! ہم میں سے کسی بھی تیرے باپ اور اس کے ساتھیوں کو ادھر سے گزرتے نہیں دیکھا۔“

ابو احمد اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ اُن کے پیر و مرشد۔ ابواسحق شامی کی آواز تھی۔ ابو احمد نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا، لیکن ان کے مرشد کہیں نظر نہ آئے آپ نے بے بسی سے پوچھا: ”حضرت! آپ کا آواز تو سنائی دے رہی ہے لیکن آپ خود نظر کیوں نہیں آتے ہیں؟“

ابواسحق شامی چالیس آدمیوں کے پیچھے سے نمودار ہوئے ہوئے: ”ابو احمد! میں یہاں ہوں۔ بولو کیا بات ہے؟“

ابو احمد نے جواب دیا: ”حضرت! میں اپنے باپ سے بھڑکیا ہوں اور اب انہیں ڈھونڈنا پھر رہا ہوں، خدا کے لئے میری رہنمائی فرمائیے۔“

ابواسحق نے کہا: ”میں ابو دلعب کی طرف تیری رہنمائی نہیں کر سکتا، اور اس وقت میرے یہاں آنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ تیرے باپ نے تجھے جس غلط راستے پر لائے کی کوشش کی ہے، میں تجھے اس سے باز رکھوں تیری وہ راہ نہیں ہے جس پر ابھی تو ذرا دیر پہلے چل پڑا تھا۔ امیرے ساتھ چل، خانقاہ تیرا انتظار کر رہی ہے۔“

ابو احمد نے عرض کیا: ”مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن کیا اس طرح والد صاحب مجھ سے ناراض نہیں ہو جائیں گے۔“

ابواسحق شامی نے جواب دیا: ”تو نے اپنے باپ کی فرماں برداری کر لی، اب معذرت کر لینا۔ بات ختم ہو جائے گی۔“

ابو احمد نے دوسرے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ”حضرت یہ کون لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ اس پہاڑی پر کھڑے ہیں؟“

ابواسحق شامی نے حیرت سے پوچھا: ”کون سے لوگ؟ وہ کہاں ہیں؟“

ابو احمد نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو ناچا ہا مگر اب وہاں کوئی تھا ہی نہیں، بس

ان کے پروردگار ابواسحق شامی کھڑے تھے ابوالاحمد نے حیرت سے پوچھا یہ سب کہاں چلے گئے؟

ابواسحق نے جواب دیا ”یہ سب رجال الغیب تھے اور میری مدد کو پہنچ گئے تھے“
 ابوالاحمد مرتبا حیرت سے بولے ”میں حیران ہوں کہ جس کو ناش اندام شد مل جائے
 وہ اپنے باپ کا اس کے ابو و لعب میں ساتھ دے! اب اس پر لعنت ہے جو ان فضول اور بیکار
 مشاغل میں باپ کا ساتھ دے“

ابواسحق شامی نے پوچھا ”اب کیا ارادے ہیں؟“
 ابوالاحمد نے جواب دیا ”حضور میرا ارادہ دیا مفت فرما رہے ہیں؟ جبکہ اب
 میرا ارادہ کوئی چیز ہی نہیں۔ اب میں آپ کا تابع ہوں اور آپ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل
 کروں گا“

ابواسحق شامی نے کہا ”اپنا گھوڑا، اسلحہ اور اسی قسم کا دوسرا سامان یہیں
 چھوڑ دو اور یہ لو کمبل، اسے اوڑھ کر میرے ساتھ ہو لو۔“
 ابوالاحمد نے ان کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔
 مرشد کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر ان کے ساتھ چل دیے۔

سلطان فرساقہ کو بڑی دیر بعد اپنے بیٹے کا خیال آیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں
 کو حکم دیا کہ ابوالاحمد کو تلاش کیا جائے حکم پاتے ہی وہ لوگ ادھر ادھر پھیل گئے اور
 بڑی دیر بعد چند آدمیوں نے ابوالاحمد کا گھوڑا، اسلحہ اور دوسرا سامان سلطان فرساقہ کی
 خدمت میں پہنچا دیا اور عرض کیا ”یہ سامان تو ایک جگہ سے دستیاب ہو گیا ہے لیکن خود
 ابوالاحمد کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان ٹک گیا۔“
 سلطان فرساقہ نے تشویش سے کہا ”ابوالاحمد کسی کھدیں بھی نہیں کر سکتا۔
 کیونکہ اگر وہ گرتا تو اسلحہ اور سامان کے ساتھ گرتا لیکن ان چیزوں کی موجودگی ہمیں یہ بتاتی
 ہے کہ وہ کہیں چلا گیا ہے اور زندہ سلامت موجود ہے۔“

خدمت کاروں نے عرض کیا ”اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“
 سلطان فرساقہ نے جواب دیا ”میں گھر واپس جا رہا ہوں تم لوگ ابوالاحمد کی

تلاش میں بھل جاؤ اور اس وقت تک تلاش کرو جب تک اُسے کسی حال میں پا نہ لو۔“
 سلطان فرساقہ چشت واپس گیا اور اس کے آدمیوں نے ابوالاحمد کی تلاش شروع کر دی۔

گھر میں جب سلطان کی بہن اور بیوی کو ابوالاحمد کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں اور ان دونوں نے تقریباً ایک ہی جیسی بات کی۔ ابوالاحمد ایک شاندار ولی ہے اور یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس سے شاندار اور عظیم خاندان سے وجود میں آئیں گے جب تک یہ باتیں ظاہر نہیں ہوتیں ابوالاحمد کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔“

سلطان فرساقہ کے آدمی ایک عرصے تک ابوالاحمد کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ آخر ایک پہاڑی غار میں انہیں دیکھ ہی لیا۔ یہاں وہ اپنے پیر و مرشد ابوالاسحق شامی کے ساتھ مصروف عبادت تھے۔

ان لوگوں نے ابوالاحمد سے کہا: یہ حضرت! ہم تو آپ کی تلاش میں عاجزا و مایوس ہو چکے تھے آپ گھر واپس چلیے۔ آپ کی مفارقت میں آپ کے والد کا بُرا حال ہے۔“
 ابوالاحمد نے جواب دیا: ”یہ جھوٹ ہے میری مفارقت کا میرے باپ پر کوئی اثر نہیں۔ اگر اُسے غم ہوتا تو آج تم سب کی جگہ میرے دو برو میرا باپ کھڑا ہوتا۔“
 لوگوں نے کہا: ”بہر حال ہم آپ کو لینے آئے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلیے۔“

ابوالاحمد نے جواب دیا: ”جب تک میں عبادت اور ریاضت میں ہوں، نہیں چل سکتا۔ پھر جب میرے مرشد ابوالاسحق شامی مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے تو میں گھر چلا جاؤں گا۔“

ان لوگوں نے بڑا اصرار کیا لیکن آپ واپسی پر تیار نہ ہوئے۔ آخر وہ واپس چلے گئے اور انہوں نے سارا حال سلطان فرساقہ کے گوش گزار کر دیا۔ باپ نے ابوالاحمد کو لانے کے لئے اپنے کئی سردار روانہ کر دیے اور انہیں تاکید کر دی کہ جس طرح بھی ممکن سمجھو ابوالاحمد کو لے آؤ۔

سردار بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے بڑی کوشش کی کہ ابوالاحمد کو گھر واپس لے آئیں لیکن وہ واپسی آمادہ نہ ہوئے آخر ان سرداروں کو بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔ انہوں نے سلطان فرساقہ کو مطلع کر دیا کہ ابوالاحمد کی اس وقت

تک واپسی ناممکن ہے جب تک وہ اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتے
 سلطان فرساق نے کہا: ”تم لوگوں نے اس کا ٹھکانہ تو دیکھ لیا ہے؟“
 سرداروں نے کہا: ”بالکل دیکھ لیا ہے۔“

سلطان فرساق نے کہا: ”اچھا پھر میں اس وقت تک کے لئے صبر کرتا ہوں جب تک
 کہ ابو احمد اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتا اس کے بعد تو اس کو واپس آنا
 ہی پڑے گا۔“

ابو احمد آٹھ سال تک اپنے مرشد ابو اسحق شامی کے ساتھ مصروف مجاہدہ
 رہے اور اس عرصے میں وہ اتنے ہو گئے کہ روشن ضمیر پیر نے انہیں خرقہ خلافت کا مستحق
 مان لیا۔ ابو اسحق شامی نے اپنا خرقہ خلافت دے کر اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور فرمایا: ”ابو احمد
 تو میرا فرزند ہے۔ مجھے اپنے پیران سلاسل سے جو نعمتیں بھی ملی تھیں وہ سب تیرے حوالے
 کر رہا ہوں۔“

اس کے بعد ابو اسحق شامی نے ابو احمد کا ہاتھ پکڑ لیا اور قبلہ کی طرف منہ کر کے
 فرمایا: ”اے اللہ! ابو احمد پر رحم فرما اور اسے وہ مرتبہ عطا فرما جس کا تو نے وعدہ
 فرما رکھا ہے۔“

ابو احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن یوں محسوس ہوا گویا کوئی غیبی آواز کہہ رہی تھی: ”ابو اسحق
 شامی! میں نے ابو احمد کو اپنے مقبول بندوں میں شامل کر لیا۔ یہ میرا دوست ہے اور جو
 شخص اس کی صحبت اختیار کرے گا وہ بھی میرا دوست ہوگا۔“

ابو اسحق شامی نے خوش ہو کر پوچھا: ”ابو احمد تو نے کوئی آواز سنی؟“
 ابو احمد نے جواب دیا: ”ہاں میں نے بھی وہ آواز سنی۔“
 ابو اسحق شامی نے کہا: ”تب پھر آج سے تو بھی کاملوں میں شامل ہوا۔“

آپ گھر واپس آ گئے باپ نے بڑی خوشی منائی۔ پھر بھی بہت ضعیف ہو چکی
 تھیں انہوں نے ابو احمد کو سینے سے لگالیا۔ ماں نے پیشانی کو بوسہ دیا۔ گھر کے درو
 دیوار خوشی سے روشن ہو گئے۔

کئی دن بعد آپ کی نظر ایک ایسے حصے پر پڑی جو چاروں طرف سے بند تھا

اپنی کسی خدمت گار سے پوچھا۔ اس میں کیا بند ہے؟
 خدمت گار نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے سے ٹل گیا آپ نے دوسرے خدمت گار
 سے پوچھا۔ اس میں کیا بند ہے؟

اس دوسرے خدمت گار نے عرض کیا۔ اگر حضور یہ وعدہ فرمائیں کہ میرے بیج
 بولنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔
 آپ نے وعدہ کیا۔ میں اپنے رب پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ تم سے بیج بولنے
 پر تجھے کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ اب بتا اس میں کیا ہے؟
 خدمت گار نے عرض کیا۔ حضور یہ میخانہ ہے اس میں شراب کا ذخیرہ بند ہے۔
 ابو احمد نے حیرت سے کہا۔ میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں پہلے تو یہاں کوئی میخانہ
 نہیں تھا۔

خدمت گار نے جواب دیا۔ پہلے بھی تھا لیکن یہاں نہیں تھا اگر سے دور ایک دوسرے
 مکان میں تھا، لیکن آپ کی غیر موجودگی میں سلطان نے اسے میخانہ بنالیا۔
 ابو احمد نے کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے لیکن میں تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔
 میں اسے تباہ و برباد کر دوں گا۔

خدمت گار نے تشویش سے کہا۔ اگر حضور نے ایسا کیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ
 ہے کہ سلطان آپ کے خلاف مزاحمت کریں گے اور اس مزاحمت سے کوئی ناخوشگوار واقعہ
 رونما ہو سکتا ہے۔

ابو احمد نے جواب دیا۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ اس میخانے کو تباہ کر کے
 رہوں گا۔

یہ خانہ ہر وقت مقفل رہتا تھا ایک دن سلطان نے کسی خدمت گار سے شراب
 منگوائی اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگا جب شراب ختم ہو گئی تو مزید کی ضرورت پیش
 آئی اور اسی خدمت گار کو دوبارہ شراب لینے بھیج دیا۔ یہ شخص شراب کے لئے جلیے کا اندر
 لگسا، اس کے پیچھے ابو احمد بھی پہنچ گئے اور خدمت گار کو حکم دیا۔ تو باہر نکل جا۔
 خدمت گار نے خوفزدہ ہجے میں کہا۔ مجھ سے سلطان نے شراب منگوائی ہے
 میں شراب لینے آیا ہوں۔

آپ نے سختی سے کہا: ”سلطان سے کہہ دے کہ میں بخانہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کو تباہ و برباد کر کے ہی دم لوں گا۔“

خدمت گار تو مارے ڈر کے واپس چلا گیا اور آپ اندر سے میخانہ کا دروازہ بند کر لیا۔ سلطان کو اس واقعے کا جوں ہی علم ہوا، وہ بھاگا بھاگا میخانے کے قریب آیا اور باہر سے دروازہ پھٹتے پھٹتے ہوئے کہا: ”ابو احمد! دروازہ کھولو۔ یہ تم اندر کیا کر رہے ہو؟“ ابو احمد نے جواب دیا: ”والد محترم! دروازہ نہیں کھلے گا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس میخانے کو تباہ و برباد کر کے ہی باہر نکلوں گا۔“

سلطان نے غصے سے کہا: ”لیکن میں تمہاری اس حرکت کو برداشت نہیں کروں گا تمہیں میری ذات سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

ابو احمد نے جواب دیا: ”آپ کے ارادوں میں جب تک مشیتِ الٰہی شامل نہ ہو آپ کسی کو نہ تو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان میں انہوں سے نہیں ڈرتا۔“

سلطان نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور بہت ہی غصے سے کہا: ”دروازہ کھولو۔“ ابو احمد نے جواب دیا: ”میں نے ایک بار کہہ دیا کہ دروازہ اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک پوری شراب زمین پر انڈیل نہ دی جائے۔“

باپ نے کہا: ”تو اپنے باپ کی عدول حکمی کر رہا ہے۔“

ابو احمد نے جواب دیا: ”لیکن میں اپنے رب کی فرماں برداری کر رہا ہوں۔“

باپ نے غصے سے کہا: ”اگر تو سیدھی طرح دروازہ نہیں کھولے گا تو مجھے دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔“

ابو احمد نے پوچھا: ”وہ کونسا طریقہ ہے؟“

باپ نے جواب دیا: ”میں وہ طریقہ ابھی بتاتا ہوں۔“

اس کے بعد سلطان کٹی بڑے بڑے پتھر لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ ابو احمد نے شراب لٹھکنا شروع کر دی وہ ہاتھوں سے اور پٹھوروں سے شراب کے ٹنکے توڑنے میں مشغول تھے شراب کی تیز بو چاروں طرف پھیل گئی۔ باپ کو غصہ ہوا تو ایک پتھر روشن دان کی راہ سے ابو احمد کے سر پر مارا۔ سلطان کا خیال تھا کہ یہی ایک پتھر ابو احمد کو بے ہوش کر کے گر دے گا لیکن یہ دیکھ کر حیران نہ گیا کہ پتھر ہوا میں معلق ہو گیا۔ سلطان کے حواس ہی

جاتے ہے وہ دوسرا سچر نہیں مار سکا۔ ابواحمد کسی خوف یا لحاظ کے بغیر شراب کو اٹھاتے
 لڑھکاتے ہے اور کچھ ہی دیر میں ساری شراب زمین پر گرا دی اور میخانے سے باہر نکل گئے۔
 حیران اور پریشان سلطان چھت سے نیچے اُترا اور کمزور آوازیں بیٹے کو پکارا۔
 ”ابواحمد! ذرا بھڑکنا تو۔“

ابواحمد بھڑک گئے۔ اداس اور نادام باپ اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا ولی بیٹے کے پاس
 پہنچا اہستہ سے پوچھا ”بیٹے! یہ تو نے کیا کر دیا؟“
 ابواحمد نے جواب دیا ”وہ میں نے جو کچھ کیا، آپ اچھی طرح واقف ہیں۔“
 باپ نے پوچھا ”کیا یہ تو نے جو کچھ کیا اچھا کیا ہے؟“
 ابواحمد نے جواب دیا ”آپ یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے منہ سے کیجئے اپنے رب
 سے کیجئے۔“

باپ بیٹے سے نظریں نہیں ملا رہا تھا ندامت سے کہا ”میں تجھے اپنا بیٹا تو سمجھتا تھا۔
 لیکن اس پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ تُو ولی ہے۔“
 ابواحمد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔
 باپ نے جھک کر بیٹے کے پاؤں پکڑنا چاہے لیکن ابواحمد نے باپ کے دونوں
 ہاتھ پکڑ لیے اور عاجزی سے کہا ”والد محترم! آپ مجھے گنہگار نہ کیجئے۔“
 باپ کی آنکھوں سے چشمہ اُبل پڑا۔ اس نے رشتے ہوئے کہا ”ابواحمد! میں بہت
 گنہگار ہوں اور اس پر مزید یہ ستم کہ میں نے تجھے نہیں پہچانا۔“
 ابواحمد نے جواب دیا ”میں آپ کی بیٹیوں اور کچھ نہیں۔“
 باپ نے کہا ”اچھا! اپنے ہاتھ لائے۔ میں تیرے ہاتھوں پر شراب نوشی سے توبہ کرنا
 چاہتا ہوں۔“

ابواحمد نے اپنے دونوں ہاتھ باپ کی طرف بڑھادیے اور باپ نے الحاح و زاری سے
 خدا کو حاضر و ناظر جان کر شراب نوشی سے توبہ کی اور یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ شراب کو ہاتھ تک
 نہ لگائے گا۔

باپ نے توبہ کی اور عزت نشینی اختیار کی۔ آپ کے ماموں امیر نصیر ملک آفندہ بڑھیا
 ۱۴۹

اور ساری امارت گویا ماموں کی طرف منتقل ہو گئی۔ آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی اور جب سماع سنتے تو ان کی حالت کچھ عجیب ہو جاتی۔ علمائے عصر ان کو بدعت سمجھتے انہوں نے آپ کے ماموں سے شکایت کی اور کہا ”محضور والا! آپ اپنے بھانجے کو اس بدعت سے روکیے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

نصیر ملک نے جواب دیا ”میرا بھانجا ابوالاحمد بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہے یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حق پر تم لوگ ہو یا میلر بھانجا ابوالاحمد؟ علمائے نے کہا ”ہم اسے اپنے علم سے قائل کر دیں گے اور وہ خود ہی کہہ دے گا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بدعت میں داخل ہے۔“

نصیر ملک نے پوچھا ”اگر تم لوگ یہ ثابت نہ کر سکے تو؟“ ایک عالم نے جواب دیا ”اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی علمیت کا اندازہ ہے ہم ابوالاحمد کو لا جواب کر دیں گے۔“

نصیر ملک نے کہا ”بہتر ہے میں ابوالاحمد کو بلو آتا ہوں تم لوگ بھی علمائے مناظرہ کو تیار کر لو۔ پھر میں دیکھتا ہوں کون کس کو قائل کر لے گا۔“ نصیر ملک نے اسی دن ابوالاحمد کو ایک خط لکھا۔

”پیارے بھانجے ابوالاحمد! مجھے تیری علمیت اور بزرگی کا بھی اعتراف ہے اور احترام بھی، لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے تنگ نظر عالم تیرے مقام اور مرتبہ سے واقف نہیں ہیں اور تیرے اقوال اور افعال پر اعتراض ہیں وہ تیرے ذوقِ سماع کو بدعت سمجھتے ہیں میں ان کی شکایات اور اعتراضات سے عاجز آچکا ہوں اور انہیں ہمیشہ کے چپ کر دینے کی یہ ترکیب سوچی ہے کہ تو میرے پاس آجا۔ دوسری طرف سے علمائے کرام بھی آجائیں گے پھر تم دونوں آپس میں مناظرہ کرے اپنے اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرو گے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہی وہ واحد طریقہ ہے جو تیرے مخالفوں کی زبان بند کر سکتا ہے۔ میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

ماموں کا خط پڑھتے ہی ابوالاحمد نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے خادم محمد خدا بندہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ محمد خدا بندہ سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص سے زیادہ نہیں پڑھا تھا۔

جب علما کو یہ معلوم ہوا کہ ابوالاحمد مناظرؒ کے غرض سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے نصیر ملک سے التجا کی ”وختاب والا! ابوالاحمد آپ کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ مامو، بھانجے ہیں دوسرے یہ ہے کہ عوام الناس پر ان کی بزرگی اور ولایت کا بھی بڑا عجب ہے ہم سب ان باتوں کے پیش نظر یہ چاہتے ہیں کہ ابوالاحمد کا استقبال نہ کیا جائے کیونکہ اگر ان کا استقبال کیا گیا تو بیشتر علمائے کرام پر ان کا رعب طاری ہو جائے گا اور وہ آزادی سے مناظرہ نہیں کر سکیں گے۔“

امیر نصیر نے وعدہ کر لیا کہ ان کا استقبال نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ابوالاحمد جیسے ہی شاہی محل کے دروازے تک پہنچے امیر نصیر خود کو قابو میں نہ رکھ سکا وہ بے اختیار محل سے باہر نکلا اور ابوالاحمد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لٹکانی پھر انہیں عزت و تکریم سے اپنی مجلس میں لے گیا وہیں علما کو بھی طلب کر لیا گیا۔

امیر نصیر نے علما سے پوچھا ”کیا آپ لوگوں نے مناظرے کی تیاری کر لی ہے؟“
 علمائے جواب دیا ”ہاں اور ہمارا خیال ہے ابوالاحمد بھی تیاری کر کے ہی آئے ہوں گے“
 ابوالاحمد بے نیازی سے جواب دیا ”میں نے کوئی تیاری نہیں کی پھر بھی تمہارے سوالوں کے جوابات میرا یہ خادم محمد خدا بندہ دے گا، میری ضرورت ہی نہیں رہے گی؛“
 علما ہکا بکا رہ گئے انہوں نے خادم محمد خدا بندہ کی طرف دیکھا۔ ابوالاحمد کی بات ان کی سمجھ میں یوں نہیں آئی کہ خادم خدا بندہ صورت و شکل سے ان پرٹھ معلوم ہوتا تھا ایک عالم نے حیرت سے سوال کیا ”یعنی آپ کی بجائے یہ ان پرٹھ شخص ہم سے مناظرہ کرے گا؟“
 ابوالاحمد نے جواب دیا ”ہاں یہی شخص تم سب کے لیے کافی ہے۔“

علمائے سمجھے ”شاید آپ مناظرے سے بچنا چاہتے ہیں اسے علمائے اپنی توہین سمجھا ایک عالم نے کہا۔“ ”ابوالاحمد! یہ تو ہم سب کا ظلم ہے کہ ہم تم سے مناظرہ کرنے آئے تھے اور تم اپنے خادم محمد خدا بندہ سے بیڑاٹے دے رہے ہو۔“

ابوالاحمد نے جواب دیا ”اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ محمد خدا بندہ تمہارے سوالوں کے جوابات نہیں دے پارہا ہے تو مناظرے میں میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔“

علمائے اپنی دانست میں مشکل ترین سوالوں کی پوچھا کر دی۔ قرآنی آیات زیر بحث

لائی گئیں ان کے معانی و مطالب اور تفسیر پوچھی گئی انہیات پر سوال ہوئے تصوف

کے پیچیدہ مسائل زیر بحث آئے اور اُدھر محمد خُدا بندہ کا یہ حال تھا کہ علمائے کرام ہر سوال کا مدلل جواب اس کے پاس موجود تھا۔ وہ علمائے ربوبہ اس طرح بول رہا تھا گویا وہ سب طفلِ مکتب تھے اور محمد خدا بندہ انہیں درس دینے پر مامور کیا گیا تھا امیرِ نصیریہ کیفیت دیکھ کر مبہوت تھا وہ علمائے سوالات گستاخا تھا چند گھنٹوں میں انہی سوالات کٹے گئے اور محمد خدا بندہ نے ان کے تشفی بخش جوابات دے کر علماء کو شرمندہ اور خاموش کر دیا۔

ابوالاحمد نے پوچھا ”علمائے کرام! آپ کوئی سوال کریں گے یا سارے سوالات ختم ہو چکے ہیں؟“

کئی علمائے بیک آوازیں جواب دیا ”ہم سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہیں اور اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم سب مل کر بھی محمد خدا بندہ کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ ابوالاحمد نے پوچھا ”آپ لوگ تو مطمئن ہو گئے اب میرے خادم محمد خدا بندہ کو اجازت دیجئے کہ آپ سے چند سوالات کر لے۔“

کئی علمائے ایک ساتھ بولے ”ہم تیار ہیں اور محمد خدا بندہ کو اجازت ہے کہ سوالات کرے۔“

ابوالاحمد نے محمد خدا بندہ کی طرف دیکھا اور حکم دیا ”تو بھی چند سوالات کر لے۔“ خدا بندہ نے کہا ”بہتر ہے“ پھر علمائے کہا ”حضرات! میرے سوالوں کے جواب دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔“

کئی علمائے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا ”ہم تیار ہیں۔“ محمد خدا بندہ نے پوچھا ”حضرات! میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار سوال نہیں کروں گا لوگ کہتے ہیں کہ نیندیں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نیندیں واقعی لذت ہوتی ہے؟“

ایک عالم اس طرح مسکرایا گویا وہ اس بچکانہ سوال پر طنزاً ہنس رہا ہو، بولا ”یہ بھی کوئی سوال ہے بھلا۔“

خدا بندہ نے جواب دیا ”حضرات! میرا سوال کتنا ہی معمولی اور حقیر ہے لیکن آپ اُسے

حقیر کہہ کر رد تو نہیں کر سکتے۔ مجھے میرے سوال کا جواب ضرور دیا جائے۔“ ۱۵۲

ایک دوسرے عالم نے مسکرا کر کہا ”ہاں تو تو نے کیا سوال کیا تھا؟ ذرا اسے دھرانا تو سہی!“

محمد خدا بندہ نے اپنا سوال پھر دہرایا ”لوگ کہتے ہیں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے کیا نیند میں واقعی لذت ہوتی ہے؟“

ایک عالم نے جواب دیا ”ہاں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے“
محمد خدا بندہ نے پوچھا ”اس لذت سے ان ان لطف اندوز ہوتا ہے؟ یعنی اس کا مزہ کب چھکتا ہے سونے سے پہلے یا سونے کے بعد؟“

اس سوال نے سبھی کو چکرا دیا۔ ایک نے جواب دیا ”سونے سے پہلے“
محمد خدا بندہ نے ہنس کر کہا ”کیا کسی چیز کی لذت کا احساس کھانے سے پہلے ہی کیا جاسکتا ہے میرا مطلب ہے آدمی کوئی چیز کھائے بغیر ہی اس کی لذت کا مزہ کس طرح حاصل کر سکتا ہے“

دوسرے عالم نے گہرا جواب دیا ”سونے کے بعد“
محمد خدا بندہ نے کہا ”یہ بھی ناممکن ہے جب ایک چیز حلق سے نیچے اتر جائے تو ساتھ ہی اُس کا مزہ بھی نائل ہو جاتا ہے جب نیند جاتی رہی تو اس کا مزہ کہاں باقی رہا“
علماء اور زیادہ چکر اگٹے کسی تیسرے عالم نے جواب دیا ”نیند کی لذت آدمی سوتے میں محسوس کر لیتا ہے“

محمد خدا بندہ نے جواب دیا ”یہ بھی غلط ہے عالم مدہوشی میں کسی چیز کی لذت محسوس کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا“

اب سارے عالم بے بس اور لاجواب ہو چکے تھے۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادا معمولی سوال تھا جس نے سب کو گنگ اور لاجواب کر دیا تھا۔

امیر نصیر کا مائے خوشی کے بُرا حال تھا۔ اس نے بے بس علماء سے پوچھا ”حضرات آپ کا کیا خیال ہے؟ محمد خدا بندہ جو ابو احمد کا معمولی پڑھا لکھا خادم ہے اس نے تمہارے سوالوں کے مدلل جوابات دیے لیکن تم اُس کے ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکے کہاں اسی سوال اور کہاں ایک سوال۔ اب تم سب ابو احمد کے بلائے میں کیا کہتے ہو؟“

سب جید عالم نے جواب دیا ”جناب امیر! ہم سب خطا کار اور قصور وار ہیں“

ابو احمد کو علم لدنی حاصل ہے علم لدنی کا علم اکتسابی مقابلہ نہیں کر سکتا، ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب ہم لوگ ابو احمد کے خادم محمد خدا بندہ کا مقابلہ نہیں کر کے تو ان کا کیا مقابلہ کریں گے؟ ابو احمد سے مباحثہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد علمائے اپنے علمے اپنی گردنوں میں ڈالے اور ابو احمد کے سامنے ادب سے دوڑا نو بیٹھ گئے اور درخواست کی یہ حضرت! ہم اپنی نادانی پر شرمندہ ہیں آپ ہمیں بھی اپنے ارادت مندوں میں شامل فرمائیں۔

آپ نے جواب دیا یہ کوئی مضائقہ نہیں، بس میری ایک نصیحت پر زندگی بھر کا رہنما رہنا۔ وہ یہ کہ کسی بھی انسان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا اور دل آزاری کے عذاب سے بچتے رہنا۔

امیر نصیر بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”ابو احمد! گورشتے میں میں تم سے بڑا ہوں لیکن باقی تمام باتوں میں تم افضل اور بزرگ ہو۔ بخدا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تم کو مناظرے کے لئے زحمت دیتا۔ لیکن علمائے کرام کے مجبور کرنے پر میں نے یہ گستاخی کی۔ اب جبکہ تم کامیاب ہو چکے ہو، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔“ ابو احمد نے جواب دیا۔ ”مناظرہ تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ میں اس میں کسی قسم کی شرمندگی یا عار محسوس کرتا، لیکن ایک ایسا مناظرہ جس میں عالموں کی ایک جماعت پہلے ہی سے ملے کر لے کر اپنے حریف یا فریق کو ذلیل و خوار کرے گی میری اپنی نظر میں گناہ ہے کیونکہ اس میں انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔“

امیر نصیر نے آپ کی خدمت میں بڑے تحفے پیش کئے لیکن آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اس واقعے کا اتنا شہرہ ہوا کہ چاروں طرف سے لوگ جوق درجوق حاضریاں دینے لگے اور ہزاروں آدمیوں نے آپ کے حلقہ ارادت مندی میں شمولیت کا شرف حاصل کیا۔



آپ سیر و سیاحت کے لئے چلے تو آپ کے ارادت مندوں نے ایک منزل تک آپ کا ساتھ دیا، لیکن ان میں سے اُن اسی ایسے ارادت مند تھے جو ایک منزل سے آگے تک آپ کے ساتھ رہے جب یہ لوگ دریا کے کنارے پہنچے تو وہاں کشتی کا دور دور تک نام و نشان نظر نہ آیا۔ آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا وہاں کشتی کا

دُور دُور تک پتہ نہیں، اس لئے اب تم لوگ واپس جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔
 ارادت مندوں نے عرض کیا ”حضرت! ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو دُجلہ
 کے اس پار پہنچا کر واپس ہوں گے۔“
 آپ نے لاپرواہی سے کہا ”چلو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کشتی کا تو کہیں
 پتہ نہیں۔“

کچھ دیر تک تو وہ لوگ چچا پکھڑے رہے آخر آپ نے کہا ہم لوگ کشتی
 کے انتظار میں کب تک کھڑے رہیں گے اور ہم لوگ کشتی کے بغیر ہی دُجلہ عبور کریں۔“
 لوگوں نے پوچھا ”وہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا ”آدم سب حلقہ بنا کر ذکر الہی میں مشغول ہو جائیں اور آہستہ آہستہ
 دُجلہ کی طرف بڑھیں اللہ نے چاہا تو اس سے ہماری مشکل حل ہو جائے گی۔“
 لوگوں نے آپ کی اتباع کی اور وہ سب حلقہ بنا کر اللہ اللہ کرنے لگے آپ اُن کو لے
 کر دُجلہ میں اتر گئے پانی کو دیکھ کر ان کے ارادت مندوں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب کچھ
 دیر بعد آپ نے انہیں حکم دیا ”کراپنی اپنی آنکھیں کھول دو۔“ تو وہ حیران رہ گئے وہ
 دُجلہ کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور اُن کے پاؤں تک خشک تھے۔
 اس منظر کو دیریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے چوبیس کفار بھی دیکھ رہے
 تھے وہ سب آپ کی خدمت میں پہنچے اور پوچھا ”حضرت! آپ کی تعریف؟“
 ایک ارادت مند نے جواب دیا ”ابو احمد چشتی۔ کیا تم لوگ اتنے ہی کور اور نابینا
 ہو کہ انہیں پہچانتے ہی نہیں؟“

ان میں سے دو نے ایک ساتھ جواب دیا ”ویارو! ہم نہ مسلمان ہیں نہ عیسائی نہ یہودی
 ہم سب بت پرست ہیں اور ان حضرت کو تم سب کے ساتھ کشتی کے بغیر دُجلہ سے پار اترتے
 جو دیکھا تو حیران ہو رہے ہیں ہم سب مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔“
 ابو احمد کفار کی طرف بڑھے اور فرمایا ”سبحان اللہ، نیک کام میں دیر کیوں؟
 خدا تمہیں مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔“ اس کے بعد آپ نے ان سب کو مسلمان
 کر لیا۔

دوران سفر آپ کا گزر ایسا ہی بستی کے پاس سے ہوا کہ مسلمان اس بستی کے

ساتھ تک سے خوفزدہ رہتے تھے شام کا وقت تھا اور اس بستی میں دیے ٹمٹمانے لگے تھے آپ نے سوچا اس بستی میں داخل ہو کر رات یہیں گزاروں گا، صبح دیکھا جلے گا ابھی آپ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی شخص پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور آپ کا دامن پکڑ لیا۔ آپ نے گھوم کر دیکھا۔ ایک بوڑھا شخص آپ کا دامن پکڑے گھسیٹ رہا تھا۔
 آپ نے پوچھا ”تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟“

بوڑھے نے جواب دیا ”میں ایک مسلمان ہوں اور شاید آپ بھی مسلمان ہیں“

ابو احمد نے جواب دیا ”ہاں، محمد اللہ کریم مسلمان ہوں“

بوڑھے نے عرض کیا ”حضرت! میں آپ کی ہمدردی میں بڑی دور سے بھاگا چلا آیا ہوں یہ سامنے کی بستی، جس میں دیے ٹمٹمانے لگے ہیں کافروں کی بستی ہے یہ بڑے ظالم اور سنگ دل کافر ہیں انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے اتنی نفرت کہ جب یہ کسی مسلمان کو پکڑ لیتے ہیں تو پہلے تو اس پر خوب ظلم کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان کے ظلم و جور کی تاب نہ لا کر اللہ کو پکارا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان کے ظلم و جور سے نہیں مڑتا تو وہ اس مسلمان کو آگ میں ڈال کر مارتے ہیں“

ابو احمد نے پوچھا ”آخر تو مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے؟“

بوڑھے نے جواب دیا ”میں یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ اُدھر کا رخ نہ کریں اور اس بستی کے کنارے سے کہیں اور چلے جائیں“

آپ نے کہا ”لیکن میں مجبور ہوں۔ میں کفار سے نہیں ڈرتا میں تو یہ رات اسی بستی میں گزاروں گا“

بوڑھے نے عاجزی سے کہا ”آپ نادانی نہ کریں میرا کہنا مائیں۔ میں نے آج تک کسی مسلمان کو اس بستی میں داخل ہو کر باہر نہ نکلتے نہیں دیکھا اگر آپ اتنے ہی بضد ہیں، تب پھر آپ اپنا لباس ضرور بدل دیجئے اور یہ کہ ان کفار جیسا ہی لباس پہن لیں۔ اس طرح آپ انہی جیسے ہو جائیں گے اور وہ آپ سے تعرض نہیں کریں گے“

آپ نے جواب دیا ”اے شخص! خدا نے مجھے اسلام کا لباس پہنایا ہے میں کفار کے ڈر سے یہ لباس کیوں اتار دوں؟“

بوڑھا بے بس ہو گیا۔ بولا ”حضرت! میں آپ کو نہ تو مطمئن کر سکتا ہوں نہ اس پر

مجبور کر سکتا ہوں کہ آپ میری بات مان لیں۔ اس لئے جو مناسب سمجھیں کریں۔ میں واپس جاتا ہوں۔“

بوڑھا واپس چلا گیا۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس بستی میں قدم رکھ دیا۔ آپ کے لباس کو دیکھ کر کفار آپ پر ٹوٹ پڑے اور ”مسلمان ہے مسلمان“ کہہ کر اپنے زرخے میں لے لیا۔

وہ لوگ آپ کو پکڑ کر ایک بہت بڑے احاطے میں لگے اور پوری بستی میں یہ اعلان کر دیا کہ خوش قسمتی سے ایک مسلمان ہاتھ آگیا ہے کل صبح اس کی درگت بنائی جائے گی اس لئے جج جس کو یہ دلچسپ اور مزیدار تماشا دیکھنا ہو، اس احاطے میں آجائیں۔

دوسرے دن علی الصبح پوری بستی اسی احاطے میں جمع ہو گئی۔ کفار کے دو پروہت آگے بڑھے اور انہوں نے بستی والوں کی موجودگی میں باوازی بلند پوچھا۔
”اے شخص کیا تو مسلمان ہے؟“

اپنے جواب دیا۔ ”ہاں میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔“

ایک پروہت نے کہا۔ ”اگر تو مسلمان ہے اور تجھے اپنے مسلمان ہونے کا غرور ہے تو میں بھی تجھے یہ بتانا ہوں کہ اس بستی سے ایک مسلمان بھی صحیح سلامت بچ کر نہیں گیا ہے ہم تجھے بھی تیرے مسلمان ہونے کی سزا دیں گے۔“

آپ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”لیکن اے نامعقول پروہت! کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ سزا اور جزا تیرے یا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تو یا کوئی اور مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔“
پروہت نے حقارت سے کہا۔ ”ایسی باتیں نہی اور مسلمان بھی کرچکے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ہم میں موجود نہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تب پھر جو کچھ کرنا ہے کر کے دیکھ لے میں تیری اور تیری قوم کی طاقت اور اختیار کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

پروہت نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ باری باری آگے بڑھیں اور اس مسلمان پر

تھوکیں۔ اس کی قوم نے اس پر عمل کیا، لیکن جس نے بھی تھوکرنا چاہا اس کا تھوکر خود اس کے اپنے منہ پر اُن گرا۔ لوگ حیرت زدہ اور شرمندہ ہو کر تھوکنے سے باز آ گئے۔

پروہت نے جھنجھلا کر حکم دیا۔ ”اس پر ڈنڈے برسائے جائیں۔ تھوکر کا کیا ہے وہ ہوا سے اڑ کر بھی منہ پر آ سکتا ہے۔“

کئی آدمی موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آپ کی طرف بڑھے اور آپ پر وار کیا۔ ڈنڈے آپ سے بالشت سوا بالشت دور رہ کر اس طرح واپس ہو جاتے گویا کسی نے ہاتھ سے پتھر کر واپس کر دیا ہو۔ واپسی میں یہ ڈنڈے اسی شخص کی پیشانی یا سر سے ٹیکر کر اسے لہو لہان کر دیتے۔

جیسے جیسے وار خالی جا رہے تھے پروہت کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پروہت نے ایک ڈنڈا خود لیا اور آپ کے سر پر ضرب لگائی لیکن وہ ڈنڈا بھی واپس ہوا اور اُلٹے پروہت کو لہو لہان کر دیا۔

دوسرا پروہت ابھی تک کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے زخمی پروہت کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ بولا۔ ”تو بھی کیسی بے عقلی کی بات کر رہا ہے یہ شخص مجھے جادوگر معلوم ہوتا ہے اور اس کے جادو کا میرے پاس ایک توڑ موجود ہے۔“

زخمی پروہت کا سر جھک رہا تھا۔ کہتے ہوئے پوچھا۔ ”یقیناً یہ شخص جادوگر ہے اب جادو کا توڑ بتاتا کر اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔“

دوسرے پروہت نے اسے سمجھایا۔ ”اگ جادو ٹوٹنے کو ختم کر دیتی ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں ایک بہت بڑا الاؤ جلایا جائے اور جب منوں لکڑی سے آتش کدہ تیار ہو جائے تو اس شخص کو اس میں جھونک دیا جائے اس طرح نہ تو یہ شخص بچے گا اور نہ ہی اس کا جادو اثر دکھائے گا۔“

’ زخمی پروہت کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔

دونوں پروہتوں نے بستی والوں کو حکم دیا کہ منوں لکڑی کا انتظام کیا جائے پوری بستی لکڑیاں جمع کرنے میں مشغول ہوگی آخر شام کے ہوتے ہوتے آدھا احاطہ لکڑی سے گھر گیا اس لکڑی پر چیری ڈالی گئی اور چیری کو آگ لگا دی گئی۔ بستی والوں نے احاطہ خالی کر دیا کیونکہ شعلوں کی لپیٹ میں وہاں کھڑا ہونا محال تھا وہ لوگ درختوں

اور مکالموں پر چڑھ گئے اور ایک مسلمان کے زندہ جلانے جانے کا منظر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آنے لگے۔

جب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو دونوں پروہتوں نے آپ کو احاطہ کی دیوار پر بٹھادیا اور پوچھا ”کہو اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“
آپ نے جواب دیا ”کیسا لگ رہا ہے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ آگ جل رہی ہے شعلے اٹھ رہے ہیں اس کی تپش سے درو دیوار تپ رہے ہیں اس کے سوا اور کیا لگے گا؟“

پروہت آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سوال سے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر یہ جادو گر ہیں تو کیا اس آگ نے ان کے جادو کا اثر زائل کر دیا جب آپ نے یہ بتایا کہ آگ کی تپش سے درو دیوار تپ رہے ہیں تو دونوں پروہت بہت خوش ہوئے۔
ان پروہتوں نے آپ کو شعلوں میں دھکیل دیا آپ آگ میں گر گئے اور بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابو احمد آگ میں جس جگہ گرے تھے وہ حصہ مرد پڑ چکا تھا اور اس پاس کے شعلے ابو احمد سے دور بھاگ رہے تھے۔

آپ نے اسی جگہ، جہاں گرے تھے مصلّا بچھا دیا اور نماز پڑھنے لگے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ نے پروہتوں سے پوچھا ”کیا خیال ہے؟ اب تو میں نکل سکتا ہوں تمہاری آگ مجھے جلانے سے انکار کر رہی ہے۔“

پروہتوں کی زبان گنگ ہو چکی تھی ان سے بولا نہیں جا رہا تھا بستی والوں پر ابو احمد کا رعب طاری ہو گیا تھا ابو احمد جیسے ہی باہر نکلے پوری بستی نے واہانہ آپ کو گھیر لیا۔ وہ شور کر رہے تھے ”یہ شخص بالکمال ہے سچا ہے، آگ نے اسے جلانے سے انکار کر دیا ہے اس لئے ہم اس کا دین اختیار کریں گے۔“

پروہتوں نے انہیں سمجھایا ”یہ شخص جادو گر ہے، لوگو! ذرا صبر کرو۔ اس کا

دین اتنی جلدی نہ اختیار کرو۔“

لیکن لوگوں نے اپنے پروہتوں کی ایک نہ سنی اور آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔

دونوں پروہتوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم کے لوگ ان کے ہاتھ سے نکل

چکے ہیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے وہ خود اپنے دل میں بھی ابو احمد کی سچائی اور عظمت کا اعتراف

کر رہے تھے لہذا انہوں نے آپ سے درخواست کی ”حضرت! ہم دونوں بنے آپ کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اب ہمیں بھی مسلمان کی بجائے اور ہماری قوم کو، جو اب مسلمان ہو چکی ہے ہدایت کر دیجئے کہ بدستور ہمیں بڑا مانتی ہے۔“
 آپ نے جواب دیا ”میں تم دونوں کو پہلے اسلامی تعلیم دوں گا اس کے بعد تم دونوں بستی کو تعلیم دینا۔ اسی طرح تم دونوں خود بخود بڑے ہو جاؤ گے۔“
 آپ نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا اور اس بستی کو دونوں دین دار پرہیزگاروں کے حوالے کر کے آگے بڑھ گئے۔

ایک عرصے بعد جب آپ وطن واپس پہنچے تو بڑھاپا آچکا تھا۔ یہاں اس بستی کے سوا آدمی آپ کا انتظار کر رہے تھے ان سوا آدمیوں نے آپ کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ اب تک دس ہزار افراد کو مسلمان کر چکے ہیں آپ بہت خوش ہوئے اور ان پر اتنی توجہ دی کہ ان میں سے بعض نے شیخ کامل کا مقام حاصل کیا۔

آپ نے جمادی الثانی ۳۵۵ھ میں وصال فرمایا اور جیسا کہ ابواسحق شامی نے آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فرمادیا تھا کہ یہ لڑکا ایک بہت بزرگ اور خانوادے کا بانی ہوگا ان کی یہ بشارت حرف بہ حرف پوری اُتری۔ بعد میں مشہور زمانہ خانوادہ، سلسلہ چشتیہ، انہی سے پھیلا اور اس خانوادے کی شعاعیں عرب، ایران، افغانستان، ماوراءالنہر اور ہندوستان اور پاکستان میں قیامت تک پھیلی رہیں گی۔



حضرت شیخ احمد رفاعیؒ

بَصْرَہ کا اَوَّلُ اَسْطُ کے درمیان جہاں دجلہ و فرات کا پانی جمع ہو کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے، وہاں جو بہت سارے گاؤں آباد تھے انہیں بطائع کہتے ہیں انہی بطائع میں ایک بستی میں اُمّ عبیدہؓ کی تھی اس بستی میں ایک عرب قبیلہ نبی رفاعؓ آباد تھا۔ مشہور صوفی شیخ احمد کا اسی قبیلہ سے تعلق تھا وہ رفاع قبیلہ سے تعلق کی بناء پر رفاعی کہلاتے تھے۔ یہ مروت اور محبت کے پتلے تھے اور ان کے نزدیک مروت اور محبت کے مستحق محض انسان ہی نہیں، تمام جاندار ہیں چنانچہ جانور تک آپ سے فیض پالتے تھے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے کہتے کہ تصوف یہ نہیں ہے کہ کوئی صوفی کراٹ اور خوارقِ عادات چیزیں دکھا کر لوگوں کو عاجز اور مغلوب کر لے بلکہ صوفی کا اصل کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ جانداروں کی خدمت کرے۔ طبیعت میں علم اور عاجزی اتنی جتنی کہ آپ کے مخالفت تک نادم اور شرمسار ہو جاتے۔

آپ چلہ کشی کی خاطر اُمّ عبیدہ کے باہر ایک جنگل میں چلے گئے وہاں چلہ کشی کرتے رہے اور جب اس سے فارغ ہوئے تو اچانک خیال آیا کہ بستی میں بہت سے گھر ایسے ہیں جنہیں ایندھن کی پریشانی درپیش رہتی ہے آپ اُن کے لئے لکڑیاں پختہ رہے اور جب لکڑیوں کا گھر آتنا بڑا ہو گیا کہ آپ اُسے بہ آسانی اٹھالیں تو اُسے اپنے سر پر رکھ لیا اور اس شان سے بستی میں داخل ہوئے بستی والوں نے جب یہ عجیبے غریب منظر دیکھا تو آپ سے دریافت کیا ”حضرت! یہ کیا ہے کیا آپ نے لکڑیاں پیچھے کا پیشہ اختیار کر لیا؟“

آپ نے جواب دیا ”نہیں بھائیو! ایسی کوئی بات نہیں میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جو انسانی خدمت کے ذیل میں آتا ہو مگر اس کا معاوضہ وصول کیا جائے“

اس کے بعد آپ نے یہ لکڑیاں مستحقین میں تقسیم کر دیں آپ کے مریدوں نے آپ کی اتباع میں یہ کام اجتماعی شکل میں انجام دینا شروع کر دیا۔ وہ اپنی مصروفیات میں سے

اتنا وقت ضرور نکال لیتے کہ جنگل سے لکڑیاں لاکر مستحقین میں مفت تقسیم کر دیا کریں بستی کے ناداروں کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا اور وہ شیخ احمد دفاعی کو دعائیں دینے آگئے۔

ایک دن لوگوں نے آپ کو ایک جگہ کھڑے دیکھا، چند ساعتوں بعد جب ادھر سے لوگوں کا پھر گزر ہوا تو آپ کو اسی جگہ بدستور کھڑے دیکھا۔ ایک شخص نے آپ کے قریب پہنچ کر طنزاً پوچھا ”حضرت! آپ کے پاس بڑا فالو وقت ہے کہ ایک ہی جگہ بے مقصد گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”میں بے مقصد نہیں کھڑا ہوں بھائی۔ یہاں میں ایک شخص کا انتظار کر رہا ہوں“

مقرر نے پوچھا ”کیا کسی مُرید کا انتظار فرما ہے میں آپ؟“
آپ نے جواب دیا ”نہیں، مُرید تو خود بھی میرے پاس پہنچ سکتے ہیں“
سوال ہوا ”پھر یہاں کس کا انتظار فرما ہے میں آپ؟“

آپ نے جواب دیا ”دراصل اس راہ سے ہر روز ایک نابینا گزر رہا ہے کل میں نے اُسے ایک جگہ ٹھوکر لکھا کر گرتے دیکھا ہے بس اس کے بعد ہی سے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر روز اس جگہ آجایا کروں گا اور اس نابینا کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا دیا کروں گا“

ایک مخلص مُرید نے کہا ”حضرت! یہ کام تو بڑا مشکل ہے اور اس صورت میں اس کی دشواری میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، جب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس بستی میں کئی اور اندھے بھی موجود ہیں آپ کس کس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی منزل تک پہنچائیں گے بڑی دشوار فتنے داری اپنے سر لی ہے آپ نے“

آپ نے جواب دیا ”لوگو! مجھے اس میں مزہ آتا ہے اور اگر کسی کام میں مزہ آئے لگے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کام کی لذت آدمی کو اس کام سے لگائے لگھے گی“
اس کے بعد آپ کے مُریدوں اور ارادت مندوں نے یہ اصول بنالیا کہ وہ بستی کے اندھوں کو بڑی ذمے داری اور مستعدی سے ادھر ادھر لایا لے جایا کرتے یہ اندھے ان مُریدوں کے ساتھ شیخ احمد دفاعی کو بھی بڑی دعائیں دیا کرتے۔



عصر کا وقت جا رہا تھا آپ کے پاس ایک بلی اس طرح بیٹھی تھی کہ کرتے کی داہنی ۱۶۲ آستین بلی کے نیچے تھی بلی خراٹے لینے کے انداز میں خُرخُر رہی تھی، نماز قضا نہیں کر سکتے تھے

اور بلی کو بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آخر آپ نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا کہ قریب رکھی ہوئی قلیتی سے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنی آستین کا وہ حصہ کاٹ دیا۔ جو بلی کے نیچے دبا ہوا تھا اس کے بعد آپ نماز پڑھنے چلے گئے نماز سے فارغ ہونے کے بعد بلی تو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے اور کٹی ہوئی آستین فرش پر پڑی ہوئی ہے آپ نے آستین اٹھا لی اور گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا: ”میرے مولا! میں نے تو حتی المقدور یہی کوشش کی تھی کہ بلی کے آرام میں میری وجہ سے خلل نہ پڑے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ اس سلسلے میں، میں نے کیا کیا، اب اگر بلی میری وجہ سے جاگی ہے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں، معاف کر دے۔“

کچھ دیر بعد مغرب کا وقت آگیا آپ نے آنسو خٹکے اور مغرب کی نماز ادا کی۔ فراغت کے بعد کٹی ہوئی آستین دوبارہ سینے لگے ابھی آپ آستین سی ہی رہے تھے کہ بلی میاؤں میاؤں کرتی دوبارہ آگئی اور آتے ہی اس نے خود کو آپ کی انگوٹھ میں گرادیا اور آنکھیں بند کر کے پڑی۔ آپ نے اوپر دیکھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا: ”الہ العالمین! میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں، بلی کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں، یہ مجھ سے خوش ہے۔“

آپ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے اور بلی آنکھیں بند کئے خرخر کر رہی تھی۔ آپ کے بے پناہ حلم اور مروت نے نادانوں کو گستاخ بنادیا تھا، ایک آپ بستی کی ایک گلی سے جو گزرتے تو بہت سارے لڑکوں کو کھیلنے اور آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے دیکھا آپ ان کے پاس بٹھرتے لڑکوں میں سے ایک تیز طرار لڑکا آپ کے پاس آیا اور گستاخی سے پوچھا ”تو ہمارے جھگڑے کا تماشا کیوں دیکھ رہا ہے؟“ آپ نے جواب دیا: ”میرے بچو! آپس میں مت لڑو جھگڑو، تم سب شریف والدین کے بچے ہو۔“

شریر لڑکے نے کہا: ”واہ ایک ہی رہی، لڑیں جھگڑیں ہم آپس میں اور نصیحتیں کرنے والا یہ معلوم نہیں کہاں سے آگیا۔“

دوسرے لڑکے نے زور سے سیٹی بجا لی اور کہا: ”جانے نہ پائے،“

تیسرے نے آواز لگا دی: ”کھسکا ہوا ہے،“

چوتھا بولا: ”علاج کراؤ، جلدی ٹھیک ہو جائے گا ابھی زیادہ خرابی نہیں نظر آتی۔“ ۱۶

آپ نے نہایت نرمی سے کہا: ”کیا یہ ساری باتیں تم سب میری بابت کہہ رہے ہو؟“
ایک لڑکے نے جواب دیا: ”وہ جناب! اتنی سادہ لوحی بھی کس کام کی؟“
آپ نے لڑکے سے پوچھا: ”بیٹے تمہارے والد کا کیا نام ہے؟“

لڑکے نے جواب دیا: ”فسادی“

آپ نے کہا: ”میرے بیٹے! باپ کو اس طرح نہیں کہتے۔ تم مجھے برا بھلا کہہ لو لیکن اپنے والدین کی عزت کرو۔“

ایک دوسرے لڑکے نے کہا: ”تب بچہ تمہارے معاملے میں کیوں دخل دیتے ہو؟“
آپ نے جواب دیا: ”میں تمہارے معاملے میں دخل نہیں دے رہا ہوں میرے بچو! بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ آپس میں لڑو جھگڑو نہیں، دوست ہو تو دوست ہی بن کر رہو۔“

ایک شریر لڑکے نے غصے میں کہا ”دریچا اب اپنی بکواس بند کر اور اپنا راستہ لے“
آپ نے نرمی سے کہا: ”بیشک میرے بچے میں نے جو کیا یا کہا، اس کی حیثیت بکواس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتی، اگر میں بکواس کر رہا ہوں تو تم سب خد سے میرے حق میں دُعا کرو کہ وہ مجھے صحیح راستے پر ڈال دے، سنا ہوں، جوانوں اور بوڑھوں کے مقابلے میں بچے کم گناہگار ہوتے ہیں، خدا تمہاری دُعائیں ضرور قبول کرے گا۔“
ایک لڑکے نے کہا: ”دوستو! تم سب اس نیک اور بزرگ شخص کی باتوں کا کس طرح مذاق اڑا سکتے ہو، یہ شخص تو بڑی اچھی باتیں کر رہا ہے۔“

دوسرے نے کہا: ”کیا تم نے سنا نہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ جوانوں اور بوڑھوں کے مقابلے میں بچے کم گناہگار ہوتے ہیں یعنی ہم لوگ کم گناہگار ہیں اس لیے ہم سب اس نیک انسان کو سزا کر خواہ مخواہ اپنے گناہوں میں کیوں اضافہ کریں۔ اگر ہم اس کی نصیحتیں مان لیں اور ان پر عمل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی اس جیسے نیک اور اچھے انسان بن جائیں۔“
سب سے زیادہ شریر لڑکا، جس نے آپ کا مذاق اڑانے میں پہل کی تھی، آپ کے قریب پہنچا اور التجا کرتے ہوئے کہا: ”جناب والا! مجھے معاف کر دیجئے میں نے آپ کا بڑا دل دکھایا۔“

آپ نے جواب دیا: ”تو نے میرا دل نہیں دکھایا میرے بچے! اس عمر میں سارے ہی بچے شریر ہوتے ہیں، میں نے تمہیں جو نصیحت کی تھی وہ اس عمر کے لئے تھی جب تم سب با شعور

اُس کے سنجیدہ ہو گئے بولے ”نہیں جناب! آپ کی نصیحتیں ہماری جیسی عمر والوں کے لئے
 بھی ہیں کیوں کہ ہم سب میں اتنی سمجھ تو موجود ہی ہے کہ آپ کی باتوں کے مفید اور مُضر اثرات کو سمجھ رہے ہیں؟
 آپ بہت زیادہ خوش ہو گئے بولے ”اگر یہ بات ہے تو میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے
 میری زبان میں تاثیر پیدا کر دی اور میری باتوں میں مفید اور صالح مطالب بھر دیے۔“
 لڑکوں نے آپ کو تھوڑی دُور ساتھ چل کر رخصت کیا اور اس کے بعد جو کھیل شروع کیا
 اس میں لڑائی جھگڑے کے بجائے، ضبط و مروت اور حلم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔



درویشوں کی ایک جمعیت نے آپ کا بستی میں قیام کیا۔ یہ درویش دنیا دار تھے اور اُن
 کا کام یہی تھا کہ بستی بستی کا دورہ کر کے لوگوں کو بے وقوف بنائیں اور اپنا اُلٹو سیدھا کریں آپ کو
 ان کی اُگمہ کی خبر ملی تو ان سے ملنے چلے گئے اور انہیں دعوت دی کہ جب تک آپ لوگ میری بستی
 میں ہیں میرے مہمان بن کر رہیں۔

دنیا دار درویشوں نے کہا ”کیوں؟ ہم تمہارے مہمان بن کر کیوں رہیں کیا ہم ہتھوڑی نہیں
 ہیں؟“

آپ نے جواب دیا ”میرے دوستو! توکل کا تھوڑا بہت مفہوم تو مجھے بھی
 معلوم ہے اگر آپ لوگ مجھے شرفِ میزبانی بخشیں گے تو اس سے آپ کے توکل میں کوئی فرق نہ آئے گا۔
 ایک درویش نے کہا ”سنا ہے تو بھی ہماری طرح ایک درویش ہے؟“
 آپ نے جواب دیا ”میں عاجز و در ماندہ انسان آپ کی برابری کس طرح کر سکتا ہوں
 میں ایک معمولی انسان ہوں اور درویش کے مرتبے سے ابھی تک محروم ہوں۔“
 دوسرے درویش نے پوچھا ”تو باتیں تو بڑی اچھی کر لیتا ہے اچھا اب یہ بتا کہ اگر ہم میں سے
 کوئی یہ کہے کہ تو مجھے کوئی نصیحت کر تو تو کون سی نصیحت کرے گا؟“
 آپ نے کچھ نامُل اختیار کیا۔ اس کے بعد کھجور کے درختوں کی اطراف اشارہ کرتے ہوئے۔
 پوچھا ”کیا تم ان درختوں کو دیکھ رہے ہو؟“

درویش نے جواب دیا ”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

آپ نے پوچھا ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

درویش نے جواب دیا ”یہ دیکھ رہا ہوں کہ کھجور کے درخت آسمان کی طرف سر

اٹھائے تے کھڑے ہیں اور وہ کھجوروں سے لڑے ہوئے ہیں۔“

آپ نے کہا: ”یہ مت کہو کہ کچھ وردوں سے لڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہو کہ کچھ بچوں کے بوجھ سے لڑے ہوئے ہیں۔“

دریش نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر طنزاً کہا: ”باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے یہ شخص۔“

دوسرے دریش بھی آپ کی باتوں میں بڑا مزہ لے رہے تھے۔ ایک نے کہا: ”بیچ میں مت بول، اسے اپنی بات پوری کر لینے دے۔“ پھر آپ سے کہا: ”ہاں تو تو اپنی بات جاری رکھ۔“

آپ نے کہا: ”کیا تم لوگوں نے کدو کی بیل دیکھی ہے؟“

دریش نے جواب دیا: ”ہاں دیکھی ہے۔“

آپ نے پوچھا: ”کیا وہ بھی کچھ رکی طرح تنی کھڑی رہتی ہے؟“

دریش نے جواب دیا: ”نہیں، وہ زمین پر کھچی رہتی ہے اور کدو زمین پر پڑا

رہتا ہے۔“

آپ نے کہا: ”خدا تمہارا بھلا کرے جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔“

دریش حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے ایک نے پوچھا: ”آخر تو کیا

کہنا چاہتا تھا میں بھی تو معلوم ہو۔“

آپ نے جواب دیا: ”ان دونوں مثالوں میں قدرت کا یہ نکتہ پنہاں ہے کہ جس نے

سراٹھایا اور غرور سے تن کر کھڑا ہوا، خدا نے اس پر کچھ رکی طرح ایک بوجھ لادیا اور یہ بوجھ

بلا مشرکت غیر اس کو تنہا ہی اٹھانا پڑے گا برخلاف اس کے کدو کی مثال میں یہ نکتہ چھپا ہے

کہ جس نے خاکساری، عاجزی اور فروتنی اختیار کی، اس کا بوجھ دوسروں پر ڈال دیا گیا، بالکل

کدو کی طرح، جو بیل کے بجائے زمین پر ڈال دیا جاتا ہے۔“

دریش اس طرزِ اثرِ لال سے بہت محظوظ ہوئے بولے: ”مثال تو تو

نے بڑی اچھی دی، اور کچھ؟“

آپ نے جواب دیا: ”میں جب کسی دریش کو دیکھتا ہوں تو یہی کہتا ہوں کہ دیکھو

اور غور کرو تم نے کس کا لباس پہن لیا ہے اور کس کی طرف کا ارادہ کر لیا ہے یا رکھو یہ نیوں

اور متقیوں کا لباس ہے اسے پہنا ہے تو مقربین کے واسطے پرچلو ورنہ لباس اتار دو۔“

ایک فقیر کو غصہ آگیا، وہ آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”اود جال! میں تجھے سمجھ گیا۔
 مجھے تیری بات پہلے ہی لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ تو نے محرمات کو حلال قرار دے
 رکھا ہے، میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو قرآن کے معانی اور مطالب بدل دیا کرتا ہے۔
 اوملحد اکتے! اپنی زبان بند رکھ ورنہ میں ٹھنڈا چکھاؤں گا کہ تو زندگی بھر یوں لکھے گا۔“

آپ نے درویش کے قدموں میں سر رکھ دیا اور نہایت عاجزی سے کہا: ”اے میرے
 سردارو! اپنے غلام کو معاف کر دو۔ میرا دھڑے سخن تمہاری طرف ہرگز نہ تھا، اس کے
 بعد آپ نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسے دینا شروع کر دیا۔ ”آپ لوگ خدا کے لئے
 مجھ سے راضی ہو جائیے ورنہ میں اپنے خدا کو لکھا منہ دکھاؤں گا میں دل آزادی کر کے اپنا جین
 اور کچھ ختم کر دوں گا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے ورنہ میں کہیں کا بھی نہ رہ ہوں گا۔“

ایک درویش نے کہا: ”یارو! میں نے بہت سے درویش دیکھے ہیں لیکن اس جیسا آدمی
 کوئی نہیں دیکھا اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا، میرا خیال ہے اس پر نیا دتی ہو گئی ہے اور
 ہیں اتنے تند و تلخ لب و لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیئے تھی۔“

دوسرے درویش نے کہا: ”میرا اپنا بھی یہی خیال ہے میں یہ جانتا ہوں کہ اگر یہی باتیں
 اس کے بجائے کسی اور کو کہی جاتیں تو اس وقت یہاں ایک ہنگامہ برپا ہوتا اور ہم سے معلوم
 نہیں کس کس کی، مار پیٹ سے حالت غیر ہو چکی ہوتی۔“

آپ نے کہا: ”اس لئے میں آپ سب سے کہتا ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا سنا ہے مجھے کہہ
 سُن لیجئے۔ میں آپ کو جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہوں گا لیکن اس قسم کی گفتگو کسی اور سے
 ہرگز نہ کیجئے گا کیونکہ دوسرا شخص فتنہ و فساد پر آمرائے گا اور اس سے آپ میں سے
 کسی کو کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

ان لوگوں نے آپس میں کہا: ”یہ شخص کمال کا ہے، برداشت اور حلم تو کوئی اس سے سیکھے
 ان لوگوں نے اسی وقت اس بستی سے کوچ کیا اور کہا: ”جس بستی میں آنا نہ بردست
 بزرگ رہتا ہو، وہاں ہم دنیا داروں کو اپنی کمینی حرکتوں سے باز رہنا چاہیئے۔“

آپ کے گاؤں سے دور، ایک دوسرے گاؤں میں ایک اور بزرگ رہتے تھے ان کا
 نام شیخ ابراہیم تھا، شیخ ابراہیم کے پاس آنے جانے والے شیخ احمد رفاعی کی بڑی تعریفیں
 کرتے، جس سے شیخ ابراہیم کو تکلیف پہنچتی۔

شیخ ابراہیم نے اپنے چند مرید شیخ احمد کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ وہ شیخ احمد رفاعی کے جملہ کوائف معلوم کر کے شیخ ابراہیم تک پہنچادیں۔ چنانچہ یہ مرید کچھ عرصہ آپ کے پاس رہ کر اپنے پیر کے پاس چلے گئے اور انہیں مطلع کیا کہ یہ عجیب سادہ سادہ ولیش ہے اس کے پاس نہ تو کوئی خانقاہ ہے نہ حجرہ نہ کچھ اور، عبادت اور ریاضت کے بعد جو وقت بچتا ہے لوگوں کی خدمت میں گزار دیتا ہے عورتوں مردوں کو یکجا کر کے وعظ و تلقین کرتا ہے اور اس کے ماننے والے اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

شیخ ابراہیم نے پوچھا کیا یہ بات بالکل درست ہے کہ شیخ احمد عورتوں اور مردوں کو یکجا کر کے وعظ و تلقین کرتا ہے؟
مریدوں نے جواب دیا ”ہم نے جو کچھ دیکھا، بیان کر دیا۔ جھوٹ اور مبالغے سے ہمیں کیا لینا ہے۔“

شیخ ابراہیم کو ایک نکتہ ہاتھ آگیا تھا، اسی وقت شیخ احمد رفاعی کو ایک خط لکھا۔

”و او دجال! او بدعتی! اور اے وہ شخص جس نے مردوں اور عورتوں کو یکجا جمع کر دیا ہے اپنی یہ حرکتیں بند کر دے اور درویشی کا ڈھونگ نہ رچا۔ میں تجھے انسان کے بجائے کتے کی اولاد سمجھتا ہوں اگر تو اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تو میں اپنے مریدوں کی فوج لے کر اُم عبیدہؓ اوّل کا او تیرا کام تمام کر دوں گا تاکہ خلافت تیری نحوست سے بچ جائے۔“

آپ نے یہ خط پڑھا اور ذرا بھی ملول نہ ہوئے۔ جو شخص خط لے کر آیا تھا اس سے فرمایا ”میں ابھی ابھی اس خط کا جواب لکھ کر تیرے حوالے کرتا ہوں، لیتا جا۔“

آپ نے جواب میں لکھا ”میرے لائق صدا احترام شیخ ابراہیم! آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا، پیدا فرمایا اور جو باتیں چاہیں مجھ میں رکھ دیں لیکن اس کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی نیکو کاری سے میرے حق میں دعا کیجئے اور اپنے علم و کرم سے مجھے محروم نہ رکھیے۔“

شیخ ابراہیم کو جب یہ جواب ملا، تو اس پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ دیوانہ ہو گیا

اس نے اپنی خانقاہ چھوڑ دی اور کسی طرف کی راہ لی۔ کہتے ہیں اس کے بعد کسی نے بھی شیخ ابراہیم کو نہیں دیکھا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ شیخ کہاں غائب ہو گیا۔



بستی کے دو آدمیوں میں بڑی دشمنی ہو گئی تھی، پہلے یہ دونوں دوست تھے بعد میں کسی عورت کے سبب اختلاف ہو گیا اور دونوں اس فکر میں پھنسے لگے کہ جس کسی کو بھی موقع ملے گا دوسرے کی مرگمت کر دے گا اس بات اور اس ارادے کو کچھ ہی عرصہ گزر رہا تھا کہ اس عورت نے دونوں ہی کو دھوکا دیا اور کسی تیسرے کے ساتھ فرار ہو گئی دونوں کو ایک دوسرے پر یہ شبہ تھا کہ اس نے عورت کو کہیں چھپا دیا ہے اس سلسلے میں دونوں ہی ایک دوسرے کو لعنت ملا مت کرتے رہتے اور دھمکیاں دے کر کہتے کہ اس عورت کو جہاں کہیں بھی چھپا یا ہے نکال لاؤ اور میرے حوالے کر دو ورنہ اس کا بڑا برا نتیجہ نکلے گا لیکن دونوں ہی اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔

ایک دن، سرِ شام ایک نے دوسرے کو بازار میں پکڑ لیا، کہا۔ ”دیکھ تو سیدھی طرح سے اُس عورت کا پتہ بتا دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا“ دوسرے نے جواب دیا ”خوب! یعنی اس کو چھپایا خود تو نے اور اُلٹا مجھ سے اُس کا پتہ تو کچھ رہا ہے میں خود تجھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اُسے جہاں کہیں بھی چھپا رکھا ہے پتہ بتا دے ورنہ اگر میں نے تیری مرگمت کر کے اس کا پتہ معلوم کر لیا تو تیری کرکری ہو جائے گی“ پہلے نے جواب دیا ”یہی عمل میں بھی کر سکتا ہوں، کیا اللہ نے مجھے ہاتھ پر نہیں دیے تو مارے گا تو میں بھی ماروں گا تو اس بھول میں بھی نہ رہ کر میں آسانی سے تیری مار کھا لوں گا“ دوسرے نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ”تب پھر رہی، میں اگر اپنے ماں باپ کا ہوں تو اس عورت کا پتہ چلا کر ہوں گا اور تجھے اس کا پتہ بتلانا ہی پڑے گا“ پہلے نے کہا ”میں بھی یہی کہتا ہوں کہ تو مجھ سے اس عورت کو کب تک چھپائے گا۔ ایک نہ ایک دن میں طاقت کے ذریعے یہ معلوم کر کے رہوں گا“

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور عہد کیا کہ جو بھی پیش پا جائے جان سے مارے بغیر محض مار پیٹ کر کے عورت کا پتہ معلوم کرے۔ جو میں کامیاب ہو جائے گا اُسے انعام بھی دیا جائے گا اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس پر خوش تھے کہ انہیں

جب اس عورت کا پتہ معلوم ہی نہیں تو وہ ایک دوسرے کو بتائیں گے کیا ؟
 دونوں موقع کی تاک میں تھے لیکن ایک دوسرے سے اتنے ہوشیار تھے کہ کسی کو کوئی
 موقع ہی نہیں مل رہا تھا ان دونوں کی اس شرط کا حال شیخ احمد کو بھی معلوم ہو گیا چنانچہ
 وہ ان دونوں میں سے ایک سے ملے اور کہا ”برادر عزیز! جیسا کہ تم سب پہلے ہی سے واقف ہو
 کہ میں ایک بے ضرر انسان ہوں اور کسی کو آج تک نقصان نہیں پہنچایا ہے
 اس شخص نے پوچھا ”حضرت! اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟
 آپ نے جواب دیا ”میں چاہتا ہوں کہ چند دن تمہارا مہمان رہوں، کیا تم مجھے اپنا
 مہمان بنانا پسند کرو گے ؟“

اس نے کہا ”کیوں نہیں کیوں نہیں، ضرور، جب کہتے آپ کو مہمان بنانے کا شرف
 حاصل کر لوں ۔“

آپ نے کہا ”لیکن ایک شرط پر مہمان بنوں گا ۔“
 اس نے جواب دیا ”حضرت! آپ جیسے حلیم الطبع انسان کی ہر شرط منظور، فرمائیے۔“
 آپ نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم میرے مہمان ہونے کی خبر کو راز میں رکھو، کسی کو اس
 کی خبر نہ ہونے پائے ۔“

اُس نے فراخ دلی سے جواب دیا ”منظور، اور کچھ ؟“
 آپ نے کہا ”اور دوسری شرط یہ ہے کہ تم ایک رات کے لئے اپنا لباس مجھے دے
 دو گے اور میرا لباس تم پہن لو گے ۔“

اُس نے آپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیسی شرط ہے اور
 اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اس نے یہ بھی سوچا کہ کہیں ان کے دماغ میں کوئی گڑبڑ تو
 نہیں ہو گئی آپ نے کہا ”وہ شخص تو کئی دسویں میں پھنس گیا ؟ میرے دماغ میں کوئی
 خرابی نہیں، میں جو کچھ کر رہا ہوں تیری بھلائی کی خاطر کر رہا ہوں ۔“
 اس شخص نے پریشان ہو کر عرض کیا ”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے فرمائیے،
 ان دو کے علاوہ کوئی اور شرط ؟“

آپ نے جواب دیا ”بس، اور یہ کہ میں آج رات تیرے ہی گھر میں رہوں گا ۔“
 اس شخص نے آپ کو مہمان بنالیا ۔ وہ آپ کے باسے میں سوچتے ہوئے بھی گھبرا

رہا تھا کیونکہ اس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ احمد کو دلوں کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔
 شام سے ذرا پہلے آپ نے اپنے میزبان کو منع کر دیا کہ وہ کسی سے ملاقات نہ کرے
 اور کوش کر کے ٹال دے چنانچہ میزبان نے اس پر آنکھ بند کر کے عمل کیا۔ رات کو دونوں
 نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد آپ نے میزبان کو اپنے کپڑے پہنا دیے اور خود
 میزبان کے کپڑے پہن لیے۔ سوتے وقت آپ نے دریافت کیا ”تو کہاں سوتا ہے؟“
 اُس نے ایک کمرے میں لے جا کر بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس کمرے
 اور اس بستر پر“

آپ نے جواب دیا ”میں اس کمرے اور اس بستر پر آرام کروں گا۔“
 میزبان نے کہا ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، جیسی آپ کی مرضی۔“
 چنانچہ آپ اس کمرے میں اور اسی بستر پر سو گئے۔

رات کے پچھلے پہر اُن کے کمرے میں ایک سایہ چھپتا چھپاتا، بچتا بچاتا داخل ہوا،
 کمرے میں ایک مدھم نو والی شمع روشن تھی۔ آنے والا آپ کے سر پرانے کھڑا ہو گیا۔
 اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی اس نے آپ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور آپ کی پٹائی شروع
 کر دی وہ آپ کو پٹیتا جاتا اور کہتا جاتا ”آج تو مجھ سے نہیں بچ سکتا۔ اس عورت کو تو نے
 کہاں چھپا دیا ہے؟ پتہ بتا دے ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔“

آپ فوراً کھڑے ہو گئے لیکن آپ نے اپنے چہرے کو چادر میں چھپا لیا تھا۔ پیٹنے
 والے نے لکڑی تو پھینک دی، مٹکول اور لالتوں سے مروت کرنے لگا۔ آپ نے کوئی
 مزاحمت نہ کی اور نہ ہی شور و غل کیا۔ پیٹنے والا برابر پیچھے جا رہا تھا۔ ”میں کہتا ہوں
 اس عورت کا پتہ سیدھی طرح بتا دے ورنہ میں تیرا کلا گھونٹ دوں گا۔“

آپ نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آپ کے چہرے پر پے درپے کئی منٹ
 دسید کر دیے، بولا ”کیا تو گونگا ہو گیا ہے کیا تیری زبان کٹ گئی ہے؟ کیا خدا نے تیری
 قوت گویائی چھین لی؟“

آپ نے بدستور خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آپ کی خاموشی نے پیٹنے والے کو بہت
 زیادہ مشتعل کر دیا۔ وہ بہت زور سے چیخا ”اگر تو اس عورت کا پتہ نہیں بتائے گا تو
 آج مجھ سے بچے گا کبھی نہیں۔ میں تیری جان لے لوں گا، تجھے جان سے مار دوں گا۔“

میں تیرا خون پی جاؤں گا “

اسی لمحے کمرے میں شیخ احمد کا میزبان داخل ہوا اور اس نے اس شخص کو پکڑ لیا اور چیختا ہوا بولا: ”اے یہ تو کیا کر رہا ہے؟ تو شیخ احمد کو مار رہا ہے، یہ تجھے اس عورت کا پتہ کیا بتائیں گے؟“

پیٹنے والا سناٹے میں آگیا اور اپنے ہاتھ روک لئے، حیرت سے شیخ احمد کے میزبان کو دیکھا اور شرمندگی سے کہا: ”اے یہ تم ہو۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے تم پر قابو پالیا ہے میرے دوست اور آج تم سے اس عورت کا پتہ معلوم کر کے ہی رہوں گا۔“

میزبان نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ اس کا وہی دوست تھا جس سے عورت کے بارے میں یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ دونوں میں سے جس کسی کو موقع ملے گا وہ فریق مخالف کو دھوکے سے قابو لین کر کے، مار پیٹ کر اپنی مشترکہ محبوبہ کا پتہ معلوم کر لے گا۔

دوست نے حیرت سے پوچھا: ”لیکن یہ معاملہ کیا ہے؟ تیرا کمرہ؟ تیرا بستر؟ تیرا لباس؟ یہ سب کیا ہے؟“

میزبان دوست نے پوری تفصیل بتا کے کہا: ”آج شیخ احمد خواہش کر کے میرے مہمان ہوئے تھے اور دہائی کی شرائط یہ رکھی تھی کہ اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ رات کو میرا لباس پہنیں گے اور میں ان کا لباس پہن لوں گا۔ انہوں نے تیسری شرط یہ رکھی تھی کہ میں انہیں سونے کے لئے اپنا کمرہ اور اپنا بستر دے دوں گا چنانچہ میں نے رات کے کھانے کے بعد اپنا لباس، اپنا کمرہ اور اپنا بستر آپ کے حوالے کر دیا۔“

اب آپ کے چہرے سے چادر ہٹ چکی تھی اور آپ کا چہرہ حاف دیکھا جاسکتا تھا آپ کا چہرہ لہو لہان ہو رہا تھا اور آپ کے دوسرے اعضاء جسمانی بھی چوٹ سے بُری طرح دکھ رہے تھے میزبان نے چادر کے پلو سے آپ کے چہرے کا خون پونچھنا شروع کر دیا اور پوچھا: ”یہ آپ نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب نہیں دیا۔ پیٹنے والا شرمندہ اور خجل گردن جھکائے کھڑا تھا بولا: ”کمال تو یہ ہے کہ میاں جی نے شروع سے آخر تک اپنی زبان بند رکھی، چاہتے تو احتجاجاً شروع کر سکتے تھے۔“

میزبان نے عاجزی سے پوچھا: ”حضرت! آپ نے مدد کے لئے آواز تو دی ہوتی

مجھے پکارا تو لیا ہوتا ۛ

آپ نے بڑی معصومیت سے جواب دیا ۛ اگر میں بول دیتا تو یہ شخص میری مرمت نہ کرتا بلکہ رگ جاتا اور میرے یہاں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ۛ

میزبان نے پوچھا ۛ آپ کے یہاں آنے کا کیا مقصد تھا؟ کون سا مقصد فوت ہو جاتا؟
آپ نے جواب دیا ۛ مجھے کشف سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آج تیرا یہ دوست تیری پیٹائی کے لیٹے آئے گا اور تجھے اس حد تک مار لگائے گا کہ تیری جان ہی چلی جائے گی چنانچہ میں نے سوچا کہ تیرے گھر میں تیرے لباس اور تیرے کمرے میں تیرے سونے کے بستر پر میں خود ہی لیٹ جاؤں اور تو اپنے دوست کے شر سے محفوظ رہے ۛ

میزبان نے کہا ۛ لیکن حضرت! آپ یہ تو سوچیں کہ اگر آپ خاموش نہ رہتے اور اس کے پہلے وار پر ہی شور کر دیتے تو آپ مار سے بھی بچ جاتے اور میں آپ کی مدد کو آ جاتا ۛ
آپ نے جواب دیا ۛ خاموشی میں نے اس لئے اختیار کی کہ تیرا دوست اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لے اگر اسے اس کے پہلے وار پر ہی روک دیا جاتا تو اس کے دل کی بھڑاس نہ نکلتی اور یہ کسی دوسرے موقع پر بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا، لیکن میرا خیال ہے کہ اب یہ ایسا نہیں کرے گا اور اپنے دل میں ندامت ضرور محسوس کر رہا ہوگا ۛ

میزبان کا دوست واقعی بہت شرمندہ تھا، اس کا دل بھرا، اس نے لگا لگا کر فرتے آوازیں کہاں ۛ یہ میں نے کیا کر دیا میاں جی! یہ میں نے کیا کر دیا؟

آپ نے اس کی پشت تھپتھپائی، فرمایا ۛ شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، مجھے کوئی شکایت نہیں، میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو بھی خوش ہو جا ۛ
اس شخص میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آپ سے آنکھ ہی ملا لیتا۔

میزبان نے کہا ۛ میاں جی! مجھے پٹ جانے دیتے۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ آپ نے میرے خاطر یہ کھ اٹھا یا ہے یہ چوٹیں برداشت کیں، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ۛ
آپ نے جواب دیا ۛ مجھے اس میں مزہ آتا ہے کہ دوسروں کے دکھ خود بھیلوں، دوسروں کے غم خود سہوں، اس میں جلدت ہوتی ہے اگر تم دونوں کو اس کا علم ہو جائے تو تم بھی یہی کرنے لگو ۛ

دونوں دوست شرمندہ اور نادم سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

”کچھ دیر بعد آپ نے پوچھا: ”وہ عورت کہاں ہے جس کی وجہ سے تم دونوں کی دوستی میں دشمنی کا عنصر شامل ہو گیا۔“

میزبان نے پورا واقعہ بتا کے عرض کیا: ”اب ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں سے کسی ایک نے اس عورت کو کہیں پھینکا دیا ہے اور اسی لیے ہم دونوں اس فکر اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس کا پتہ معلوم کر لیں۔“

آپ نے قطع کلام کیا، فرمایا: ”تو اب تم دونوں اپنے اپنے دلیں سے یہ غلط فہمی نکال دو، کیونکہ اس عورت کو ایک تیسرا شخص لے اڑا ہے۔ اللہ نے چاہا تو میری اس بات کا کوئی نہ کوئی ثبوت بھی عنقریب مل جائے گا۔“

میزبان کے دوست نے شرمندگی سے کہا: ”آپ نے جو کچھ فرمایا۔ ہمیں اس کی صداقت پر پورا یقین ہے اور ہمیں اس کے لیے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”یہ نہیں میرے دوستو! تم پریشان نہ ہو۔ خدا نے وہ انتظام بھی کر دیا ہے جس سے تمہارے دلوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور تم دونوں ایک بار پھر مخلص اور گہرے دوست بن جاؤ گے۔“

آپ دوسرے دن صبح ان دونوں سے جدا ہو گئے، اس دن سہ پہر کو وہ عورت خود بخود ان دونوں کے پاس پہنچ گئی اور رو کر اپنی مصیبت کی داستان سناتی رہی۔ اس نے بتلایا کہ اُسے کس طرح ایک شخص اغوا کر لے گیا تھا اور وہ کتنی مشکلوں سے بھاگ کر واپس آئی ہے وہ دونوں شیخ احمد کے پاس گئے اور ان سے معافیاں مانگتے رہے آپ نے ان دونوں کو نصیحت کی کہ اب جبکہ عورت آپہنچی ہے، تم دونوں میں سے کوئی ایک اس سے نکاح کر لے۔



ایک مرتبہ!

شیخ احمد کے بھانجے شیخ ابوالحسن ماموں کی ملاقات کو جو آئے تو حجرے کے دروازے پر انہیں احساس ہوا کہ اندر کوئی شخص موجود ہے اور وہ شیخ سے باتیں کر رہا ہے۔ شیخ ابوالحسن حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ اندر موجود شخص باتیں کر کے باہر نکلے تو یہ اندر داخل ہوں۔ کافی دیر بعد بھانجے

نے اندر جانا چاہا لیکن اس وقت وہاں ایک عجیب ہی منظر تھا۔ ابوالحسن نے دیکھا، وہ شخص باتیں کرتے کرتے ایک دم جواٹھا تو باہر کی طرف آنے کے بجائے دیوار کے پھوٹے سے روزن میں داخل ہوا اور وہاں سے کسی طرف غائب ہو گیا ایک چمک تھی بجلی کی جو روزن میں گھسی اور ناپید ہو گئی۔

ابوالحسن ڈرے پہے حجرے میں داخل ہوئے اور اپنے ماموں سے کہا ”ماموں جان! یہ شخص کون تھا؟“

شیخ احمد نے پوچھا ”کیا تو نے اُسے دیکھا؟“

ابوالحسن نے جواب دیا ”ہاں، میں نے اُسے دیکھا اور وہ اس حجرے سے جس طرح گیا ہے اس بات نے مجھے چونکا دیا ہے کہ آخر وہ برقی خائف کی طرح اس حجرے سے شخصیت کس طرح ہوا؟“

شیخ احمد نے کہا ”اب جبکہ تو نے اُسے دیکھ ہی لیا ہے تو میں اس کا تعارف بھی کر اُسے دیتا ہوں، اصل میں یہ کوئی انسان نہیں تھا اُس کا تعلق رجال الغیب سے تھا یہ تین دن سے بارگاہِ کبریائی سے ہجور (معزول) ہو چکا ہے۔“

ابوالحسن نے پوچھا ”معزولی کا سبب؟“

آپ نے جواب دیا ”یہ جزائرمحیط میں رہتا ہے چند دن گزرے وہاں تین دن لگاتار بارش ہوتی رہی۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا ”اے کاش یہ بارش آباد زمین پر ہوتی اور انسان اس کا فرہ چکھتا اور اُسے اس کا فائدہ پہنچتا، اس کے اس خیال سے خدا ناخوش ہو گیا اور اُس نے اسے ہجور (معزول) کر دیا۔“

ابوالحسن نے پھر پوچھا ”کیا آپ نے اُسے یہ بتا دیا کہ یہ شخص خدا کا ہجو ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”نہیں، میں نے اُسے یہ نہیں بتایا۔“

ابوالحسن نے کہا ”یہ تو آپ نے بڑا ظلم کیا۔ آخر آپ نے بتایا کیوں نہیں؟“

آپ نے کہا ”مجھے اس پر شرم آئی کہ اس کی معزولی کی خبر میں سناؤں۔“

ابوالحسن نے عرض کیا ”تب پھر مجھے اس کی اجازت دیجئے کہ میں اُسے اُس کے

حال سے مطلع کر دوں۔“

آپ نے جواب دیا ”اگر تیری یہی خواہش ہے تو میری طرف سے اس کی پوری

پوری آزادی اور اجازت ہے کہ تو کسے پریشانی سے بچا لے، میں تیری جو مدد کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔

ابوالحسن نے پوچھا: ”لیکن جزائر محیط تک میں پہنچوں گا کس طرح؟“
 آپ نے کہا: ”اچھا، اپنا سرگرمیہ بان میں تو ڈالنا۔“
 ابوالحسن نے اپنا سرگرمیہ بان میں ڈال لیا۔ اسی لمحے ابوالحسن کو یہ محسوس ہوا
 گویا وہ کسی سے مخاطب ہیں اور وہ ان کے سامنے موجود ہے۔

انہوں نے اپنے ماموں سے کہا: ”ماموں جان! میری حیرت کس طرح بھی کم نہیں
 ہو رہی ہے برابر مارے حیرت کے میرا برا حال ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”ابوالحسن! خاموش رہ، دم نہ مار تو کسی سے بھی مخاطب
 نہیں ہے اور نہ ہی تو کسی کے سامنے موجود ہے اس وقت تو حالت سفر میں ہے تو سفر کر رہا
 ہے بحر محیط کی طرف۔“

ابوالحسن نے محسوس کیا۔ ماموں کی آواز ڈوبتی جا رہی ہے اور وہ اپنے ماموں
 سے بہت دور ہوتا جا رہا ہے۔ اچانک اسے حکم ملا: ”ابوالحسن! سر اٹھا اور آنکھیں کھول دے۔“
 ابوالحسن نے حکم کی تعمیل میں آنکھیں جو کھولیں تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ
 کسی اجنبی جزیرے میں کھڑے ہیں انہوں نے پوچھا: ”یہ میں کہاں آ گیا؟“
 کسی نے جواب دیا: ”یہ بحر محیط کے جزائر ہیں انہی جزائر میں سے ایک میں اس
 وقت تم کھڑے ہو۔“

ابوالحسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ وہ یہاں کیا کریں؟ کس سے اور کہاں
 ملیں اور کہہ کر سفر اختیار کریں۔ آخر ایک طرف یہ اپنی مرضی ہی سے چل پڑے ابھی یہ زیادہ
 دور نہیں گئے تھے کہ ایک جگہ اس شخص کو بیٹھ دیکھا جسے وہ اپنے ماموں کے حجرے
 میں باتیں کرتے دیکھ چکے تھے ابوالحسن اس شخص کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اس نے
 اوپر نظریں اٹھائیں اور پوچھا: ”تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟“

ابوالحسن نے پوچھا: ”تو نے مجھے نہیں پہچانا؟ کیا تو واقعی مجھے نہیں جانتا؟“
 اس نے جواب دیا: ”نہیں میں تجھے نہیں جانتا اور تو یہاں آیا کس طرح؟“
 ابوالحسن نے کہا: ”مجھے شیخ احمد رفاعی نے بھیجا ہے اور میں نے تجھے

دہیں دیکھا تھا ۛ

اس کے بعد ابوالحسن نے پوری تفصیل سنا دی، کہا ”میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تجھے بتا دوں، خدا تجھ سے خوش نہیں ہے اس لئے کچھ ایسا کر کہ وہ تجھ سے راضی ہو جائے ۛ

وہ بہت فکر مند ہو گیا کچھ دیر خاموش رہ کر بولا ”میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ میں تجھے جو ہدایت دوں، اس پر تو پوری طرح عمل کرے گا ۛ

ابوالحسن نے جواب دیا ”میں تیری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ۛ
اس شخص نے کہا ”تو میرا خرقہ میری گردن میں ڈال کر گھسیٹا پھر اور باواز بلند یہ کہتا رہ کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے ۛ
ابوالحسن نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ اس کا خرقہ گردن میں ڈال کر گھسیٹنا شروع کیا اور ساتھ ہی باواز بلند کہتا جاتا تھا کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے۔

ابھی اس عمل کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آواز آئی ”اے ابوالحسن! یہ تو کیا کرتا ہے اسے پھوڑ دے کیونکہ فرشتوں میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور وہ رو رہے ہیں اور اس شخص کو مطلع کر دے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو چکا ہے ۛ

ابوالحسن پر اس آواز نے ایک کیفیت طاری کر دی۔ فرط خوشی میں ان کی آنکھیں بند ہو گئیں ابوالحسن نے سوچا یہ خوشخبری اس شخص کو بھی سنا دوں لیکن جیسے ہی آنکھ کھولی تو پتہ چلا کہ وہ بحر محیط کے بجائے اپنے ماموں شیخ احمد رفاعی کے سامنے کھڑے ہیں ابوالحسن حیرت زدہ اپنے ماموں کو دیکھتے رہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ گزر چکا ہے کیا وہ ایک واقعہ تھا یا محض خواب و خیال۔ چاہتے تو ماموں سے پوچھ لیتے لیکن ان میں ہمت نہیں تھی۔ ادب سے خاموش بیٹھ رہے۔

شیخ احمد رفاعی کو حضرت غوث الاعظم کے ہم عصر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا ایک دن آپ کی خدمت میں شیخ محمد صادق شیبانی نے حاضری دی اور کہا ”حضرت! میں حضرت غوث الاعظم کے پاس سے چلا آ رہا ہوں ۛ

غوث الاعظم کا نام سن کر آپ پر لرزہ سا طاری ہو گیا، بولے ”انہوں نے ۛ

مجھ گنہگار کے پاس تمہیں کیوں بھیجا ہے؟

شیبانی نے جواب دیا: ”حضرت غوث الاعظم نے پوچھا ہے کہ عشق کیا ہوتا ہے؟ آپ نے ایک سر داہ بھری بولے؟“ حضرت عشق کا مفہوم مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں! حالانکہ وہ عشق کے مفہوم سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔“

شیبانی نے عرض کیا: ”حضرت! بات مذاق یا تمسخر کی نہیں ہے انہوں نے واقعی اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے یہ کہا ہے کہ عشق کا مفہوم شیخ احمد رفاعی سے زیادہ اچھا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔“

شیخ احمد پر وقت طاری ہو گئی اور انہوں نے ایک پُر سوز آہ کھینچی فرمایا: ”حضرت غوث الاعظم سے فرما دینا کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں اللہ کے سوا ہر شے جل جاتی ہے۔“ جس وقت آپ یہ فرما رہے تھے شیخ احمد کے اس پاس آگ لگ چکی تھی اور اس آگ نے ان دونوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ وہ شخص یہ جواب لے کر حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

آپ لوگوں کے اصرار پر تعویذ بھی دے دیا کرتے تھے لیکن یہ تعویذ قلم سیاہی کے بجائے اپنی انگلی سے لکھ دیا کرتے تھے ایک دن کسی ارادت مند نے یہ سوچا کہ غالباً شیخ لوگوں کو ٹالنے کی خاطر ایسا کر دیا کرتے ہیں اس نے ایک شخص سے آپ کا محض انگلی پھیرا ہوا تعویذ لیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اس نے یہ سادہ کاغذ آپ کی طرف بڑھا دیا کہ حضرت! میرے کاغذ پر تعویذ لکھ دیجئے۔

آپ نے سادہ کاغذ لے لیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”بھائی! کیا تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا: ”بھلا یہ میری مجال کہ میں آپ سے مذاق کروں؟ میں اتنی ہمت کس طرح کر سکتا ہوں۔“

آپ نے کہا: ”بھائی! اس کاغذ پر تو پہلے ہی سے تعویذ لکھا ہوا ہے، اب مزید کیا لکھوں؟“

اس نے سادے کاغذ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”حضرت! اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے مجھے بھی تو دکھائی دے کہ اس پر کیا لکھا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ اس پر جو کچھ بھی لکھا ہے میری آنکھیں ابھی طرح دیکھ رہی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس شخص کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا: ”لے اب پڑھ اس تعویذ کو۔“

اس شخص نے غور سے جو دیکھا تو اس پر واقعی آیات قرآنی کے دو فقرے لکھے ہوئے تھے اُس نے شرمندہ ہو کر آپ سے معافی مانگی اور صاف صاف بتا دیا کہ اس طرح وہ آپ کا امتحان لے رہا تھا۔

ایک دن یہی شخص آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور گزارش کی۔ ”حضرت! آج میں اپنی بہت بڑی ضرورت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں امید ہے کہ آپ مجھے یابوس نہیں کریں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”لیکن جو کچھ تو چاہتا ہے اس کا تعلق تیرے اعمال سے ہے۔“ اس شخص نے عاجزی سے کہا: ”یہ تو میں خود بھی جانتا ہوں کہ میں آپ سے جو طلب کرنے آیا ہوں اس کا تعلق میرے اعمال سے ہے لیکن کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے میری سفارش فرمادیں اور خدا اُسے منظور کر لے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر ایسا ہو جایا کرے تو پھر اچھے اعمال کی کوئی ضرورت ہی نہیں باقی رہے گی۔“

وہ شخص بہت بے چین تھا، بولا: ”پہلے آپ میری درخواست سن تو لیجئے سُنئے بغیر کوئی فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں آپ۔“

آپ نے فرمایا: ”میں خوب جانتا ہوں کہ تو کیا درخواست لے کر یہاں آیا ہے، اگر تو اُسے سنا ہی چاہتا ہے تو سُن لے کیا تو میرے پاس اس لئے نہیں آیا ہے کہ تو میرے واسطے سے آتشیں دوزخ سے نجات پا جائے کیا تو جنت کی خواہش میں میرے پاس نہیں آیا ہے؟“

وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور روتے ہوئے کہا: ”بے شک میں اسی لئے یہاں آیا ہوں۔ میں ملتجی ہوں آپ خدا سے میری سفارش کر دیجئے تاکہ آتشیں دوزخ مجھ پر حرام ہو جائے۔“

آپ نے جواب دیا: ”تیرے حق میں کوئی ایسی دُعا میں اُس وقت کر سکتا ہوں

جب تو مجھے یہ یقین دلادے کہ تو اپنی بقیہ زندگی تائب ہو کر گزارے گا جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بخشش کا تعلق انسان کے اپنے اعمال سے ہے اگر انسان زندگی بھر گنہ گار رہے گا تو پھر بخشش کس طرح ہوگی ؟

وہ شخص رونے لگا ، بولا : ” یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی بقیہ زندگی توبہ پر قائم رہ کر گزار دوں گا ، اب آپ مجھے یہ یقین دلادیجئے کہ آپ خدا سے میری سفارش فرمادیں گے آپ مجھے مطمئن فرمادیجئے “

آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس شخص کو حکم دیا : ” تو بھی فضائے بسیط پر نظریں جمائے رکھ اور مجھے بتا کہ تجھے کیا نظر آرہا ہے “

اس شخص نے آسمان کی طرف دیکھا ، اوپر کچھ بھی نہ تھا لیکن کچھ دیر بعد بجلی کی طرح لہراتی ہوئی کوئی چیز نیچے اتری اور اس شخص کے بالکل سامنے ایک کاغذ آن کر ا۔ آپ نے وہ کاغذ اٹھا کر اس شخص کے حوالے کر دیا اور کہا : ” دیکھ یہ تیرے لیے اوپر سے پروانہ نجات اُتر رہا ہے ، اس کی حفاظت کر اور اپنی بقیہ زندگی توبہ پر قائم رہ کر گزار دے ۔ اللہ نے چاہا تو تیری بخشش ہو جائے گی مرنے سے پہلے اپنے ورثا کو وصیت کر دینا کہ وہ اس کاغذ کو تیرے کفن میں رکھ دیں “

وہ شخص بہت خوش ہوا اور اس سادے کاغذ کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل سادہ تھا اس نے کہا : ” حضرت ! یہ تو بالکل سادہ ہے اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے “

آپ نے جواب دیا : ” اس پر جو کچھ لکھا ہے خطِ نور سے لکھا ہے جسے تو نہیں پڑھ سکتا “

وہ شخص یہ کاغذ لے کر خوش خوش چلا گیا ۔ آپ نے ایک بار پھر اسے ہدایت کر دی کہ بقیہ زندگی معاصی سے پاک ہونا چاہیئے ورنہ میں خدا سے تیرے حق میں اپنی برأت کی دعا کر دوں گا ۔

آپ نے زندگی بھر لوگوں کو اس طرح خوش رکھا کہ دوسروں کی اذیتیں اور مصیبتیں حتی الامکان اپنی جان پر لیتے رہے آپ نے مرض الموت میں اپنے ایک خادم سے فرمایا : ” مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس بار شاید دہن آکے رہے گی “

خادم نے پوچھا : ” حضرت ! یہ دہن کیا چیز ہے ، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا “

آپ نے جواب دیا۔ ”میں موت کو دلہن کہہ رہا ہوں کیونکہ دوسروں کے لئے موت میں اذیتیں ہوں گی، کرب ہوگا، لیکن میں موت کو اس طرح قبول کروں گا جس طرح عام لوگ اپنی دلہن کو قبول کرتے ہیں۔“

خادم نے لگا۔

آپ نے اسے چپ رہنے کی تلقین کی اور فرمایا ”مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس بارہم نے کافی صلہ کیوں کر لیا ہے!“

خادم نے جواب دیا ”حضرت! میں نہیں جانتا۔“

آپ نے کہا ”اس بستی اُمّ عبیدہ پر ایک بہت بڑی وبا کا نزلہ ہونے والا تھا آج میں کئی دن سے اصرار کر رہا ہوں کہ وہ مجھے اٹھالے مگر میری بستی والوں کو محفوظ رکھے آج مجھے یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ بستی کو محفوظ کر دیا گیا مگر مجھے اس دنیا سے چلا جانا ہوگا۔“

خادم اور زیادہ زور شور سے رونے لگا۔

آخری لمحوں میں آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ آخر جمعرات کے دن، بوقت

ظہر مؤخرہ ۱۲۔ ربیع الاول ۵۷۲ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آخری لمحوں میں آپ نے اپنی

انگشت شہادت اٹھا رکھی تھی اور زبان سے کلمہ طیبہ جاری تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طنیت را



حضرت شمس تبریزیؒ

حضرت امام جعفر صادقؑ کے پوتے سید محمد عریض طبرستان کے شہر رہے، ہجرت کر گئے اور وہاں محمد آباد نامی ایک بستی بسا کر رہنے لگے بعد میں اس خاندان کے دوسرے لوگ قندھار، خراسان اور سندھ وغیرہ ہجرت کر گئے اور اس خاندان کے ایک بزرگ عراق کے شہر سبزوار میں رہنے لگے یہ لوگ خاندانی روابط اور اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے آپس میں ملتے جلتے ضرور رہتے تھے ایک دوسرے سے بعد و طویل مسافت کا خیال کئے بغیر یہ لوگ قافلوں میں شریک ہو جاتے اور کوہستانی سلسلوں کو عبور کرتے اور میدانی علاقوں میں گرد و غبار اٹاتے اپنے عزیز رشتے داروں سے جا ملتے اسی خاندان کے ایک بزرگ خراسان سے سبزوار کے لئے چلے سبزوار میں ان بزرگ کے عزیز سید صلاح الدین نور بخش رہتے تھے ان بزرگ کا قافلہ صحرائے نمک کے کنارے خیمہ زن تھا اور یہاں سے سبزوار صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا دو پہر کی تند و تیز ہوائیں لوگوں کے چہرے جھلانے لگیں اور قافلے والوں نے اپنے مخدو ملی خیموں کے در بند کر کے مضبوط ڈوریوں سے باندھ دیئے۔ ہوا کے پھیلنے سے ان خیموں سے ٹکراتے اور پھسل کر اوپر یا ادھر اُدھر نکل جاتے۔ خطرناک موسم نے قافلے والوں کے حوصلے پست کر دیئے اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں پڑاؤ چھوڑیں گے لوگوں نے خیموں کے اندر ہی ظہر کی نماز ادا کی۔ سادات گھرانے کے بزرگ نماز ظہر پڑھ کر آرام کی نشست سے لیٹ گئے ابھی وہ سوچ ہی نہ سکے تھے اور نیم غنودگی کا عالم طاری تھا کہ انہوں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا وہ سبزوار میں اپنے عزیز سید صلاح الدین نور بخش کے گھر میں فروکش ہیں۔ صحن میں خاندان کے لوگ انہیں گھیرے بیٹھے ہیں اسی وقت آسمان سے سورج نے حرکت کی اور وہ آہستہ آہستہ سید صلاح الدین نور بخش کے مکان کی چھت پر اُترا چلا رہا ہے ان کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اور خواب ہی میں یہ سوچنے لگے کہ اگر یہ سورج واقعی نیچے آگیا تو دنیا کا کیا حشر ہوگا، یہ جل بھن کے راکھ ہو جائے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ

ہی ہے تھے کہ سورج سید صلاح الدین نوربخش کی بیوی کی گود میں سما گیا۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی یہ بہت پریشان ہوئے۔ رات کو قافلہ سبز واری طرف روانہ ہو گیا۔ جب یہ بزرگ صلاح الدین نوربخش کے گھر میں داخل ہوئے تو انہیں یہ خوش خبری سناٹی گئی کہ ایک دن پہلے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے اور لڑکے کا نام شمس الدین رکھ دیا گیا ہے ان بزرگ نے صلاح الدین نوربخش کو اپنا خواب سنایا اور پیش گوئی کی کہ لڑکا بڑا ہو کر کوئی بہت ہی خاص مرتبہ حاصل کرے گا جس سے اس کی شہرت اور عظمت قیامت تک سوئے کی طرح چمکتی رہے گی۔ شمس الدین کی پرورش ہوتی رہی اور جب ذرا سن شعور میں داخل ہوئے تو انہیں ان کے چچا عبدالہادی کے سپرد کر دیا گیا عبدالہادی تفسیر فقہ اور حدیث میں جواب نہ دیکھتے تھے انہوں نے نہایت توجہ سے شمس الدین کو تعلیم و تربیت دینا شروع کر دی اور ایک نلیل مدت ہی میں شمس الدین نے علوم ظاہری و باطنی میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ ان کے چچا عبدالہادی دنگ رہ گئے۔

۱۵ شعبان ۵۶۰ ھ میں پیدا ہونے والا یہ بچہ انیس سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ باپ نے بدخشاں کا سفر اختیار کیا، یہ سفر کسی تجارتی مقصد سے نہیں اختیار کیا گیا تھا کیونکہ یہ لوگ ان میں سے تھے جو دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے تھے اور جن کا ہر کام خدا کی خوشنودی کے پیش نظر انجام پا جاتا ہے سید صلاح الدین نوربخش نے کسی سے سنا تھا کہ بدخشاں اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اللہ سے ناواقف ہے اور ان کے کان صدائے حق سے نا آشنا ہیں انہوں نے بیٹے کو ساتھ لیا اور ۵۷۹ ھ میں بدخشاں روانہ ہو گئے بدخشاں والوں نے ان کی آواز اور پیغام کو تعجب سے سنا اور آہستہ آہستہ مشرق پر اسلام ہونے لگے یہاں تک کہ کھوڑی سی مدت میں ہزاروں خاندانوں کو دین حق میں داخل کر لیا۔ جب یہاں کام ختم ہو گیا تو انہوں نے تبت کو چمکا کر فتح کیا تبت کو چمک کر لوگ بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے یہاں شمس الدین کے جوہر کچھ زیادہ ہی آشکار ہوئے یہ اپنے بوڑھے باپ کو کچھ دکر ادھر ادھر رہتیوں میں نکل جاتے اور لوگوں میں دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے۔ گو تم بدھ کے پیرو بھی معمولی لوگ نہیں تھے کراسانی سے ان کی بات مان لیتے وہ ان سے بڑی جرح بحث کرتے اور کوشش کرتے کہ ان مسلمان فقر کو لا جواب کر دیا جائے لیکن یہ انہیں لا جواب کر دیتے۔

نوجوان شمس الدین تبت کو چمک کر ایک گھاٹی میں بیٹھے مناظر قدرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ان کا دل مالک حقیقی پر درود و سلام بھیج رہا تھا انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر ۱۸

کر رکھی تھیں اور دل ہی دل میں خدا کی شان بے نیازی اور خلاق پر وہ واہ واہ کر رہے تھے کہ اچانک انہیں چند آدمیوں کے زور زور سے منہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا چند بدھ متی جسم کو کفن میں چھپائے کھڑے ہیں انہوں نے حیرت سے سوال کیا ”بابا کیا بات ہے تم لوگوں نے مجھے تماشا کیوں بنا رکھا ہے؟“

ایک بدھ بھکشو نے جواب دیا ”ہم لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

شمس الدین نے کہا ”ہم نے سنا تھا کہ تبت کو چمک کے لوگ بے راہ روسی اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان کے کان ہلکے سے ابھی تک محروم ہیں چنانچہ ہم لوگ یہاں ہی خدمت انجام دینے آئے ہیں۔“

بودھ بھکشو نے نفرت سے کہا ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ گمراہ ہیں اور تم لوگ ہمیں دین کی اختیار کرنے پر مجبور کر دو گے؟“

”نہیں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے ہمارے رسول مقبولؐ نے فرمایا لا کرہ فی الدین، دین میں جبر نہیں، پھر ہم تم پر کس طرح دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ تم اپنا آبائی دین چھوڑ کے مسلمان ہو جاؤ۔“

بودھ بھکشو نے تعجب سے پوچھا ”پھر تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

شمس الدین نے جواب دیا ”اپنے رسول مقبولؐ کی حیات طیبہ اور تعلیمات کے بلے میں ہم سب کو کچھ بتانے آئے ہیں اگر یہ باتیں تمہیں اچھی لگیں تو تم ان پر غور کرنا ممکن ہے ان میں کچھ باتیں ایسی موجود ہوں جو کبھی تم کو کام دے جائیں۔“

بودھ بھکشو نے پوچھا ”یادہ باتیں ہمارے شاکیہ منی کی باتوں سے زیادہ قیمتی

ہیں۔“

شمس الدین نے جواب دیا ”اس کا جواب میں نہیں تم خود دے لو گے کیونکہ اگر میں کچھ کہوں گا تو تم لوگ یہ کہہ گے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے اپنے رسولؐ کی بے جا طرف داری کر رہا ہوں۔“ ایک بودھ بھکشو ذرا اور قریب آگیا بولا ”اپنے رشی کی کچھ باتیں بتاؤ۔“

شمس الدین نے کہا ”پہلے تم ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارے شاکیہ منی تمہیں کیا تعلیم دے

گئے ہیں؟“

بودھ بھکشو نے جواب دیا ”ہمارے شاکیہ منی نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم ظلم و تشدد سے

بچیں، لڑائی جھگڑا نہ کریں، جیو ہتھیار سے بچیں۔
 شمس الدین نے کہا: ”لیکن ہمارے رسولؐ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی ہمارا ایک دانت
 توڑے تو ہم بھی اس کا ایک دانت توڑ سکتے ہیں کوئی ہمارے ایک طمانچہ لگائے تو اسے ہم بھی
 ایک طمانچہ لگا سکتے ہیں۔“

بودھ بھکشو نے کہا: ”ہمارے شاکیہ منی نے بتایا کہ زندگی اور دنیا بے کار سی چیزیں ہیں
 خواہشات کو ختم کر کے انسان ایک اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے اور وہ شے جسے نروان کہتے ہیں
 خواہشات کو ختم کر کے پاک صاف زندگی گزار کے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

شمس الدین نے کہا: ”لیکن ہمارے رسولؐ نے ہمیں بتایا ہے کہ لارہبانیت فی الدین
 ہمارے دین میں رہبانیت نہیں، دنیا میں رہ کے دنیا کو اس طرح ترک کر دو کہ دنیا بے معنی نہ کہلائے
 خدا نے اس دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے ہم انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اگر ہم اس سے
 کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ دنیا بے کار بنائی گئی ہے دنیا میں رہو لیکن اس
 طرح کہ دامن نہ آلودہ ہو، پانی سے دور روکے دامن خشک رکھنا کون سے کمال کی بات
 ہے ہاں پانی میں رہ کے آلودگی سے بچنا منتہائے کمال ہے۔“

اس طرح دیر تک ان دونوں میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور جب یہ گفتگو بند ہوئی تو
 بودھ بھکشو مسلمان ہو چکے تھے انہیں اپنی سابقہ زندگی اور مذہب پر قائم رہنے کا بڑا دکھ تھا۔



تبت کو چکے سے فارغ ہو کر یہ کشمیر میں داخل ہو گئے یہاں انہیں بڑی محنت کرنا پڑی
 یہاں ایک قوم چنگیز نامی آباد تھی جو آفتاب پرست تھی اس قوم نے انہیں بہت ستایا لیکن یہ لوگ
 بھی باز نہیں آئے اور محنت نہیں ہارے، شمس الدین یہاں بھی پیش پیش تھے وہ اکثر و بیشتر
 چنگیز قوم کے مذہبی رہنما کے پاس پہنچ جاتے اور اس سے باتیں کرتے رہتے۔ چنگیز قوم کا یہ
 رہنما ساٹھ بیسٹھ سالہ ایک بوڑھا تھا جس کی داڑھی قدیم چینوں جیسی تھی اور جس کی پیشانی پر
 شکنیں تیلی رسی کی لڑیوں جیسی نظر آتی تھیں اس کے دانت کچھ کچھ تھے اور کچھ باقی تھے
 وہ شمس الدین سے ہمیشہ بلا خلقی سے پیش آتا لیکن ہمیشہ بلا خلقی کا جواب خوش اخلاقی دیتے۔
 ایک دن چنگیز قوم کے بوڑھے رہنما نے شمس الدین سے کہا: ”تم میری قوم میں اپنا
 وقت بلاوجہ ضائع کر رہے ہو کیا تم یہ یقین رکھتے ہو کہ اس دنیا میں کوئی چیز آفتاب سے
 زیادہ بڑی اور روشن ہو سکتی ہے روشن اور با عظمت۔“

شمس الدین نے جواب دیا ” لیکن بابا ! ہم جس خدا کی عبادت کرتے ہیں یہ سورج اس دربار کا ادنیٰ سا چاکر ہے تم لوگ اس کی عظمت اور طاقت کو مانتے ہو تو شوق سے مانتے رہو لیکن میں تم سے درخواست ضرور کروں گا کہ اس معاملے میں ذرا غور و فکر سے بھی کام لو۔“

بوڑھے آفتاب پرست نے کہا ” میرے باپ دادا غلط نہیں تھے اور انہوں نے جو مذہب اور عقائد اختیار کر رکھے تھے وہ غلط نہیں تھے۔“

شمس الدین نے جواب دیا ” لیکن بابا ! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر یہی انداز فکر دنیا کا ہر آدمی اختیار کر لے تو پھر دنیا کا ہر انسان سچا ہی بن سکے گا۔ لیکن ہر بات صداقت اور عقل کے خلاف ہے کہ اس دنیا کا ہر آدمی سچا ہو اور دنیا کے ہر آدمی کے باپ دادا مستند ہوں عقلمندی یہ نہیں ہے کہ جانوروں کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتے رہیں اور عقل اور سوچ بچار سے کام نہ لیں۔ آدمی کو خدا نے عقل اسی لیے دی ہے کہ یہ اس عقل کے ذریعے کھرے کھوٹے میں فرق کرتا ہے لیکن اگر انسان ایسا نہیں کرتا اور محض باپ دادا کی راہ پر چلتے رہنے کو عقل کی کسوٹی پر نہیں کستا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی اور جانور میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔“

بوڑھا رہنما سورج میں پڑ گیا کچھ توقف کے بعد بولا ” اچھا پھر تم بتاؤ کہ سورج سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے ؟“

شمس الدین نے جواب دیا ” رات کی وہ چادر جو سورج کے چہرے پر پڑ جاتی ہے اور سورج کی ساری توانائی اور روشنی غائب ہو جاتی ہے۔“

بوڑھا رہنما چونک پڑا۔ غصے میں بولا ” اے نوجوان ! ادب کرو ادب، سورج کو یوں ذلیل نہ کرو۔“

شمس الدین نے جواب دیا ” میں آفتاب کو ذلیل کب کر رہا ہوں۔ میں تو اس کی حیثیت کی نشان دہی کر رہا ہوں۔“

بوڑھے رہنما نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کسی سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر بعد دریافت کیا ” اور تم جس کی پرستش کرتے ہو وہ کیسا ہے ؟“

شمس الدین نے جواب دیا ” ہمارا خدا وہ ہے جو ہمیں یا کسی کو بھی نظر نہیں آتا ۱۸۶ لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے اس کے کان نہیں لیکن وہ سنتا ہے آنکھ نہیں لیکن دیکھتا ہے

وہ ہر شے اور پوری کائنات پر محیط ہے وہی ہر جاندار کو رزق پہنچاتا ہے اس کی ایما پر ہوا میں چلتی ہیں، سورج اور چاند طلوع ہوتے ہیں بیج نشوونما پانکے زمین سے پونے کی شکل میں اُبھرتا ہے اور وہی ہے جان پودوں کو بڑھاتا ہے ان سے پھل پھول پیدا کرتا ہے اسی کے حکم سے انسان پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے اس کی کوئی شکل نہیں لیکن وہ ہر شکل میں موجود ہے ۛ بوڑھے رہنما پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا، پوچھا ۛ کیا مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے؟ شمس الدین نے جواب دیا ۛ ۛ تعداد نہ صرف بڑھ رہی ہے بلکہ بڑھ چکی ہے دنیا کے دور دراز حصوں میں مسلمان پہنچ چکے ہیں اور پرانے مذہب ختم ہوئے ہیں اس مذہب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو قبول کرنے والا ایک خدا کو سجدہ کر کے ہزاروں بتوں کے سجدوں سے نجات پا جاتا ہے ۛ

بوڑھے رہنما نے کہا ۛ تم لوگ کس طرح عبادت کرتے ہو مجھے تو سکھاؤ ۛ شمس الدین نے جواب دیا ۛ پہلے تم اسلام قبول کر لو پھر میں مذہبی ارکان بھی سکھا پڑھا دوں گا ۛ

بوڑھے رہنما نے ایک عجیب سا سوال کیا پوچھا ۛ مگر ذرا ایک بات تو بتاؤ مسلمان ہوجانے کے بعد میرا مقام کیا ہوگا کیونکہ اس وقت میں اپنی قوم کا رہنما اور پرہت ہوں لیکن کیا مسلمان ہوجانے کے بعد بھی مجھے اپنا یہ مرتبہ حاصل ہے گا؟

شمس الدین نے جواب دیا ۛ افسوس کہ اسلام میں ایسا کوئی دستور نہیں کہ آدمی اپنے حسب نسب کی بڑائی سے بڑائی حاصل کرنے کا مستحق قرار پائے یہاں تو پہلا کلمہ ہی یہ ہوتا ہے لا الہ الا اللہ، نہیں کوئی اللہ سوائے اللہ کے۔ یہاں اللہ کی بڑھائی اور عظمت کے گے کسی کی بڑائی اور عظمت کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی عزت کرنا چاہتا ہے اور یہ عزت اسے خدا کی نظر میں بھی حاصل ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی ذاتی کردار میں رفعت و عظمت پیدا کرے، زہد و تقویٰ سے بڑبے، تم اگر مسلمان ہوجانے کے بعد بھی بڑے رہنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے عمل اور کردار سے بڑے بنو اور اس اعتبار سے جو شخص بھی بڑا بن جائے گا اسے ان تمام لوگوں پر بھی فضیلت اور برتری حاصل ہوگی جو مسلمان ہونے سے پہلے حسب نسب بڑے کہلاتے تھے ۛ

ان سچی سچی باتوں نے بوڑھے رہنما کے دل پر بڑا اثر کیا اور وہ مسلمان ہو گیا اس کے ۛۛۛ

ساتھ ہی اس کی قوم بھی مسلمان ہو گئی۔

بدخشاں اور کشمیر میں شمس الدین سات سال تک رہے اور یہاں اپنا کام ختم کر کے ۵۸۶ھ میں سبزوار واپس تشریف لے گئے اب ان کی عمر چھبیس سال کی ہو چکی تھی وطن میں ان کی شادی کر دی گئی شادی کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے ان میں سے ایک کا نام سید رضی الدین اور دوسرے کا نام سید علاء الدین احمد رکھا گیا۔

یہاں ان پر ایک عجیب سا غلبہ ہو گیا اور وہ قلندرانہ زندگی گزارنے لگے اس حال میں نہ تو انہیں کپڑوں کا ہوش رہتا نہ کسی اور بات کا۔ زبان اور نظر میں ایسا اثر ہو گیا کہ جو زبان سے نکلتا فی الفور ہو جاتا اور جس شے پر نظر ڈال دیتے اپنا اثر اس میں منتقل کر دیتے۔



شمس الدین نے اسی عالم میں سبزوار کو خیر باد کہا اور تیرہ چلے گئے تیرہ انہیں بہت پسند تھا تیرہ سے ترکی کے شہر قونیہ تشریف لے گئے قونیہ کے لوگوں نے ایک تنگ دھڑنگ شخص کو کلی کوچوں اور بازاروں میں چپ چاپ گھومتے پھرتے دیکھا لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں دی شمس الدین بھی کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے یہ چلتے چلتے بازاروں میں دکانوں کے سامنے ٹھنک کر کھڑے ہو جاتے اور دنیا داروں کو دنیا کے بھٹیروں میں الجھا ہوا دیکھتے رہتے یہ ان سے کوئی بات تو نہ کرتے لیکن بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہتے ”بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان گلے گلے دنیا کی دلدل میں چھنس جائے“

اس کوچہ گردی اور بازار نور دی میں ایک دن وہ ایک نہایت قابل شخص کے کتب خانے میں گھس گئے یہاں ایک دراز ریش عالم قیمتی لباس میں ملبوس اپنے بہت سارے شاگردوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں استاد اور شاگردوں کے سامنے بھی کتابیں رکھی تھیں ان میں منطق، فلسفہ، الہیات، مذہبات اور دوسرے علوم کی بے شمار کتابیں موجود تھیں کتب خانے کے استاد اور اس کے شاگردوں نے اس تنگ دھڑنگ حواس باختہ شخص کو ناگواری سے دیکھا اور ان سے دریافت کیا ”تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

شمس الدین نے کوئی جواب نہ دیا اور کتابوں کو دیکھنے لگے۔

کتب خانے کے مالک اور شاگردوں کے استاد نے لمبی سے سوال کیا ”یہاں کیا

لینے آئے ہو؟ اس علمی ماحول میں تم جیسے ان پڑھ اور عقل و خرد سے عاری شخص کا کیا کام؟
 شمس الدین نے کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”یہ کیا ہے؟“
 فاضل استاد نے حقارت سے جواب دیا ”یہ وہ ہیں جسے تم نہیں جانتے“
 شمس الدین نے کتب خانے پر ایک نظر ڈال اور آپ کی نگاہ جہاں سوز نے کتب خانے
 میں آگ لگادی۔ کتابیں جلنے لگیں۔ فاضل استاد گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور بے ساختہ سوال کیا
 ”حضرت! یہ کیسا ہے؟“

شمس الدین نے بے نیازی سے جواب دیا ”یہ وہ ہیں جسے تم نہیں جانتے“
 شمس الدین یہ کہہ کر باہر نکل آئے اور فاضل استاد اپنے شاگردوں کی مدد سے کتب خانے
 کی آگ بجھانے لگا۔ جب آگ پر قابو پایا گیا تو فاضل استاد کو اس مرد قلندر کی تلاش ہوئی لیکن
 اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ فاضل استاد ایک ایک سے ان کا پتہ پوچھتا پھرتا رہا لیکن قونیہ کے شہریوں
 کا ایک ہی جواب تھا اس مرد قلندر سے ہم سب اسی مدت تک واقف ہیں کہ ہم نے آج صبح تک
 اسے قونیہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتے دیکھا ہے لیکن دوپہر سے یہ شخص یہیں
 نہیں دکھائی دیا۔“

فاضل استاد کے قلب و نظر کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو چکا اس نے کتب خانہ
 چھوڑ دیا اور اس مرد قلندر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔



کتب خانے کا یہ واقعہ جو اوپر بیان ہو چکا ہے اسے خزینۃ الامم کے مصنف
 مفتی غلام سرور لاہوری نے دوسری طرح بیان کیا ہے جو نیچے دیا جا رہا ہے۔
 شمس الدین قونیہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے پھرنے کے دوران ایک
 دن ایک کتب خانے میں گھس گئے یہ کتب خانہ مولوی جلال الدین رومی (مصنف مشنوی معنوی)
 کا تھا۔

مولانا رومی اپنے شاگردوں اور کتابوں کے درمیان بیٹھے درس دے رہے تھے
 مولانا رومی نے ایک تنگ دھڑنگ شخص کو کتب خانے میں کھڑا دیکھ کر حیرت سے کہا۔
 ”تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟“
 شمس الدین کتابوں کو دیکھتے رہے کوئی جواب نہ دیا۔

مولانا رومی نے پھر پوچھا ”آخر تم چاہتے کیا ہو اور یہاں سے درسِ تدریس میں کیوں مغل ہو رہے ہو؟“

شمس الدین نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا ”یہ کیا ہے؟“
 مولانا رومی نے حقارت سے جواب دیا ”اسے قیل وقال کہتے ہیں جسے تم نہیں جانتے“
 شمس الدین مولانا رومی کے آگے سے کتابیں اٹھاکے پانی کے حوض میں بھینک دیں۔
 قیمتی کتابیں پانی کی تہہ میں بیٹھی چلی گئیں مولانا رومی گہوارے لٹھے اور حیرت سے کہا ”حضرت یہ کیا؟“

شمس الدین نے کوئی جواب دینے کی بجائے حوض سے کتابیں نکال کے مولانا رومی کے آگے بڑھا دیں۔

مولانا رومی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان میں ایک کتاب بھی پانی میں بھسکی نہیں تھی
 انہوں نے ایک ایک کتاب ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھی اور اس میں پانی کی نمی کو تلاش کرتے رہے لیکن وہاں تو کسی کتاب پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔
 مولانا رومی نے شمس الدین کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھا اور سوال کیا۔
 ”شیخ! یہ کیا؟“

شمس الدین نے جواب دیا ”یہ ذوق وصال ہے جسے تم نہیں جانتے“
 مولانا رومی پر سکتہ طاری ہو گیا اور شمس الدین نے اپنی راہ لی ہوش میں آتے ہی
 مولانا رومی نے انہیں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ نہیں ملے اور جب ملے تو مولانا رومی
 انہی کے ہو کے رہ گئے۔

شمس الدین کو تبریز بہت پسند تھا، وہ تبریز ہی میں رہنے لگے مولانا رومی نے بھی
 ان کے ساتھ ہی اقامت اختیار کر لی۔ شمس الدین یہیں سے شمس تبریزی ہو گئے تبریز میں وہ
 بارہ سال تک حالت سکر میں مبتلا رہے یہیں شمس تبریزی اور مولانا رومی نے ایک ہی
 حجرے میں تین ماہ تک چکر کشی کی۔ مولانا رومی کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ شب و روز ان کی
 صحبت میں رہتے۔ مولانا کے عقیدت مندوں کو یہ بات شاق گزرنے لگی۔ لوگ مولانا رومی
 سے تنہائی میں ملنا اور علمی مباحث پر بات کرنا چاہتے لیکن شمس تبریزی کی موجودگی میں ایسا
 ہونا ممکن نہ تھا چنانچہ عقیدت مندوں کے دلوں میں شمس تبریزی کی طرف سے غبار رہنے لگا۔

شام سے ذرا پہلے ایک ادھیڑ عمر عالم مولانا رومی سے ملنے آیا۔ مولانا رومی شمس تبریز کے روبرو دواؤں بیٹھے ہوئے تھے عالم نے کہا: ”مولانا! میں آپ سے بعض علمی مباحث پر باتیں کرنا چاہتا ہوں کیا آپ ہیں تنہائی کی سعادت بخشیں گے؟“
 مولانا رومی نے ننگ دھڑنگ شمس تبریزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”جناب آپ کو جو باتیں بھی کرنا ہیں حضرت شمس تبریز کے روبرو ہی کریں کیونکہ میرا معاملہ ان سے الگ نہیں ہے۔“

ادھیڑ عمر عالم نے کسی قدر تلخی سے کہا: ”ابھی میں آتا بھی گزرا ان ان نہیں ہوں کہ لوگ مجھے مٹری دیوانہ سمجھنے لگیں، نہ میں اپنے علم کی بیقداری کر سکتا ہوں۔“
 مولانا رومی نے پوچھا: ”آخر علم کی بے قداری کس طرح ہوتی ہے؟“
 اس شخص نے جواب دیا: ”کیا یہ علم کی بے قداری نہیں ہے کہ ایک ننگ دھڑنگ شخص نے تمہاری جیسی بالکمال اور صاحب علم شخصیت پر قبضہ کر رکھا ہے۔“
 مولانا رومی نے کہا: ”یہ ننگ دھڑنگ شخص؟ وہ منارہ دہنائی ہے جس سے میرے دل نے سوز و گداز کی روشنی پائی ہے۔“

یہ شخص ناراض ہو کے چلا گیا اور اس نے شمس تبریزی کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ شمس تبریزی تبریز سے ننگ آکر اپنے وطن بسزوار چلے گئے وہاں سے بغداد کی راہ لی لیکن ان کی حالت اس بے چین شخص جیسی تھی جس کو ایک جھکے ٹھہرنا اور قیام کرنا نصیب ہی نہ ہوتا ہو، تبریز کی محبت انہیں پھر کھینچ لے گئی لیکن یہاں کچھ دن رہ کر دمشق چلے گئے اور دمشق سے پھر بغداد کی راہ لی۔

علمائے ظاہر کو شمس تبریزی کے خیالات سے سخت اختلاف تھا وہ ان کی حالت اور مقبولیت سے حد کر تے تھے چنانچہ ان علماء نے بغداد کے حکمران کو خوب خوب ورغلائیا اور اسے یہ یقین دلایا کہ اگر شمس تبریزی کو بغداد میں رکھا گیا تو وہ دن دور نہیں جب خدا کا عتاب اس شہر میں نازل ہو جائے بادشاہ نے علمائے دربار اور علمائے شہر کے دباؤ میں آ کے شمس تبریزی کے نام حکم جاری کر دیا کہ وہ فوراً بغداد چھوڑ دیں۔
 شمس تبریزی نے حکم ملتے ہی بغداد چھوڑ دیا اور کاظمین چلے گئے۔

بادشاہ شہر بدری کا حکم دے کر تھلپے میں چلا گیا۔ اس وقت اس کا سر جھاری ہو رہا ۱۹۱

تھا اور دل پر ایک بوجھ سا تھا اسے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی اندر بیٹھا دل کو چٹکیوں سے مسل رہا ہے بادشاہ کئی دن تک اداس اداس اور کھویا کھویا سا رہا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہے کئی دن بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ ولی عہد کی حالت نازک ہے بادشاہ گھبراہوا اندر پہنچا، وہاں اس کا عزیز ترین شہزادہ بستر مرگ پر درازا پر دیکھ رہا تھا گویا اسے اپنی موت کا انتظار ہے۔

بادشاہ نے محل سر کی خواتین کو ڈانٹا اور کہا رجب شہزادے کی حالت اتنی خراب تھی تو پھر مجھے مطلع کیوں نہیں کیا گیا؟

کسی خاتون نے جواب دیا۔ ”حضور ہم سب کی کوشش یہ تھی کہ شہزادے کی علالت کی خبر حضور کو پہنچا کر پریشان نہ کیا جائے کیونکہ امور مملکت کی فکر اور تدبیر پر حضور یوں بھی الجھا در پریشان رہتے ہیں۔“

بادشاہ نے غضب ناک ہو کر کہا ”شہزادہ ولی عہد ہے اس کے علاوہ میں اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں اگر اسے خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو....“

شاہی اطباء کی پانچ رکنی جمعیت شہزادے کے علاج میں لگی ہوئی ہے اور خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ اسے بچالیں گے۔

بادشاہ شہزادے کے چہرے پر جھک گیا، کمزوری کی وجہ سے شہزادے کی آنکھیں گڑھے میں چلی گئی تھیں اور خسار کے دونوں طرف کے جڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ بادشاہ نے نہایت پیار سے شہزادے کو مخاطب کیا۔ ”بیٹے! تمہارا کیا حال ہے؟“

شہزادے نے پھیٹی پھیٹی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا لیکن اسے پہچان نہ سکا۔

بادشاہ نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ”بیٹے! ادھر دیکھو میز کی طرف میں تمہارا باپ تمہیں

دیکھنے آیا ہوں۔“

بیٹے نے باپ کو غصے کی نظروں سے گھورا اور ہڈیانی کیفیت میں جواب دیا۔ ”وہ

کہاں ہے؟ وہ جسے خدا نے تو پسند کیا لیکن اس کے بندوں نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ کہاں ہے جسے لوگ پہچان نہیں سکے اور کسی نبی کی طرح جلا وطن کر دیا۔“

بادشاہ کانپ گیا۔ وہ شہزادے کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے کہا

”بیٹے! تم کسی کی بات کر رہے ہو؟ کیا تمہارا اشارہ شمس تبریزی کی طرف تو نہیں؟ اگر تم یہ سب

اس کی بابت کہہ رہے ہو تو میں بتاتا ہوں کہ اسے علمائے دہرا اور علمائے شہر نے بالاتفاق بے دین اور گمراہ قرار دے دیا ہے ۛ

شہزادے کے ہونٹ پکپکائے، نہایت خیف آواز میں کہا ”خدا کی شان گمراہ دین دار کو گمراہ قرار دے سہے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی ذات کے شر سے بھی آگاہ نہیں دوسرے کے خیر کو شر قرار دے سہے ہیں“

بادشاہ نے پوچھا ”اگر تم کہو تو میں شمس تبریزی کو کاظمین سے بلواؤں“
شہزادے نے کرب سے چہرے کو بھینچا، بولا ”میں مرد ہا ہوں، میں مر جاؤں گا، میرا جسم کچھ رہا ہے، میرا دم نکل رہا ہے میری روح جسم کو چھوڑ رہی ہے“
بادشاہ نے گھبرا کر طبیعوں کو طلب کیا، اس پانچ رکنی وفد سے آتے ہی شہزادے کا علاج شروع کر دیا۔

بادشاہ نے بے چینی سے طبیعوں کو مخاطب کیا کہا ”کیا شہزادہ جاں برب ہو جائے گا کیا یہ اچھا ہو جائے گا؟“

اطبا کے سربراہ نے مایوسی سے کہا ”میں حضور والا کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو بعد میں مجھے پھٹتا پاڑے گا“ پھر سر جھکا کر عرض کیا ”کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ خدا ہمیں شرمندہ کرنا چاہتا ہے“
بادشاہ اس لطیف اشارے کا مطلب سمجھ گیا بولا ”تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو، میں اشاروں کی باتیں پسند نہیں کرتا، میں ابہام کا آدمی نہیں ہوں“

طبیعوں کے سربراہ نے جواب دیا ”حضور والا! اب دو اکا وقت نہیں رہا، دھاکا وقت ہے بس یہ خادم تو اسی طرح اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے“

شہزادہ ایک بار پھر بڑبڑایا ”مجھے کاظمین نے چلو کاظمین جاؤں گا“
بادشاہ کی آنکھیں بھینکنے لگیں اس نے طبیعوں سے دریافت کیا ”اسے تم لوگ کتنی دیر تک زندہ رکھ سکتے ہو؟“

طبیعوں کے سربراہ نے جواب دیا ”بس چند گھنٹے“

بادشاہ نے بے چینی سے کہا ”نہیں اس میں کچھ اضافہ کر دو میں اس مرد بزرگ کو

کاظمین سے بلائے لیتا ہوں اور اس سے معافی مانگ لوں گا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ۛ

اور یہ اسی زیادتی کی سزا ہے جو شہزادہ جھیل رہا ہے اور میں پاگل ہوا جا رہا ہوں، اس کے بعد بادشاہ نے شہزادے کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا ”بیٹے تم فکر نہ کرو میں ابھی اسی وقت شمس تبریزی کو بلوائے لیتا ہوں۔“

بادشاہ شہزادے کو بوسہ دے کر باہر چلا گیا اور اسی وقت چند آدمیوں کا ایک وفد کاظمین روانہ کر دیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر شمس تبریزی کو اپنے ساتھ لے کر واپس آئیں اور ہر سے فائدہ ہو کے بادشاہ پھر سیر شہزادے کے پاس پہنچ گیا شہزادے پر اس وقت بھی ہندیا کی کیفیت طاری تھی۔

کئی دن بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ شہزادے جاں کنی میں مبتلا ہے اور چند ساعتوں کا مہاجن ہے بادشاہ گھبرا ہوا اندر پہنچا۔ شہزادے نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بادشاہ نے بے بسی سے شہزادے کی طرف دیکھا اور علمائے شہر اور علمائے دربار کو بڑا جھلا کہنے لگا شہزادے نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا، گویا وہ باپ کو الوداعی سلام کر رہا ہو بادشاہ کا دل ڈوبنے لگا اس نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”بیٹے! کیا بات ہے تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

شہزادے کی آنکھیں پتھرنے لگیں اور کچھ ہی دیر بعد شہزادے کی سانس رک گئی اور سر ایک طرف ڈھلک گیا محل میں کہرام برپا ہو گیا اور بادشاہ کے منہ سے چیخ بھل گئی شاہی طبیب، آگے بڑھے اور بغور معائنے کے بعد اعلان کیا ”شہزادہ اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ چکا ہے اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کو نیند سے بیدار نہ کیا جائے۔“

اور پتھوڑی ہی دیر بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ شمس تبریزی کو کاظمین سے لے آگیا گیا ہے بادشاہ بحالت جنون باہر نکلا اور دیوانہ وار چیخا ”کہاں ہیں شمس تبریزی؟ انہیں میرے قریب لاؤ تاکہ میں ان سے ہاتھ جوڑ کے اور ان کے قدموں میں گر کے معافی مانگوں۔ میں نے انہیں ستایا تھا ان کا دل دکھایا تھا چنانچہ میں اپنی سزا کو پہنچ گیا، کہو اب تو مجھے معاف کر دیں۔“

لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا شدتِ غم سے بادشاہ کا دماغی توازن جاتا رہا ہے

شمس تبریزی بادشاہ کے قریب گئے اور پوچھا ”بابا! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“
 بادشاہ ان کے قدموں میں گر گیا، ”حضرت! میں لٹ گیا، میں تباہ ہو گیا، میرا تاج تخت
 ویران ہو گیا، ولی عہد فوت ہو گیا۔“

”ولی عہد فوت ہو گیا؟“ شمس تبریزی نے حیرت سے سوال کیا ”کہاں ہے ولی عہد
 ذرا میں بھی تول سے دیکھوں۔“

بادشاہ نے جواب دیا ”وہ اندر چادر میں منہ ڈھلپنے سو رہا ہے۔“
 شمس تبریزی نے کہا ”تم مجھے اس کے پاس لے چلو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 بادشاہ نے مایوسی سے کہا ”وہ اب اس سے کیا ملیں گے اب اس میں بڑا ہی
 کیا ہے ایک جسدِ روح ہے جو بستر پر دراز مٹی میں ملنے کا منتظر ہے۔“
 شمس تبریزی نے غصے میں کہا ”بابا! تم بیکار باتوں میں وقت کیوں برباد کر رہے
 ہو؟ مجھے اندر لے چلو۔“

بادشاہ ان کے بعد اصرار پر اندر لے گیا۔ شمس تبریز مردہ شہزادے سامنے کھڑے
 ہو کر اسے دیکھتے ہوئے پھر چہرے سے چادر مڑکا کے شہزادے کو مخاطب کیا ”یہ مکار کی کیوں؟
 کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو اس طرح مکاری سے مکر کر مجھ پر تہمت رکھ کے آسانی سے چلا جائے گا
 نہیں ایسا نہیں ہوگا، ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔“

بادشاہ نے کہا ”حضرت! یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟“
 شمس تبریزی نے جواب دیا ”اس مکار سے، تمہارے ولی عہد سے۔“
 بادشاہ گلو گرفتہ آواز میں بولا ”لیکن یہ زندہ کیسے ہے یہ تو مر چکا ہے۔“
 شمس تبریزی نے کہا ”یہ مردہ کہاں ہے مگر کر کے پڑ رہا ہے۔“ اس کے بعد شہزادے
 سے کہا ”تم باذن اللہ (اٹھ جا اللہ کے حکم سے)
 شہزادہ نہیں اٹھا آپ نے دوبارہ حکم دیا۔ تم باذن اللہ (اٹھ جا اللہ کے حکم
 سے)۔“

شہزادہ پھر نہیں اٹھا۔ شمس تبریزی نے تسیری بار پھر یہی کہا لیکن شہزادہ نہیں اٹھا
 آخر چوتھی بار غصے میں کہا ”تم باذن (اٹھ جا میرے حکم سے)
 شہزادہ فوراً اٹھ کے بیٹھ گیا۔“

شمس تبریز اس کے بعد فوراً باہر چلے آئے اور محل میں ایک داویلا سی جمع گئی ”شمس تبریز نے مردہ زندہ کر دیا، شمس تبریز نے مردہ شہزادے کو زندہ کر دیا“ یہ سننے پر خیر خبر محل سے نکلی اور پورے شہر میں پھیل گئی علمائے شہر اور علمائے دربار ناک جھوں پڑھائے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ غضبِ خدا کا یہ شمس تبریز کو آخر ہو گیا ہے خدا کے حکم سے مردہ شہزادہ اٹھا نہیں لیکن اپنے حکم سے اٹھایا تو فوراً اٹھ بیٹھا، شمس تبریز نے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے اس پر شرعی حد جاری ہونا چاہیے۔

بڑے بڑے تمام علمائے جمع ہوئے شمس تبریز کو ان کے رد و کھرٹا کر دیا گیا اس معاملے میں بادشاہ بھی کچھ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ شمس تبریز پر تکفیر اور دعویٰ الہیت کا الزام لگایا گیا تھا۔

علمائے آپ سے جواب طلب کیا۔ ”کیا یہ صحیح ہے کہ جب تم نے قہ باذن اللہ کہا تو مردہ شہزادہ زندہ نہیں ہوا؟“

شمس تبریز نے جواب دیا ”ہاں یہ بالکل صحیح ہے“

علمائے پھر سوال کیا ”اور کیا یہ بھی درست ہے کہ جب تم نے مردہ شہزادے سے قہ باذن (اٹھ جا میرے حکم سے) کہا تو مردہ زندہ ہو گیا؟“

شمس تبریز نے جواب دیا ”ہاں یہ بھی درست ہے“

علمائے پھر یہ جبین ہو کے کہا ”یعنی مردہ شہزادہ اللہ کے حکم سے اٹھا نہیں لیکن تمہارے حکم سے اٹھ بیٹھا، آخر یہ کیا بات ہوئی؟“

شمس تبریز نے جواب دیا ”کیا میں اور خدا الگ الگ ہیں وہ بھی خدا ہی کی آواز تھی جس نے یہ کہا تھا کہ اٹھ جا میرے حکم سے چنانچہ مردے نے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور اٹھ بیٹھا۔“

علمائے غصے میں پوچھا ”کیا تم خدا ہو، کیا تم خدائی کے دعویٰ کر رہو؟“

شمس تبریز نے جوش میں کہا ”میں نے یہ کب کہا کہ میں خدائی کا دعویٰ دار ہوں؟“

علمائے کہا ”جب تم نے اپنے حکم سے مردے کو زندہ کر دیا تو اس کا اور کیا مطلب

ہوا؟“

شمس تبریز نے جواب دیا ”اس کا مطلب تمہاری موٹی کھوپڑی میں نہیں سمجھ

گالیں تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جس آواز نے تم باذن کہا تھا وہ میری اپنی آواز نہیں تھی وہ اللہ کی آواز تھی اور جب اللہ نے خود ہی یہ حکم دیا کہ میرے حکم سے اٹھ جاؤ مردہ اٹھ کے بیٹھ گئے پہلے میں نے تین بار اللہ کا نام لے کر اٹھنے کا حکم دیا تھا لیکن مردہ نہیں اٹھا تھا۔“

علمائے عاجز آگے کہا ”تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں آخر تم کہنا کیا چاہو؟“
شمس تبریزی نے جواب دیا ”ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں اس سے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بادشاہ اپنا کوئی حکم اپنے کسی خدمت گار کے ذریعے کسی تک پہنچایا اس شخص نے اس پر عمل نہیں کیا بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا لیکن سننے والے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا آخر بادشاہ خود اس شخص کے پہنچا اور یہی حکم اپنی زبان سے دیا تو بادشاہ کی پہلی آواز پر شخص جھک کر گرتے پڑا اپنا سر جھکا دیا۔“

علمائے حیرت سے کہا ”لیکن وہ آواز تو تمہاری تھی وہاں خدا کہاں تھا؟“
شمس تبریز نے علمائے بحث مباحثہ سے تنگ آگئے تھے، بولے ”میں نے تو کہہ دیا کہ خدا نے میری آواز میں اپنا حکم صادر فرمایا تھا۔“

علمائے عاجز آگے کہا ”شمس تبریز کا عذر ناقابل قبول ہے ان کی تاویل بے جاں ہے اور ان کی دلیل بعید از فہم ہے اور علما مجبور ہیں کہ شمس تبریزی پر دعویٰ الوہیت کی فرد جرم لگا کر حد شرعی جاری کریں۔“
شمس تبریز معصومیت سے علما کی صورتیں دیکھنے لگے۔

علما کے سربراہ نے اپنا فیصلہ سنایا ”چونکہ شمس تبریز نے عملاً الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے اس لئے علمائے حق کی یہ مجلس تعزیراً شرعی حد جاری کرتی ہے کہ شمس تبریز کی کھال کھینچو اے عبرت کی خاطر لوہے شہر میں گشت کرائی جائے۔“

شمس تبریز نے کسی خوف یا ڈکھ کا اظہار کئے بغیر کہا ”بس اتنی سی بات، تم لوگوں کو میری کھال درکار ہے فکر نہ کرو میں ابھی آتا ہوں دیتا ہوں۔“

اس کے بعد آپ نے کبیل اوڑھ لیا اور اپنی کھال خود اپنے ہاتھ سے اتار کے علما کے حوالے کر دی اور کہا ”لے جاؤ اے اور پورے شہر میں گشت کر اے لوگوں کے لیے عبرت کا نظارہ فراہم کر دو۔“

علمائے یہ کھال پوسے شہر میں گشت کرائی۔

اس کے بعد آپ نے بغداد چھوڑ دیا اور بصرہ کے لئے روانہ ہو گئے اس سفر میں بادشاہ کا بیٹا محمد بھی ان کے ساتھ تھا ایک جگہ یہ کشتی میں سوار دریا کے دوسری طرف جا رہے تھے کہ کشتی ڈلگ جانے لگی۔ آپ نے شہزادے سے کہا ”کیا تمہارے پاس کوئی قیمتی چیز موجود ہے؟“ شہزادے نے جواب دیا ”ہاں ایک لعل میرے پاس موجود ہے۔“ شمس تبریز نے کہا ”اسے دریا میں پھینک دو، ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔“ شہزادے نے حکم کی تعمیل کی اور لعل دریا میں پھینک دیا۔ اس کے بعد دریا میں دور تک لعل ہی لعل دکھائی دینے لگے۔



آپ نے ملتان میں سکونت اختیار کی لیکن یہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی مخالفت کی۔ کچھ بھڑائیوں کا کہنا تھا کہ ”یہ لعل کشتی سے نکل آئے اور گوشت کا جب بھی کوئی حصہ کھٹا مکھیا بھسن بھسن کرنے لگتی۔“ لوگ ان کے عقائد اور ادھرے ہوئے جسم سے گھن کھانے لگتے شہزادہ ان کے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا۔ لوگ ان دونوں کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ جھوک سے بڑا حال ہو رہا تھا، اتفاق سے آپ کو کہیں سے گوشت کا ایک ٹکڑا ہاتھ آگیا۔ آپ نے شہزادے کو حکم دیا ”شہزادے! جاؤ اور کسی سے آگ مانگ لاؤ تاکہ میں اس گوشت کے ٹکڑے کو بھجوں لوں۔“

شہزادے نے تعمیل ارشاد میں گردن جھکالی اور آگ کی طلب میں نکل کھڑا ہوا لیکن بد قسمتی سے جس سے بھی آگ مانگی اس نے نفی میں جواب دیا۔ ایک جگہ آگ جل رہی تھی شہزادے نے آگ کے قریب جا کے لوگوں سے کہا ”لوگو! مجھے ذرا سی آگ دے کر رہے۔“

ایک تند خوشہ شہزادے کو جلالی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ”کیا تو وہی شخص ہے جو اس ننگ دھڑنگ اور مٹری کھال والے گھناؤنے آدمی کے ساتھ کہیں باہر سے آیا ہے؟“ شہزادے نے جواب دیا ”ہاں میں وہی شخص ہوں۔“

اس خوفناک شخص نے غصے میں کہا ”اچھا تو تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے ہم سب پر بھی کوئی عذاب

شہزادے نے خوشامد سے کہا ۛ ”لوگو! اب تم لوگ ہمیں آنا بھی نہ سناؤ کہ ہمارے دلوں سے تمہارے لیے دُعا کی خیر کی جگہ کچھ اور نکلے ۛ

وہ ظالم شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور غصے میں شہزادے کے کٹی ہاتھ رسید کر ڈیٹے شہزادے نے بچنے کی کوشش کی تو اس کے کٹی ہاتھ دونوں رخساروں اور ناک پر پڑے جس سے شہزادے کی تکمیر پھوٹ گئی اور دونوں نتھنوں سے خون کی دھار بہنے لگی شہزادہ آگ لے بغیر شمس تبریزی کی خدمت میں واپس آگیا اور پوری رو داد سننے کے کہنے لگا ۛ ”حضرت! یہاں کے لوگ بڑے سخت اور ظالم ہیں خوشامد درآمد سے بھی ان کے دل نہیں پیسجے، اس لیے انہیں چھوڑ کے ہمیں کہیں اور چلا جانا چاہیے ۛ

شمس تبریزی نے جواب دیا ۛ ”نہیں ہم یہیں ہیں گے اور لوگ اگر ہمیں آگ نہیں دیتے تو نہ دیں ہم خود ہی آگ فراہم کئے لیتے ہیں ۛ

اس کے بعد شمس تبریزی نے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کو مخاطب کیا ۛ ”او میرے ہم نام دلا تو ہی نیچے آجاتا کہ میں اپنا گوشت کا ٹکڑا بھون لوں ۛ

آپنے گوشت کا ٹکڑا سورج کی طرف اٹھایا گرمی دم بہ دم شدید ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں میں اتنی حدت پیدا ہو گئی کہ پورا شہر جلنے جھلنے لگا لوگ ادھر ادھر دھڑکھٹے پھیننے لگے بہت سے دریا کی تہ میں اتر گئے لیکن دریا کا پانی بھی کھولنے لگا ۛ کچھ لوگوں نے ہمت سے کام لیا اور بھاگ کے شمس تبریزی کی خدمت میں پہنچ گئے بولے ۛ ”حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کر دیا؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ پورا شہر جل بھٹن کر ختم ہو جائے؟ ۛ

شمس تبریزی نے بے نیازی سے جواب دیا ۛ ”بابا! میں کیا اور میری خواہش کیا، میں ایک مجبور اور معتوب انسان جسے شہر والے اس لالچی بھی نہیں سمجھتے کہ اسے ذرا سی آگ ہی دے دیں تاکہ اس میں اپنی غذا بھون لوں ۛ

لوگوں نے کہا ۛ ”حضرت! آپ کو کتنی آگ دکھا رہے کہیے تو اسی وقت فراہم کر دی جائے گی ۛ

شمس تبریزی نے کہا ۛ ”لوگو! تم میری مدد تو کرتے نہیں لیکن مجھ سے مدد کے مطالبہ ہو ۛ

پھر سوچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”ابا! نے اپنے سہم نام کو اپنے کام سے ذرا نیچے بلالیا تو تم لوگ پریشان ہو رہے ہو، خیر، اس کے بعد سوچ کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا: ”بابا! بازو! یہ کہنا تھا کہ سوچ گویا پیچھے ہٹ گیا اور موسم معمول پر آگیا۔
لوگ کہتے ہیں ملتان کی گرمی میں اس واقعے کا بڑا ہاتھ ہے۔



آپ مولانا جلال الدین رومی کے پاس بیٹھے تھے شمس تبریز کی صحبت سے جو لوگ جلتے تھے ان میں مولانا رومی۔۔۔۔۔ کا بیٹا علاء الدین بھی شامل تھا لوگ جب یہ کہتے کہ مولانا رومی ایک پڑھے لکھے لائق آدمی ہیں لیکن یہ بڑی عبرت کی بات ہے کہ ان کی ذات پر شمس تبریز کا قبضہ رہتا ہے، وہ شمس تبریز جو ننگ دھڑلنگ ہوتا ہے اور جس کے ہوش و حواس تک ٹھکانے نہیں۔ علاء الدین لوگوں کی باتیں سنا تو اسے شمس تبریز پر براغصہ آتا۔

شمس تبریز جب مولانا رومی کے پاس موجود ہوئے تو مولانا کا بیٹا علاء الدین ان کے پاس نہ جاتا۔

شمس تبریز مولانا رومی سے باتیں کر رہے تھے کہ کسی شخص نے باہر سے جھانک کے دیکھا مولانا رومی نے دریافت کیا کہ کون ہو بجائی! سامنے آؤ۔

مگر وہ شخص سامنے نہیں آیا۔ دونوں پھر باتیں کرنے لگے اسی دوران اس شخص نے ایک بار پھر جھانک کے اندر کی طرف دیکھا۔ مولانا رومی نے پھر پوچھا ”تم کون ہو اور اندر کیوں نہیں آتے؟“ اس شخص نے شمس تبریز کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ مولانا رومی نے شمس تبریز سے پوچھا ”یہ شخص اشارے سے کیا کہہ رہا ہے؟“

شمس تبریز نے جواب دیا "وہ مجھے باہر بلارہا ہے"
 مولانا رومی نے پوچھا "کیا آپ اس شخص سے واقف ہیں؟"
 شمس تبریز نے جواب دیا "نہیں میں اسے نہیں جانتا"
 مولانا رومی نے حیرت سے کہا "پھر یہ شخص آپ کو باہر کیوں بلارہا ہے؟"
 شمس تبریز نے جواب دیا "یہ شخص مجھے قتل کرنے کیلئے باہر بلارہا ہے"
 مولانا رومی نے پریشان ہو کر پوچھا "یہ آپ کی فرمائش ہے؟"
 شمس تبریز نے کہا "میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس میں جھوٹ ذرا بھی نہیں"

اسی دوران اسل جنہی نے ایک بار پھر جھانک کر دیکھا۔ شمس تبریز نے اس سے کہا ”اچھا بھائی! تو کیوں پریشان ہوتا ہے میں آتا ہوں اور مشیتِ ایزدی پوری کیے دیتا ہوں۔“ مولانا رومی ابھی یہ باتیں پوری طرح سمجھ بھی نہ تھے کہ شمس تبریز باہر نکل گئے وہاں سات آدمی ان کے منتظر کھڑے تھے ان میں مولانا رومی کا بیٹا بھی شامل تھا شمس تبریز جیسے ہی باہر نکلے ان ساتوں آدمیوں نے بجا رگی شمس تبریز پر حملہ کر دیا اور انہیں چھروں اور تلواروں سے ہلاک کرنے لگے۔ شمس تبریز نے ایک زوردار غرہ لگایا جس کے اثر سے یہ ساتوں آدمی بے ہوش ہو گئے۔

مولانا رومی بے چین ہو کے باہر نکلے اور شمس تبریز کو تلاش کرنے لگے جس جگہ انہیں زخمی کیا گیا تھا وہاں خون کے دھبے تو ضرور موجود تھے لیکن شمس تبریز کی لاش وہاں نہیں تھی مولانا نے بے ہوش آدمیوں میں اپنے بیٹے کو بھی موجود دیکھا مولانا رومی اپنے بیٹے سے اس قدر ناراض ہوئے کہ بیٹے کی صورت تک سے نفرت ہو گئی۔

کچھ عرصے بعد مولانا رومی کے دوسرے بیٹے سلطان کو شمس تبریز ثواب میں دکھائی دیئے سلطان نے آپ سے پوچھا ”حضرت! آپ کہاں ہیں؟ آپ تو ایسے غائب ہوئے کہ والد صاحب تلاش کرتے کرتے پریشان ہو گئے لیکن آپ نہیں ملے، آخر آپ ہیں کہاں؟“ شمس تبریز نے جواب دیا۔ ”میرے جسم کے ٹکڑے آبادی کے باہر ایک ویران کنوئیں سے نکال لو۔ مجھے لوگوں نے قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یہ ٹکڑے اس ویران کنوئیں میں ڈال دیئے۔“

مولانا رومی کے بیٹے سلطان نے گھبرا کے پوچھا ”وہ میں ان ٹکڑوں کو نکال کے کیا کروں؟“ شمس تبریز نے جواب دیا ”یہاں کے مدرسے کے بانی امیر بدیع الدین کے پہلو میں ان ٹکڑوں کو دفن کرو۔“

میدار ہونے پر اس کنوئیں سے شمس تبریز کے جسم کے ٹکڑے برآمد کر لیئے گئے اور انہیں شمس تبریز کی خواہش کے بموجب وہاں کے مدرسے کے بانی امیر بدیع الدین کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔



مولانا رومی کے جس لڑکے نے شمس تبریز کے قتل میں عملی حصہ لیا تھا کچھ عرصے

بعد ایک ہلک بیماری میں مبتلا ہو کے ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اس کی اذیتیں لوگوں سے دیکھی نہ جاتی تھیں۔ لوگوں نے مولانا رومی کو مطلع کیا کہ علاء الدین کی حالت بہت خراب ہے آپ اس کا دیدار فرمائیں۔ کیونکہ وہ صبح شام میں کسی وقت بھی مر جائے گا۔
مولانا رومی نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

چند دنوں بعد کسی نے مولانا کو مطلع کیا ”مولانا! علاء الدین کا انتقال ہو گیا“
مولانا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

علاء الدین کا جنازہ قبرستان روانہ ہو گیا، اس جنازے کے ساتھ چند اجنبی چل رہے تھے جو انسانی ہمدردی کی وجہ سے اس میں شامل ہو گئے تھے لوگوں نے مولانا رومی کو ایک بار پھر مطلع کیا ”مولانا! علاء الدین کا جنازہ قبرستان جا رہا ہے آپ اس میں شرکت فرمائیں“
مولانا رومی نے ایک بار پھر نفرت سے منہ پھیر لیا اور جواب دیا ”ستم تبریز کا قاتل میرا بیٹا نہیں ہو سکتا، وہ میرا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑے مرد ستمی کا قاتل تھا اس کے جنازے میں میں کیوں شرکت کروں“



حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خدا ہوش کربايع ہر ذقت کسی فکر میں ڈوب رہے تھے وہاں بچہ جب اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو گیا تو بیوہ ماں کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر لاحق ہو گئی، گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ تھا زمانے کے دستور کے مطابق ایک شیرینی اور چھوہاروں سے بھر کر غلام کو کو حکم دیا کہ بچے کو محلے کے مکتب میں داخل کرادو۔

طباق کا ندھ پر رکھے اور ایک ہاتھ سے بچے کی انگلی پکڑے جب غلام گھر کی گلی سے ذرا آگے بڑھا تو ایک بزرگ نے اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا ”اس بچے کو کہاں لیے جا رہے ہو؟“

غلام نے جواب دیا ”مکتب میں داخل کرانے“

اجنبی بزرگ نے جواب دیا ”اس بچے کو بھلا مکتب کا مولوی کیا پڑھا سکے گا۔ میرے ساتھ آؤ، میں اس بچے کو اس کے استاد کے پاس پہنچا دوں جو منجانب اللہ مقرر ہوا ہے۔“ غلام سراسیمہ اور سہما سہما ان بزرگ کے ساتھ ہولیا تھوڑی دیر بعد یہ لوگ مٹ ہو کر بزرگ اور عالم باعمل ابو حفصؒ کے گھر پہنچ گئے اور اجنبی بزرگ نے بچے کو ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا ”ابو حفصؒ! اس بچے کو خوب پہچان لے اور جی جان سے اس کی تعلیم و تربیت کر۔“

وہ بزرگ یہ کہہ کر چلتے بنے اور ابو حفصؒ نے بچے کو احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ پھر غلام سے پوچھا۔

”یہ بزرگ کون تھے؟“

غلام نے شیرینی اور چھوہاروں کا طباق ابو حفصؒ کے روبرو رکھ کر پورا قصہ سنا دیا اور آخر میں کہا ”میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔“

ابو حفصؒ نے رمز میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ سے کہا ”ہاں تم کیا جانو، یہ خضر

علیہ السلام تھے“

غلام بہت بچا پاگلوں کی طرح ابو حفصؒ کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

ابو حفص کے قریب ہی رحل پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا۔ بچے کے ہاتھ میں تختی تھی، استاد نے قلم سیاہی میں ڈبوایا اور پھر تختی کی طرف بڑھاتے ہوئے بچے سے دریافت کیا ”ہاں بیٹے! کہاں سے تمہاری تعلیم کا اعتنا کیا جائے؟“

بچے نے سادگی سے جواب دیا ”لکھیے سُجَّانَ الَّذِي (سُجَّحِي) ...“

استاد نے حیرت سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا ”لیکن یہ تو پندرہویں پارے میں ہے

اور اس سے پہلے کے چودہ پارے؟“

بچے نے سادگی سے جواب دیا ”جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا انہوں نے

چودہ پارے ختم کر لیے تھے وہ سارے مجھے حفظ ہو چکے ہیں پندرہواں شروع کیا تھا کہ میری دلدل ہونے لگی“

ابو حفصؒ نے امتحاناً کہا ”اچھا انہیں سناؤ“

بچے نے بے جھجک الف لام میم سے لے کر رُبَّ مَا يُؤَدُّ الَّذِينَ (چودہویں پارے)

کے آخر تک سُنادیا۔

غلام کے ہوش و حواس جالتے رہے لیکن استاد کا دل جذبہ فخر و انبساط سے سرشار

ہو گیا کہ پوری زندگی میں ایک عظیم الشان بچے کی استادی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

بچے نے بقیہ پارے بھی حفظ کر لیے۔

یہیں ایک دن بچے کی ملاقات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہو گئی دونوں

ایک دوسرے کی طرف کھینچے اور کھینچ کر دھ گئے شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جو دونوں کی

مقدرات میں تھا۔



علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل ہو چکی تھی اب وہ بچہ جوانی میں قدم رکھ کر قطب الدیوب

کے نام سے معروف ہو چکا تھا نوجوانی کے آغاز ہی میں مجاہدے اور ریاضت کا یہ عالم؟

کہ نماز اور تلاوت کلام کے مسلسل عمل اور اوراد و وظائف کی شدید محنت کے بعد جب

بستر سے پشت لگاتے تو ہزاروں بار درود شریف کا ورد کرتے۔

کچھ دنوں سے ماں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ بیٹا انہیں پھونک کر کہیں جانے والا ہے

کسی لمبے اور دُور دراز سفر پر۔ ماں نے ازراہِ فرض مادری ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی سے بیٹے کی شادی کر دی نوجوان قطب الدین اس حسین پری پیکر میں کچھ ایسا کھو گیا کہ سائے دن کی ریاضت کے بعد رات کا وقت اس پری پیکر پر وقف کر دیا۔ درود شریف کے ورد کا عمل فراموش ہو گیا اور اس صورتِ حال کو تین دن گزر گئے۔

قطب الدین کی بزرگی اور ولایت کا دُور دُور شہرہ ہو چکا تھا اس پاس کے لوگ ان کے مرید ہو چکے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد جب قطب الدین نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی تو کسی نے بتایا کہ رئیس احمد نامی ایک عمر رسیدہ پڑوسی مرید شرفِ ہم کلامی کے خواہش مند ہیں۔ نوجوان قطب الدین نے تلاوت کلام پاک کے بعد ان بزرگ سے ملاقات کی اور دریافت فرمایا ”ہم سے کوئی خاص کام؟“

بزرگ پڑوسی نے کچھ تکلف اور کچھ شرمائے شرمائے لہجے میں عرض کیا ”حضرت! جو عرض کرنا ہے خود دیں اس کی ہمت نہیں پاتا۔“

قطب الدین نے جواب دیا ”شرماؤ نہیں جو بات ہے صاف صاف کہہ دو۔“
شرمیلے پڑوسی نے عرض کیا ”حضرت! رات کے پچھلے پہر اس ناچیز نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس خادم نے دیکھا کہ ایک عالی شان محل کے سامنے کھڑا ہے اس محل کے سامنے لوگوں کا زبردست ہجوم ہے محل کے اندر سے ایک درمیانہ قد نورانی چہرے کا آدمی باہر آتا ہے اور لوگوں کا پیغام لے کر اندر چلا جاتا ہے اور پھر وہاں سے جواب لیکر واپس آتا ہے یہ غلام آگے بڑھا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ بھائیو! یہ کون بزرگوار ہیں اور یہ محل کن صاحب کا ہے؟ جواب ملا۔

یہ قصر تو رسول مقبول کا ہے اندر آپ تشریف فرما ہیں اور یہ بزرگوار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ حضرت رسول مقبولؐ کے نام پیغامات بھیجتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اندر پہنچا دیتے ہیں سنتے ہی یہ خاکسار حضرت عبداللہؓ کی طرف بڑھا اور ان سے درخواست کی کہ حضرت! رسول قبول کی خدمت میری درخواست پہنچا دیجئے کہ رئیس احمد نامی آپ کا غلام زادہ دینار میرے انوارِ امتشاق ہے اس پر بھی کم ہو جائے تھوڑی دیر بعد حضرت عبداللہ میری درخواست کا یہ جواب لے کر واپس آئے کہ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ ابھی تجھ میں ہمارے دیکھنے کی قابلیت نہیں ہے تو واپس جا اور قطب الدین سے کہنا کہ کیا بات ہے تین راتوں سے تمہارا تسخف بن نہیں ملا۔“

خواب میں کرنا جو ان قطب الدین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے چند لمحوں کے لئے سکوت اختیار کیا، سینے میں ایک طوفان برپا تھا حسین بیوی کے سحر اور رسول مقبول کی محبت میں بپا ہونے والی جنگ میں عورت کو شکست ہو گئی آپ اُسی وقت اندر گئے، بیوی کو اس کا مہر ادا کیا اور طلاق دیکر ہمیشہ کی جدائی اختیار کر لی۔ ماں اپنے بیٹے کی عظمت سے واقف تھی وہ خاموش رہی پھر ماں کے استفسار پر بیٹے نے یہ مختصر جواب دے کر اُسے چپ کر دیا ”جوشے رسول اللہؐ کی نظر میں مجھے شرمسار کر دے میں اسے کس طرح دکھ سکتا ہوں“ پھر وطن بھی چھوڑ دیا اور بغداد کے لئے روانہ ہو گئے جب رات ہو گئی تو ایک مسجد میں قیام کیا نماز کے بعد آپ وظیفے میں مشغول ہو گئے اسی عالم میں انہیں اپنا بچپن یاد آیا، وہ دن جب کسی اجنبی بزرگ نے انہیں استاد ابو حفصؒ کی خدمت میں پہنچا دیا تھا اور جس کی بابت استاد ابو حفصؒ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ وہ اجنبی بزرگ خضرؑ تھے جو تمہاری رہنمائی کو حاضر ہوئے تھے قطب الدین نے سوچا کہ خضر علیہ السلام کی ضرورت آج کہیں زیادہ ہے لیکن ایک خوب صورت لڑکے نے مسجد میں داخل ہو کر ان کے انہماک کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے پوچھا ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

قطب الدین نے جواب دیا ”ذکر و فکر“
 لڑکے نے کہا ”ذکر کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن یہ فکر کس کی کر رہے ہو؟“
 نوجوان قطب الدین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”خضر علیہ السلام کی“
 لڑکے نے حیرت سے قطب الدین کو دیکھا اور پوچھا ”وہ کس لئے؟“
 ”یہ یاد دینا کے لئے؟“

قطب الدین نے بے نیازی سے جواب دیا ”بزرگے کو دونوں سے مطلب نہیں، میں صرف اللہ کے واسطے اُن سے ملنا چاہتا ہوں“
 لڑکے نے کہا ”خوب! جس خضرؑ کی تو ارزو رکھتا ہے وہ خود تیری ہی طرح سرگرداں ہے“

اسی لمحے مسجد کے ایک گوشے سے ایک عمر رسیدہ شخص ان کے قریب آگیا اور پوچھا ”کیا بات ہے؟ تم دونوں کس بات پر الجھ رہے ہو؟“
 لڑکے نے ہنس کر کہا ”یہ نوجوان کہتا ہے کہ مجھے نہ تو دین چاہیئے اور نہ دنیا،“
 ۲۰۶ پھر بھی خضرؑ کی ضرورت محسوس کر لے ہے“

مسجد کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں نوجوان قطب الدین نے ان بزرگ کو دیکھا اور ان کے حافظ میں بچپن کے اُس اجنبی بزرگ کی شبیہ ابھڑائی جس نے انہیں استاد ابو جھنڈی کی خدمت میں پہنچایا تھا قطب الدین نے کچھ پوچھنے کے لئے حیرت زدہ انداز میں رٹکے کی طرف دیکھا لیکن لڑکا وہاں موجود نہ تھا اس کے فوراً بعد ہی وہ اجنبی بزرگ کی طرف مڑے لیکن ادھر بھی کوئی نہ تھا حیرت، ٹمٹماتا دیا، رات کا سناٹا اور جھینگر وں کے ساز و آواز کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔



یہ سترہ سالہ نوجوان جب شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ احمد الدین کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمود اصفہانی جیسے بزرگ جید صوفیائے کرام کی صحبت میں داخل ہوا تو اس مادرِ زاد ولی کی ولایت پر کبھی رشک کرنے لگے حضرت خواجہ معین الدین سے یہیں ملاقات ہو گئی اور نوجوان قطب الدین نے والہانہ فرمایا: یا حضرت! اب تاب صبر نہیں اس ناچیز کو شرفِ غلامی سے سرفراز فرمائیں!

حضرت خواجہ معین الدین نے تلبسم فرمایا اور امام ابو اللیث سمرقنی کی مسجد میں مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے ربوب، قطب الدین کو شرفِ مریدی بخش کر بختیار کا خطاب عطا فرمایا۔ اور اپنی خلافت بھی بخش دی دونوں حضرات ایک بار پھر جدا ہو گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند کو کرا، جمیر چلے گئے اور نوجوان قطب الدین ایران اور عرب کی سیر و سیاحت میں مصروف ہو گئے عرصہ بعد جب انہیں اپنے مرثد کی اجمیر میں موجودگی کا علم ہوا تو نوجوان مرید اپنے مرثد سے ملنے کے لئے ہندوستان چل پڑا۔ ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا سے ملاقات ہوئی، دونوں ملکر بے حد خوش ہوئے۔

ابھی ملتان میں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ تانایوں نے اُس کا محاصرہ کر لیا، پورا شہر خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا، شہر کا حاکم خوف زدہ تھا فوج محدود اور کسی طرف سے کمک ملنے کی کوئی امید نہ تھی مقابلے کی ہمت نہ پا کر حاکم شہر نے تلوار اپنے گلے میں لٹکالی اور مجرموں کی طرح حضرت بہاء الدین زکریا ملتان کی خدمت میں حاضر ہو گیا ان کے سامنے ہی حضرت بختیار بھی تشریف فرما تھے حاکم شہر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں حضرت بہاء الدین سے کہا: حضرت! وحشی تانایوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے کوئی دقت جاتا ہے کہ وہ فاتحانہ شہر میں داخل ہو جائیں گے اور شہریوں کی دولت و ناموس پر وحشیانہ ہاتھ صاف کرنے لگیں گے، خدا کے لئے کچھ کیجئے۔

حضرت بہا الدینؒ نے مخزن مہمان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، گویا کہ یہ ہے ہوں۔
 ”قطب الدین! تمہارے ہوتے ہوئے ہماری کیا مجال جو کوئی قلم اٹھائیں“
 نوجوان قطب الدین نے حاکم شہر سے کہا: ”وہ تاناری کہاں ہیں؟ وہاں ہمیں لے چلو!“
 حاکم شہر نے جواب دیا: ”حضرت! قلعے کی فصیل یا کسی برجی سے تاناریوں کے
 لشکر کا مشاہدہ فرما سکتے ہیں“

آپ نے فرمایا: ”چلو ایسا ہی سہی، وہیں سے دیکھ لیں گے“
 حاکم شہر نے آپ کو قلعے کے صدر پھانگ کی برجی میں لے جا کر کھڑا کر دیا، آپ نے
 دیکھا، حد نظر تک سیاہ، نیلے اور سُرخ خیموں کا ایک جنگل سا پھیلا ہوا تھا اور خیموں کے
 سامنے کے میدان میں بڑے بڑے بالوں اور چوڑے اور ابھرے ہوئے جبروں اور
 کھلی زنگے کے مسلح اور غول خوار تاناری، دمدموں اور منجنیقوں کے اس پاس چل پھر
 رہے تھے حضرت قطب الدینؒ نے برجی میں متعین ایک سپاہی کے ترکشیں سے ایک تیر نکال
 لیا اور حاکم شہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ”لو، اسے چلتے میں رکھ کر پوری قوت سے دشمنوں
 کی طرف چھوڑ دو“

حاکم شہر اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا بولا: ”لیکن جناب والا! یہ تو ایک قلم اعلان جنگ
 ہو جائے گا اور جواب میں جب یہ وحشی قلعے پر یلغار کریں گے تو ہم انہیں روک نہیں سکیں گے“
 حضرت بختیارؒ نے بے نیازی سے فرمایا: ”جب ہم نے ہم سے مدد مانگی ہے تو پھر
 جیسا ہم کہیں اُس پر عمل کرو، ورنہ فقیر کو اجازت دو، یہ واپس جائے اور ہم جیسا مناسب سمجھو
 اس پر عمل کرو“

حاکم شہر نے سوچا تباہی اور بربادی کے امکانات تو دونوں ہی صورتوں میں موجود ہیں
 اگر نوجوان درویش بختیارؒ کے مشورے پر عمل نہ کیا گیا تب بھی یہ وحشی معاف نہ کریں گے اور
 اگر بختیارؒ کے حکم پر چھوڑا گیا تب بھی بربادی لازم ہے دل نے مشورہ دیا کہ نوجوان بختیار
 کے حکم کی تعمیل زیادہ اہم ہے اس کے بعد اگر تباہی آتی ہے تو یہ بزرگ خود ہی کچھ کریں گے۔
 حاکم شہر نے رگے کی تلوار تار کر ایک طرف رکھ دی اور سپاہی سے کمان لے کر چلتے پیر تیر چڑھایا
 اور پھر پوری قوت سے کھینچ کر چھوڑ دیا، تانت سے شپ کی آواز نکلی، کمان تھڑکائی اور تیر
 ہوا میں لہراتا ہوا ایک منجنیق پر پہاڑی چٹان کی طرح جاگرا، منجنیق چٹان چوڑ ہو گئی اُس کے

اس پاس موجود وحشی خوف زدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھ گئے ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی یہ معرکہ حل نہ ہوا تھا کہ مغرب سے طوفان گرد و باد اٹھا اور اس نے تاناریوں کو محاصرے میں لے لیا دم سے اڑ گئے، منجھتیں کہیں سے کہیں جا پہنچیں، خیمے ہوا میں خبروں کی طرح اڑنے لگے تاناری بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائے لگے ابھی طوفان گرد و باد کم نہ ہوا تھا کہ موسلا دھار بارش نے آلیا اور تاناری میں سب کچھ ڈوب گیا۔

حضرت بختیارؒ کے قدموں میں حاکم شہر گر کر اٹھیں فرط عقیدت سے بوسے دے رہا تھا، اپنے اُسے اٹھایا، حاکم شہر نے گر کر اُٹھ کر عرض کیا ”حضرت! غلام آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے“

آپ نے بے نیازی سے ارشاد کیا ”تو ان کی خدمت کر، جنہیں تیرے سپرد کیا گیا ہے یعنی اہالیانِ ملتان اور بندگانِ خدا کی خدمت، ہم تو خود ہی تم سب کی خدمت پر متعین ہوئے ہیں“ حاکم شہر نے درخواست کی ”حضرت! آپ ملتان ہی میں قیام فرما رہے ہیں آپ کی موجودگی ہماری طمانیتِ قلب کا باعث ہے گی“

آپ نے جواب دیا ”ملتان بہاء الدینؒ کے حوالے کیا گیا ہے ہم یہاں چند دنوں کے لیے مہمان کی حیثیت سے تو رہ سکتے ہیں مستقل نہیں“

حاکم شہر نے استیاق سے پوچھا ”حضور والا کو کون سا علاقہ تفویض ہوا ہے؟“

آپ نے جواب دیا ”ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے ہم دہلی جا رہے ہیں ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ بھی کہاں متعین کرتا ہے؟“

حاکم شہر نے گومسکو سے پوچھا ”ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے؟“

حضرت وہ تو دہلی سے حکومت کرتا ہے، یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ہندوستان کی راجدھانی اجمیر ہے؟

آپ نے تبسم فرمایا اور کہا ”دہلی کا بادشاہ بھی ہمارے سلطان کا تابع ہے تمہارے

بادشاہ کا نام سلطان شمس الدین التمش ہے اور ہمارے سلطان کا نام خواجہ معین الدین چشتی ہے

ہمارا سلطان، سلطانوں کا سلطان ہے“

حاکم شہر کو ان رموز کا کیا پتہ تھا۔ چپ ہو رہا۔

آپ ملتان سے چل کر، دہلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ نے مشہور زمانہ بزرگ ۲۰۹

قاضی حمید الدین ناگوری کے یہاں قیام فرمایا، حمید الدین ناگوری ہر اعتبار سے حضرت بختیار کے مرشد معلوم ہوتے تھے لیکن حفظ مراتب کی ادائیگی کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ نوجوان بختیار کی عزت اور احترام حضرت حمید الدین ناگوری مریدوں کی طرح کرتے لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔ ”عجیب بات ہے کہ قاضی حمید الدین جیسا بزرگ کامل اس نوعمر بختیار کا اس طرح احترام کرتا ہے جیسے کوئی مرید کسی مرشد کا کرے۔“

ایک مرزٹاس نے جواب دیا: ”تم لوگ کیا جانو حضرت قطب الدین بختیار اپنی نوعمری کے باوجود قطب المشائخ ہیں اور فضل و کمال میں حضرت حمید الدین ناگوری سے فائق ہیں“ دہلی سے حضرت بختیار نے اپنے مرشد خواجہ چشتی کو لکھا: ”غلام بختیار دہلی تک آچکا ہے اور آپ کی زیارت کا خواہاں ہے آپ کی اشارت یا بشارت کے ملتے ہی قدم بوسی کا شرف حاصل کر لے گا۔“

چند دنوں بعد حضرت خواجہ چشتی کا جواب آگیا: ”آپ نے لکھا تھا بختیار! تم دہلی میں ٹھہرے رہو اللہ نے وہاں کی ولایت تمہارے سپرد کر دی ہے تمہیں میرا قرب و روحانی حامل ہے جس میں بعد مکانی حامل نہیں ہو سکتا۔ چند دنوں بعد یہ فقیر بھی وہیں پہنچے گا اور ہم دونوں کی ظاہری ملاقات بھی ہو جائے گی۔“

حضرت بختیار دہلی میں قیام فرما ہو گئے روز بروز ہجوم بڑھنے لگا پھر پورا شہر آپ کا معتقد ہو گیا، آپ اس ہجوم سے تنگ آکر کہیں چلے جانا چاہتے تھے لیکن حضرت خواجہ چشتی نے یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم جو دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش بھی ہفتے میں دو دن حاضری دینے لگا اس نے آپ کو کچھ مرحمت فرمانا چاہا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا پھر التمش کا حاجب (سکیٹری) بہت سادہ نقد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذر پیش کرنا چاہا لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ ”فقیر کو ان کی کوئی حاجت نہیں۔“

بادشاہ کے حاجب نے اصرار کیا، بولا: ”حضرت! اسے قبول فرمائیں کیوں کہ انسانی ضروریات اسی سے پوری ہوتی ہیں ان کی آپ کو یقیناً ضرورت پیش آئے گی۔“

حضرت بختیار جس بورے پر بیٹھے تھے آپ نے اس کا ایک کونا اٹ لٹ دیا اور

بادشاہ کی حاجب سے فرمایا: ”ادھر دیکھ، میرے بورے کے نیچے۔“

حاجب نے دیکھا، بویہ کے نیچے سونے کی ہر گہرائیوں میں جا کر غائب ہو گئی ہے
 حیران رہ گیا حضرت بختیار نے فرمایا ”حق تعالیٰ غیب کا خزانہ اپنے دوستوں کے تصرف
 ن سے دیتا ہے ان کو تمہارے در و جواہر کی کوئی ضرورت نہیں“

اسی دوران سرکاری شیخ الاسلام کا انتقال ہو گیا التمش نے یہ عہدہ حضرت بختیار
 پیش کیا لیکن آپ نے انکار کر دیا مجبوراً یہ منصب ایک دوسرے بزرگ نجم الدین صغریٰ کو
 پیش کیا گیا انہوں نے اسے قبول کر لیا، نجم الدین صغریٰ حضرت خواجہ چشتی کے پیر بھائی بھی
 تھے وہ شیخ الاسلام تو مروہ بن گئے لیکن اپنے روحانی مرتبے سے نیچے آگئے سادہ ہجوم
 حضرت بختیار کے دیر رہتا تھا، شیخ الاسلام کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا ان کے دل میں حضرت
 بختیار کے خلاف حسد پیدا ہو گیا کچھ دنوں بعد جب حضرت خواجہ چشتی ”دہلی پہنچے تو حضرت
 فیتار سے ملکر شیخ الاسلام سے ملنے بھی گئے اُس وقت نجم الدین صغریٰ اپنے مکان کے
 رضی حصوں کی تعمیر کر رہے تھے انہوں نے حضرت خواجہ چشتی کو نکھیوں سے دیکھا اور نظر انداز
 گئے حضرت خواجہ شیخ الاسلام کی سر دھری سے آزرہ خاطر ہوئے اور انہیں مخاطب
 کے فرمایا: ”نجم الدین! یہ تجھے ہو گیا ہے کیا شیخ الاسلامی کے منصب نے تیرے
 ل میں غرور پیدا کر دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تو گویا چاہہا ہلاکت میں گرا“

شیخ الاسلام نے تہمید آمیز لہجے میں جواب دیا ”حضرت! میں تو آپ کا اس حد تک
 غلص اور تابعدار ہوں کہ جہاں آپ قدم رکھتے تھے وہاں میں اپنا سر رکھ دیتا تھا لیکن اب مجھے
 پیسے یہ شکایت ہو گئی ہے کہ آپ نے اپنے مرید قطب الدین بختیار کو دہلی کی ولایت
 طا فرمادی ہے اور اجمیر سے تشریف لا کر آپ نے شرفِ مہمان نوازی بھی اپنے اسی مرید
 بخشا ہے ان تمام باتوں اور آپ کی عنایتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہاں کی ساری خلقت اسی
 پر حاضری دینے لگی ہے اور میں جو شیخ الاسلام ہوں اس حد تک بے وقعت ہو چکا
 ہوں کہ ایک شخص بھی مجھے پان تک سے نہیں نوازتا، میں خود کو حقیر محسوس کرنے لگا ہوں“
 حضرت خواجہ نے افسوس سے جواب دیا ”اچھا شیخ! تو خاطر جمع رکھ ہم قطب الدین
 اپنے ہمراہ اجمیر لے جائیں گے“

حضرت خواجہ بختیار کے پاس پہنچے اور آزرہ کی سے فرمایا ”قطب الدین! اس
 شہر میں تجھ سے حسد کیا جاتا ہے اور بعض تیرے شاکی ہیں تو ہمارے ساتھ اجمیر چل، ہم وہاں

تجھے مسند شیوخت پر بٹھا کر تیرے روبرو حاضری دیا کریں گے اور تیری خدمت کیا کریں گے ۛ

نوجوان مرید اس دیدہ ہو گیا اور دل در لہجے میں جواب دیا ۛ جو کچھ حضور نے فرمایا ہے یہ آپ کی بندہ نوازی ہے غلام تو بس اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ آپ کے روبرو دست بستہ کھڑا ہے اس کی کیا مجال کہ سامنے بیٹھ بھی سکے ۛ

سامان سفر تیار ہو گیا تو بادشاہ کے نمائندے نے حضرت خواجہؒ سے عرض کیا ۛ حضور بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ قطب الدین کو اجمیر نہ لے جائیں ۛ

لیکن یہ قافلہ اجمیر روانہ ہو گیا، دہلی میں صف ماتم کچھ گئی لوگ زار و قطار رونے لگے اور شہریوں کا جم غفیر ان کے پیچھے ہولیا، یہ لوگ رور و کرالپسی کی درخواستیں کر رہے تھے حضرت خواجہ کا دل پسینہ لگا آپ نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا ۛ قطب الدین بھتیجا! لوگ تیری مفارقت سے پریشان اور آزرده خاطر ہیں اتنے بہت سارے قلوب کی خرابی اور خستہ حالی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے تم دہلی ہی میں بود و باش رکھو اور ہم یہ شہر اور تمہیں خدا کی حفظ و امان میں چھوڑتے ہیں ۛ

جب حضرت خواجہؒ تنہا اجمیر جانے لگے تو ایک بار پھر شیخ الاسلام سے ملنے گئے، انہوں نے ایک بار پھر نیک بھوں پڑھائی حضرت خواجہؒ نے غصے میں فرمایا ۛ نجم الدین! شیخ الاسلامی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے تجھے رسوائی سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا ۛ یہ کہہ کر آپ اجمیر شریف چلے گئے ۔

دہلی ہی میں آپ نے دوسری شادی کیا دن عشرت اور تنگ دستی میں گزرتے تھے سلطان التمش نے کئی بار چند گاؤں جاگیر میں دینے چلا ہے لیکن آپ نے انکار کر دیا، پڑوس میں بنیارتہا تھا اُس کا دکان سے اُدھار سامان آجایا کرتا تھا ایک دن بیسے کی بیوی نے ازراہ افتخار حضرت قطب الدین کے بیوی سے کہا ۛ ہمارا پڑوس تم لوگوں کے لیے نعمت ہے، اگر ہم یہاں نہ ہوتے تو تم لوگ ناقوں سے مر جاتے ۛ

صابر بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بیسے کی بیوی کا مکالمہ غم آلودہ سے شوہر کے سامنے دھرایا۔ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر بیوی سے کہا ۛ اب بقال سے کچھ بھی نہ لیا جائے گا ہماری ضرورتیں محدود ہیں جب کھانے کی ضرورت ہو، طاق کا پردہ ہٹا کے کاک (تنوری کچھ

نمان) حاصل کر لیا کرو۔

اس کے بعد بیٹے سے کہا نے پینے کا سامان نہیں خرید لیا اور وقت اشتہا طاق سے کاک حاصل کی جاتی رہی، یہیں سے آپ کاک کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔
پھر محویت اور استغراق اس عروج کو پہنچ گیا کہ روکے کا انتقال ہوا اور جب بیوی کے رونے کی آواز سنی تو کسی سے دریافت فرمایا ”یہ کیوں رو رہی ہے؟“
کسی نے جواب دیا ”آپ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے“
آپ نے افسوس سے کہا ”اچھا۔ میں اس کی علالت کا پتہ نہ تھا ورنہ اس کے لئے دُعا ضرور کرتے۔“

دہلی میں قحط پڑا، لوگ بھوکوں مرنے لگے سلطان التمش نے اپنے بھانجے سعد الدین کے سپرد یہ خدمت کا کہ وہ منوں لٹے کی روٹیاں لگو کر بھوکوں میں تقسیم کرے ایک دن نانبا کی غفلت سے بیشتر روٹیاں جل جھلس گئیں، سعد الدین نے غفلت کے جرم میں نانبا کی گرفتار کر لیا اور اسے قید خانے لے چلا، ایک مجمع ساتھ ہوا، ایک طرف سے حضرت کاک کی نمودار ہوئے اور لوگوں سے دریافت کیا ”یہ مجمع کیسا ہے اور یہ قیدی کون ہے؟“
لوگوں نے پورا قصہ سنا دیا، حضرت کاک نے سعد الدین کے قریب گئے اور اس سے کہا ”اگر تیری جلی جھلسی روٹیاں ٹھیک ہو جائیں تو کیا اس غریب کو چھوڑ دے گا؟“
سعد الدین نے منلاق اڑایا ”جلی جھلیسی روٹیاں کس طرح ٹھیک ہو جائیں گی؟“
پھر ساتھیوں سے کہا ”اس شخص کی برنگی اپنی جگہ لیکن یہ مُردے کو جلانے کا دعوا کس طرح کر سکتا ہے! جلی جھلسی روٹیوں کو صحیح حالت میں لے آنے کا مطلب یہی ہوا جیسے کسی مُردے کو جلا دیا جائے۔“

حضرت کاک نے قیدی نانبا کی سے پوچھا ”تیرا تو رکھاں ہے؟ جلی ہوئی روٹیوں کو لے کر تو رتک واپس چل“

سعد الدین نے حضرت کاک کی عظمت کا خیال کیا اور نانبا کی اور جلی ہوئی روٹیوں سمیت تنور پر واپس گیا حضرت کاک نے نانبا کی کو اس کے ٹھیکے پر بٹھا کر روٹیاں دیکھتے ہوئے تنور میں جھونک دیں اور اسے اوپر سے بند کر دیا۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی سعد الدین ہنسا کر چلو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

نانبائی نے سوچا کہ یہ اچھا ہوا کہ میرے جرم میں بختیار کاکی میرے ساتھی ہو گئے
حضرت بختیار کاکی نے کچھ دیر بعد تنور کا منہ کھولا اور نانبائی کو حکم دیا ”اپنی روٹیاں
اندسے نکال لے“

نانبائی نے حکم کی تعمیل کی اور روٹیاں نکالنے لگا۔ تمام روٹیاں بالکل صحیح بنی
پکی نکل آئیں۔

حضرت کاکی نے سعد الدین سے فرمایا ”اپنی روٹیاں لے اور راستہ دیکھ، اس
نانبائی غریب کی جان چھوڑ اور ہمیشہ اس کا خیال رکھ کر تیرے کسی فعل یا عمل سے بدگمان
خدا کو دکھ نہ پہنچے“

آپ یہ کہہ کر چلے گئے لیکن شام کو سعد الدین دست بستہ حضرت کاکی کی خدمت
میں کھڑا یہ درخواست کر رہا تھا کہ حضرت! خادم کو اپنے حلقہ خدمت گزاراں میں شامل
فرمائیں۔

آپ نے جواب دیا ”ثروت اور دولت کا درویشی سے بر چلا آتا ہے جب
تک تیرے گھر میں یہ چیزیں موجود ہیں تو درویشی کسی طرح اختیار کر سکتا ہے“
سعد الدین کوئی جواب نہ دے بغیر واپس چلا گیا اور دوسرے دن پھر حاضر ہوا
نہایت درد مندی سے عرض کیا۔

”حضرت! خادم نے اپنا سب کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا اور شاہی
منصب سے کن رہ کشی اختیار کر لی، اب تو درویش کے دروازے غلام پر فدا ہو جانا چاہیے!“
پاس ہی قاضی حمید الدین ناگوری موجود تھے آپ نے ان سے کہا ”یہ نہیں
مانے گا اس ضدی کو حلقہ مریدان میں داخل کر لو“

سعد الدین کو مرید کر لیا گیا اور حضرت کاکی کی خدمت میں رہنے لگا۔
سلطان شمس الدین التمش کی انتہائی دل آرزو تھی کہ حضرت بختیار کاکی اس کے
پاس تشریف لائیں حضرت بختیار کاکی بھی سلطان کے ذہد و تقویٰ کے بہت قائل تھے ایک
دن اچانک سلطان کے روبرو پہنچ گئے التمش کی خوشی کی انتہا نہ رہی اسی وقت اس مجلس خاص
میں حاکم اودھ کرن الدین حلوائی بھی حاضر ہوا یہ ذات کا حلوائی سیاست اور حکومت کے
میدان میں اگر بہت اچھا منتظم اور حاکم ثابت ہوا تھا اور اسے سلطان نے اودھ کی حکومت

بخش دی تھی، یہ شخص حضرت بختیار کاکیؒ کے مرتبے سے واقف نہ تھا مجلس خاص میں اپنی نشست کے لئے ایسی جگہ پسند کی جو حضرت بختیار کاکیؒ کی نشست گاہ سے قدرے بلند تھی سلطان اس بے ادبی کو برداشت نہ کر سکا وہ رکن الدین خلوائی کے خلاف کوئی حکم صادر فرماتے ہی دالا تھا کہ حضرت بختیار کاکیؒ بھی اصل حقیقت سے آگاہ ہو گئے آپ نے حاکم اودھ خلوائی پر ایک اچلتی سی نظر ڈالی پھر سلطان سے فرمایا ”رکن الدین نے اپنے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے میں کاکھوں توبہ خلوا ہے اور خلوا ہمیشہ روٹی کے اوپر ہی رہتا ہے“

سلطان حضرت بختیار کاکیؒ کی منشا سے آگاہ ہو گیا اور اس نے رکن الدین خلوائی کو کچھ بھی نہ کہا۔

عرصے بعد سلطان اپنے سپاہیوں کے ساتھ حضرت کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، سپاہ حجرے سے دور رہی اور سلطان آپ کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضرت کاکیؒ کے ایک طرف حمید الدین ناگوری بیٹھے تھے دوسری طرف سلطان کا بھانجا سعد الدین موجود تھا سلطان نے حضرت کاکیؒ سے کہا ”حضرت کچھ اشتہا ہو رہی ہے کھانا مرحمت فرمائیں“

آپ نے اسی وقت گرم کاکہ پیش کر دیں سلطان نے پوچھا ”کیا خالی روٹیاں؟ انہیں کس چیز سے کھاؤں؟“

حضرت کاکیؒ نے حمید الدین ناگوری کو اشارہ کیا وہ اٹھے اور وضو گاہ سے کیچڑ اٹھا لائے اور اسے روٹی پر رکھ دیا، غور سے دیکھنے اور کھانے پر پتہ چلا کہ وہ تو لذیذ ترین حلوہ ہے سلطان ان کرامتوں سے بہت متحیر ہوا اور اپنے بھانجے سعد الدین سے مخاطب ہوا ”کیوں سعد الدین! توجہ اتنے دنوں سے یہاں حاضری دے رہا ہے تو نے بھی ان سے کچھ حاصل کیا یا یوں ہی وقت ضائع کر رہا ہے“

سعد الدین نے اپنی گردن جھکالی اور ایک ہاتھ اپنی بغل میں دے لیا۔

جب سلطان روٹی کھا چکا تو سعد الدین نے بغل سے ہاتھ نکال کر اپنے ماموں التمش کی طرف بڑھادیا، اس میں تازہ ترین پان کا بیڑا تھا سلطان پان کھا کر بہت خوش ہوا اور حضرت بختیار کاکیؒ سے درخواست کی کہ ہمارے سپاہی بھی بھوکے

ہیں اسی طرح انہیں بھی نواز اجائے ۛ

حضرت بختیار کاکیؒ نے اسی طرح پوئے لشکر کی دعوت کردی اور سعد الدین نے اسی طرح سب کو بیان پیش کر دیے اور وہیں سے سعد الدین غزنوی کے نام سے مشہور ہوئے



گھر میں سوئے روٹیوں کے ہر شے کی منگی تھی حضرت بختیار کاکی کا اٹھ دس سال بڑا اس منگی ترشی سے پریشان تھا اپنے ایک پڑوسی سے اس کا اظہار کر دیا اس غلغلہ عقیدت مند نے بہت سارا سامان خرید کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور لجا جت سے کہنے لگا ”وہ اس غلام کو آپ کی پریشانی کا ذرا علم نہ تھا ورنہ حضرت کو اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی“ آپ نے یہ سامان اسی وقت واپس کر دیا اور انتہائی کرب میں فرمایا ”خدا یا! تو اس شخص کی گردن توڑ دے جس نے ہمارے گھر کا زناش کر دیا ۛ

شام کو خبر آئی کہ حضرت کاکی کے صاحبزادے چھتے گر کر ہلاک ہو گئے یہ صاحبزادے سر کے بل گرے تھے جس سے ان کا منکا ڈھل گیا تھا اور گردن ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے اس خبر پر تیرہ تبصرہ فرمایا ”اچھا تو وہ یہ تھا لیکن بخدا مجھے اگر پہلے سے ہی حقیقت کا صحیح علم ہوتا تو شاید میں ایسی بات زبان سے نہ نکالتا لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا ۛ آپ کو سماع کا سجد شوق تھا خدا معلوم، شیخ الاسلام کے اساتذہ پر یا خود ہی قاضی صادق اور مفتی عمار نے آپ کو منع کیا کہ موسیقی شرعاً ناجائز ہے آپ سماع سے پرہیز کریں ۛ

آپ نے جواب دیا ”ہمارے دو معزز مہمان زکریا ملتانی اور جلال الدین تبریزی دہلی آئے ہوئے ہیں ہم نے ان کے لئے محفل سماع کا انتظام کیا ہے تم دونوں بھی آجانا ہم وہیں ہمیں شائع اسلام سے سماع سننے کی اجازت دلوا دیں گے ۛ

قاضی اور مفتی خبر نہ ہوئے اور انہوں نے سختی سے کہا ”ہم اپنے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد متعین کر دیں گے اور دیکھیں گے کہ آپ کس طرح محفل سماع منع کرتے ہیں اور لوگ اس میں کس طرح داخل ہوتے ہیں ۛ

آپ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بہت جلد زیر زمین

چلا جانا ہے ۛ

حمید الدین ناگوری نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن آپ کو بخیر کچھ کہنا تھا کہ سچکے تھے ۔
قاضی اور مفتی اپنے اختیارات کام میں لاپٹے اور مشرقی اور جنوبی دروازوں
پر پہرے دار سپاہی کھڑے کر دیے اور انہیں یہ حکم دیا کہ : ” بلا الحاضرتہ ومنصب
کسی کو بھی محفل سماع میں نہ جانے دیا جائے ۔“

لیکن اسی عالم میں حضرت بہا الدین زکریا ملتانی مشرقی دروازے سے اور
حضرت جلال الدین تبریزی جنوبی دروازے سے محفل سماع میں داخل ہو گئے ان کے
پیچھے اور بہت سے لوگ بھی اندر آ گئے اور پہرے دار سپاہی اندھوں کی طرح پہرا ہی دیتے رہ
گئے جب قاضی اور مفتی کو اس بات کا علم ہوا تو دونوں دلی میں بے حد شرمندہ ہوئے اور دونوں
خود بھی محفل سماع میں پہنچ گئے اور سماع سے ان پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ بے حال
ہو گئے اسی شب رسول مقبول نے انہیں مطلع کیا کہ انہیں بختیار کی محفل سماع میں شرکت کرنی
چاہیے ۔

دونوں نادم و شرمسار جب محفل سے نکلے تو سلطان نے انہیں برخاست کر دیا اور
اس کان کے دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ اس صدمے اور خجالت نے ان دونوں کی جان لے لی ۔



حضرت خواجہ چشتی کو وصال فرمائے دو سال گزر چکے تھے بختیار کاکیؒ اُداس
اُداس رہتے تھے اسی عالم میں عید الگئی نماز ادا کر کے واپس جو ہوئے تو ایک جگہ ڈک کر کچھ سو گھنے
لگے کسی نے پوچھا ”یا حضرت! کیا سو گھنے ہے؟“

آپؒ نے فرمایا ”ہیں یہاں کی زمین سے بوئے عشت محسوس ہو رہی ہے! پھر اس
زمین کے مالک کو طلب کیا اور اس سے یہ زمین خرید لی اور مریدوں سے فرمایا کہ ”ہیں یہیں دفن
کیا جائے۔“

محفل سماع گرم تھی قوال پر بھی وجد کی کیفیت طاری تھی اس نے لہر اکریہ شعر ادا کیا:
کشتگانِ خنجر تسلیم یا ہر زماں از غیب جلنے دیکر است
حضرت بختیار کاکیؒ کی حالت غیر ہو گئی آپؒ بے ہوش ہو گئے شعر کی سحر اڑھتی رہی
اور آپؒ کا حال متغیر ہوتا رہا پھر تین دن تک یہی کیفیت رہی، جب آخری بار ہوش میں آئے
تو اس وقت آپؒ کا سر حمید الدین ناگوری کے زانو پر تھا اور پیر بدالدین غزنوی کے
آغوش میں۔ آپؒ نے خرقہ خلافت اپنے غیر حاضر مرید حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو
پہنچانے کا حکم دیا اور وصال فرما گئے۔ چاروں طرف ایک کھرام برپا ہو گیا۔

جب آپؒ کا جسد مبارک نماز کے لئے سامنے رکھا گیا تو خواجہ ابوسعید نامی ایک محرم راز

نے باواز بلند یہ اعلان کیا کہ حضرت بختیار کاکی نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ ان کے جنازے کی امامت وہ شخص کرے گا جس نے تمام عمر حرام نہ کیا ہو اور عصر کا سنت اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کیا ہو ۔

یہ ایک ایسا اعلان تھا جس نے سب کو گونگا کر دیا بڑے بڑے بزرگ اور شیوخ موجود تھے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو حضرت بختیار کاکی کی شرط وصیت پر پورا اترتا ہو پھر ایک شخص مجمع سے علیحدہ ہو گیا اور آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چل کر جنازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اس نے رُکے رُکے لہجے اور رسوا ہو جانے کے احساس سے اپنی زبان کھولی ۔

”و لوگو! میں بے حد دکھ اور افسوس ہے کہ جس راز کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے حضرت بختیار نہیں چاہتے کہ وہ پوشیدہ رہے ہم ان کی وصیت اور حکم کی تعمیل میں امامت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں“

یہ آواز شہنشاہ ہند شمس الدین التمش کی تھی جس کے لئے بعد میں پتہ چلا کہ حضرت بختیار کے خلفائیں اس کا نام بھی شامل ہے ۔

دہلی کی جامع مسجد سے تقریباً گیارہ میل دور قصبہ مہرولی میں حضرت بختیار آرام فرما رہے ہیں اور ان کی وجہ سے لوگ اس جگہ کو قطب صاحب کہتے ہیں ۔ ۵۸۲ھ میں پیدا ہونے والے اس ماوراء النہری قطب نے جب ۶۳۴ھ میں دہلی میں وصال فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر باون سال کی تھی اور اس مختصر سی مدت میں آپ نے وہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا جو ان کے ہم عصر لمبی عمر میں گزار کر بھی نہ حاصل کر سکے ۔

بدرالدین غزنوی جن کی آغوش میں آخری لمحات میں آپ کے پیر تھے لوگوں کو بتایا کہ وصال سے ذرا پہلے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ حضرت بختیار اپنے حجرے سے نکل کر متبسم آسمان کی طرف محو پرواز ہیں جب ہم دونوں کی نظریں ملیں تو انہوں نے فرمایا ”بدرالدین! اللہ کے دوستوں کو موت نہیں آتی وہ جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں“ پھر جب میری آنکھ کھلی تو حضرت بختیار کاکیؒ وصال فرما چکے تھے ۔



حضرت جلال الدین تبریزیؒ

معلوم نہیں؟ کیوں اقتدار سے دل بھر گیا اور شان و شوکت اور نمود و نمائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ تبریز کی حکومت بیٹے کے حوالے کی اور بہت سارا مال و منال لے کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے یہ سب ان کے ساتھ رکھ کر دست بستہ چھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ————— اور عرض کیا: ”حضرت آپ کا غلام جلال الدین تبریزی حاضر ہے اس نے حکومت و اقتدار پر بلا مار کر حضور کی غلامی کی نیت کر لی ہے آپ اُسے عشق الہی کی آگ میں بھونک دینے کے حکم سے فرما فرمائیں“

شہاب الدین سہروردیؒ کے ارادتمندوں نے اس نووارد کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں: تبریز کا حاکم اور فقرو فاقے کی زندگی! کتنی متضاد اور محال بات ہے شہاب الدین سہروردیؒ نے انہیں حکم دیا ”یہ مال و زریم لے کر کیا کریں گے، اسے حاجت مندوں میں خود لپٹے ہاتھ سے تقسیم کر دو“

جلال الدین نے اپنے مرشد کے حکم کی فوراً تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ دونوں ہاتھوں سے لٹا کر فراغت حاصل کر لی۔ دونوں ہاتھ چھڑا کر مرشد کے روبرو مؤدب کھڑے ہو گئے اور عاجزی سے دریافت کیا ”حضرت! غلام نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی کوئی اور حکم؟“

مرشد نے اس طالب عشق الہی میں معلوم نہیں کیا چیز محسوس کی کہ ارشاد فرمایا: ”جلال الدین! تجھ میں اب بھی حکومت کی بُو باقی ہے پہلے اس کا علاج کر، اس کے بعد تو کچھ حاصل کر سکے گا۔“

جلال الدین نے عرض کیا: ”یہ غلام ہر آزمائش اور کسوٹی سے گزرنے کو تیار ہے بس آپ کے اشارے کی دیر ہے۔“

شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا: ”جلال الدین! تیرے سپرد نمازیوں کے لئے

وضو کے پانی اور استنجے کے ڈھیلوں کی فراہمی کی خدمت کی جا رہی ہے اور یہ کام تجھے پوسے جا رہا سال تک انجام دینا ہے، بول منظور؟

جلال الدین کی پیشانی پر ناگواری یا کراہت کی خفیف سی شکن تک نہ پڑی۔ پر شوق لہجے میں جواب دیا۔ ”منظور، بہ دل و جان منظور“

حکم اور حکومت کا نواکھنے والے نے سرکش اور مغرور نفس کو، مرثد کی طرف سے مفوضہ خدمات انجام دیکر کچلنے لگا، شہاب الدین سہروردی نہایت گہری نظروں سے جلال الدین کی لگن کا جائزہ لیتے رہے وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے انہیں زود مہضم اور گرم گرم غذائیں پسند تھیں۔ جلال الدین کو جب اپنے مرشد کی اس پسند کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے سر ایک خدمت اور ٹلی، بازار سے ایک انگلیٹھی خریدی اور ایک بڑے سے تھیلے میں مرشد کی پسندیدہ چیزیں بھر لیں۔ پھر انگلیٹھی میں آگ جلائی۔ اشیاء کا تھیلہ لٹکانے سے لٹکا لیا اور انگلیٹھی سر پر رکھ لی۔ جہاں جہاں شہاب الدین سہروردی جاتے یہ ان کے پیچھے پیچھے خادموں کی طرح چلتے۔ اس عجیب طیلے میں پیر مرشد نے جو دیکھا تو دیاقت کیا۔ ”جلال الدین! تو نے یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے خیریت تو ہے؟“

جلال الدین نے جواب دیا ”حضور والا! غلام نے آپ کی مریدی اور خدمت کا جو جو اپنی گردن میں ڈالا ہے ہر طرح اس کا حق ادا کرنا چاہتا ہے معلوم نہیں کس وقت آپ کو کھانے کی اشتہا ہو، اس خیال سے یہ ناچیز کھانے کی اشیاء اور روشن انگلیٹھی ساتھ لیے پھرتا رہے کہ بوقت طلبی آپ کو گرم گرم کھانا پیش کیا جاسکے۔“

مرشد نے اس جذبہ خدمت کو دل ہی دل میں سراہا لیکن زبان سے اظہار نہ کیا۔ ہر وقت جلتی ہوئی انگلیٹھی سر پر رکھنے سے بال اور گلے میں لٹکانے سے سینے کے بال اور کھال دونوں مجھلس گئے۔

شہاب الدین سہروردی ہر سال حج فرور کرتے تھے مریدی اختیار کرنے کے بعد جلال الدین تبریزی بھی ساتھ رہنے لگے دوران سفر مرشد تو اونٹ پر سوار ہوتے اور جلال الدین پاس ادبے پیدل چلتے رہتے، گرم سواؤں کے تھپڑے، آگ کی طرح جلتے ہوئے ریت کے ذرات اور کھلے آسمان پر آگ کے گولے کی طرح جہنم کی آگ برساتا سورج کے آگے اور مدینے کے زائچوں کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیتے۔ اس عالم میں کس کی مجال تھی جو پیدل سفر کر سکتا لیکن جلال الدین نے اس مشکل مشقت کو بھی اپنے جذبہ شوق سے گلے لگا لیا اور اس امتحان ۲۲۱

میں پورے آکرے، منزل تک پہنچتے پہنچتے پیروں میں پھالے پڑ پڑ کر پھوٹ جاتے اور پیروں کے تلوے اور پنچے خون اور آبلوں کے پانی سے پوری طرح بھیگ جاتے اور جب جلال الدین اس امتحان میں پورے آکرے تو شہاب الدین سہروردیؒ کی دعاؤں سے اُن کے دونوں پیر بالکل صحیح حالت میں آجاتے۔

راج اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے بعد شہاب الدین سہروردیؒ کا فائدہ بغداد میں داخل ہوا تو انہیں ان کے عقیدت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور فرط عقیدت میں تحائف پیش کرنے لگے، صبح سے شام تک قیمتی تحائف کا ڈھیر لگ گیا۔ ان ارادت مندوں میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی۔ اس نے حضرت سہروردیؒ کی خدمت میں ایک دم پیش کیا رات کو غسل کے بعد اپنے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ جو تحائف جمع ہوئے ہیں ان میں جو جس کو پسند آئے اپنے گھر لے جائے کیونکہ وہ احتکار کے قائل نہیں ہیں۔

تمام مرید قیمتی تحائف پر ٹوٹ پڑے لیکن بے غرض، طبع اور حرص سے پاک جلال الدین نے بڑھیا کے ایک دم پر قناعت کر لی۔ آخر میں حضرت سہروردیؒ نے اس کا جائزہ لیا اور کس کے حصے میں کیا آیا۔ اپنے کسی مرید سے پوچھا ”تحائف کے اس انبار سے جلال الدین کے حصے میں کیا آیا؟“

مرید نے ہنس کر جواب دیا ”صرف ایک دم، جو بڑھیا لے کر آئی تھی۔“
اپنے جلال الدین کو طلب کیا اور فرمایا ”جلال الدین! اگرچہ بظاہر تو نے ایک دم اٹھایا ہے لیکن لوگ نہیں جانتے کہ زرد و جاہر کے اس انبار میں سب سے زیادہ قیمتی یہی ایک دم تھا۔ اللہ تعالیٰ کمی بیشی کو نہیں دیکھتا دل کے اخلاص کو دیکھتا ہے اس نیک بڑھیا نے اس دم کو پورے خلوص اور جوش کے ساتھ پیش کیا تھا اور اس سائے انبار میں جو کچھ تھا وہی ایک دم تھا تو نے وہ دم اٹھا کر دوسروں کے لیٹے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔“
مُرشد کی زبان سے کلماتِ خیر سن کر جلال الدین کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ان کا دل بھر آیا۔

یہیں ان کی ملاقات ایک ہندی درویش سے ہوئی۔ ان کا نام بہاء الدین ذکر کیا تھا اور یہ ملتان سے تشریف لائے تھے جلال الدین تبریزی اُن سے ملکر بہت خوش ہوئے رفتہ رفتہ اُن کی دوستی اتنی بڑھی کہ دونوں علیحدگی میں ایک دوسرے کی کمی محسوس کرنے لگے۔
مُرشد کی خدمت میں سات سال رہ کر جلال الدین مرتبہ کمال کو پہنچ گئے اور اُن کے

روحانی کمالات کا چرچا ہونے لگا۔ اسی دوران بہاء الدین زکریا کو حکم ملا کہ ملتان واپس جاؤ اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دو۔

جلال الدین اس خبر سے لرزے ہوئے اور خواہش کی کہ انہیں بھی بہاء الدین کے ساتھ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ مُرشد نے اجازت عطا فرمادی اور دونوں دوست ہندوستان روانہ ہو گئے۔ دونوں کا گزر نیشاپور سے ہوا وہاں مولانا عطار رومی کا قیام تھا اور یہ علوئے مرتبت میں اپنا ثانی نہ کہتے تھے جلال الدین تبریزی نے ان سے ملاقات کی لیکن بہاء الدین زکریا ان سے نہیں ملے۔ جب یہ مل کر اپنے دوست بہاء الدین کے پاس پہنچے تو انہوں نے جلال الدین سے پوچھا: ”جلال الدین! شیخ عطار سے مل لیے؟“ جلال الدین نے جواب دیا: ”ہاں مل لیا،“ اور خوشی سے ان کا چہرہ تما گیا۔ بہاء الدین نے اشتیاق سے پوچھا: ”کہیے ملاقات کے بعد کس درویش کو بہتر پایا؟ اپنے مُرشد شہاب الدین سہروردی کو یا شیخ فرید الدین عطار کو؟“ جلال الدین نے خلاف توقع جواب دیا: ”شیخ فرید الدین عطار کو۔“ بہاء الدین نے حیرانی سے پوچھا: ”ان سے کیسی صحبت رہی؟“ جلال الدین نے جواب دیا: ”شیخ عطار نے مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں آتے ہو؟ میں نے جواب دیا، بغداد سے، انہوں نے سوال کیا۔ وہاں کون درویش مشغول حق ہے؟ میں ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خاموش کھڑا رہا۔“ بہاء الدین نے کہا: ”تم نے اپنے مُرشد حضرت شہاب الدین سہروردی کا نام کیوں نہیں لیا؟“

جلال الدین نے سچائی کا سہارا لیا۔ بولے ”میں اس وقت شیخ عطار کی عظمت سے اتنا... مرعوب اور متاثر ہو چکا تھا کہ میرا رائے گفتگو جاتا رہا اور میں بدقسمتی سے اپنے مُرشد کو بھی جھٹلا بیٹھا۔“

بہاء الدین نے افسوس سے کہا: ”خوب! جلال الدین! اب ہم دونوں نہ تو ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ ساتھ ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ ہم خاموش رہ کر پیرو مُرشد کی بے عزتی کی ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم اسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتے۔“

جلال الدین نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ بولے ”بابا بہاء الدین اگر تم علیٰ گری ۲۲۳

پر ہی مہر سوچ تو تمہاری مرضی، ورنہ میں اپنی اس کوتاہی کے عذر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ عطار نے اس وقت میری قوت گویائی سلب کر لی تھی اور میں نے اُن کے سوال کے جواب میں وہی روش اختیار کی، جس کے وہ غلامش مند تھے۔“

دونوں درویش ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بہاء الدین زکریا ملتان چلے گئے اور جلال الدین نے دہلی کا رخ کیا۔ یہ دہلی کے اس عہد کی بات ہے جب یہاں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی اور حضرت بختیار کاکیؒ کا روحانی فیض ایک نوری ہالے کی طرح پھیل کر دہلی اور اس کے گرد و نواح پر محیط ہو چکا تھا۔

دہلی پہنچتے پہنچتے انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی حضرت بختیار کاکیؒ اُن کے منتظر تھے اور سلطان شمس الدین التمش ان کی راہ میں اُنکھیں بچھانے کے لئے مضطرب اور مستعد تھا جب جلال الدین تبریزی دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ کو استقبال کے لئے موجود پایا۔ التمش نے جوش عقیدت سے انہیں خوش آمدید کہا۔ التمش کے تھا شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ بھی تھا اس نے جلال الدین تبریزی کی غیر معمولی آوجھت کو حسانہ محسوس کیا۔ التمش انہیں شاہی محل تک نہایت اعزاز و احترام سے لایا۔ اس کے بعد اس نے شیخ الاسلام سے مشورے کے طور پر پوچھا ”حضرت تبریزی کو کہاں ٹھہرانا چاہیے؟“

شیخ الاسلام نے حسب سے جواب دیا ”بیت الجن میں“

سلطان نے کہا ”بیت الجن میں کیوں؟ اس مکان میں جو جن اقامت کریں ہیں وہ کس طرح حضرت تبریزی کو سکون سے رہنے دیں گے؟“

شیخ الاسلام نے کہا ”اگر جلال الدین تبریزی مر و کامل ہیں تو جن انہیں نہیں ستائیں گے اور اگر یہ سب کچھ ڈھونڈ لگے اور ان کا خرقہ فقیری لوگوں کو ٹھکنے کا جال ہے تو انہیں ان کی ریاکاری کی سزا ضرور ملنی چاہیے اور بیت الجن کے اجنہ خود ہی انہیں سزا دے لیں گے۔“

بادشاہ نے کسی حد تک شیخ الاسلام کی بات سے اتفاق بھی کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جلال الدین ہمارے مہمان ہیں ہمیں اُن سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

شیخ الاسلام نے خاموشی اختیار کی۔ بادشاہ اور شیخ الاسلام کی بات چیت انتہائی رازدارانہ ہو رہی تھی اور اس کا کسی اور کو ذرا بھی علم نہ تھا۔ ابھی دونوں خاموش ہی ہوئے تھے کہ جلال الدین تبریزی ان دونوں کے پاس آئے اور شیخ الاسلام سے کہا ”نجم الدین! ہم بیت الجن مقفل ہے اس کی چابی کہاں ہے لاؤ، ہم اس میں قیام کریں گے۔“

بادشاہ معنی خیز انداز میں شیخ الاسلام کی شکل دیکھنے لگا۔ شیخ الاسلام نے بیت الجن کی چابی تبریزی کے حوالے کر دی۔ تبریزی نے یہ چابی اپنے ایک ساتھی درویش کی طرف بڑھادی اور اسے حکم دیا۔ ”تراب! یہ کنجی لو اور بیت الجن چلے جاؤ، اسے کھولو اور دروازے پر کھڑے ہو کر یاد آواز بلند یہ کہہ دو کہ اے قوم اجنہ! اس مکان میں تم ایک عرصے سے رہ رہے ہو اب اسے خالی کر دو کیونکہ اس میں جلال الدین تبریزی رہنا چاہتا ہے۔“

تراب نے چابی لی اور بیت الجن کا قفل کھول دیا۔ تراب نے دروازے کے اندر قدم رکھ کر تبریزی کا پیغام با آواز بلند سنا دیا اور گلے میں پٹری ہوئی حامل شریف بیت الجن کی ایک کھونٹی میں ٹکادی۔ اس کے بعد جلال الدین تبریزی بھی بیت الجن میں داخل ہو گئے اور اطمینان سے رہنے لگے۔

عام شاہراہ کو چھوڑ کر جلال الدین نے چھوٹی ٹھیکیاں اختیار کیں وہ حضرت بختیار کاکی سے ملاقات کرنے جا رہے تھے انہوں نے عام شاہراہ اس خیال سے ترک کی تھی کہ بڑے اور معروف راستوں میں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم تھا اور وہ ہجوم سے گھبراتے تھے اسی غیر معروف اور سنسان راہ میں ایک جگہ حضرت بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہو گئی جلال الدین تبریزی ان سے گلے لگ گئے اور پوچھا ”بابا بختیار! ہم تم سے ہی ملنے جا رہے تھے، تم کہاں؟“

حضرت بختیار کاکیؒ نے جواب دیا ”ہمیں تمہارے ارادے کی اطلاع ہو گئی تھی اس لئے ہم تمہارے استقبال کے لئے آگے بڑھے اور تمہیں اس جگہ پایا۔“
دونوں دوست ہنسنے لگے۔

ان واقعات اور جلال الدین کی عزت افزائی کی خبریں برابر شیخ الاسلام کو پہنچ رہی تھیں وہ حسد کی آگ میں بری طرح جل جھن رہا تھا اس کا دماغ جلال الدین تبریزی کے خلاف سازش کرنے میں مصروف تھا۔ رات بے چینی میں گزارنے کے بعد شیخ الاسلام شاہی محل کی مسجد میں نماز پڑھانے پہنچا۔ یہ مسجد بالائی حصے میں واقع تھی اور یہاں سے جلال الدین کی قیام گاہ کا..... اندرونی حصہ صاف نظر آتا تھا۔ شیخ الاسلام نے دیکھا کہ جلال الدین نماز کی غرض سے مسجد میں نہیں آئے اور وہ اپنے مکان کے صحن میں نہایت اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے اور ایک غلام ان کے پیر و بارہا تھا۔ غلام نو عمر اور حسین تھا شیخ الاسلام

نے یہ ہوش ربا منظر دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ بھی اچکا تھا۔ شیخ الاسلام نے الشمس سے جلال الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ حضور! ذرا ملاحظہ فرمائیے، یہ ہے وہ شخص جس کے زہاد و تصوف کا دور دو پرچر چاہے۔ مجھے تو بس یہ شخص یوں ہی سا نظر آتا ہے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”شیخ الاسلام! تم تبریزی کے پیچھے مت پڑو کیونکہ ایسا کرنے میں کسی بڑے نقصان کا احتمال موجود ہے۔“

اسی دوران مکان کے اندر سے باواز بلند جلال الدین تبریزی کی آواز گونجی، آپ نے فرمایا۔ ”شیخ الاسلام! ابھی تو نے کیا دیکھا ہے اگر ذرا دیر پہلے آجاتا تو تجھے یہ غلام پیر دابتا ہوا نہ ملتا بلکہ یہ ہماری آنکھ میں ہوتا۔“

دونوں کی گفتگو بادشاہ نے بھی سُن لی اس نے شیخ الاسلام کو ڈانٹا۔ ”شیخ الاسلام! تم فرد کو ٹی ہنگامہ کھڑا کر دے گے، ہم تمہیں یہ کس طرح بتائیں کہ جلال الدین ایک غیر معمولی انسان ہے اسے چھڑ دمت۔“

لیکن شیخ الاسلام انتہا پسند تھا اس نے اپنے اصل ارادے کو چھپاٹے دکھا تقریباً دوپہر سے ذرا پہلے مشہور گانے والی شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچی شیخ الاسلام گوہر سے بات کرنے لگا۔ شیخ الاسلام بات تو گوہر سے کر رہا تھا لیکن اس کا دماغ ایک خطرناک سازش کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کچھ کہنے کے لئے زبان کھولنا چاہی لیکن نہیں کھلی۔ آخر کار ہمت کر کے شیخ الاسلام نے حرف مدعا بیان کیا۔ ”گوہر! ہم تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں کیا تو اسے گوارا کرے گی اور اس بات کا حلف اٹھائے گی کہ جو کچھ ہم کہیں گے تو اسے اپنے دل میں کسی کی امانت کی طرح محفوظ رکھے گی۔“ گوہر نے جواب دیا۔ ”حضور حکم تو فرمائیں، پھر دیکھیے گا آپ کی یہ کنیز بجا آوری حکم اور اطاعت میں کتنی مستعد اور محتاط نکلتی ہے۔“

شیخ الاسلام نے ڈھائی سو سُرُخ دینار اس کی خدمت میں پیش کر دیے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گوہر! یہ حقیر سا نذرانہ ہے بقیہ ڈھائی سو دینار ہم احمد شرف نامی بقال کے پاس رکھوائے دیتے ہیں اور ہم نے اسے یہ ہدایت کرنی ہے کہ جب تو اپنا کام انجام دے چکے تو تجھے بقیہ ڈھائی سو دینار بھی دے دے۔“

گوہر نے پریشان ہو کر پوچھا ”وہ کام تو بتائیے پہلے“

شیخ الاسلام نے اس کے کان میں کہا ”تو دو چار بار جلال الدین تبریزی کے پاس بھی جا اور انہیں اپنی آواز سے دیوانہ بنا دے۔ تو جلال الدین سے اس طرح ملتی جلتی رہ گویا تیری ان سے قدیم سے راہ درسم چلی آرہی ہے پھر ایک دن تو جلال الدین پر یہ الزام لگائے گی کہ انہوں نے تجھے میں تیری عزت ابرو پر ہاتھ ڈال دیا ہے تجھے یہ تہمت فریادی بن کر بادشاہ کے سامنے دہرائی ہوگی اور تیری گواہی احمد اشرف بقال بھی دے گا“

گوہر نے چندے سکوت اختیار کیا پھر کہا ”اچھا جناب! بندی کو شش کرے گی کہ اس ناک میں اپنا کردار نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے ادا کرے“

گوہر ڈھائی سو دینار سرخ لے کر چلی گئی۔ شیخ الاسلام نے دوسرے ہی دن سے جلال الدین تبریزی کے خلاف یہ افواہ پھیلانا شروع کر دی کہ وہ گوہر نامی مطربہ سے ملوث ہونے کے مرتکب ہو چکے ہیں وہ درویش نہیں بہر پیسے ہیں۔

جلال الدین نے جب یہ افواہ سنی تو بہت پریشان ہوئے انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے انہیں تسلی دی اور کہا ”آپ پریشان نہ ہوں ہم خود اس معاملے کی تحقیق کریں گے“

جلال الدین چلے آئے تو بادشاہ نے گوہر کو طلب کیا۔ دو سپاہیوں کے درمیان وہ التمش کے سامنے پہنچی۔ اس کا چہرہ اُتر اُتر ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہے بادشاہ نے اُسے غور سے دیکھا تو اس نے سر جھکالیا۔ قریب ہی شیخ الاسلام بھی موجود تھا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا ”نجم الدین! مطربہ دور ہی ہے کیا واقعی ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ جلال الدین جیسا پاکباز درویش ایسی مذموم اور ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہوا ہو؟“

شیخ الاسلام نے جواب دیا ”حضور! گوہر سے دریافت فرمائیں، ظاہر ہے یہ جھوٹ کیوں بولے گی؟“

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”مطربہ کی سوگواری نے ہمیں شک شبہ میں ڈال دیا ہے اور ہمیں کچھ یہ خیال ہو چلا ہے کہ یہ سب کچھ کسی سازش کے ماتحت ہو رہا ہے۔“

شیخ الاسلام گھبرا گیا، لیکن چہرے پر اس کا کوئی اثر نہ آنے دیا پوچھا۔

”حضور کو کس قسم کا شبہ کس بات پر ہوا؟“

بادشاہ نے جواب دیا ”یہ ایک مطربہ ہے، بدنام فاحشہ اگر جلال الدین واقعی اس سے ملوث ہو چکے تھے تو اسے اتنا شور نہیں مچانا چاہیے تھا کیونکہ یہ ایک پیشہ ور زنِ بازار کی ہے۔“

چالاک شیخ الاسلام نے کہا ”حضور اسے ملال تو اس بات کا ہے کہ وہ ایک درویش کی سالہا سال کی عبادت اور تقویٰ کی بربادی کا سبب بن گئی ہے“

بادشاہ نے گویا ہر سے پوچھا ”مطربہ! تو اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟“

مطربہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے عرض کیا ”حضور! میں یوں ہی کیا کم کنا ہنگام تھی کہ جلال الدین نے مجھے اور زیادہ تباہ کر دیا۔ کل قیامت میں اپنے اللہ کو کیا جواب دوں گی؟“

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا ”سارا معاملہ صاف صاف بیان کر کیونکہ اس نازک مقدمے میں اشاروں کنیوں سے باتیں نہیں کی جاسکتیں۔“

مطربہ نے روتے ہوئے عرض کیا ”حضور! مجھے جلال الدین نے عشاء کے بعد طلب کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ سُنا چاہتے تھے۔ میں چلی گئی انہوں نے دروازے بند کر لیے اور تخیلے میں مجھ سے ایک لایسی شے کے طالب ہوئے کہ میں حواس باختہ ہو گئی جب میں نے اُن سے کہا کہ یہ آپ کیا چاہ رہے ہیں اس طرح تو آپ کا زہد و تقویٰ اور درویشی سب خاک میں مل جائیں گے تو شیخ نے جواب دیا کہ میرے اعمال کی تم فکر نہ کرو، خدا کے سامنے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہوگا۔ میں نے اس پر بھی مزاحمت کی لیکن جلال الدین کے طاقت ور بازوؤں نے وہ سب کر دیا جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سانحے کے بعد میں ایک لمحے کا سکون بھی نہیں حاصل کر سکی ہوں۔ اندھے کوئی شے مجھے کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

بادشاہ نے فکر مند آواز میں کہا ”نجم الدین! مطربہ نے جرم کا اقرار کر لیا ہے یہ تعزیر کی مستحق ٹھہرتی ہے لیکن جلال الدین تبریزی پر اس وقت تک حکم تعزیر جاری نہیں ہو سکتا جب تک وہ واقعی اس جرم کے مرتکب نہ ٹھہرائیں۔“

شیخ الاسلام نے کہا ”گوہر کے بیان کے بعد کی کسی اور گواہی کی ضرورت باقی

رتہی ہے، اس ناچیز کی رائے میں اگر گوہر اس سلسلے میں اپنا ایک گواہ پیش کر دے تو اس مقدمے کا فیصلہ باسانی سنایا جاسکتا ہے۔“

بادشاہ نے مطرب سے پوچھا: ”اس سلسلے میں تیرا کوئی گواہ؟“

مطرب نے جواب دیا: ”جب میں ابرو باخشگی کے بعد باہر نکلی تھی تو دروازے پر احمد اشرف بقال سے ملاقات ہو گئی تھی وہ بابا جلال الدین تبریزی کی خدمت میں حاضری دینے آیا تھا لیکن جب اس نے میری داستان سنی تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر واپس ہو گیا اور توبہ استغفار کرنے لگا۔“

شیخ الاسلام نے کہا: ”اگر جہاں پناہ اجازت دیں تو یہ ناچیز جلال الدین تبریزی کے خلاف اپنا شرعی فیصلہ سنا دے۔“

بادشاہ نے جواب دیا: ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس مقدمے کے مدعی تم خود ہو اور مدعی خود اپنے مقدمے کا فیصلہ کس طرح سنا سکتا ہے؟ ہمیں اس مقدمے کے لئے دوسرے حاکم مقرر کرنا پڑیں گے۔“

اس کے بعد گوہر کو رخصت کر دیا گیا اور بادشاہ نے ہندوستان کے بڑے بڑے علماء اور شیوخ کو دربار میں حاضری کا فرمان جا کر دیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ جنہیں علوم ظاہری کے سچے اہل باطنی علوم بھی حاصل تھے یہ دوسرے زائد تھے اور ان میں بہاء الدین زکریا ملتانی بھی شامل تھے۔

پورے ملک کے علماء اور شیوخ بادشاہ کے پاس پہنچ گئے انہیں جامع مسجد میں جمع کیا گیا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا: ”نجم الدین! تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ تم اپنے حکم سے ان علماء اور شیوخ میں سے ایک حکم مقرر کرو تاکہ وہ اس افسوس ناک مقدمے کی کاروائی کرے اور اپنا فیصلہ سنا دے۔“

شیخ الاسلام، جلال الدین تبریزی اور بہاء الدین زکریا ملتانی کی باہمی رنجش سے آگاہ تھا اس نے فوراً حضرت زکریا ملتانی کا نام لیا بولا: ”میں بہاء الدین کو اس مقدمے کا حکم بنانا ہوں وہ کاروائی شروع کریں۔“

نماز جمعہ کے بعد مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی۔ بادشاہ خود بھی ان سب کے

درمیان موجود تھا۔ شیخ الاسلام نے ایک خدمت کار کو حکم دیا ”مطر بہ کو حاضر کیا جائے“ خدمت کار باہر گیا اور مطر بہ کو لے کر واپس آگیا۔ اس کے پیچھے ہی جلال الدین تبریزی بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے جوتے ہاتھ میں لے لئے اور ننگے پیر مسجد کے صحن کی طرف بڑھے۔ تمام علما اور صوفیاء ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے بہاء الدین زکریا تیزی سے آگے بڑھے اور جلال الدین تبریزی کے جوتے نہایت ادب سے خود لے لئے اور انہیں شانے سے پکڑ کر اپنی نشست گاہ تک لائے اور اپنے برابر بٹھالیا۔

بادشاہ نے کہا ”بس جناب ہو چکا فیصلہ۔ اب فیصلے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ شیخ الاسلام نے جس ذات کو اس مقدمے کا حکم بنایا ہے وہ خود جلال الدین کی اس قدر تعظیم بجالا رہا ہے“

بہاء الدین زکریا نے جلال الدین تبریزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”جناب والا! یہ تو اس کے مستحق ہیں کہ میں ان کی خاک پا کر اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں۔ یہ مسلسل سات سال تک حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے سفر و حضر میں جس طرح ساتھ رہے اس سے ان کے زہد و تقا کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے تبریزی کی حکومت اور حکومت کے تعینات کولات مادی۔ اس لئے ہم سب پر ان کی تعظیم واجب ہے“ اس کے بعد انہوں نے شیخ الاسلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”و لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ نجم الدین کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم نے جلال الدین کی تعظیم کے پردے میں ان کا عیب چھپایا“ پھر مسجد میں موجود تمام علما اور صوفیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ہمیں یقین ہے کہ یہاں جتنے بھی عالم اور صوفی موجود ہیں وہ جلال الدین کے مرتبے سے خوب اچھی طرح واقف ہیں“ مسجد میں سنائطاری ہو گیا۔ بہاء الدین زکریا اچانک گوہر مطربہ سے مخاطب ہوئے کہنے لگے ”مطر بہ! یہیں تیری شکایت کا علم ہو چکا ہے اور تو یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ہم اور دوسرے صوفیائے کرام جو اس وقت مسجد میں موجود ہیں، باطنی علوم بھی رکھتے ہیں اور انہوں نے جلال الدین کو جس طرح تعظیم دی ہے وہ ریاکاری کی تعظیم نہیں ہے تجھ پر یہ فرض ہے کہ یہاں جو کچھ بھی کہے سچ سچ کہے ورنہ جھوٹ میں تباہ کاری اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے“

مطر پہلے ہی بدحواس ہو رہی تھی وہ اہل اللہ کی نظروں کی تاب نہ لا سکی
سر جھکا کے باواز بلند اس نے جواب دیا۔

”میرا خدا بہتر جانتا ہے کہ بابا جلال الدین پر یہ صریح تہمت اور بہتان ہے اور
یہ سارا کھیل شیخ الاسلام کا تیار کیا ہوا ہے“

اس کے بعد اس نے ساری تفصیل بتا دی اس نے ڈھائی سو دینار بھی دیے ڈیسر
کر دیے اسی لمحے احمد اشرف بقال کو بھی طلب کر لیا گیا اس نے مطربہ کے بیان کی تائید کی
اور بقیہ ڈھائی سو دینار بھی پیش کر دیے شیخ الاسلام نے سازش کا بھانڈا پھوٹے جو
دیکھا تو بدحواس ہو گئے اور ان کے اعصابی نظام میں انتشار پیدا ہو گیا وہ تھر تھر کے
مسجد کے صحن میں گرے اور بے ہوش ہو گئے بادشاہ نے انہیں اسی وقت معزول
کر دیا اور بہاء الدین زکریا کو شیخ الاسلام کا منصب بخشا۔

اس واقعے نے جلال الدین کو بے حد ملول کر دیا اور انہوں نے دہلی کو
چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُن کا دوسرا مقصد تقریباً یوں قرار پایا لوگوں نے آپ کو روکنا
چاہا لیکن آپ نے یہ کہہ کر ان کی درخواست مسترد کر دی کہ جب میں اس شہر میں آیا تھا تو
خالص سونا تھا لیکن اب چاندی رہ گیا ہوں، آئندہ معلوم نہیں کیا ہوگا۔

جلال الدین بدایوں چلے گئے وہاں جس مکان میں آپ کا قیام تھا آپ وہاں
اکثر دروازے پر بیٹھ جایا کرتے تھے ایک دن صبح ہی صبح ایک ہندو سرپردہ کا ٹمکا
لیے سامنے سے گزرا۔ یہ شخص موضع کنہر کا ڈاکو تھا جو دن میں تو دہی بیچتا تھا اور رات
میں ڈاکے ڈالتا تھا جلال الدین نے اُسے گھور کر دیکھا اُس کی نظریں بھی ٹمکائی، وہ کھنچا
ہوا آپ کے قریب پہنچا اور بے اختیار ہی میں کہا ”تم مسلمان ہو؟ محمد کی امت میں؟“

آپ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور نظریں اس کے چہرے اور آنکھوں کی راہ
سے دل میں اُتری چلی گئیں۔ اس شخص نے کہا ”حضرت! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا
ہوں۔ مجھے مسلمان کر لیجئے“

آپ نے اُسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام علی رکھا، بعد میں یہ شخص بزرگی اور
فضیلت کے اس مرتبے تک پہنچا کہ محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی دستارِ فضیلت
اسی نے باندھی۔

علی نے ایک لاکھ جیتل آپ کی خدمت میں پیش کئے اور عرض کیا ”حضرت!

آپ انہیں یہاں چاہیں خرچ کریں“

اسپنے جواب دیا ”انہیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس کے لئے جتنے کاہم حکم دیں تم خرچ کر دینا۔“

چنانچہ اس کے بعد جو حاجت مند بھی آیا، آپ ان جیتلوں میں سے کچھ نہ کچھ دلوا دیتے۔ اس تقسیم میں یہ خاص بات تھی کہ کسی حاجت مند کو بھی آپ سے سو سے زیادہ اور پانچ سے کم نہیں دلوائے آخر میں کچھ ایسا ہوا کہ کسی طرح بس ایک جیتل باقی رہا۔ علی نے سوچا کہ اب جو حاجت مند آئے گا اور بابا جلال الدین اس کو پانچ جیتل دینے کا حکم دیں گے تو بقیہ چار کہاں سے لائیں گے علی ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ ایک حاجت مند آگیا بابا جلال الدین نے حکم دیا۔

”علی! تمہارے پاس ایک جیتل باقی بچا ہے وہ اس شخص کو دے دو۔“

علی نے جیتل تو حاجت مند کے حوالے کیا اور فرط عقیدت سے بابا جلال الدین کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔

بدایوں کے حاکم قاضی کمال الدین کی جلال الدین تبریزی سے بڑی دوستی ہو گئی تھی دونوں ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے ایک دن جلال الدین قاضی سے ملنے جو گئے تو قاضی کے خادم نے انہیں بیٹھک میں بٹھا دیا اور کہا ”حضرت تشریف رکھیں، قاضی صاحب اس وقت نماز میں مشغول ہیں۔“

بابا تبریزی نے فرمایا ”خوب! کیا قاضی بھی نماز پڑھتی جانتا ہے؟“ اور آپ وہاں رُکے نہیں، اپنے گھر واپس چلے آئے۔ خادم نے بابا تبریزی کی آمد اور ان کا جملہ قاضی کے سامنے بیان کر دیا۔ قاضی کو اس سے تکلیف پہنچی وہ سیدھا جلال الدین کے پاس پہنچا اور حاکمانہ شان سے گردن میڑھی کر کے پوچھا ”کیا آپ نے میرے خادم سے یہ فرمایا تھا کہ کیا قاضی بھی نماز پڑھتی جانتا ہے؟“

قاضی کا خیال تھا کہ شاید اس طرح جلال الدین اس کے رعب میں آجائیں گے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ صاف صاف کہہ دیا ”ہاں میں

قاضی نے طنزاً کہا ”خوب! میں قاضی ہوں اور میرا علم و فضل مانا ہوا ہے اگر میں نماز پڑھنی نہیں جانتا تو پھر اس شہر میں کون ہے جو نماز پڑھنی جانتا ہے“
 جلال الدین نے نرمی سے فرمایا ”قاضی! تم میرا مطلب نہیں سمجھے، علماء کی نماز اور ہوتی ہے اور فقرا کی اور! تم اس سلسلے میں مجھ سے مت الجھو“
 قاضی نے غصے میں کہا ”کیوں نہ الجھوں، تم باتیں ہی الٹی سیدھی کر رہے ہو، نماز میں جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں کیا وہ الگ الگ ہوتی ہیں، کیا علماء کا قرآن اور ہوتا ہے اور فقرا کا قرآن کوئی اور۔ کیا ان دونوں کے رکوع اور سجود میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟“
 آپ نے بدستور تحمل سے جواب دیا ”قاضی! تم میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو، بیشک قرآن اور نماز کا طریقہ دونوں کا ایک ہی ہے لیکن دونوں کی نمازوں میں فرق اتنا ضرور ہوتا ہے کہ علماء قیاساً کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور فقرا جب تک کعبہ کو دیکھ نہیں لیتے، ہجیر تک نہیں کہتے۔ فقرا کی معمولی نماز یہ ہے کہ وہ عرش پر پڑھی جائے۔“

قاضی ان کی بات سے متفق نہ ہوا اور اسے گمان کر رہا کہ اس طرح جلال الدین شاید اپنی کرامت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ میں نماز میں کعبہ دیکھتا رہتا ہوں اور عرش پر نماز ادا کرتا ہوں۔ دوستانہ تعلقات کا خیال کر کے قاضی نے خاموشی اختیار کی اور چپ چاپ واپس آگیا۔ رات کو خواب میں قاضی نے دیکھا کہ بابا جلال الدین تبریزی عرش معلّٰی پر جانا بیٹھا نماز ادا کر رہے ہیں۔

دوسرے دن اتفاق سے دونوں ایک ضیافت میں یک جا ہوئے جب قاضی وہاں پہنچا تو بابا جلال الدین لوگوں سے گفتگو میں محو تھے قاضی پر نظریں پڑتے ہی آپ نے کہا ”علماء کی معراج یہ ہے کہ وہ متولی یا مدرس بن جائیں، زیادہ پڑھ لیں تو قاضی بن جائیں اس سے زیادہ ترقی کریں تو صدر الصدور کا عہدہ سنبھالیں اور یہ ان کی انتہا ہے لیکن فقرا کے مرتبے کی کوئی حد نہیں، ان کا پہلا مرتبہ وہ ہے جس کا قاضی نے رات کو خواب میں مشاہدہ کیا ہے۔“

قاضی کا سارا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہوا اور بے ساختہ بڑھ کر بابا جلال الدین کے قدموں میں سر رکھ دیا اور معافی مانگنے لگا۔

بابا جلال الدین نے ایک مسجد کی تعمیر کا کام شروع کر لیا تو کعبے کی سمت کا مسئلہ
 زیرِ غور آیا۔ آپ نے معماروں سے، ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”لو ادھر دیکھو، کچھ
 نظر آیا؟“

معماروں کے سامنے کعبہ موجود تھا۔ ہلکے دھوئیں کی چادر کے اُس پار خانہ کعبہ صفا
 نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا ”اس سے کعبے کی صحیح سمت کا تعین کر لو“
 ایک دن آپ ندی کے کنارے دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک اُٹھ
 کھڑے ہوئے اور دوستوں سے کہا ”دوستو! اٹھو اور وضو کر لو تاکہ نجم الدین صغریٰ کی
 نماز جنازہ پڑھ لیں“ پھر خود بھی وضو کرنے لگے ساتھ میں دوسروں نے بھی وضو کیا وضو
 کر چکے بعد آپ نے فرمایا ”گو کہ یہیں نجم الدین کی شہادتوں ہی کی وجہ سے دہلی چھوڑنی پڑی۔ لیکن
 اب جبکہ وہ ملک عدم سدھل چکا ہے جہاں اس کے لئے دُعا سے مغفرت کرنی چاہیئے۔“
 آپ نے باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی۔ چند دنوں بعد نجم الدین کے انتقال کا باقاعدہ
 خبر بھی آگئی اور حساب لگانے پر پتہ چلا کہ ٹھیک اسی وقت انتقال ہوا تھا جب بابا تبریزی
 ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری کر رہے تھے۔

آپ کا بدایوں سے دل اُگتیا تو اودھ کا رخ کیا اور اودھ سے بہار روانہ ہو گئے
 بہار سے بنگال پہنچے، بنگال کا لکھنؤی مسلمانوں کا صدر مقام تھا آپ نے لکھنؤ کی
 سے چند فاصلے پر پنڈو نامی جگہ پر ایک درخت کے سایے میں قیام فرمایا۔ یہاں مندوں کی
 کثرت تھی۔ مندروں سے ناقوسوں اور گھنٹیوں کی آوازیں ہر وقت فضا میں گونجتی رہتی تھیں
 چند دنوں بعد پجاریوں اور ہندوؤں نے انہیں ایک درخت کے نیچے آرام کرتے دیکھا
 تو حیران ہوئے ہندوان کی بنگرانی کرنے لگے آپ کو جب بھوک لگتی تو درخت کے پتے
 کھا لیتے پٹوے میلے ہوتے تو خود دھو لیتے۔ جب یہ اپنے پٹوے دھونے تالاب پر
 پہنچتے تو ہندو بڑا شور کرتے لیکن ان کی پروا کئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہتے کئی
 پجاری آپ کے اس فعل میں مزاحم ہوئے لیکن آپ کو باز نہ رکھ سکے۔ جب کسی اور طرح
 بابا جلال الدین کی تاکی نہ کر سکے تو انہوں نے مناظرے شروع کر دیے اور مناظروں کا یہ
 نتیجہ نکلا کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے کچھ ہی عرصے میں آپ کی تعلیمات اور قوت روحانی کا یہ
 نتیجہ نکلا کہ پنڈو کی بیشتر آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ مسجدیں تعمیر ہونے لگیں، کل

ایک جو پجاری ناقوس بھونکا کرتے تھے اور گھنٹے بجاتے تھے اب مسجدوں میں امامت کرتے نظر آتے تھے اور لوگ پنجوقتہ نماز کی حاضری دینے لگے تھے اور لوگوں کو پھر یہ تماشا بھی دیکھا کہ پنڈو سے مندر غائب ہو گئے اور مسجدیں شمار سے باہر ہو گئیں وہاں کی پوری آبادی مسلمان ہو چکی تھی اور جو اسلام قبول کر کے تھے انہوں نے راہ فرار اختیار کی تھی اور پنڈو کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا تھا۔ ننگال کا اسلام بابا تبریزی کا دین ممت ہے پنڈو سے آپ بندرگاہ دیومحل آشریف لے گئے اور وہاں بھی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ یہاں ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا۔ بابا تبریزی کی کوشش اور تصرف باطنی سے یہاں بھی اسلام پھیلنے لگا آپ نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دیومحل کے لوگ جو درجہ جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

آپ کی عمر ایک سو پچاس سال ہو چکی تھی آپ کے گرد و پیش عقیدت مندوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ یکایک آپ نے مراقبے سے سر اٹھایا اور اپنے چار عقیدت مندوں سے کہا: ”لوگو! ذرا شمال مغرب کی راہ پر جانا تو، طنجہ (افریقہ) کا ایک سیاح ہماری محبت کو دل میں چھپائے ہم سے ملنے آ رہا ہے، ذرا اس کا استقبال تو کرنا“

چاروں عقیدت مندوں نے دو منزل چل کر طنجہ کے اس سیاح کا شاندار استقبال کیا یہ مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ تھا جو شیخ تبریزی کی شہرت سن کر اُن سے ملاقات کرنے آ رہا تھا اسے اپنے استقبال کو پہنچنے والوں کی زبان سے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ بابا تبریزی نے انہیں استقبال کے لئے بھیجا ہے۔

ابن بطوطہ والہانہ جلال الدین تبریزی کی خدمت میں پہنچا اُس نے دیکھا ایک ڈیرھ سو سالہ دُبلایا، کشیدہ قامت، نورانی چہرے کا با عظمت انسان ابن بطوطہ کا منتظر ہے ابن بطوطہ نے انہیں سلام کیا، آپ نے جواب دیکر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابن بطوطہ نے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس وقت جلال الدین تبریزی کے جسم پر ایک نہایت قیمتی عمدہ چٹہ تھا ابن بطوطہ نے دل میں سوچا: ”اے کاش شیخ تبریزی اپنا یہ چٹہ مجھے مرحمت فرمادیں“ پھر لوگوں نے یہ دیکھا کہ آپ فوراً اندر آشریف لے گئے اور ایک دوسرا چٹہ پہن کر قیمتی چٹہ ہاتھ میں لئے دوبارہ نمودار ہوئے آپ نے یہ چٹہ ابن بطوطہ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: ”یہ چٹہ تجھے پسند ہے تو لے لے، لیکن یہ تیری قسمت کا نہیں ہے، اے ۳۵“

میں نے اپنے بھائی کے لئے تیار کر دیا تھا، خیر تو لے جا، یہ چُختیرے پاس ہے گے کا نہیں
یہ تجھ سے چھن جائے گا ایک غیر مسلم بادشاہ اس چُختے کو جبراً چھین لے گا لیکن یہ ہے
گا ان کے پاس بھی نہیں یہ آخر کار میرے بھائی کے پاس پہنچ جائے گا ۛ

ابن بطوطہ نے شکریے کے ساتھ یہ چُختہ قبول کر لیا اور دل میں یہ ارادہ کر لیا
کہ وہ یہ چُختہ بہن کر کسی حکمران کے سامنے۔۔۔ ہرگز نہ جائے گا چند دن بابا تبریزی کی
خدمت میں گزار کر ابن بطوطہ اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر چین روانہ ہو گیا۔

دریائے ہوانگ ہو کے جنوبی حصے میں کنگ زے نامی نہایت خوب صورت
شہر آباد تھا اسے عرب خناس کہتے تھے کنگ زے یہاں کا دار الخلافہ تھا۔ ابن بطوطہ
کنگ زے میں ایک سیاح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور بادشاہ سے ملنے کا کوئی
ارادہ نہ رکھتا تھا ابن بطوطہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوم پھر کر کنگ زے کے بازاروں کا
مشاہدہ کر رہا تھا۔ شاہی محل چوک پر واقع تھا یہاں تین نہریں دن تھیں ایک نہر کے
قریب چوک میں شاہی محل کھڑا تھا ابن بطوطہ نے دور سے اس محل کا مشاہدہ کیا ابھی وہ
مشاہدے میں کھویا ہوا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے پچھر گئے اور ابن بطوطہ تنہا رہ گیا اس
وقت بابا تبریزی کا چُختہ اس کے جسم پر تھا۔ ایک اجنبی ابن بطوطہ کی حرکات و سکنات
پر نظریں لکھے ہوئے تھا ابن بطوطہ نے ادھر ادھر اپنے ساتھیوں پر نظریں دوڑائیں تو
کوئی نظر نہ آیا۔ پریشان ہو کر واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اجنبی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا
پوچھا۔ ”کیا تم اجنبی ہو؟“

ابن بطوطہ نے جواب دیا۔ ”ہاں میں سیاح ہوں“

اجنبی نے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

ابن بطوطہ نے جواب دیا۔ ”میں بہت سے ملکوں کی سیاحت کرتا ہوں یہاں آیا ہوں
میرا وطن طنجہ ہے جو افریقہ کے انتہائی مغربی سر پر سمندر کے کنارے آباد ہے۔
اجنبی نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”میں یہاں کا وزیر ہوں، میرے ساتھ آؤ۔“

ابن بطوطہ کے جسم پر بابا تبریزی کا چُختہ تھا وہ وزیر کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔
لیکن وزیر اسے جبراً شاہی محل میں لے گیا۔ بادشاہ اس سے ملکر بہت خوش ہوا اور دیر تک
مسلمان بادشاہوں کا حال پوچھتا رہا۔ بادشاہ کی نظریں ابن بطوطہ کے چُختے پر جمی ہوئی تھیں

اس نے پرستیاق پہنچے میں کہا ”سیاح! یہ چغہ میں بہت اچھا لگ رہا ہے کیا تم اسے بطور تحفہ ہماری خدمت میں پیش کرو گے؟“

ابن بطوطہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ بابا تبریزی کی پیش گوئی پوری ہو کر ہے گی ابھی ابن بطوطہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ وزیر نے اسے حکم دیا ”اپنا چغہ اتار کر ادب بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو۔“

ابن بطوطہ نے حکم کی تکمیل کر دی۔ بادشاہ نے اس تحفہ کے حلقے میں دس خلعتیں ساز و سامان سے لیس ایک گھوڑا اور سفر خرچ مرہمت فرمایا۔ ابن بطوطہ نے نہایت اذیت کے ساتھ یہ چیزیں وصول کیں۔

ابن بطوطہ ایک سال تک ادھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا اس کے بعد وہ خان بالغ (قائن) کے شہر یعنی یحییٰ چلا گیا یہاں اس کے بہنہ نے شیخ برہان الدین صاغری نامی بزرگ کی خانقاہ میں پناہ دیا۔ جب ابن بطوطہ خانقاہ میں داخل ہوا شیخ برہان الدین کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے اور ان کے جسم پر وہی چغہ تھا جسے بابا تبریزی نے عطا فرمایا تھا ادب جسے ابن بطوطہ سے کنگ نہ لے کے حکمران نے جبراً تحفے میں قبول کر لیا تھا۔

ابن بطوطہ آگے بڑھا اور چغے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا شیخ برہان الدین نے سوال کیا ”تو اسے الٹ پلٹ کر کیوں دیکھ رہا ہے کیا اس چغے کو پہچانتا ہے؟“ ابن بطوطہ نے جواب دیا ”ہاں خوب پہچانتا ہوں، خنسا کے بادشاہ نے اسے جبراً مجھ سے لے لیا تھا۔“

شیخ برہان الدین نے کہا ”نادان سیاح! شیخ جلال الدین نے یہ چغہ میرے لئے تیار کرایا تھا اور مجھے خط کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ یہ دو واسطوں سے تیرے پاس تک پہنچ جائے گا۔“

اس کے بعد شیخ برہان الدین نے خانقاہ کی طاق میں رکھی ہوئی ایک کتاب سے بابا تبریزی کا خط نکال کر ابن بطوطہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

”بابا برہان الدین تمہارا چغہ تیار ہے اسے میں ایک مغربی سیاح کے ذریعے روانہ کروں گا۔ یہ چغہ سیاح سے چین کا ایک بادشاہ جبراً تحفے میں لے لے گا اور وہ بادشاہ اسے تمہاری خدمت میں روانہ کر دے گا۔“

ابن بطوطہ خط پڑھتا جاتا تھا اور حیران و پریشان ہوتا جاتا تھا۔ برہان الدین اس کے چہرے کے تاثرات سے اندوہی کش مکش اور حیرت کا اندازہ لگا رہے تھے انہوں نے کہا۔ ”سناح! تو پریشان یا حیران کیوں ہو رہا ہے میرے بھائی جلال الدین تبریزی کا مرتبہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے، جتنا تو نے سمجھ رکھا ہے انہیں دنیا کے معاملات میں حیرت انگیز دخل حاصل ہے کیا سمجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ ہر روز صبح کی نماز مگر شریف میں ادا فرماتے تھے اور ہر سال حج پر تشریف لے جاتے تھے عذرا اور عید کے دن وہ اپنی خانقاہ میں موجود نہیں ہوتے“ پھر ذرا دکھ سے کہا ”لیکن افسوس کہ جب تو ان سے رخصت ہوا تھا اس کے چند دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور اب وہ اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں“

ابن بطوطہ کو سکتہ لگ گیا اور شیخ کے وصال کی خبر پر اس کی آنکھیں بھرائیں۔ کہتے ہیں آپ کے مزار دیو محل میں ہے آپ کا عرس ۲۲ رجب کو ہوتا ہے ہر روز شام کو یہاں سے غریب و مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے مروز زمانہ سے مزار کا سامناں ٹوٹ گیا تھا لیکن کسی عقیدت مند نے اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ وہ شخص جو ایران کے شہر تبریز میں ایک حکمران گھرانے میں پیدا ہوا تھا حضرت رابع بن ادہم کی طرح حکومت پر لات مار کر دوش بن گیا اور عبادت و ریاضت سے وہ بلند مرتبہ حاصل کیا کہ شاہان وقت ان کا استقبال کے لئے حاضری دینا فخر کی بات سمجھنے لگے جس نے ہندوستان کے دور افتادہ علاقے بنگال میں اسلام پھیلایا اور آج وہیں محوِ استراحت ہے۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاکِ طنیت را

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

نواجگانِ چشت	سوانح عمری نواجگانِ چشت	تذکرہ صوفیائے بنگال
منیر لکھنوی	سید قربان علی بسمل	احبابِ الحق قدوسی
النوارِ اصفیاء	سفر نامہ ابن بطوطہ	
خلع علی ایند مسکن	ابن بطوطہ	

حضرت حمید الدین حاکمؒ

بنوہما مشحرا و بنو امیہ کے منافقات اور آویز تیس ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی چلی گئیں، خوش قسمتی اور اقبال مندی بنو امیہ کی یاوری کرتی رہی اور مسلسل سیاسی استحکام حاصل ہوتا رہا اور ان کے مقابلے میں بنو ہاشم پے در پے انتشار اور پریشانیوں کا شکار ہوتے رہے۔ آخر بنو ہاشم کے چند بزرگوں نے اقبال مند بنو امیہ کے مقابلے میں باغرت پسائی اختیار کی اور مدینہ منورہ سے اپنی مرضی سے شہر بدر ہو کر عراق چلے گئے انہوں نے بغداد کے نواح میں جبل ہنکار میں سکونت اختیار کی۔ ان کے سربراہ کا نام یوسف قریشی ہاشمی تھا یوسف قریشی ہاشمی سرزمین عرب کے زیادہ دور نہیں جا چلا ہتے تھے انہیں اپنے آبا و اجداد کی زمین سے محبت تھی لیکن بغداد کی سڑکوں میں یہ محبت قائم نہیں رہی۔ اور انہوں نے جبل ہنکار کو بھی چھوڑ دیا اور سندھ کے سیستان اور کچھ مکران میں داخل ہو گئے قسمت مہربان تھی اور اقبال ان کا ہم رکاب تھا ان دنوں سیستان اور کچھ مکران کے لوگ اپنے مقامی حکمرانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و جور سے نالاں تھے انہوں نے آل رسول کو اپنے درمیان دیکھ کر بڑی آؤ بھگت کی اور ان کی حمایت میں بغاوت کر کے اپنے مقامی حکمرانوں کو بے دخل کیا اور سیستان اور کچھ مکران کی حکومت نواداران آل رسول کے حوالے کر دی۔

یہ حکومت ایک دوسرے سے منتقل ہوتی ہوئی پانچویں نسل میں شہزادے بہاء الدین ملک پہنچی۔ ان دنوں لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد توختہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کچھ مکران تشریف لے گئے اور اپنی صاحبزادی بی بی حاج کی شادی شہزادے بہاء الدین سے کر دی یہ بعد دیگرے ان سے تین اولادیں ہوئیں، جمال الدین، ضیا الدین، اور حمید الدین۔ یہ خاندان نہایت خوش و خرم اور پر مسرت زندگی گزار رہا تھا، حکومت تھی، بھرپور اکذبہ تھا عزت تھی۔ بہاء الدین کو اقتدار سنبھالے ایک عرصہ گزر چکا تھا انہیں اپنے جدِ املا کی سرزمین یاد آئی۔ جمال الدین، اور ضیا الدین کو ساتھ لیا اور حج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔ حمید الدین صوبہ سے چھوٹے تھے کچھ مکران ہی میں رہ گئے بہاء الدین نے اپنی نیابت کا فرض چھوڑے بھائی

شہاب الدین ابوالبقا کو سونپا اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور دونوں بیٹوں سمیت رسول اللہ کے مزار پر حاضری دی۔ دل بھرا آیا اور آنکھیں پر مالالین لگیں۔ ان کا خاندان یہیں کی مٹی سے عالم وجود میں آیا تھا وہ بے مقصد ایک ایسے مافی کی یاد میں جسے انہوں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا مدینے کی گلیوں میں گھومتے پھرتے دہتے رہاں کی فضا اور سرزمین میں ایک مسخر تھا جس نے منہ اور کچھ مکران کی یاد دل سے مٹا دی تھی مدینے کے بعد عرب کے دوسرے علاقوں کی سیاحت شروع کر دی۔ وہ ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا چاہتے تھے جہاں کہیں رسول اللہ تشریف لے چاہے تھے ان میں یمن بھی شامل تھا یہ گویا پتھر تھے یمن پہنچ گئے یہاں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک معمولی بیمار نے ان کا کام تمام کر دیا۔ دونوں لڑکوں نے تہنیت و تحفین کی اور باپ کی محبت میں یمن ہی میں رہ پڑے کچھ مکران کی حکومت ان کے چھوٹے بھائی شہاب الدین ابوالبقا کے پاس رہی۔ دو سال بعد یہ بھی چل بسے اور ان کی جگہ یمن کے مرحوم بہاء الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے حمید الدین حاکم بنادے گئے بہاء الدین قریشی ہاشمی کا بیٹا اور لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد تونسختہ کا نواسہ اور اقدار آیا تو کچھ مکران کی فضا ہی بدل گئی۔ حمید الدین کو عدل و انصاف کا اتنا خیال رہتا کہ طاقتور ظالم خود کو تنگ سے زیادہ کمزور محسوس کرتا اور کمزور مظلوم خود کو کچھ مکران کا سب سے زیادہ طاقتور و انسان محسوس کرتا۔

حمید الدین کا جدھر سے بھی گزر ہوتا لوگ احترام اپنی گردنیں جھکا دیتے۔ یہ احترام یہ قدر و منزلت ان کی نہیں ان کے عدل و انصاف کی تھی۔ اس احترام اور قدر و منزلت سے حمید الدین میں حکومت اور امارت کی خوب پیدا ہوتی رہی اور حکومت کے اکیسویں سال ان میں ایک ایسے شخص کی تعمیر ہو چکی تھی جس کے سر میں حکومت کا نشہ اور دل میں اپنی برتری کا شدید احساس پیدا ہو چکا تھا۔

دن بھر کاروبار مملکت انجام دینے کے بعد تھکے ہوئے حمید الدین محل میں داخل ہوئے راستے کے آس پاس سبزے اور پھولدار پودوں اور درختوں کے قطعات سے گزرتے ہوئے یہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ محنت اور تھکان کا بوجھ اٹھائے جب یہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو یکبارگی ٹٹٹک کر رہ گئے۔ سامنے ہی ان کی مسہری پکھی ہوئی تھی اس پر پتھے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے پوری خواب گاہ کو معطر کر رکھا تھا اور اس معطر مسہری پر ان کی فزائیت نامی کینز اسکیں بند کئے دین و دنیا سے بے خبر، مدہوش خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے کینز کی اس جرات اور گستاخی نے حمید الدین کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے تالی بجا کے محل

کی پہرے دار مسلح عورتوں کو طلب کر لیا اور ایک تو منہ سخت مزاج عورت کو حکم دیا کہ اس گستاخ کینز کو گریبان پکڑ کے جگادیا جائے اور اس کے بعد اسے کوڑے سے زرد کو بکایا جائے۔ اسی وقت کوڑا بھی مہیا ہو گیا اور موٹی خدمتگار عورت نے کینز کو گریبان سے کھینچ کر میدان کر دیا، اس نے نیم خوابیدہ نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا تو سہم کر رہ گئی۔ تو منہ پہرے دار عورت اپنے آقا کے حکم کو طرازی کا انتظام کرنے لگی۔

حمید الدین نے قہر اور نظروں سے کینز کو گھورا اور دریافت کیا ”تجھ میں یہ جرات کہاں سے آئی کہ اپنے مالک کی مسہری پر خوف و دہشت کے بغیر سو گئی؟“

کینز نے نہایت اطمینان سے گردن جھکالی اور جواب دیا ”مجھے یہ بستر بہت اچھا لگتا تھا بس یہ سوچ کر لیٹ گئی تھی کہ دیکھوں اس پر لیٹنے والے کو کیسا آرام ملتا ہے“
 ”وہی کیسا آرام ملا؟“ حمید الدین نے غصے میں سوال کیا۔

کینز نے بے نیازی سے جواب دیا ”ایسا آرام کہ میں آج سے پہلے اس سے آشنا بھی نہ تھی۔“
 حمید الدین نے طنزاً کہا ”بیشک ہم تجھے ایسی لذت سے بھی آشنا کرائے دیتے ہیں کہ اس سے بھی تو آج تک نا آشنا ہی ہو گی“
 کینز حمید الدین کی بات نہیں سمجھ سکی اور ان کی صورت دیکھنے لگی۔

حمید نے غصے میں چیخ کر تو منہ پہرے دار عورت کو حکم دیا ”تعمیل ہو، اب مزید برداشت کی طاقت نہیں ہے، کوڑا زنی، مسلسل کوڑا زنی، تہا حکم ثانی کو طرازی۔“

تو منہ پہرے دار عورت کا ہاتھ اوداٹھا اور کینز پر برسنے لگا۔ شپ شپ، شراب، شپ۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کینز دوسری ہو جاتی لیکن زبان سے آف تک نہ کرتی۔
 حمید الدین کو وہ رکھ اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر یہ کینز روتی کیوں نہیں۔ جب وہ دیر تک کوڑے کی ضربات برداشت کر کے ہنستی مسکراتی رہی تو حمید الدین نے ہاتھ کے اشارے سے کوڑا زنی موقوف کرادی۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کینز کے روبرو پہنچ گئے۔ وہ کینز سے آنکھ ملاتے گھبرا رہے تھے کینز اب بھی مسکرا رہی تھی جگہ جگہ سے پٹے مسک چکے تھے اور ان میں سے خون چھلک رہا تھا۔

حمید الدین نے غصے اور کھسیا نے پن کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا ”بے شرم، بے غیرت! اس ہنسی کا سبب؟ کیا کوڑے کی ضربات تجھے تکلف نہیں پہنچا رہی؟“

مسکراتے ہنستے چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں کافی شہوں کی روشنی ۲۴۱

میں چمک رہی تھیں کینز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”میسر مسکے ہوئے کیڑے اور
لوہا ہاں جسم کیا یہ گواہی نہیں دے رہے ہیں کہ کوڑوں کی مار نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے؟“
پھر تو ہنس کیوں رہی ہے؟

کینز نے بے نیازی سے جواب دیا: ”میں یہ سوچ کر ہنس رہی تھی کہ پھولوں کے جس بستر
پر چند لمحے سو کر میں اتنی اذیت ناک سناں بھگت رہی ہوں اس بستر پر ہر روز سونے والا کتنی
بڑی سناں کا مستحق ہوگا،“

اس مختصر سے جملے نے حمید الدین کے دل دماغ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔
ان کے چہرے کا کرب اند کوئی کشمکش اور اذیت کی غمازی کر رہا تھا۔ انہوں نے دونوں
ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھولوں سے لدی ہوئی مسہری کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے
بے خیالی میں دوایک بار اس پر بیٹھ جانے کا ارادہ بھی کیا۔ اس پر بیٹھنے کی نیت سے جھکے
بھی لیکن بیٹھے نہیں، کینز کے پُراثر، دل کو مجروح کر دینے والے الفاظ کانوں میں مسلسل گونج رہے
تھے۔ کینز اور مسلح پھرے دار خواتین ادب سے سر جھکائے کسی حکم کی منتظر کھڑی تھیں۔

کچھ دیر بعد حمید الدین نے سر اوپر اٹھایا اور حسرت و مایوسی سے انہیں دیکھنے لگے، دل
کے سوتے آنکھوں کی راہ سے پھوٹ نکلتے تھے کینز کے سوا کسی اور میں اتنی جرأت نہ تھی کہ آنکھیں
تک چار کر سکتی۔

حمید الدین نے انہیں حکم دیا: ”جاؤ، باہر جاؤ، تخلیہ“

ساری عورتیں منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر لٹے پیروں واپس جانے لگیں۔ انہی میں
کینز بھی شامل تھی۔ حمید الدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔ تم نہیں، تم روک جاؤ بس
چند لمحوں کے لیے“

کینز ٹک گئی۔ حمید الدین نے اسے قریب بلایا ”ہاں قریب ہو جاؤ“
کینز ان کے قریب چلی گئی۔ یہ بغور اس کی صورت دیکھنے لگے کینز نے نظروں کی تان نہ لا
کر آنکھیں بند کر لیں۔ حمید الدین نے پوچھا: ”تم کون ہو؟“
کینز نے جواب دیا: ”آپ کی ایک ادنیٰ کینز نو نایت“

حمید الدین نے کہا: ”نہیں، تم کوئی اور ہو تم نے ایک جملے سے ہمارے دل دماغ
کو پھونک کے رکھ دیا ہے“

کینز خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ”حضور کے چہرے سے مکان اور محنت کے

آثار ہویدا علی۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام فرمالیں طبیعت قابو میں آجائے گی،
حمید الدین نے پھولوں میں بچی بسی مسہری پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ اور پھر کنیز کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا یہ آرام کر لیں؟ اس مسہری پر؟ جس پر چند لمحوں کی استراحت کی سزا ابھی تم بھگت
چکی ہو؟“

کنیز نے جواب دیا۔ حضور والا! وہ ایک بات تھی جو ختم ہو گئی تھی اس اذیت ناک سزا
کی تکلیف کس طرح برداشت کرتی۔ یقین جانئے اس عارفانہ جواز نے یکایک مجھ میں اتنی ہمت اور
برداشت کی قوت عطا کر دی کہ اگر میں اسے کرامت یا معجزہ قرار دوں تو غلط نہ ہوگا۔“
حمید الدین نے وہ رات کس طرح گزاری اس کا صحیح علم اور احساس انہی کو ہو گا لیکن
رات بھر کی بے چینی اور اضطراب کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صبح ہوتے ہی انہوں نے
کنیز کو آزاد کر کے خود سے جدا کر دیا۔

حکومت کی ذمہ داریاں اور اس کی پرفریب دل نوازاں اب بھی غنا گیر تھیں اور کنیز کا
عارفانہ جواز انہیں شکست دینے کی کوشش میں تھا۔ کبھی یہ حاوی ہوا کبھی وہ۔ اس کشمکش نے
انہیں ہلکان کر دیا۔ انہوں نے داروغہ اصطبل کو طلب کیا اور حکم دیا یہ شکار پر جانا چاہتے ہیں
ہمارا گھوڑا حاضر کیا جائے۔“

داروغہ اصطبل نے غزوہ اور سوگوار آقا کی اندرونی کیفیت کو بیان نہتے ہوئے سوال کیا
”شکار میں ہمہر کا بی کا شرف کس کس کو بخشا جائے گا؟“

حمید الدین نے کربے جواب دیا ”کسی کو بھی نہیں۔ ہم تنہا جائیں گے“
داروغہ اصطبل نے حیرت سے جواب دہرایا ”حضور شکار پر تنہا تشریف لے جائیں گے؟“
”ہاں ہم تنہا جائیں گے“

داروغہ اصطبل نے اسی وقت شاہی گھوڑا حاضر کر دیا اور حمید الدین نے اسی وقت
شکار کا ضروری سامان ساتھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ بڑی دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گھوڑا دوڑاتے رہے ایک آگ تھی جو دل میں روشن
تھی اور وہ اس کی آغ میں پھنک رہے تھے جنگل کے دلکش حسین نظائے اپنی مرطوب تازگی اور
تراوٹ سے اس آگ کو سبجانے سے قاصر تھے اسی عالم میں ایک جھاڑی سے سرسراہٹ
کی آواز سنائی دی کسی جنگلی درندے کے خیال سے انہوں نے اپنی کمان میں تیر جوڑا اور جھاڑی کی طرف سم لہم

نظر جماعے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ کوئی چھوٹا سا جانور نکل کے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا انہوں نے اسے ایک نظر میں پہچان لیا۔ یہ ہرن کا ایک خوبصورت بچہ تھا۔ یہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے اس کی طرف بڑھے جو کام جنگل کے قدرتی مناظر نہ کر سکے تھے ہرن کے بچے نے انجام دے دیا تھا۔ اس کی پیادری پیادری شکل اور ننھے منے سراپا نے حمید الدین کو اس پر مائل کر دیا کہ وہ اسے زندہ گرفتار کر لیں یہ بچہ برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا اس کے چاروں پیر بھاگنے کے دوران ایک ہی جھک پڑے تھے بالکل اس طرح جیسے چاروں انگلیاں انگوٹھے سے مل کر اپنی جگہ والپس جاتی رہیں، دونوں کا درمیانی فاصلہ دم بدم کم ہوتا رہا۔ دونوں جنگل سے نکل کر آبادی میں داخل ہو گئے کچھ پختے مکانوں کے ہیوے آہستہ آہستہ اپنی اصل صورت میں نظر آنے لگے ہرن کے بچے نے آبادی کے بجائے ویرانے کی راہ اختیار کی۔ آگے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ حمید الدین نے سوچا اب یہ نیچ کے کہاں جاؤں گا ندی میں پھاندنے سے رہا۔ اس دوران وہ بستی کے قبرستان میں داخل ہو گئے کچی پچی قبریں بے ترتیب حالت میں دوڑ تک پھیلی ہوئی تھیں ہرن کے بچے نے کوئی پختے کی راہ نہ دیکھ کر ایک شکستہ قبر میں گھس کے پناہ حاصل کی، حمید الدین کے چہرے پر غموشی بکھر گئی گھوڑے سے کوڑتے ہوئے کہا وہ اب کہاں جاؤ گے نیچ کر؟ آخر پکڑ ہی لیا ہم نے تمہیں؟

یہ آہستہ آہستہ قبر کے شکاف تک پہنچ گئے اس میں بھاگ کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے شکاف کو بڑا کرنے کی کوشش کی اور جب یہ شکاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اندر کی ہر چیز روشنی میں آگئی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے کہ وہاں ہرن کے بچے کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ ایک لاش ضرور دکھی تھی۔ تازہ کفن یہ بتاتا تھا کہ اسے دفن کئے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ آخری دیدار کرنے والوں نے میت کا چہرہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اور اس کے لب رخسار پر ایک بچھوئی گئی پھر رہا تھا۔ وہ بار بار کبھی ہونٹوں پر ڈنک مارتا۔ کبھی رخساروں پر نشین زنی کرتا۔ حمید الدین ہرن کے بچے کو تو گئے بھول، اس تازہ واقعے نے ان کی پوری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ آخر وہ برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے تیر کی مدد سے اسے مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ رینگ کر پھر وہیں پہنچ گیا۔ انہوں نے سوچا یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے اس خیال سے وہ بار بار بچھو کو مٹاتے رہے اور وہ ہر بار رینگ کر وہیں پہنچ جاتا۔ وہ بچھو کو مارتا نہیں چاہتے تھے انہوں نے کسی طرح بچھو کو قابو کیا اور اسے ندی میں پینک آئے ان کے خیال میں اس طرح انہوں نے بچھو کو بے بس کر دیا تھا اور اب وہ کسی بھی طرح قبر تک نہیں

پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک سانپ پانی کی لہروں کو چیرتا ہوا پچھو کی طرف بڑھا اور وہ جیسے ہی پچھو کے قریب پہنچا، پچھو سانپ پر سوار ہو گیا۔ سانپ پانی سے خشکی پر آ گیا اور تیزی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ حمید الدین اس کا پیچھا کرتے ہوئے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ سانپ پچھو سمیت اسی قبر میں داخل ہو گیا پچھو سانپ کی پشت سے رینگ کر نیچے اتر گیا اور لب رخسار پر پھیر نیشن زنی کرنے لگا۔ سانپ میت کی گدڑی کو ڈسنے لگا۔ اس واقعے نے حمید الدین کو بہت متاثر کیا۔ یہ وہاں سے اپنے گھوڑے سمیٹ کر پہنچا اور اس پر سوار ہو کر قریب کی آبادی میں داخل ہو گئے۔ سامنے سے گاؤں کا مکھیا آ رہا تھا انہوں نے اُسے روک کر دریافت کیا۔ ”کیوں بھائی! کیا تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟“

مکھیا نے جواب دیا: ”ہاں، کیوں؟ کیا بات ہے؟“

”تم کیا کرتے ہو؟“

”میں اس گاؤں کا مکھیا ہوں“

”خوب!“ حمید الدین نے کہا ”میں ایک مسافر ہوں اور تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ گاؤں کے قبرستان میں ہوتا زہ قبر بنی ہوئی ہے وہ کس کی ہے؟“

مکھیا نے نفرت سے ہونٹ سکڑ لیے، بولا: ”کیوں؟ تم یہ جان کر کیا کرو گے؟“

حمید الدین نے جواب دیا: ”میں وہاں سے گزر رہا تھا اور اس تازہ قبر کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی میرا خیال ہے وہ شخص عذابِ قبر میں مبتلا ہے“

مکھیا نے کہا: ”وہ یہاں کا زمیندار تھا۔ خدا مغفرت کرے اس نے لوگوں کے بڑے دل دکھائے تھے۔“

حمید الدین لرز گئے۔ ایک زمیندار اتنا گھنگار تھا تو کیج مکران کا حکمران کتنے گنا زیادہ گناہگار ہو گا۔ مکھیا نے اس فکر مند اور سوچ کی الجھنوں میں مبتلا شخص کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی ہوشمند کسی پاگل کو دیکھتا ہے اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ جس شخص سے مخاطب ہے۔ وہی یہاں کا حکمران ہے۔

حمید الدین نے گھوڑے کا رخ موڑا اور محل کو واپس ہوئے انہوں نے محل میں داخل

ہوتے ہی بیوی کو مطلع کیا کہ وہ تاج و تخت سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں اگر بیوی کو ان کی

رفاقت عزیز ہے تو اُسے بھی سب کچھ ترک کر کے ان کے ساتھ چلنا ہو گا۔ دفا دار بیوی نے بلا تامل اعلان

کیا کہ میری موت زندگی کے آپ مالک ہیں آپ جس حال میں بھی رکھیں گے خوش رہوں گی۔

حمید الدین نے کہا وہ اگر یہ بات ہے تو سب کچھ اسی محل ہی میں رہتے دو اور ہمارے ساتھ نکل چلو۔
شہر پرست بیوی نے اپنا سب کچھ محل میں ہی چھوڑ دیا اور جو پڑے پہنٹی تھی اسی میں شوہر
کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی ان کی منزل لاہور تھی جہاں حمید الدین کے نانا سید احمد توختہ قیام فرماتے تھے
اور جن کی بزرگی اور عظمت کا دور دورہ شہر تھا۔

ابھی لاہور آٹھ میل دور تھا کہ بیوی بے درپے قے کرنے لگیں پیٹ میں جو کچھ تھا منہ کے
رستے نکلنے لگا بیوی بے دم ہو گئیں اور ہاتھ پیر جھوڑ دیئے۔ ایسا لگا جیسے وہ گھڑی دو گھڑی کی
مہمان ہیں جلنے ہی والی ہیں حمید الدین قے زدہ بے دم بیوی کے سر ہانے جا کھڑے ہوئے! انہوں
نے آنکھیں بند کر لیں۔ جھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر فرمایا ”بیوی! ہمیں تمہارے پاس سے دنیا کی
بو آ رہی ہے۔“

بیوی نے نحیف و فقیرانہ آواز میں کہا دو میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔
حمید الدین نے جواب دیا ”ہمارا مطلب واضح ہے تمہارے پاس سے دنیا کی بو آ رہی ہے
کیا تم نے اپنا سب کچھ محل میں چھوڑ دیا؟“

”ہاں!“ بیوی نے جواب دیا ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی۔“
حمید الدین نے بطور تنبیہ کہا ”ہم پھر بھی یہی کہیں گے کہ تمہارے پاس سے دنیا کی بو
آ رہی ہے ذرا غور کرو کہ ہمیں تم غلطی سے کوئی قیمتی چیز لے کر تو نہیں چلی تھیں؟“
بیوی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ”وہے شک میں غلطی
پر تھی۔“ اس کے بعد بیوی نے اپنے سامان میں سے ایک قیمتی تسبیح نکال کر حمید الدین کے سامنے
ڈال دی کہا ”بس یہ تسبیح ہے میرے پاس۔ مروارید کی۔ اگر دنیا کی بو اس میں سے آ رہی ہے
تو اسے آپ اسی وقت کسی کے حوالے کر دیجئے۔“

حمید الدین نے وہ مروارید کی تسبیح کسی درویش کو دے ڈالی اور ادھر ادھر کی سیر و
سیاحت کرتے ہوئے لاہور میں داخل ہو گئے نانا سید محمد توختہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور
نواسے کی بڑی خاطر مدارت کی۔

نانا سید محمد توختہ نے۔۔۔۔۔ حمید الدین کو اس حال میں دیکھ کر سوال کیا ”کیا بات ہے

۲۴۶ بغیر اطلاع کراٹے تم لاہور میں کس طرح وارد ہو گئے؟“

حمید الدین کا دل بھرا آیا۔ بھرائی آواز میں کہا ”نانا جان! ہم درویشی اختیار کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں آپ اس سفر میں ہماری راہ نمائی فرمائیں“

نانا نے خوش ہو کر جواب دیا ”تم بالوس مت ہو لیکن درویشی اختیار کرتے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ دنیا تمہیں طرح طرح سے درغلائے گی اور کوشش کرے گی کہ تم ایک بار پھر اس کے پاس واپس جاؤ اس وقت تم کیا کرو گے؟“

حمید الدین نے جواب دیا ”ہم جس راہ پر چل پڑے ہیں اس پر مستقل مزاجی سے چلتے رہیں گے آپ مطمئن رہیں“

نانا نے کہا ”اگر یہ بات سچ تو بسم اللہ۔ ہم ہر طرح حاضر ہیں“

اس کے بعد حمید الدین اپنے نانا کی نگرانی اور سرپرستی میں عبادت و ریاضت کرنے لگے۔ سینے کی سوزش نے ان کا کھانا پینا سونا جاگنا حرام کر دیا تھا انہیں کسی شے کی پرواہ نہ تھی وہ کسی طرح جلد از جلد راہِ سلوک پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔



چونکہ حمید الدین کچھ مکران کے حاکم رہ چکے تھے اس لئے انہیں نانا ہمیشہ حاکم ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ یہاں تک کہ جب بعد میں حمید الدین نے شاعری شروع کی تو انہوں نے اپنا تخلص بھی حاکم ہی اختیار کیا۔

عبادت و ریاضت میں کافی وقت گزار چکنے کے بعد حاکم اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ انہیں نانا کسی اہم خدمت پر متعین کر دیں لیکن وہ ایسی چُپ سادھے ہوئے تھے کہ اگر حاکم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ان کا کمر بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن حاکم خود کو نفاذِ فیض کے لئے نانا کی خدمت میں پہنچے تھے وہ عبادت و ریاضت میں روزِ اوّل کی طرح مشغول ہے۔

ایک دن نانا نے انہیں طلب کیا اور کہا ”حاکم! تمہیں لاہور کے شمالی سرحد پر جانا ہے وہاں ایک ٹیلے پر تمہیں ایک بزرگ یا دالہٰی میں مشغول ملیں گے تم ان سے ملو اور پہلنے کا پانی طلب کرو“

حاکم نے حیرت سے کہا ”اس کے بعد؟“

نانا نے کہا ”وجہ وہ پانی لے کر حاضر ہوں تو پانی کا برتن ہاتھ میں لے کر ٹھیک دینا“

اس عجیب غریب حکم نے حاکم کو پریشان کر دیا۔ پوچھا ”پھر؟ اس کے بعد؟“

نانا نے کہا: ”اس سے پھر پانی طلب کرنا“

”پھر اس کے بعد؟“

”پھر اس کے بعد حسب سابق پانی کا برتن زمیں پر ٹینکے توڑ دینا“

حاکم نے پھر سوال کیا ”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد پھر وہی، بار بار یہی کرتے رہنا“

حاکم نے کہا: ”نانا جان! ظاہر ہے اس کے پاس پانی کے برتن سینکڑوں کی تعداد میں تو ہوں گے
نہیں آخر کار یہ ختم ہو جائیں گے اور ایک ایسا مرحلہ بھی آجائے گا کہ وہ پانی دینے سے قاصر ہو جائیں گے
اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

نانا نے جواب دیا ”جب وہ پانی دینے سے قاصر رہیں تو تم غصے میں ان کے دوچار کھورنسے
رہ کر دینا اور پھر بھاگ کر ہائے پاس چلے آنا“

حاکم اس عجیب غریب حکم کا مطلب نہیں سمجھ سکے لیکن نانا کے حکم کی تعمیل میں مذکورہ ٹیلے پر
بیٹھ گئے وہاں ایک درویش آنکھیں بند کئے یا دلہی میں مشغول تھے۔

حاکم نے اس کے روبرو کھڑے ہو کر پانی طلب کیا ”وہ بابا! ہم پیلا سے ہیں تھوڑا سا پانی پلاؤ۔“
درویش نے آنکھیں کھولیں اور کٹیا میں پانی لینے چلے گئے۔ حاکم نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لیتے ہی
زمین پر گر دیا اور کہا ”وہ بابا اور پانی لے آؤ۔“

درویش تیوری پر بل لائے بغیر دوبارہ کٹیا سے پانی لے آئے اس بار حاکم نے پانی کا پیالہ
زمین پر ٹینکے دیا اور غصے میں کہا ”ہم پیلا سے ہیں بابا ہمیں پانی پلاؤ۔“

درویش نے بے چوں چہرا اندر کیا اور تسلیہ پیالہ لے آئے۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور حاکم
نے پانی پھر طلب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ درویش کو غصہ آجائے گا لیکن درویش کے تحمل کا جواب نہ تھا
وہ متواتر بار بار پانی لائے اور اپنے جملہ پیالوں کا یکساں حشر دیکھتے رہے جب پیالے ختم ہو گئے اور
حاکم کی آب طلبی جاری رہی تو درویش نے آہستہ سے کہا: ”بابا! اب کوئی پیالہ کٹیا میں نہیں ہے ورنہ ضرور
حاضر کرتا۔“

حاکم غصے میں آگے بڑھے اور درویش پر پتھوں کی بارش کر دی۔ ان کی خاصی مرمت کر چکنے
کے بعد یہ دالسی کئے لئے مڑے، تو درویش نے ان کا راستہ روک لیا اور نہایت تحمل سے کہا ”بابا!
ہمیں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔“

حاکم نے درشت لہجے میں حقارت سے کہا: ”کہو کیا کہنا ہے؟“

دردیش نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں سہلانے دبانے لگے، بولے -
 ”ہم سالہا سال سے ترک دنیا کیے بیٹھے ہیں کبھی کھایا کبھی نہیں کھایا، کم کھانے اور نلے کرنے سے
 ہماری صحت بڑھت ہو گئی اور آج ہم ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے ہیں ہمارا خیال ہے کہ مکوں
 اور گھونسوں میں آپ کے ہاتھوں کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی، ہم آپ کی تکلیف کا فی الحال یہی علاج
 کر سکتے ہیں کہ انہیں سہلادبا کے ٹھیک کر دیں، آپ ذرا دیر اور ٹھیکریں اور ہم کو اپنی خدمت کا
 موقع دیں۔“

دردیش دیر تک ان کے دونوں ہاتھوں کی مالش کرتے رہے۔

جب یہ لپے نانکے پاس واپس پہنچے تو نانانے ان کی صورت دیکھتے ہی کہا ”حاکم!

تسلیم و رضا کا مفہوم سمجھ میں آیا؟ اسے ہمیشہ ذہن میں محفوظ رکھنا۔“

حاکم نے آہستہ سے جواب دیا ”بہت بہتر۔ گو تسلیم و رضا کی راہ نہایت دشوار ہے لیکن
 ہم اس پر چلنے کا کوشش ضرور کریں گے۔“



ابھی عبادت و ریاضت جلدی ہی تھی کہ نانا کا آخری وقت آ پہنچا۔ انہوں نے اپنے نواسے
 حاکم کو طلب کیا اور کہا ”حاکم افسوس کہ میرا وقت آ پہنچا اور میں تمہیں مرتبہ مسلوک تک نہیں پہنچا سکا۔
 لیکن یہ بھی مشیتِ ایزدی تھی کہ میں لپے حصّے کا کام ختم کر کے بقیہ کے لیے صحیح شخص کا نام بتا دوں۔“
 حاکم رونے لگے نانانے ان کا ہاتھ لپے تھامیں لے لیا اور شفقت سے دبا کے فرمایا۔
 ”حاکم! تمہارا باقی مقسوم سہروردی سلسلے میں ہے تم وہاں پہنچو اور اپنی قسمت کا بقیہ حاصل کر لو۔“
 اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ حاکم ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سہروردیہ
 سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد روانہ ہو گئے اب ان
 پر کیف و مستی طاری ہونے لگی تھی۔ یہ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں داخل ہو کر اتنے
 وارفتہ و مست ہوئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ شہاب الدین سہروردی کی خدمت
 میں بھی حاضری نہ دے سکے۔ چوتھی رات شہاب الدین سہروردی سے رسول اللہؐ نے خواب
 میں فرمایا ”یہ شہاب الدین! ہمارا فرزند تین دن سے تمہاری خانقاہ میں ملاقات کو آیا ہوا ہے لیکن
 اس پر استغراق نے اتنا غلبہ کر رکھا ہے کہ وہ تم سے ملاقات تک نہ کر سکا۔ تم خود اس سے ملو اور چند دن

اسے اپنی صحبت میں لکھ کر اس کی منزل مقصود کا پتہ دو ۛ

شہاب الدین بیدار ہوتے ہی حاکم کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ حاکم اس وقت بھی سکر دمستی میں تھے۔ انہیں شہاب الدین کی آمد کا بالکل پتہ نہ چلا۔ شہاب الدین نے حاکم کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا ۛ حاکم! ایسی بھی کیا بے خودی کہ جس سے ملنے آئے اس سے ملے بغیر ہی سکر دمستی میں چلے گئے ۛ

حاکم خود اسی عالم صحیح میں آگئے ہو شش وحواس میں آتے ہی سامنے شہاب الدین سہروردی کو دیکھ کر ادب سے بیٹھ گئے۔

شہاب الدین سہروردی نے کہا ۛ حاکم! ابراہیم بن آدم کی طرح تم نے درویشی تحت و تاج ۛ دے کر حاصل کی ہے تمہارے اس ایثار اور قربانی نے زہد و ریاضت کا پہلا مرحلہ تو یوں ہی طے کر دیا ہے اب مزید کیا درکار ہے ہمیں بتاؤ؟

حاکم نے جواب دیا ۛ یا شیخ! شیوخ عالم! سید احمد توختہ ترناری لاہوری اس ناچیز کے نامہ تھے انہوں نے ایک عرصہ تک اس خاکسار کی تعلیم و تربیت فرمائی اور اپنے آخری لمحوں میں خالق حقیق کے پاس جانے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ حاکم! تیری قسمت کا بقیہ اکیسے عزیز کے پاس ہے جس کا تعلق سلسلہ سہروردی سے ہے میں نے سوچا اس بزرگ کو میں کہاں تلاش کروں، سیدھا آپ کے پاس چلا آیا کیونکہ سلسلہ سہروردی آپ ہی کے دم سے قائم ہے اور اس سلسلے میں آپ ہی میری صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں ۛ

شہاب الدین سہروردی نے بہ نظر غائر حاکم کو دیکھا اور مراقبہ میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد فرمایا ۛ حاکم! ہم نے کشف سے اس شخص کو تلاش کر لیا۔ جس کے پاس تمہاری قسمت کا بقیہ ہے افسوس ہے کہ وہ اس وقت عالم وجود میں نہیں ۛ

حاکم نے پریشان ہو کر دریافت کیا ۛ کیا ان صاحبِ کمال وصال ہو چکے ہیں؟

نہیں ۛ شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا ۛ وہ حال عدم سے وجود ہی میں نہیں آئے؟

حاکم نے حیران ہو کر خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد دریافت کیا ۛ حضرت! کچھ وضاحت سے ارشاد فرمائیے ۛ

شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا ۛ تمہاری قسمت کا بقیہ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پوتے کے پاس ہے اور وہ حضرت ابھی تشریف ہی نہیں لائے ۛ

حاکم نے پوچھا ”ان بزرگ کا نام کیا ہوگا؟“
 شہاب الدین نے جواب دیا ”بکن الدین ابو الفتح فیض اللہ“
 حاکم فکر مند ہو کر بیٹھ گئے شہاب الدین سہروردی نے پوچھا ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“
 حاکم نے جواب دیا ”میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے کس کے پاس جانا چاہیئے
 ان کا انتظار کہاں کرنا چاہیئے؟“

شہاب الدین سہروردی نے کہا ”تم وہیں چلے جاؤ جہاں تمہارے پیرو مرشد ظہور فرما
 ہونے لگے ہیں یعنی ملتان، اور وہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرو“
 حاکم نے کہا ”بہتر ہے جیسا حکم شیخ الشیوخ عالم؟“
 چلتے وقت شہاب الدین سہروردی نے انہیں ترکا ”ایک مُصلّا عطا فرمایا اور دعائیں
 دے کر رخصت کر دیا۔“

رحیم یار خاں ایٹشن سے جب آپ جانب شمال چلیں گے تو آپ چھ میل فاصلہ طے کرنے کے
 بعد قلعہ مؤ مبارک تک پہنچ جائیں گے، ایک ہندو راجا اسے منس کروانے اپنی ماں کے لیے یہاں
 قلعہ تعمیر کرایا تھا اور ماں کی نسبت سے اس کا نام ”مٹو“ رکھ دیا تھا۔ یہاں آج بھی قدیم مو اور قلعے
 کے آثار پائے جاتے ہیں چھ سو گز دائرے پھیلی ہوئی فصیل اور پچاس فٹ بلند گڑھی کے آثار اب
 بھی باقی ہیں حاکم بغداد سے یہیں پہنچے تھے۔ اس وقت یہ جگہ آباد نہیں تھی۔ یہاں ایک ہندو جوگی
 رہتا تھا جس کے رشتوں کا بڑا چرچا تھا۔ حاکم یہاں پہنچ کے اس کے قریب ہی رہنے لگے جوگی کئی دن
 تک ان کے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ حاکم کی غربت اور افلاس نے ہندو جوگی کو بہت متاثر کیا اس
 نے مٹی اور کالسی کے چند برتن ساتھ لیے اور حاکم کی صحبت میں پہنچ گیا۔ آپ نے سر اٹھا کر جوگی کو
 دیکھا اور سوال کیا ”کیسے آنا ہوا شریمان جی؟“

ہندو جوگی نے کہا ”میں تمہیں کئی دن سے پریشان پریشان دیکھ رہا ہوں۔“
 حاکم نے کہا ”پھر اس کا کیا علاج ہے تمہارے پاس؟“
 ہندو جوگی نے کہا ”علاج تو اس وقت کیا جاتا ہے جب مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے؟“
 حاکم نے پوچھا ”پھر تم نے کیا مرض تشخیص کیا؟“

جوگی نے جواب دیا ”افلاس، غربت، معاشی بد حالی، تہی دستی“
 حاکم کو ہنسی آگئی بولے ”بس تمہاری یہیں تک رسائی تھی خوب اور کچھ؟“

جوگی نے جواب دیا ”مرض تو ایک ہی ہے لیکن اس کے نام کئی ہیں مثلاً پریشان حالی، مالی اور معاشی تنگی وغیرہ“

حاکم نے پوچھا ”اگر یہی واقعی یہی مرض ہے تو اس کا علاج کیا ہے تمہارے نزدیک؟“
 جوگی نے ساتھ لائے ہوئے برتن حاکم کی طرف بڑھائے اور کہا ”سر دست ان سے کام چلائیں، آگے بھگون بھلا کر گے کا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے“
 حاکم نے برتن ہاتھ سے نہیں پکڑے بے نیازی سے کہا ”انہیں رکھ دو۔ یہ ہمارے کیا کام آئیں گے؟“
 جوگی نے کہا ”یہ بظاہر مٹی اور کالی سی برتن ہیں لیکن ہماری نظر کیمیا اثر سے سونے کے ہو جائیں گے انہیں بازاری میں بیچ کر کھانے پینے کا خرچ چلانا“

یہ کہہ کر جوگی مسکراتے لگا اور ایک نظر خاص برتنوں پر ڈالی، اس نظر میں کیا اثر تھا کہ سارے برتن آہستہ آہستہ سنہری رنگ اختیار کرنے لگے بالکل اس طرح جیسے دھوپ میں جگمگاتی نین پر آہستہ آہستہ ابر کا کوئی ٹھنڈا سایہ فگن ہو جاتا ہے تھوڑی دیر بعد سارے برتن سونے کے ہو گئے۔
 جوگی نے ان برتنوں کو اک شان متکبرانہ سے دیکھا اور حاکم سے کہا ”تم چاہو تو یہیں رہو اور ان برتنوں کی قیمت سے خرچ چلاؤ۔ جب رسی رقم خرچ ہو جائے تو مجھے دوبارہ مطلع کر دینا۔ میں اور انتظام کر دوں گا لیکن اگر تم یہاں رہنا چاہو تو جہاں جانا چاہو ان برتنوں کو لے کر چلے جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا“

حاکم نے ان برتنوں کو اٹھا کے دریا کی نذر کر دیا اور اک شان بے نیازی سے کہا ”ہم بے غرض اور بے فکر لوگ کہاں سونے چاندی کے چکر میں پڑیں گے جس نے حکومت اور امارت کو اس درویشی پر قربان کر دیا ہو۔ وہ سونے چاندی کے ان چند ٹھیکروں کی کیا پردا کرے گا“
 جوگی بے چین ہو کر کبھی تو حاکم کی صورت دیکھنے لگتا اور کبھی دریا کی اُن موجوں کو گھورنے لگتا۔ جنہوں نے اس کے سونے کے برتنوں کو کھالیا تھا اُسے حاکم کی اس حرکت پر غصہ بھی آرہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا کچھ دیر بعد اس نے حاکم سے کاروباری انداز میں کہا ”میرے سونے کے برتنوں کو دریا میں ڈال کر تم نے میرے دل کو تکلیف پہنچائی ہے اگر تم انہیں اپنے مصرف میں نہیں لانا چاہتے تھے تو تمہیں اس بات کا بھی حق نہ پہنچتا تھا کہ انہیں دریا برد کر دو۔ میں اپنی محنت اور دیاخت کے ثمرے کا یہ انعام پسند نہیں کرتا اگر تم اتنے ہی غنی اور بے نیاز ہو تو براہ کرم کسی بھی طرح میرے برتن مجھے واپس کر دو، مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم ان برتنوں کو کہاں سے

اور کس طرح حاصل کرو گے۔ میں تو بس اتنی سی مختصر بات جانتا ہوں کہ میں نے تمہیں جو برتن دیے تھے وہ مجھے واپس مل جانا چاہیے۔

حاکم نے فکری سے کہا: ”بس اتنا ہی ظرف تھا تم میں؟ جن برتنوں کو دریا کی نذر کیا جا چکا ہو وہ تمہیں واپس کس طرح کئے جا سکتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ برتن تو تم نے ہمیں دے دیئے تھے ان کا ہم کچھ بھی کریں۔ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیئے۔“

”واہ جناب!“ جوگی نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ تمہیں دیا تھا کسی کام کے لئے دیا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں اُسے یوں دریا بُرد کر کے اس کے فائدے سے محروم کر دیا جائے۔“

حاکم نے بظاہر بے بسی کا اظہار کیا: ”لیکن اب تو وہ دریا کی تہہ میں بیٹھ چکے یا پانی کی موجوں میں لپکیں اِدھر اُدھر بہہ گئے اب ان کا دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔“

جوگی نے بے مروتی سے کہا: ”جناب میں ممکن ناممکن کچھ بھی نہیں جانتا، مختصر بات۔ مچھاپنے برتن درکار ہیں اور کچھ نہیں۔“

حاکم نے کہا: ”اگر برتنوں کی واپسی ممکن نہ ہو تو؟“

جوگی نے جواب دیا: ”تب پھر انہی کے وزن کا سونا فراہم کر دینا۔“

حاکم نے کہا: ”ہاں یہ متبادل صورت ہمیں منظور ہے تمہیں برتنوں کے عوض اتنے ہی وزن کا سونا فراہم کر دیا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

جوگی نے اکتائے ہوئے پریشان ہنسی میں کہا: ”لیکن کب؟“ کر دیا جائے گا نہیں، مجھے زور ابھی اسی وقت اسی جگہ درکار ہے۔“

حاکم نے افسوس سے کہا: ”اگر تم اپنی ضرورت قائم ہو اور ہمیں وقت اور مہلت ہیں دینا چاہتے ہو تو نہ سہی۔“

جوگی نے چبا چکا کر باتیں بنائیں: ”شریمان جی! جب بات دل میں آئی ہے تو اسے ان تک لانے میں کیا حرج ہے تم بے گھر بے در پردیسی، معلوم نہیں بہتے بہاتے کہاں سے ان آگئے ہو۔ تمہارا کیا بھروسہ کہ یہاں رہو گے بھی یا کہیں چلے جاؤ گے اس سے پہلے ہی اپنا حساب بچکا لینا ضروری ہے۔“

حاکم نے کہا: ”یہ بے اعتباری، یہ بے مروتی! ہم تمہارا حساب کتاب چمکاکے یہیں باگے اسی جگہ، تم نے اس گہنگار کو سمجھنے میں غلطی کی ہے تم نے یہ نہ کہ نہیں سمجھا کہ یہاں جو کچھ ۲۵۳

بھی ہے محمد عربی کے طفیل ہے تمہاری نظر کیمیا اثر کیا بھی کرشمہ دکھائے اس کی پڑاؤ
کی ایک حد سو گئی، ایک انتہا، لیکن تم یا رکھو بے کنٹھے ملے کاناپیں بلا محمدؐ اناؤں، (جنت محمد کا
نام لئے بغیر نہیں ملے گی)۔

جوگی کو بس ایک ہی بات سے دلچسپی تھی سونے کے بتوں کی والپسی۔ بولا ”شریمان جی!
زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے اپنا اور میرا وقت برابر نہ کریں“

حاکم نے جوش میں دریا میں ہاتھ ڈال دیا۔ بولے ”و دریا! ہمیں سونا اور موتی درکار ہیں
اپنے دامن کی ایک حقیر سی مقدار اپنے کتے ڈھیر لگا دے، یہ لالچی جوگی بے صبر ہے پن کا اظہار
کر رہا ہے ورنہ ہمیں سونے چاندی کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اسی وقت موجوں میں طلحہ پیدا ہوا اور سمندر کی سرکش موجوں کی طرح دریا کی امواج
ساحل کی طرف بڑھیں اور جب وہ والپس گئیں تو دریا کے کتے بے شمار قیمتی موتیوں اور سونے کے
ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حاکم نے جوگی کو حکم دیا ”اس میں سے جتنا جی میں آئے اٹھالے اور
اپنی راہ پکڑ۔“

جوگی حواس را باختمہ کبھی حاکم کو دیکھتا اور کبھی سونے اور موتیوں کے ڈھیر کو۔ اسے
اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا اس نے آہستہ سے پوچھا ”شریمان جی! یہ سب کیا ہے؟“
آپ نے جواب دیا ”یہ وہ ہے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں“

جوگی آپ کے قدموں میں گر گیا۔ روتا ہوا بولا ”شریمان جی! میں ایک لوبھی انسان، مجھ میں وہ
بے غرضی اور استغنا کہاں جو تم میں پایا جاتا ہے۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ بے کنٹھے ملے کاناپیں بلا محمدؐ اناؤں
مجھے اس نام کی چاب کرا کے مسلمان کرو۔ اب اس ہندو جوگی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔“
آپ نے اسے اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس کا اسلامی نام زین الدین رکھ دیا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی آپ کے مزار کی حجابی
اسی نو مسلم زین الدین کی نسل میں چلی آرہی ہے



یہاں رہتے رہتے جب کچھ مدت گزری تو ان کا شہرہ ادھر ادھر پھیلنے لگا۔ کچھ مکاں
آپ کا خاندان بھی موہن پج گیا اور اس درویش کے قدموں میں جھک گیا۔ انہوں نے چند گاؤں آپ کا
نذر کیے کہ وہ ان کی آمدنی سے لوگوں اور حاجت مندوں کی دستگیری فرمائیں۔ انہی میں ایک گاؤں

بھی تھا۔ جس پر حضرت ہباء الدین زکریا ملتانی کے ایک مرید کو تصرف حاصل تھا اسے حاکم کے کارندوں سے کسی قسم کی تکلیف پہنچی۔ اس نے شکایت اپنے پیر زکریا ملتانی کو ایک نامہ لکھا کہ ”یا پیر و مرشد حمید الدین حاکم نامی ایک بزرگ جو سید احمد توختہ کے نواسے ہیں اور جو کبھی کبچہ مکران کے حاکم تھے درویشی اختیار کر کے مؤمن قیام فرمایاں ان کے آدمی میرے ایک گاؤں میں مداخلت کرنے لگے ہیں خاکساران سے نہیں الجھنا چاہتا۔ حضور ان سے میری سفارش فرمادیں۔“

کیونکہ اللہ والے ہی اللہ والوں سے مناسب مقام بات چیت کر سکتے ہیں۔“
حضرت زکریا ملتانی نے حاکم کو خط لکھا ”واضح ہو کہ تم قریشی ہاشمی حضرت ابوالحسن ہنسکاری کے جانشین ہو اور تمہارا نام حاکم ہے لیکن طین سلوک میں محکوم ہو کر رہنا ہی لازم ہے اور کسی ایسے امر کا ارتکاب کرنا جو ارباب حال کے مناسب حال نہ ہو اچھا نہیں ہے ایک چھوٹے سے قطعہ زمین کی خاطر کسی مسکین کے دل کو آزدہ کرنا کہاں تک مناسب ہے۔“

دل بدست آؤ کہ حج اکبر است
اس خط نے حاکم کو جھنجھوڑ دیا۔ اپنے فوراً ہی جواب لکھا ہے ”بعد تمہید خدائے ذوالجلال و درود ایزد متعال حضرت پر واضح ہو کہ یہ احقر اگرچہ حاکم کہلاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ محکوم الہی ہے یہ ناچیز خود کو درویشوں کی خاک پا سمجھتا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ہمیں درویش مذکور کے بغیر ہونے کا کوئی علم نہیں اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ درویش کا کوئی مزاعم نہ ہوگا۔“
اس خط نے حضرت زکریا ملتانی کو اتنا خوش کیا کہ انہوں نے حمید الدین حاکم کو بلا بھیجا۔ یہ ان کی خدمت میں پہنچے تو حضرت زکریا ملتانی نے بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اور آخر میں اپنی رٹ کی بی فاطمہ کو ان سے وابستہ کر دیا۔ اس موقع پر زکریا ملتانی کے کسی عقیدت مند نے کہا ”جناب یہ بہترین موقع ہے کہ آپ پیر و مرشد سے بیعت و خلافت کی بات بھی کر لیں۔“
حاکم نے جواب دیا ”میں بیعت و خلافت کی خواہش لے کر ہرگز نہیں آیا۔ ہم توان کے پوتے حضرت رکن الدین کا انتظار کر رہے ہیں۔“
یہ بیوی کو لے کر موٹا پس چلے گئے۔

مؤمن جو مرید اور اداوت مند آپ کے آس پاس رہنے لگے تھے یا حاضر یا دینے لگے تھے۔ ان میں ایک مہر نامی شخص بھی تھا یہ آپ کے لئے ہر روز دودھ لے کر آتا تھا جہاں سے آتا تھا وہ جگہ دیا کہ اس پار تھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی کشتی مل جاتی تھی اور وہ اس کے ذریعے دریا عبور کرتا تھا

ایک دن وہ جو دودھ لے کر پہنچا تو دریا میں دو درختوں کو ٹکرتی نظر نہیں آئی۔ اس نے کنا لے بیٹھ کے کسی کشتی کا کافی دیر تک انتظار کیا۔ لیکن انجام مایوسی نکلا۔ آخر اس نے ہمت کی اور بسم اللہ کہہ کے دریا میں اتار پڑا۔ دودھ کا برتن سر پر رکھ لیا اور دریا کے تندوینہ دھاکے کو کاتا ہوا دوسرے کنا لے کی طرف بڑھا۔ بچ دریا میں اسے بھنورنے آلیا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کا دریا سے بچ نکلنا ناممکن ہے تو اس نے آہستہ سے کہا: ”حضرت! میری نیت ٹھیک تھی اور میری دلی خواہش تھی کہ دودھ پہنچانے کے معمولات میں فرق نہ آئے لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں ہے میں دریا کی موجوں اور بھنور کا تو مقابلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھ میں مشیتِ ایزدی کے مقابلے کی تاب نہیں ہے، ان حالات میں، میں آپ کی مدد کا طالب ہوں۔ لیکن آپ بھی اس حد تک مدد کر سکتے ہیں جتنی خدا کو منظور ہے“

اس نے اچانک ایسا محسوس کیا جیسے کسی ہاتھ نے اس کی گڈی پکڑ لی ہے اور سرکش امواج اور بھنور کے منہ سے چھین کر ساحل کی طرف لیے جا رہے ہیں جب دراپوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ ساحل پر کھڑے وہ دودھ لے کر دیوانہ وار حاکم کی خدمت میں پہنچ گیا اور انہیں پورا وقفہ سنا کے عرض کیا: ”حضرت آج تو بس خیر ہو گئی ورنہ میں تو زندگی سے مایوس ہی ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کے قدموں تک پہنچنے میں جو محنت کرنا پڑی ہے، کچھ میں ہی جانتا ہوں۔“

آپ نے اپنا ہاتھ، جس کی آستین بھگی ہوئی تھی اپنے ارادت کی طرف بڑھا دیا اور متبسم ہو کر فرمایا: ”بیشک اس میں کیا کلام لیکن محنت تنہا تمہاری ہی نہ تھی بلکہ ہمارے ہاتھ سمیت!“ اس شخص نے حاکم کا ہاتھ چوم لیا۔ آہستہ سے کہا: ”اس بھگی آستین اور محنت کے قربان بننا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔“

فخر و فادان کا طرہ امتیاز تھا انہیں اور ان کی بیوی کو اکثر شہو کا رہنا پڑتا۔ ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ پانچ دن تک متواتر انہیں قاتلے کرنے پڑے۔ ناؤوں سے نڈھال بیوی ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ بلائے بغیر زبان حال سب کچھ کہہ دیا۔ حاکم نے بے چینی سے پوچھا: ”نیک بخت! تو کیا چاہتی ہے؟“

بیوی نے اپنے دکھ چھپا کے عرض کیا: ”صورت بہ میں حالش میری“ آپ نے خاموشی اختیار کی اور پھر مصلے کا ایک کونا اٹھا کے اس کے نیچے سے ایک نہایت قیمتی موتی نکال کر بیوی کے حوالے کیا ”بولے“ اس کی بازو میں بہت زیادہ قیمت مل جائے گی

فدا سنبھال کے خرچ کرنا ؟

بیوی کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔ قیمتی موتی کے مل جلنے کی طمانیت نے انہیں اس درجہ مطمئن کر دیا کہ انہیں نیندا لگتی۔ خواب میں دیکھا وہ جنت میں داخل ہو چکی ہیں وہاں نہایت حسین محل جگہ جگہ بنے ہوئے ہیں اور ان میں ایک محل ایسا بھی تھا جس کے ایک دروازے کا کنگرہ غائب تھا انہوں نے کسی پاسبان سے سوال کیا۔ ”یہ محل کس کا ہے ؟“

پاسبان نے جواب دیا۔ ”حضرت حمید الدین حاکم کا“

بیوی نے گھبر کر دوسرا سوال کیا۔ ”لیکن اس کا تو ایک کنگرہ غائب ہے آخر یہ کیوں ؟“

پاسبان نے جواب دیا۔ ”اس کنگرے کے مردار یہ کو انہوں نے دنیا میں ہی طلب کر لیا ہے جو

انہیں دے دیا گیا۔“

بیوی کی آنکھیں کھل گئیں ، بدحواس پریشان حال موتی ہاتھ میں لے کر شوہر کے پاس پہنچیں اور اسے شوہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا : ”مجھے فاقوں سے مر جانا گوارا۔ لیکن اپنے اس موتی کو جہاں کہیں بھی حاصل فرمایا ہے وہیں واپس پہنچا دیجئے“

حاکم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھینچنے لگی انہوں نے موتی کو مٹھی میں لے کر بیوی کو آنکھیں بند کر لینے کا حکم دیا جس کی حرف بحرف تعمیل ہوئی اور موتی غائب ہو گیا۔

بیوی ایک عرصے سے اپنے والد کے پاس نہیں گئی تھیں بھائیوں کی یاد بھی ستاتی رہتی تھی۔ ایک دن یہ اپنے بھائی صدر الدین حارف کے گھر پہنچیں اور زین پر بوریہ بچھا کر سو گئیں۔ صبح صدر الدین سو کر اٹھے اور بہن کو بوریہ پر سوتا دیکھ تو حیران رہ گئے۔ کیونکہ انہوں نے رات کو بہن کے لئے آرام دہ بستر بچھا دیا تھا ، لیکن وہ خالی پڑا تھا۔ بہن کے بیار ہو جانے پر بھائی نے سوال کیا : ”بہن ! جب بستر موجود تھا تو پھر زین پر بوریہ بچھا کر کیوں سو گئیں ؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”ایک عرصے سے ایسے بستر پر سونے کی عادت ختم ہو چکی ہے کیونکہ

تمہارے بھنوئی (حاکم) پروری رات چار رکعتوں میں گزار دیتے ہیں۔ ان رکعتوں میں وہ پورا قرآن ختم کرنے کے عادی ہیں انہیں رات کو لیٹا شادنا دہری میسر آتا ہے ایک دن وہ آرام فرما رہے تھے کہ قریب صبح میں نے ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ وہ جاگ رہے تھے انہوں نے برہمی سے تکیہ ہٹانے کے ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے کہا : ”تم شیخ کبیر : زکریا کی بیٹی ہو کر تم سے نفس کو آرام دلاؤ۔“

کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ، ان کی اس بات نے مجھے شرمسار اور نادام کر دیا اور اس ۲۵

دن سے خود میں نے آرام کی نیند ترک کر دی "

بھائی کو اس واقعے نے بہت متاثر کیا۔ کہا: "حمید الدین حاکم نام ہی کا حاکم نہیں، بلکہ تزکیہ نفس اور زہد و ریاضت میں بھی ہم سب کا حاکم ہے "

آپ کا شہرہ ملتان اور رحیم یار خان کے اس پار شمالی ہند تک جا پہنچا۔ غیاث الدین تغلق کا وزیر اپنے چند مصاحبین کے ساتھ آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا، اس وقت آپ اپنے کپڑوں میں پیوند لگائے تھے کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ فرماں ردائے ہند کا وزیر اپنے خدام کے ساتھ آپ کی زیارت کو حاضر ہوا ہے، ذرا سی دیر کیلئے آپ اس کے روبرو بیٹھ جائے آپ نے وزیر کو مصاحبین اور خدام سمیت اپنے پاس بلالیا وزیر اور اس کے ساتھیوں نے حاکم کو پیوند لگاتے جو دیکھا تو ذرا سی دیر کے لیے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ انہیں صحیح سلامت کپڑے تک میسر نہیں اور یہ کہ ان کا کوئی ایسا مخلص ارادت مند بھی نہیں جو ان کے کپڑوں میں پیوند لگا دیا کرے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی ہے تھے کہ حاکم نے پیوند لگانے کا کام موقوف کیا اور اپنے کلاہ کو ٹیٹھا کر دیا۔ کلاہ کا ٹیٹھا ہونا تھا کہ سبھی کے منہ ٹیٹھے ہو گئے وزیر اور اس کے ساتھی ٹیٹھے وزیر موڈ بانہ آگے بڑھا اور حاکم کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور روتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! مجھے اپنی ناقص اور گناہگار سوچ کا احساس ہے اور میں نادم و شرمسار ہوں۔ براہ کرم معاف فرمادیجئے۔ آئندہ میں ایسی جسارت نہیں کروں گا "

حضرت حاکم نے فرمایا: "رسول اللہ اپنے کام خود کیا کرتے تھے ہم تو اپنے رسول کی اتباع کرتے ہیں۔ دوسرے اس پر ملول اور افسردہ کیوں ہوں "

وزیر نے عاجزی سے کہا: "میں شرمندہ ہوں، معاف فرمادیجئے "

آپ نے اپنی کلاہ سیدھی کر دی۔ وزیر اور اس کے ساتھیوں کے مشیدھے ہو گئے۔ وزیر یہ کہتا ہوا افس چلا گیا کہ: آپ کی بزرگی اور عظمت کا تہہ دل سے میں معترف ہو چکا ہوں۔ اور آئندہ کسی بھی قسم کی ایسی گفتگو یا رویے سے پرہیز اور گریز کروں گا جس سے کسی بھی انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔

آپ نے آہستہ سے کہا: "یہی مناسب ہے ورنہ دل آزاری کے جواب کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی ذرا سی بے تکلفی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے سے گریز کرے اور دل آزار کی کا جواب

اپنے سوچا کہ پیر کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہنا کیا معنی رکھتا ہے اس سے تو یہی بہتر ہے سچ کر لیا جائے آپنے خانہ کعبہ پہنچنے کی تیاری کی اور جہاز میں بیٹھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ طوفان ایسا آیا کہ جہاز کے پنج نکلنے کے آثار ہی جاتے رہے، کچھ دیر بعد اس افراتفری میں طوفان کے شور میں مناوی نے باواز بلند اعلان کیا۔ وہ کہہ رہا تھا یہ حضرات جیسا کہ آپ لوگ خود ہی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ جہاز طوفان میں پھنس چکا ہے اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ کوئی شخص سمندر میں پھانڈ کر اپنا زندانہ پیش کرے تاکہ اس کاجان کے عوض سینکڑوں جانیں بچ جائیں ۴

حاکم کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے ارادے کی کسی اور کو خبر تک نہ ہونے دی۔ چپ چاپ جہاز سے پانی میں گر گئے اور ہاتھ پیر مانے لگے لوگوں نے بڑے افسوس سے کہا: بھئی ہم نے یہ کب کہا تھا کہ حاکم ہی سمندر میں کود جائیں۔ کوئی بھی کو دسکتا تھا۔

جہازیوں نے چاہا کہ انہیں بچا لیا جائے لیکن حاکم غوطہ کھاتے، ڈبکیاں لگاتے کہیں غائب ہو گئے جہازیوں کو انہیں دیر تک تلاش کرنے کے باوجود جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ انہیں وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔ حاکم غوطہ لگاتے کھڑی مائے ایک چھوٹے سے جزیرے پہنچ گئے اس جزیرے میں ایک چھوٹا سا پہاڑ بھی تھا حاکم اس پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئے پہاڑی پر پہنچ کر انہوں نے متحسانہ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کہیں بھی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ وہ ایک سرسبز شاداب حصّے کی طرف بڑھے۔ سبزہ زار پر جگہ جگہ انسانی ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں آپ وہیں بیٹھ گئے اور غور کرنے لگے کہ ان بد بخت انسانوں کے ساتھ وہ کون سا حادثہ

پیش آیا۔ جس نے انہیں ہڈیوں کے پنجروں میں تبدیل کر دیا۔ انہیں حیرت تھی کہ کہیں ایک انسان تو نظر آتا۔ آہستہ آہستہ دن ختم ہو رہا تھا اور شام قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس دیر لے میں زندگی گزارنے کا تصور ہی محال تھا۔ وہ ادھر ادھر کسی جاندار کی تلاش یا آبادی کی جستجو میں چلنے پھرنے لگے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور سورج مغربی افق میں منہ چھپانے لگا یہ سرسبز شاداب قطعے پر واپس چلے گئے اور انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کے درمیان رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سورج چھپا اور چاند نے تری ناکب مظاہرہ کیا۔ یہ قبلہ رو ہو کے سر بسجود ہو گئے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب انہوں نے سلام پھیر تو اپنے بائیں طرف کسی انسانی وجود کو محسوس کیا حاکم نے اب جو غور سے دیکھا تو انہیں ایک نہایت حسین و جمیل عورت کھڑی نظر آئی۔

حاکم نے حیرت سے پچھلاؤ تم کون ہو اور یہاں کہاں رہتی ہو؟

عورت نے سوگوار سے جواب دیا : ” میں وہ قسمت عورت ہوں جس کا اب اس جگہ کوئی
 بھی موجود نہیں، سمجھی میرا ساتھ چھوڑ کر ملک عدم سدھاپ چکے۔“
 حاکم نے پوچھا : ” یہ سب ہلاک کس طرح ہوئے؟“
 عورت نے جواب دیا : ” انہیں ان کی ہوس لگا گئی،“
 عورت کا جواب حاکم کی سمجھ میں نہ آیا۔ عورت سے پوچھا : ” اب تم کیا چاہتی؟“
 عورت نے جواب دیا : ” تم یہیں رہ جاؤ۔“
 حاکم نے پوچھا : ” وہ کیوں؟“
 عورت نے کہا : ” اس لئے کہ یہاں میں تنہا ہوں اور ایک تنہا عورت یہاں کس طرح رہ
 سکتی ہے۔“

حاکم نے جواب دیا : ” اچھا صبح ہونے دو، سوچ کر جواب دیں گے۔“



اس کے بعد حاکم پھر عبادت میں مشغول ہو گئے عورت اُن کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
 جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے اور عورت کی طرف دیکھا تو اسے نہایت انہماک اور اشتیاق
 سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ حاکم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ عورت ان کے
 قریب آگئی اور چاند کی طرف دیکھتی ہوئی بولی : ” کتنا حسین منظر ہے؟“
 آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عورت نے دل فریب تبسم کا مظاہرہ کیا، بولی : ” چاندنی اور موسم کا نشہ میں اپنی
 رگڑے میں دوڑتا محسوس کر رہی ہوں معلوم نہیں آپ کا کیا حال ہے؟“
 آپ نے سکوت بجال رکھا۔ عورت کسمسک کر بالکل قریب آگئی بولی : ” آپ نے اس ویران
 بستی کی بابت یہ محسوس ہی کر لیا ہوگا کہ یہاں از سر نو آباد کاری سخت ضرورت ہے۔“

آپ نے جواب دیا : ” ہم یہاں مستقل رہنے نہیں آئے ہیں کل صبح ساحل پر پہنچ کر ہم کسی
 جہاز کا انتظار کریں گے اور اس پر بیٹھ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ تم سے کیا چاہتی ہو؟“
 عورت نے افسردگی آمیز شوخی سے کہا : ” لیکن تم یہاں سے کیوں چلے جانا چاہتے
 ہو؟ یہاں رہتے کیوں نہیں؟“

آپ نے جواب دیا : ” ہم حج کی نیت سے گھر سے نکلے تھے اور وہی مقصد اس وقت بھی

پیش نظر ہے۔

عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ بول رہی تھیں میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ ہیں رہیں اور ہم دونوں کے اتحاد اور یک جہتی سے نسل انسانی کا سلسلہ قائم ہو، میں یہاں ایک آباد بستی دیکھنے کی خواہش مند ہوں، میرا خیال ہے آپ کی بھی یہی خواہش ہوگی۔

”وہ نہیں!“ آپ نے ہیزیاری سے جواب دیا۔ ”ہماری ایسی کوئی خواہش نہیں۔“

عورت مرمستی و سرشاری سے بے خود ہوئی جا رہی تھی۔ خود کو آپ کی آغوش میں گرائیے کی کوشش کی۔ لیکن آپ کھسک کر ذرا دور ہو گئے عورت کھاس پر گر گئی۔ سنبھل کر اٹھی تو اس طرح کہ قہر کی نظروں سے انہیں گھور رہی تھی۔ کچھ کہنے کیلئے اس نے اپنی اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ حاکم نے اک ادائے خاص اور بے نیازی سے کہنا شروع کیا۔ ”اور زنی ہزاری ہمارے بات ذرا غور سے سن، ہم تیرے مطالبے نہیں ہیں۔ اگر تو ہم سے بڑی ہے تو ہم تجھے اپنی ماں کی جگہ تصور کریں گے اگر تو ہماری ہم عمر ہے تو خود کو ہماری بہن تصور کر، اور اگر عمر میں ہم سے چھوٹی ہے تو ہم تجھے اپنی بیٹی سمجھیں گے، ان رشوتوں کے علاوہ کسی اور شے تے کا ہمارے ذہن میں کوئی تصور نہیں۔“

عورت نے سکوت اختیار کیا اور غور سے حاکم کی شکل دیکھنے لگی حاکم نے نظریں چرائیں اور گردن جھکا کے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو پتہ چلا وہ عورت کہیں جا چکی ہے۔

اس وقت کسی نے کہا۔ ”حاکم! ہمیں تیرا امتحان مقصود تھا تیرے اس پاس جن لوگوں کے ڈھلپنچے اور بڑیاں بکھری پڑی ہیں یہ سب اس عورت کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس سے چاہت اور مواصلت کا انہیں یہ صلاح ملے یہ عورت بمنزلہ قحبہ تھی۔ دنیا کی بھی یہی حیثیت ہے تو نے اسے ٹھکرا کر ایک اہم امتحان میں مثالی کامیابی حاصل کی ہے تو صبح ساحل پر پہنچ جا۔ وہاں ایک جہاز تیرا منتظر ہوگا اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ پہنچ۔“

اس باتف غیبی کی آواز پر حاکم سجدے میں گر گئے اور روتے ہوئے فرمایا۔ ”یا اللہ العالمین! میں ایک کمتر اور بے بس انسان جس امتحان میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس میں بھی تیری ہی مہربانی پیش پیش تھی ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ ٹھکن امتحان۔“

دوسرے دن صبح واقعی انہیں ایک جہاز مل گیا اور یہ اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کے لئے روانہ ہو گئے۔



حرم کے گرد طواف کرنے کے دوران آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ آپ کے نقش پاپر پر

چلنے کو کوشش کر رہا ہے۔ آپ نے گھوم کر اسے دیکھا اور کہا ”ظاہری نشان پر چلنا تو بہت آسان ہے لیکن باطنی نقش قدم پر چلنا بہت دشوار کیونکہ یہاں ہر قدم پر قرآن پاک ختم کرنا پڑتا ہے۔“

اس شخص دل میں خیال کیا کہ حاکم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا واقعی یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر قدم پر قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں بلکہ یہ محاورہ فرمایا ہوگا۔ آپ نے اسی وقت فرمایا ”نہیں، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا وہی مطلب سمجھو ہم نے کہا۔ تم ان رموز کو کیا سمجھو“

وہ شخص حیران و پریشان ایک طرف چلا گیا اور کسی دوسرے بزرگ حاکم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ”یہ شخص ابھی جو کچھ کہہ رہا تھا کیا یہ درست ہے؟“

ان بزرگ نے جواب دیا ”یہ عید الدین حاکم سلطان التارکین ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا وہی مطلب سمجھو غلط فہمی ادا کیا گیا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں۔“

اس طرح وہ ایک عرصے تک اپنے پیرو مشد کا انتظار کرتے رہے اور آخر کار عمر کا ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد انہیں رکن الدین کی شرفِ مریدی حاصل ہوئی۔ ایک عمر رسیدہ شخص کا ایک نوجوان شخص کی پیری پر ایمان لے آنا معمولی بات نہیں ہے لیکن حاکم نے یہ ہی کیا۔ نوجوان شیخ رکن الدین شیخ حاکم کے پیر تھے اور عمر رسیدہ شیخ حاکم نوجوان شیخ رکن الدین کے مرید۔



ملتان کے کئی بے کفار کا لشکر اس غرض سے اکٹھا ہوا کہ وہ مسلمانوں کو لوٹے مارتے۔ لیکن۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے پہلے ہی حضرت حاکم نے اپنی چھانل دریا میں ڈال کر نکال لی۔ آہستہ آہستہ پانی کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دریا خشک ہو گیا کفار کا جوش کہ دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، دریا کے خشک ہو جانے سے پیاس سے تڑپنے لگا۔ اسی عالم میں ملتان والوں نے ان پر حملہ کر دیا اور چشمِ زدن میں انہیں شکست دے دی۔ لیکن ان مسلمانوں کو بھی پانی کی سخت دقت اٹھانی پڑی۔ وہ اصل واقعے سے لاعلم تھے اس لاعلمی کے ساتھ وہ کسی اور بزرگ کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے شکایات اور شکایات پیش کیں۔ انہوں نے بھی سکوت اختیار کیا۔ ان سب نے تنگ آ کر لوگوں سے کہا ”ہم پیری مریدی کے لئے اتنے دعوے دار تو نہیں لیکن اتنی سی بات ہمیں بھی معلوم ہے کہ تم سب بیمار کرنا ملتان کے پاس چلے جاؤ اور اپنی مشکل ان کے روبرو بیان کرو۔ مسئلہ ابھی اسی وقت حل ہوا جاتا ہے۔“

چنانچہ ان لوگوں نے یہ مسئلہ بابا زکریا ملتانی کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے کچھ دیر
 مسوت اختیار کیا پھر فرمایا: ”ذرا بابا حمید الدین حاکم کو یہاں آنے کی زحمت تو دینا۔“
 لوگوں نے عموماً یہی دیر بعد حاکم کو دادا پیر کے رو برو کھڑا کر دیا۔ اپنے حاکم سے کہا۔
 ”کیوں جھٹی حاکم! یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا تم اس پر خوش ہو کہ دیا کا سارا پانی اپنے کوزے میں بھر لیا
 بابا حاکم! ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟“
 حاکم نے نرمی سے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ پانی تو جسے ہم کفار پر بند کیا تھا“
 بابا زکریا نے کہا۔ ”لیکن وہ تو کب کے چل چکے ہیں اب تو اپنے بھائی مسلمان بھائی بھی یہاں
 سے تڑپ رہے ہیں اور اس کے ذمے دار تم ہو صرف تم!“
 حاکم نے فرماں برداری سے کہا۔ ”جیسا حاکم ہو اس کی تعمیل کی جائے گی“
 بابا زکریا نے فرمایا۔ ”کوزے کا پانی دریا میں الٹ دو، بس ہم یہی چاہتے ہیں“
 ”دوبہتر ہے“ حاکم نے اسی وقت کوزے کا پانی خشک دریا میں ڈال دیا اور اسی وقت
 سے دریا جاری ہو گیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا وصال فرمائے بابا زکریا کے صاحبزادے شیخ علم الدین سجادہ
 نشینی کے امیدوار بن کر سلطان غیاث الدین کی خدمت میں پہنچ گئے ان کا خیال تھا کہ اس معاملے
 میں ان کے بھتیجے رکن الدین اڑے آئیں گے اور انہیں اسی طرح اپنی راہ سے مٹایا جاسکتا تھا کہ
 بادشاہ خود انہیں سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد کرے۔ جب یہ دہلی پہنچے تو ان سے دو
 ایک ایسے کرستے سرزد ہوئے کہ بادشاہ ان کے مرتبے کا قائل ہو گیا۔ شیخ علم الدین نے بادشاہ
 سے عرض کیا یہ جناب والا! میں بادشاہ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ بادشاہ مجھے
 بابا زکریا ملتانی جگہ سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد فرمادیں، میں بابا زکریا کا بیٹا اور پڑھا لکھا
 شخص ہوں۔ جبکہ رکن الدین میرے بھتیجے اور بابا زکریا کے پوتے ہیں اور پھر بے پڑھے لکھے
 بھی ہیں لوگوں کا رجحان ان کی طرف سے اور اس رجحان کے خلاف اور میرے حق میں بادشاہ سلطنت
 جو فیصلہ بھی صادر فرمائیں گے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے“

بادشاہ نے اسی وقت حکم صادر کر دیا کہ شیخ رکن الدین کو بھی بادشاہ کے رو برو حاضر
 کیا جائے حکم کی تعمیل ہوئی اور شیخ رکن الدین، اپنے خدائیدہ عمر رسیدہ مرید حاکم کو لے کر دہلی
 روانہ ہو گئے راستے میں ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ ایک طویل کھڑی ہوئی دیوار ہے۔ ایک ایسی دیوار جو

انہیں تو نظر آرہی تھی لیکن اسے عام انسان نہیں دیکھ سکتے تھے۔

شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا: ”بابا حاکم! اس دیوار کو دیکھ رہے ہو؟“

حاکم نے جواب دیا: ”جی پیر و مرشد!“

شیخ رکن الدین نے کہا: ”یہ دیوار سلسلہ جتہ اور سہروردیہ کے درمیان حائل ہے۔“

حاکم نے عصا باندھ کر دیوار پر رسید کیا ”آخر یہ حد بند کی کیوں؟ اسے گر جانا چاہیئے۔“

وہ دیوار ایک ہی ضرب میں غائب ہو گئی۔

جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے پہنچے تو علم الدین نے اپنی قابلیت کے اظہار کے

طور پر سوال کیا۔ بادشاہ سلامت شیخ رکن الدین سے معلوم فرمائیں کہ وضو میں ہاتھ دھونا، کلی کرنا

اور ناک میں پانی ڈالنا سنت ہے اور مذہبنا فرض۔ لیکن فرض پر سنتوں کو کیوں مقدم کیا گیا؟

شیخ رکن الدین کی طرف سے حاکم نے جواب دیا: ”سنتوں کی تقدیم رنگ و ذائقہ معلوم

کرنے کی غرض سے ہے۔ ہاتھ دھونے سے پانی کا رنگ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح کلی کرنے سے اس

کے ذائقے کی اچھائی برائی معلوم ہو جاتی ہے اور جب پانی ناک میں ڈالا جاتا ہے تو ناک میں

بتاتی ہے کہ پانی بدبودار نہیں یا نہیں۔ جب تین جگہوں سے پانی کی طہارت کی گواہی مل جاتی ہے

تب ہم پر فرض کی ادائیگی واجب آ جاتی ہے یعنی مذہبنا اور فرض پر سنتوں کو اسی لئے مقدم

کیا گیا ہے۔“

شیخ علم الدین نے بادشاہ سے کہا: ”حضور والا! جواب حاکم نے دیا ہے جو ایک

پڑے لکھے انسان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سوالوں کے جواب شیخ رکن الدین مرحمت فرمائیں۔“

شیخ رکن الدین کو غصہ آگیا۔ فرمایا: ”ابھی بات ہے۔“ اسی وقت کسی کو حکم دیا

”رجاؤ بازار سے ایک جاہل غلام خرید لاؤ۔ ہماری طرف سے چچا علم الدین سے وہ سوال جواب کریگا۔“

بادشاہ کی ایما پر بازار سے ایک غلام خرید کر لایا گیا۔

شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا: ”بابا حاکم! تم اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ٹپکا دو۔“

پیر کے حکم کی فوری تعمیل عمل میں آئی۔ شیخ رکن نے بادشاہ سے کہا: ”اب یہ شخص چچا

علم الدین سے کسی بھی موضوع پر بحث و مباحثہ کر سکتا ہے۔“

بحث مباحثے کا آغاز ہوا۔ پتہ چلا کہ نو خرید جاہل غلام علم الدین پر کڑی گنا زیادہ ذوقیت

رکھتا ہے جب بحث و مباحثے کا فیصلہ نو خرید غلام کے حق میں ہو گیا تو رکن الدین نے وہیں یہ اعلان کر دیا

کہ میں اپنے دادا کی سجادہ نشینی پرگز نہیں چاہتا اس کے لئے چچا علم الدین ہی مناسب ہیں۔
بادشاہ نے علم الدین کو بابا زکریا کی جگہ سجادہ نشین نامزد کر دیا۔
جب شیخ علم الدین ملتان روانہ ہوئے تو رکن الدین نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے
کہا: ”اول تو یہ ہے کہ خانقاہ میں کبھی بھی کسی کو درس نہ دینا دوم یہ ہے کہ روضے میں جو کچھ تر
رہا ہے ہیں انہیں وہاں سے نکالنا مت“

علم الدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ رکن الدین نے پھر کہا: ”جو فقیر مسجد یا حجرے میں
اذکار و اشغال رکھتے ہوں انہیں سنانا مت!“

علم الدین نے نہ تو کوئی وعدہ کیا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ بلکہ اس کے بعد انہوں نے
ہر وہ حرکت کی جس سے رکن الدین کو تکلیف پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے خانقاہ میں درس کا سلسلہ
جاری کیا۔ کبوتروں کو روضے سے نکال باہر کیا اور ان فقر کو مستانا شروع کیا جو وہیں کہیں گوشہ نشین
تھے۔ انہی میں حاکم کے علاقائی بھائی شیخ خاتم بھی تھے جن پر سکرومستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔
علم الدین نے ان کے خلاف سخت محاسبہ کیا انہیں نمازوں میں شریک ہونے سے روک دیا اور کہا: ”نماز
سکرومستی میں کہاں جائز ہے؟ اس لئے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آئندہ آپ احتیاط رکھیں“
اس پابندی پر سبھی نے جو کچھ کہا سنا وہ تو ایک الگ بات تھی لیکن اس معاملے میں بطور خاص
حاکم کے علاقائی بھائی خاتم نے جو شرم میں کہا: ”اے منترہ سوزندگان عشق راجا اے سوزی“ (اوجھلے ہوئے!)
عشق کے جلے ہوئے کو کیوں جلاتا ہے؟
ادھر زبان سے یہ جملہ نکلا اور ادھر علم الدین کو سوزش نے پناہ شروع کیا اور ساتویں دن
جان بحق ہو گئے۔

حکومت کو ٹھوکر مار دینا کسی اختیار کرنے والا یہ شخص ایک سو ستر ٹھہ سال زندہ رہا
بڑی بڑی کرامتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ لوگوں کی مشکلات حل ہوئیں آپ کو سلطان التاکیں کا خطاب
عطا ہوا۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس پر خوار و کامیاب ہوا۔

یہ سترہ ماہ کا ذکر ہے ملتان میں کسی بزرگ نے فخر بلند کیا: ”لوگوں! ہوشیار! اس کی ایک
سمت غرق ہونے کو ہے۔ تو کو خبردار! یہاں کی ایک طرف غرق ہونے والی ہے“

لوگ بدحواس اور پریشان آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہا: ”حضرت یہ کیسی آواز بلند ہوئی
ہے۔ کیا واقعی یہاں کا کوئی بڑا حادثہ غرق ہونے والا ہے اگر ایسا ہے تو ہم لوگ بچ کر نکلنے کی فکر کریں۔“

آپ نے متبسم ہو کر ارشاد فرمایا یہ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، ہاں ان دونوں کوئی صاحب
رحلت ضرور فرمائیں گے۔

اور ایک ہفتے بعد ۱۲ ربیع الاول کو خود حضرت حاکم وفات پالئے آپ کی وفات
مکان میں ہوئی۔ لیکن تجہیز و تکفین ہوئی ہوئی جو ضلع رحیم یار خاں کے ریو سے
اسٹیشن ترنڈہ سے جانب شمال چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حاکم نے بہت سوں کو مسلمان کیا اور بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کیں۔ آپ شاعر
بھی تھے اور حاکم تخلص کرتے تھے۔ فقہ میں بخارا صرف میں بیچ گنج، تفسیر میں نیام اور نظم میں گلزار
آپ کی مشہور کتابیں ہیں،

حمید الدین حاکم کے سوانح حیات میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے
شاہی جلال اور فقیہی جمال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”والفقر فخری“ حمید الدین
حاکم نے اس قول کی صداقت اپنے اعمال سے ثابت کر دی۔ حکومت کو بے نیازی سے
ٹھکرا کر فقر کا خرقہ پہن لینا ہی ”والفقر فخری“ کی ایک دلکش اور حسین تفسیر ہے۔



حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ

حضرت محبوبؒ الہی نے یک سوئی اور توجہ الہی کی خاطر جس خانقاہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی وہ دہلی میں کیلوکھڑی نامی جگہ پر واقع تھی آپ خانقاہ کی بالائی منزل میں قیام فرماتے تھے آپ کے مرید خانقاہ کے نچلے حصے میں موجو رہتے اور اپنے مرشد کی کچھ اس طرح عزت و تکریم کرتے کہ کوئی زبردست غلام اپنے آما کی عزت اور خدمت کرتا ہوگا۔ صبح ہو چکی تھی اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ مرغ بانگ دیکر کب کے خاموش ہو چکے تھے مندروں کی گھنٹیاں اور گھنٹوں کی آوازیں ہو ا کے دوش پر دور دوراڑی بھر رہی تھیں۔ مؤذن اذان دے چکے تھے اور تسلیم و رضا کے پیغمبر خدا کی بارگاہ میں دست بستہ کھڑے اپنے عجز و بے بسی اور نیاز مندی کا مؤدبانہ اظہار کر رہے تھے تھوڑی دیر پہلے جب مؤذن نے ”نماز نیند سے بہتر ہے“ کا پرودہ اعلان کیا تھا تو اس صدا نے بارگاہ ایزدی کے نیاز مندوں کے دلوں کو گرما دیا تھا اور اب یہی گرمی مسجدوں کی صفوں میں ارکان نماز کی ادائیگی کی صورت میں جلوہ نما تھی جس میں لوگوں کا یقین اور اعتماد سیال ماٹے کی طرح ادھر ادھر متحرک اور سرگرم عمل تھا۔

نماز سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد حضرت محبوبؒ الہی خانقاہ کی بالائی منزل میں اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا دریا کے کنارے غسل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا نہانے والوں نے پائے پڑے ساحل پر ہی چھوڑے اور خود پانی میں آکر گئے انہوں نے ہاتھ دلوں میں حضرت محبوبؒ الہی کے وہ معزز مہمان بھی تھے جو ملتان سے تشریف لائے تھے۔ جو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے قربت دار کی کاشفہ لکھتے۔ یہ حضرات ہاتھ باتے نہتوں کو انگلیوں سے داب کر ڈیجی لگاتے اور جب دوبارہ ابھرتے تو سر کو جھکے دیکر نتھنہ کھول دیتے اور جلدی جلدی سانسیں لینے لگتے۔ اسی عالم میں ایک درویش جو پانی کی سطح پر ابھرا اور آنکھیں کھول کر سامنے پرکھے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو یہ چار ایک اچھٹاں

کا لباس لئے بھگا جا رہا ہے۔ درویش نے پانی کے اندر ہی شور و غل مچانا شروع کر دیا
 ”لوگو! دوڑنا، پھوڑنا، کبکھوت میرے کپڑے لئے جا رہا ہے“

لوگ دوڑے لیکن شاطر اٹھائی گیر کپڑے لے کر معلوم نہیں کہاں نودو گیا رہ چکا
 تھا درویش نے ساحل پر پہنچ کر ہٹے واویلا شروع کر دی اور زور زور سے اٹھائی گیر کے کو
 براجبلا کہنے لگا در اسی دیر میں وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ان
 کی چرمیگوٹیاں اور قیاس آرائیاں بہت ساری شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونجنے
 لگیں جس سے حضرت محبوب الہی کے ذکر و فکریں خال واقع ہونے لگا خائفانہ کے ایک مرید
 خاص نصیر الدین سے یہ ہنگامی حالت دیکھی نہ گئی۔ شور غل سن کر یہ خائفانہ سے باہر نکلے
 اور ہجوم میں داخل ہو کر دریافت کیا کیا بات ہے یہ شور غل کیسا مچا رکھا ہے؟
 درویش آگے بڑھا اور ناگواری کی شکینیں ڈالتا ہوا بولا۔ ”حضرت! یہاں کے لوگ
 کیسے ہیں کہ غل کے دوران لوگوں کے لباس لے بھاگتے ہیں، ایک اٹھائی گیر امیر لباس لے
 بھاگا۔“

درویش ہلکے ہوئے تہد میں برہنہ کفرا ہجوم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تہد کا پانی
 ٹپک ٹپک کر اس کے قدموں میں جمع ہو رہا تھا اور زمین کی خشک اور پیاسی مٹی اسے نکلنے کی کوشش
 کر رہی تھی۔

نصیر الدین نے کہا۔ ”بھائی! تمہارے شور غل سے حضرت پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل
 واقع ہو رہا ہے تم ذرا توقف کرو۔“

درویش نے بے زاری سے پوچھا۔ ”کیا ذرا سے توقف سے میرے کپڑے واپس
 مل جائیں گے؟“

نصیر الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تم کپڑوں کی فکر نہ کرو، تمہیں کپڑے بھی مل
 جائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ اپنے شور غل سے باز آ جاؤ۔“

درویش چپ ہو گیا۔ نصیر الدین نے ذرا ٹھہرو، ”کہتے ہوئے خائفانہ میں واپس چلے
 گئے اور جب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو اس حیلے میں کہ جسم پر ایک تہد کے سوا کپڑے کا
 ایک تار بھی نہ تھا ان کا اپنا لباس ان کے ہاتھوں میں تھا۔ پھٹا پرانا تہد باندھ کر مضبوط اور
 کمر سے لپٹا ہوا تہد گتے کے ساتھ ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اپنا لباس درویش کے حوالے
 کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس لباس کو پہن لو۔“

درویش نے حیرت سے پوچھا : ”آپ اپنا لباس کیوں مے مے ہے ہیں ؟“
 آپ نے جواب دیا : ”اس لئے کہ تمہارے نقصان کی تلافی ہو جائے اور تم
 سے باز آ جاؤ ، تمہارے شور و غل سے یہ و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل پڑ رہا ہے ،“
 درویش کچھ دیر لیٹنے نہ لیٹے کہ تذبذب کا شکار رہا لیکن جب نصیر الدین نے ذرا
 زور دیکر کہا : ”اے بھائی ، سوچتے کیا ہو ، تم تمہارے مہمان ہو ، ملتان جا کر یہی کہو گے ، نا کہ کیلو ہرن
 میں اٹھائی گیرہ بستے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ کیلو کھڑی میں حضرت
 نظام المشائخ اور ان کے نیاز مند بھی بستے ہیں جو اٹھائی گیروں سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی
 کرتے ہیں ،“

درویش نے کپڑے لے لیٹے اور نصیر الدین خانقاہ میں واپس چلے گئے ۔ مجمع
 نصیر الدین کے روئے پر تحسین آمیز تبصرے کرنے لگا ۔
 دریا کے کنارے کیا ہو رہا تھا اور یہ منہ بگاڑ کس طرح ختم ہوا ، خانقاہ کے لوگ بھی پوری
 طرح باخبر نہ ہو سکے جب نصیر الدین خانقاہ میں واپس پہنچے تو بعض پیر بھائیوں نے اس
 عجیب چلنے کی بابت سوالات کرنے شروع کر دیے ۔ نصیر الدین اس کا چرچا نہیں کرنا چاہتے
 تھے کسی نہ کسی طرح چھپاتے رہے اور محبوب الہی نماز چاشت ادا فرما رہے تھے نماز سے فارغ
 ہوتے ہی آپ نے نصیر الدین کو طلب فرمایا ۔ نصیر الدین کو برہنہ حالت میں جلتے ہوئے شرم
 محسوس ہوئی ، لیکن مرشد کے حکم کو ٹال بھی نہ سکتے تھے وہ حالت گومگو میں مبتلا ، کسی قطعی
 فیصلے پر نہ پہنچے تھے کہ دوبارہ حکم آیا ”جس حالت میں ہو ، اسی میں چلے آؤ“

یہ بدلتا ہوا مجبوری ندامت اور خجالت کی تصویر بنے ہوئے شیخ کی بارگاہ میں پہنچے
 اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے ۔ نظام المشائخ نے سراٹھایا اور مکر کر پوچھا : ”نصیر الدین ! تم نے
 یہ جلیک کیا بنا رکھا ہے ؟“

جھوٹ بولنے کی ہمت نہ تھی اور سچ بولنے میں اس تعلیٰ اور غرور کا خدشہ تھا کہ
 نصیر الدین نے اپنے پیرو مرشد کے ذکر و فکر میں خلل انداز ہونے والے واقعے کو اپنے لباس کی قربانی
 دے کر دور کیا تھا ۔

نظام المشائخ نے ارشاد فرمایا : ”ہم تمہارے تامل سے آگاہ ہیں اور غرور ، تمہارے قریب
 تمہارے سعادت مند اور بلند مرتبہ مرید ہو ، یہ لو اور اپنی برہنہگی دور کرو“
 یہ کہتے ہوئے نظام المشائخ نے اپنا خاص لباس نصیر الدین کو مرحمت فرما دیا ۔ اس ۲۴۹

دائعہ اور عطیے نے نصیر الدین کا جو حال کر دیا وہ ناقابل بیان تھا حالت وجد اور سرخوشی میں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے پیر و مرشد نے انہیں پوری کائنات بخش دی ہے اور نصیر الدین جیسا خوش نصیب انسان روئے زمین پر تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ مل سکے گا۔

نصیر الدین حسنی سید اودھ کے رہنے والے تھے دادا انہیں باہر سے لاہور میں تشریف لائے اور یہیں نصیر الدین کے والد سید یحییٰ پیدا ہوئے پھر یہ لوگ اودھ چلے گئے اور یہیں نصیر الدین پیدا ہوئے ابھی نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ماں نے تعلیم و تربیت کا وہ حق ادا کیا کہ بہنوں کے باپ بھی اس طرح نہ ادا کر سکتے تھے بعد الحکیم شروانی نامی عالم بے بدل سے تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے انتقال کے بعد مولانا افتخار الدین گیلانی نامی فاضل اجل سے علوم ظاہری کی تکمیل کی ترک و تجربید اور نفس کشی کے آثار نو عمری ہی سے ہوید تھے ہمیشہ روزے سے رہتے اور نماز باجماعت میں کبھی فرق نہ آتا۔ پھر ریاضت و مجاہدے میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور کسی درویش کامل کے ساتھ سات سال اس طرح گزارے کہ سوتے جاگتے اور اٹھتے بیٹھتے اس کی پاک صحبت کا فیضان حاصل رہتا۔ جب یہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں داخل ہوئے تو دہلی تشریف لے گئے اور حضرت نظام المشائخ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر مستقلاً وہیں پہنچے لگے اور محبوب الہی کی مریدی اختیار کی اس مقدس چھاؤں میں نصیر الدین کو حسیا سکون ملا اس کا انہیں پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا یہ ان کی آخری منزل مراد تھی۔ ان کی بڑی بہن اب بھی اودھ ہی میں رہ رہی تھیں اور نصیر الدین کو جب بہن کی محبت ستاتی تو حضرت محبوب الہی سے اجازت لے کر اودھ تشریف لے جاتے اور کچھ عرصہ کر پھر واپس آ جاتے۔

بہن کے پاس قیام فرما ہونے کے دوران انہیں شدت سے یہ احساس بھی ہوتا کہ انہیں گھیرے رہتے ہیں جس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ ان کا بہت زیادہ وقت برباد ہو جاتا جس کا انہیں بڑا قلق ہوتا۔ وقت کی اس بربادی سے بچنے کا یہ طریقہ سوچا کہ وہ علی الصباح نماز فجر کے بعد کسی ویرانے میں نکل جایا کریں اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہیں۔ شاید وہ اس طریقہ پر فوراً ہی عمل درآمد بھی شروع کر دیتے لیکن اس کے لیڈ پیر و مرشد کی اجازت لینا بہت ضروری تھی۔ انہوں نے اودھ سے کیلوکٹری پہنچتے ہی حضرت محبوب الہی سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی، بدجہ مجبوراً امیر خسرو کا سہارا لیا۔ امیر خسرو کو شیخ کی خدمت اور مزاج میں بڑا سوخا حاصل تھا۔ نصیر الدین نے امیر خسرو سے کہا: ”حضرت!

اُپکی مناسب موقع پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں اس عاجز کی ایک درخواست کر کے منظور فرمادیں تو بڑا کرم ہو گا۔“

امیر خسرو نے پوچھا۔ ”کیسے لیکن ایسی نہ ہو جو حضرت پیر و مرشد کے مزاج پر گراں گزے۔“

نصیر الدین نے کہا۔ ”آپ حضرت سے فرمائیں کہ جب نصیر الدین اودھ میں اپنی بہن کے پاس جاتا ہے تو وہاں اس ناچیز کے گرد لوگوں کا مجمع لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی عبادت و ریاضت میں فوراً پیدا ہو جاتا ہے اور بہت سا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو جاتا ہے۔“

امیر خسرو نے جواب دیا۔ ”آپ بے فکر ہیں آپ کی درخواست کسی مناسب موقع پر پیش کر کے منظور کرادی جائے گی۔“

عشاء کی نماز کے بعد حضرت امیر خسرو حضرت محبوب الہی کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ ان کے پیروں کے گرد اپنے لگے آپ اس جامع کلمات شخص کی صورت دیکھ رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے کہ نصیر الدین کی درخواست کے لئے اس سے بہتر وقت شاید نہ مل سکے۔

حضرت محبوب الہی نے متنبہ فرمایا۔ ”خسرو! کیا سوچ رہے ہو؟“
خسرو نے جواب دیا۔ ”حضور! نصیر الدین نے ناچیز کے توسط سے ایک زبانی درخواست حضور والا کی خدمت میں بھیجی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کر دی جائے۔“
آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”کہو، بیان کرو۔“

خسرو نے عرض کیا۔ ”حضرت! نصیر الدین کہتے ہیں کہ جب میں اودھ میں ہوتا ہوں تو عقیدت مندوں کا ہجوم بڑی طرح عبادت و ریاضت میں غلغلہ مٹاتا ہے اور وقت برباد کرتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ان حالات میں نصیر الدین کسی دیر لسنے میں نکل جایا کرے اور وہاں عبادت و ریاضت کر لیا کرے۔“

حضرت محبوب الہی نے ذرا بے چلتی سے ایک پیر کھینچ لیا اور فرمایا۔ ”خسرو! تم نصیر الدین سے کہہ دو کہ اسے خلق کے درمیان ہی میں رہنا ہے اور ان کے جو رویے ظلم ٹھانے پڑیں گے خلق خدا اگر انہیں ستائے تو نصیر الدین کو اس کے جواب میں مسکرا پڑے گا، لوگوں کے جوہر ظلم کا جواب میرا ہی، خوش اخلاقی اور اچھے سلوک سے دینا پڑے گا۔“

پھر فرمایا : ”ذرا نصیر الدین کو بلانا تو“

خسر نے نصیر الدین کو مطلع کیا کہ آپ کی درخواست حضرت کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے وہ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔

نصیر الدین نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا : حضرت کا رویہ کیسا ہے ؟ انہیں میری درخواست مانگا تو نہیں گزری ؟ ان کی مزاج میں برہمی کے آثار تو نہیں ؟

خسر نے جواب دیا : حضرت فرماتے تھے کہ آپ کو خلق خدا کے درمیان ہی رہنا ہوگا ان کے جوہ و ظلم سہنے ہی پڑیں گے اور خلق خدا کی زیادتیوں کا جواب مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے دینا ہی پڑے گا۔

نصیر الدین ڈرے سہے حضرت محبوب الہی کی خدمت میں پہنچ گئے اور پیروں کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

آپ نے نصیر الدین کو دیکھتے ہوئے فرمایا : نصیر الدین ! یہ تجھے کیا سوچھی ہے کہ ویلے کا خیال اپنے دل میں لایا ہے آخر جنگل میں بسنے سے تیرا مقصد کیا ہے ؟

نصیر الدین نے جواب دیا : اس سے اس ناجیز کا مقصد دنیا اور ملاقا دنیا سے برأت اور بے زاری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ترک دنیا اور ترک لذت اس عاجز کا مقصد اور حضور والہی مرضی اور خواہش کے مطابق، گزیران حیات مقصد اولیٰ ہے۔

آپ نے دریافت فرمایا : نصیر الدین ! تیرا باپ کیا کام کرتا تھا ؟

نصیر الدین نے جواب دیا : وہ روٹی کے سوداگر تھے۔

آپ نے کہا : خوب، لوگوں کو گرمی پہنچایا کرتے تھے اور توان سے بچنا چاہتا ہے ہم تجھے جنگل یا ویرانے میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔ پھر فرمایا : ”بالا نصیر الدین !

جب ہم اپنے پیروں پر مشد بابا فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہاں ہمارا ایک دوست بھی پہنچ گیا۔ یہ دنیا دار دوست ہیں پھلے پرانے لباس میں دیکھ کر کہنے لگا : ”نظام

الدین ! تم نے یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے ؟ اگر تم میری مریدی کی جگہ معلیٰ کا پیشہ اختیار کرتے تو نہایت آسودگی اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہوتے۔“ ہم نے دوست کی اس دل آزار بات کا کوئی

جواب نہ دیا اور تلخ دوا کی طرح حلق کے نیچے آوار گئے اس گفتگو کے بعد جب ہم حضرت بابا کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے میری صورت دیکھتے ہی دریافت فرمایا : ”نظام الدین ! ایک بات تو بتا“

ہم نے کوئی جواب نہ دیا تو بابا نے ارشاد فرمایا: ”نظام الدین اگر تیرا کوئی دوست یہ کہے کہ تو نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، اگر تو معلمی کا پیشہ بھی اختیار کرتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا اور تجھے خوش حالی اور آسودگی میسر ہوتی تو تو کی جواب دیتا؟“

ہم بابا کے کشف پر حیران رہ گئے اور کہا: ”جو حکم عالی ہو عرض کر دیا جائے۔“
بابا نے فرمایا:۔

نہ ہمسری تو مر غولیش گیر دیرو تر اسعادت باد امر انگون راری
(اپنے ساتھ میری برابری کا خیال بھی دل میں نہ لا۔ جاتے تھے تیری خوش حالی مبارک ہو، میرے لئے میری عاجزی کافی ہے)

اس کے بعد بابا نے فرمایا: ”کھانے کا خوان لا، میں کھانے کا خوان لے آیا بابا نے فرمایا: ”اسے اپنے سر پر رکھ اور تیرے جس دوست نے تیری تباہ حالی پر اظہارِ افسوس کیا تھا اس کے پاس لے جا اور اسے بتلا کہ خوش حالی اور آسودگی ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے فقراء کو محروم رکھا گیا ہو بلکہ ہم خود ہی ان سے حذر کرتے ہیں“ میں نے بابا کے حکم کی تعمیل کی اور کھانوں کا خوان سر پر رکھ کر دوست کے پاس پہنچ گیا۔ دوست نے خوان پر پیش ہٹا کر لذیذ اور مرغین کھانوں کو جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں نے بابا کے ارشادات دھرا دیے وہ شرمسار ہو کر بولا ”مبارک باد دوست! میں یہ سب نہیں جانتا تھا۔“

نصیر الدین پیر و مرشد کی باتیں نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ اور اپنی درخواست عزت نشینی اور ویرانہ پسندی پر نادم ہو رہے تھے حضرت محبوب الہی نے انہیں خجالت اور شرمساری سے بچانے کے لئے حکم دیا: ”جاؤ اور ہماری باتوں کو ذہن نشین رکھو!“

نصیر الدین: ”بچے خانقاہ میں واپس آگئے۔“



کسی پیر بھائی کے ہاں محفل سماع منعقد ہوئی، قوالوں کی چوکی سازوں کے ساتھ براجمان تھی۔ اس تقریب میں نصیر الدین بھی موجود تھے قوالی کے شروع ہونے سے پہلے ہی یہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیر بھائی نے حیرت سے پوچھا: ”کہاں چلے نصیر الدین؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں تو الٰہی محفل میں نہیں بیٹھ سکتا۔“

پیر بھائی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اسلام موسیقی کے حوتیں نہیں ہے۔“

پیر بھائی نے ذرا بد مزگی سے کہا۔ ”کہاں کی بات کرتے ہو نصیر الدین! سماع سے منکر ہو کر اپنے پیر کے مشرب سے پھر جلانے کے مترسک ہوئے ہے کیا تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کوئی جت نہیں ہے دلیل تو کتاب اور حدیث سے ملنا چاہیئے جو ظاہر ہے تم نہیں پیش کر سکتے۔“

نصیر الدین وہاں سے چلے گئے کسی مرید نے حضرت نظام المصالحؒ سے ان کے اس رویے کی شکایت کر دی کہا۔ ”حضرت نصیر الدین آپ کے مشرب سے گریزاں ہیں۔“

محبوب الہی نے جواب دیا۔ ”نصیر الدین کو کچھ بھی نہ کہو ان کا تقویٰ تم سب سے بڑھا ہوا ہے۔“
حضرت محبوب الہیؒ نے آپ کو اپنے بعد نہ صرف خلافت سے سرفراز فرمایا بلکہ محمود گنج شرف اور چراغ دہلی جیسے اعلا وارفع القاب سے بھی نوازا۔

ایک دن جب آپ اپنے پیہننے کے لئے اپنا لباس طلب فرمایا تو پتہ چلا کہ وہ چوڑی ہو چکا ہے لوگوں نے کہا۔ ”حضرت آپ مستجاب الدعوات ہیں چور کے حق میں بدعا فرمائیں تاکہ کیفر کردار کو پہنچے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے پیر و مرشد کے ارشاد گرامی کے خلاف کس طرح زبان کھول سکتا ہوں۔“

ایک مرید نے کہا۔ ”حضرت بابا نظام الدینؒ کو وصال فرمائے کچھ عرصہ گزر چکا ہے انہوں نے اس چوڑی کی بابت کیا اور کب ارشاد فرمایا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”حضرت نے مجھ سے فرمایا تھا کہ لوگ تجھ پر جو رد ظلم کریں گے تو اُسے بے چون و چرا برداشت کرے گا لوگ تجھے ستائیں گے تو ان کے ساتھ سلوک ادمہر بانی سے پیش لے گا۔“

مرید خاموش ہو رہا اور آپ چور کے حق میں دعائے خیر فرماتے رہے۔

تراب نامی ایک مددیش مدتوں سے آپ کے خلاف عناد رکھتا تھا اور موقع کی تلاش میں

تھا۔ آپ بھی اس کے ارادوں سے آگاہ تھے لیکن کبھی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں اور نہ ہی کسی اور پر اس خطرے کا اظہار کیا ایک دن آپ مراقبے میں اٹکھیں بند کیے بیٹھے تھے حجرے میں آپ کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ باہر مرید بھی ذکر و اشغال میں گم مضم بیٹھے تھے تراب نے سوچا اس سے بہتر موقع شاید کبھی اور نہ ملے، چھرے کو تہ میں اڑسا اور کرتے کو اوپر ڈال کر حجرے میں داخل ہو گیا اپنے تراب کی آمد پر کوئی توجہ نہ دی۔ تراب نے پھرتی سے پھرانکا لالا اور پے درپے گیارہ وار کینے اور اس یقین کے بعد کہ کام تمام ہو چکا ہے پھرا حجرے میں پھینک کر بھاگ نکلا لیکن خون کے فوارے اس کے تہ اور کرتے کو داغ دار کر چکے تھے اور وہ بدحواس بھی بہت زیادہ تھا جب حجرے سے باہر نکلا تو مریدوں نے اس بڑے حال میں دیکھ لیا اور کئی مرید تراب پر حملہ آور ہوئے انہوں نے تراب کو گر کر بے قابو کر دیا اور اس سے پوچھا: ”تیرے لباس پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں؟“

تراب اس کا کوئی معقول جواب دے سکا ایک مرید حجرے میں داخل ہوا اور وہاں اپنے پیروں کو زخموں سے چور کر رہے ہوئے دیکھا تو اس کے حواس ہی جاتے رہے اس نے شور مچا کے دوسرے مریدوں کو بھی بلالیا اور فوراً طبیب اور جرح لائے گئے خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ معالجین نے زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن اس دوران آپ ہوش میں آگئے اور شدید کرب اور اذیت کے باوجود متبسم ہو کر فرمایا: ”تراب کہاں ہے؟“

اشکبار مرید نے جواب دیا: ”حضرت! اسے باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔“

آپ نے نگواری سے حکم دیا: ”اسے ہمارے پاس لاؤ۔“

آپ کے معالج حکیم صدر الدین نے کہا: ”حضرت آپ بات چیت سے اجتناب فرمائیں، زخم مہلک ہیں۔“

آپ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا: ”ابھی میرا وقت نہیں آیا۔“

حاضرین حیران تھے اور دل میں سوچتے تھے کیا اب بھی زندگی کے آثار موجود ہو سکتے

ہیں پھر بھی یہی کہا: ”حضور! آپ سکوت اور آرام فرمائیے۔“

آپ نے پھر حکم دیا: ”تراب کو ہمارے پاس لاؤ۔“

لوگوں نے کہا: ”آپ صحت مند ہو لیں، اسے فرار نہیں ہونے دیا جائے گا آپ تشویش نہ

فرمائیں۔“

لیکن اس بار آپ نے ذرا ترش لہجے میں فرمایا ”اسے ہلے پاس لاؤ، وہ ہمارا مجرم ہے اسے ہم خود سزا دیں گے“

لوگوں نے تعمیل ارشاد میں تراب کو آپ کے رُوبرُو پیش کر دیا بیسیوں مریدوں کے درمیان قاتل اپنے زخمی کے رُوبرُو کھڑا کھڑا تھرتھرا کر رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا ”تو نے اپنے چھڑے سے کتنے وار کئے تھے بھلا؟“

تراب شرم و ندامت اور خوف کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکا آپ نے پھر سوال کیا ”بتانا کیوں نہیں؟ کتنے وار کئے تھے تو نے؟“

قاتل نے آہستہ سے جواب دیا ”گیارہ!“ اور گردن جھکالی۔

آپ نے پھر سوال کیا ”آہستہ آہستہ یا زور زور سے؟“

اس عجیب سوال پر لوگ ان کی صورت دیکھنے لگے قاتل کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

آپ نے پھر سوال کیا ”تو نے یہ وار پوری قوت سے کیے تھے یا یوں ہی معمولی قوت سے؟“

شرسارہ اور خوف زدہ قاتل نے جواب دیا ”پوری قوت سے“

آپ نے کہا ”تیرے ہاتھ کو ان حملوں سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟“

قاتل سمجھا، نصیر الدینؒ شاید اپنے ہوش میں نہیں ہیں تبھی تو ایسے مہمل سوال کر رہے

ہیں لیکن اسی لمحے نصیر الدینؒ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا ”دیکھ اندر حجرے میں جا، وہاں

کچھ اشرفیاں رکھی ہیں اور وہیں ایک قیمتی لباس بھی رکھا ہے جو آج ہی ایک امیر نے ہمیں بھیجا

تھا، انھیں یہاں ہمارے پاس لے آ“

مرید بے چون و چرا یہ دونوں چیزیں حجرے سے لے کر واپس آیا۔ آپ نے یہ

دونوں چیزیں اپنے قاتل کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا ”سر دست اس فقیر کے پاس ان کے

سوا کچھ بھی نہیں۔ تو انہیں قبول کر اور جہاں جانا چاہتا ہے چلا جا، پھر کبھی آئیو، جو کچھ ہمارے

پاس ہو گا حاضر کر دیں گے“

مریدوں نے عرض کیا ”حضور! یہ کیا غضب فرماتے ہیں یہ شخص تو آپ کا قاتل ہے

سزا دینے کے بجائے آپ اسے اشرفیوں اور لباس سے نواز رہے ہیں یہ کیوں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مشیتِ ایزدی میں دم مارنے کا حکم نہیں خاموش رہو“

حکیم صدر الدینؒ نے کہا ”حضرت! اس انوکھے حکم میں مشیتِ ایزدی کا کیوں ذکر فرما

ہے ہیں؟

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں ہے پیر حضرت نظام الملکؒ نے بہت پہلے ہی یہ حکم دے دیا تھا کہ نصیر الدین! لوگ تجھ پر ظلم و جور کریں گے لیکن تو ان سے مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے گا لوگ تجھے ستائیں گے تو انہیں معاف کر کے نوازے گا اس وقت بھی حضرت محبوب الہیؒ کی نظریں میرے چہرے پر گر رہی ہوئی اپنے ارشاد کی تعمیل کا تقاضا کر رہی ہیں۔“

آپ نے قائل کو شرفیاں اور لباس عطا فرما کر معاف کر دیا اور اسی وقت رخصت فرما دیا۔ قائل حیران و پریشان، شرمسار اور نادم ہو کر ایسا گیا کہ کبھی معافی مانگنے بھی حاضر نہ ہوا۔



سلطان محمد تغلق کے دو با اثر امیر عمر سمرقندی اور علی قندھاری معلوم نہیں کیوں آپ سے بے صلہ تھے اور ہر وقت سلطان کے کان بھرتے بھرتے تھے ایک دن بادشاہ نے آپ کو دعوت کے بہانے طلب کیا۔ جب آپ بادشاہ کے دربار پہنچے تو دیکھا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا لگا ہوا ہے۔ سلطان کا مقصد یہ تھا کہ اگر نصیر الدین سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا نوش فرمائیں گے تو بادشاہ انہیں حید شرعی سے سزا دینے میں حق بجانب قرار پائے گا اور اگر انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو بادشاہ انہیں توہین سلطانی کے جرم میں قید کر دے گا۔ آپ بادشاہ کے منشا سے خبردار ہو چکے تھے آپ نے چٹکی میں ذرا سا کھانا لے کر زبان پر لکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بادشاہ اس تدبیر اور ذہانت پر دل ہی دل میں عجب عجب کر اٹھا۔ عمر سمرقندی اور علی قندھاری شرمندہ ہو گئے۔ بادشاہ نے اذراہ مراسم خروانہ دو توڑے ذر سُرُخ اور دو تھان آپ کی خدمت میں پیش کئے آپ نے ان پر کوئی توجہ نہ دی اور واپسی کی نیت سے چل پڑے۔ سلطان محمد تغلق کا وزیر نظام الدین یہ ساری کاروائی نہایت غصے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا وہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کا مرید، نصیر الدینؒ کا عقیدت مند اور بادشاہ کا عزیز بھی تھا۔ نصیر الدینؒ کو واپس جاتے دیکھ کر اُسکے بڑھا، زر سُرُخ کے توڑے اور دونوں تھان اٹھا کر خدام کے حوالے کیے اور آپ کی جوتیوں کو اپنے رومال سے جھاڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے کر دو قدم پیچھے ساتھ ساتھ چلا، بادشاہ یہ ساری کاروائی بہ نظر حقارت دیکھ رہا تھا اور اپنے وزیر پر ۲۷۷

سمت برہم تھا لیکن خاموش تھا۔ وزیر نے نصیر الدین کو دروازے تک پہنچا کر رخصت چاہی آپ نے دے دی یہ جیسے ہی بادشاہ کے پاس پہنچا، سلطان نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”تو نے اجازت کے بغیر عطیہ سلطانی کو ہاتھ کیوں لگائے؟“ وزیر نے کوئی جواب دیا اور نفرت اور غصے سے پیشانی پر بل پڑ گئے۔

بادشاہ نے ذرا اونچی آواز میں پھر سوال کیا۔ ”تو ہماری مملکت کا وزیر ہے تو نے ایک معمولی فقیر کی جوتیاں اپنے رد مال سے کیوں جھاڑیں اور کفش برداری کی خدمت کیوں بجالایا؟“

وزیر نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن غصے اور نفرت کی سلوٹیں کچھ زیادہ گہری ہو گئیں۔ سلطان اور زیادہ برہم ہو گیا، چیخ کر بولا۔ ”تو ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر نصیر الدین کو دروازے تک چھوڑنے کیوں گیا؟“

وزیر کے لیے اب مزید خاموش رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت دلیری سے جواب دیا۔ ”حضور والا! صاف کوئی اور راست بیان کی گستاخی معاف، اس ملک کے سلطان آپ نہیں، نصیر الدین ہیں، وہ جسے چاہیں سلطان بنا دیں، یہ ناچیز حضرت نظام الدینؒ اولیا کا غلام ہے اور میری یہ جان ناتوان ان پر قربان ہے نصیر الدین کی جوتیاں میرے لئے سرمایہ فخر و افتخار ہیں اور اگر میں انہیں تاج بنا کے اپنے سر پر رکھوں تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی۔“

بادشاہ کو اس جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا عملاً اظہار نہ ہوا۔

بادشاہ ٹھٹھہ کی دھم پیڑ وانہ ہوا تو لشکر کے ساتھ آپ بھی ہو لیے۔ شاہی لشکر میں آپ کی شمولیت ایک پراسرار عمل تھا۔ مستقبل کے دیر کچھ کھدے ہوئے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ٹھٹھہ میں کیا پیش آنے والا ہے۔

ٹھٹھہ پہنچ کر شاہی لشکر باغیوں کی سرکوبی ابھی کر بھی نہ سکا تھا کہ سلطان محمد تغلق کا بلاوا آگیا۔ وہ چل بسا بادشاہ کی بہن خداوند زادہ لشکر میں موجود تھی اس نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کا جانشین بنانا چاہا دہلی دور تھا اور وہاں وزارت عظمیٰ، تخت شاہی اور تاج قیصری کے لیے کسی اور شخص کا انتخاب کر چکی تھی۔ اس افراتفری اور منتشری میں حضرت نصیر الدین بادشاہ کے پختیا لیس سالہ چچا زاد بھائی کمال الدین کے پاس

”پہنچے۔ سفید رنگت، درمیاناً قدر اور مناسب ڈیل ڈول، نہ موٹے، نہ بے
 ناک اونچی اور چوڑے سینے والا یہ شخص فکر مند اور نگین اپنے خیمے میں منہ لپیٹے پڑا
 ہوا تھا۔ نصیر الدین اس کے خیمے میں داخل ہوئے اور آواز دی ”کمال الدین! اٹھو،
 میں ایک ضروری فیصلہ لے کر آیا ہوں اسے سنو اور مجھے بتاؤ کہ تم اس پر کتنے آمادہ ہو؟“
 کمال الدین فرط عقیدت سے کھڑا ہو گیا۔

اپنے کمال الدین سے کہا ”کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ مخلوق خدا کے ساتھ عدل
 و انصاف سے پیش آؤ گے؟“

کمال الدین اپنی ہاتھ کا مطلب نہ سمجھ سکا پوچھا ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“
 آپ نے جواب دیا ”اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بندگان خدا سے اچھا سلوک
 کرو گے تو میں بھی بارگاہِ خداوندی سے تمہاری بادشاہت کی دعا کروں اور اگر تم نفی میں جواب
 دو گے تو میں کسی دوسرے فرماں روا کو طلب کروں گا۔“

کمال الدین نے کہا ”میں حضور کا خادم ہوں جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کروں گا۔“
 آپ نے ارشاد فرمایا ”کمال الدین! میں تیرے لئے دہلی سے چل کر ٹھٹھے
 تک آیا ہوں اگر تو صدقِ دل سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تو خلقِ خدا کے ساتھ خلق و مروت سے
 پیش آئے گا تو میں بھی تیرے لئے خدا سے حکومت طلب کرتا ہوں۔“

اس کے بعد آپ نے کمال الدین کو انتالیس خرے پیش کیے اور ارشاد فرمایا
 ”در انتالیس سال حکومت اور تاج و تخت کی امانت انتالیس سال کے لئے تیرے سپرد
 کی گئی۔“

یہاں یہ فیصلہ کر دیا گیا دوسری طرف لشکر میں مرحوم بادشاہ کی جانشینی پر
 گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں اور بادشاہ کی بہن خداوند زادہ نے جملہ خواتین اور امرا کو
 یہ پیغام بھیجا کہ ”میرا بیٹا خسرو ملک لشکر میں موجود ہے اس کی موجودگی میں کسی اور کو
 فرماں روا بنانا جائز اور نامناسب ہے بادشاہ میرا حقیقی بھائی تھا۔“

خواتین اور امرا کو خداوند زادہ کی بات پر دھیان دینا پڑا لیکن وہ اس پر عمل
 پیرا نہیں ہونا چاہتے تھے ان کے دلوں میں خداوند زادہ کے خلاف گردِ سنگداری بٹھ گئی

انہوں نے اپنی جماعت میں سے ملک سیف الدین نامی ایک منہ پھٹ اور گستاخ امیر کو

خداوند زادہ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس سے کہا کہ تم ہر قیمت پر اسے اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ اپنے بیٹے خسرو ملک کی جانشینی سے باز آجائے۔

ملک سیف الدین ایک سچا اور کھر دہی شخصیت کا انسان تھا فوراً خداوند زادہ کی بارگاہ میں پہنچ گیا اور اس سے سوال کیا "اے عورت! تیرا فرزند لائق جہاں داری نہیں ہے اس سے باز آجا، اگر ہم سب تیری خواہش پوری کر دیں تو یقین رکھ کہ مغلوں کے حملوں کو کمال الدین فیروز شاہ کے علاوہ کسی میں بھی روکنے کا دم نہیں ہے۔"

خداوند زادہ نے کہا "سیف الدین! تم ایک سچے اور صاف گو انسان ہو تمہی بتاؤ کیا میں نے جو کچھ چاہا ہے غلط چاہا ہے؟" گستاخ صاف گو، امیر نے جواب دیا۔ "د عورت! تو ہمارے فیصلے سے اتفاق کر اور کمال الدین فیروز کو فرماں روا تسلیم کر لے اگر نہیں ملنے کی تو اس کے نتائج کی تو خود ذمہ دار ہوگی۔"

خداوند زادہ چپ ہو رہی کیونکہ سیف الدین کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔

امرا اور خواہن تاج شاہی اور لباس خسروی لے کر کمال الدین فیروز کی خدمت میں پہنچے اور اس سے درخواست کی کہ مرحوم بادشاہ کی جانشینی قبول فرمائے۔

کمال الدین فیروز کو "ذرا تامل ہوا۔ وہ اتنی بڑی ذمے داری قبول کرتے ہوئے گھبراہٹا تھا۔ نصیر الدین آگے بڑھے اور حکم دیا "کمال الدین! اب تو فیروز شاہ ہے خواہ مخواہ سوچ میں وقت ضائع نہ کر اور تاج اور لباس شاہی زیب تن فرما۔"

فیروز شاہ اس وقت ماتمی لباس میں تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے امرانے درخواست کی کہ اس خوشی کے موقع پر ماتمی لباس اتار دیا جائے لیکن فیروز شاہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور جامہ ماتمی پہ خلعت شاہی زیب تن کی گئی۔ بارگاہ شاہی کے نقیبوں اور چاؤشوں نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کیں اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ فیروز شاہ اسی وقت حرم میں داخل ہوا اور خداوند زادہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ خداوند زادہ نے فیروز شاہ کو سینے سے لگالیا اور مرحوم بادشاہ کی کلاہ اپنے ہاتھوں سے فیروز شاہ کے سر پر رکھ دی۔

فیروز شاہ ٹھٹھے سے واپس ہوا ابھی وہ ملتان تک ہی پہنچا تھا کہ دہلی سے

وزیر اعظم خواجہ جہاں کا فرستادہ ملیج توں پہنچ گیا۔ اس کی گردن میں مرحوم بادشاہ کے فرضی بیٹے کی طرف سے ایک فرمان لٹک رہا تھا اس فرمان میں اسے مرحوم بادشاہ کے بیٹے کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا فیروز شاہ حیران تھا کہ مرحوم بادشاہ کی کوئی اولاد زینہ نہ تھی پھر یہ بیٹا کہاں سے آگیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر فکر مند ہو گیا کہ یہ صاری عیاری خواجہ جہاں وزیر اعظم مملکت تخلیق کی ہے۔

فیروز شاہ کے قیاس کی تصدیق دہلی کے فرستادے نے بھی کر دی۔ فیروز شاہ نے مطمئن ہونے میں کہا ”کوئی پروا نہیں، جب خدا مہربان ہو تو کوئی بندہ کیا کر سکتا ہے“ اس کے بعد فیروز شاہ نے اپنے خدشات کو نصیر الدین سے کیا اور ان سے دعوئے طمانیت طلب کا رہا۔ آپ نے جواب دیا یہ ہم نے ٹھٹھے میں تجھے بادشاہ بنا دیا تھا دہلی کی بھی فکر کریں گے ادا اس اور یلوس مت ہو۔“

فیروز شاہ خاموش ہو رہا۔

جب یہ قافلہ ہانسی کے نواح میں پہنچا تو نصیر الدین نے بادشاہ سے کہا ”ٹھٹھے سے یہاں تک ہم تجھے بہ حفاظت لے آئے۔ لیکن یہاں سے قطب الدین منور کی حدود شروع ہو جاتی ہیں اب تو ان سے دُعا اور راجت کا طالب ہو۔“

قطب الدین منور حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید اور ہانسی کے خلیفہ تھے اور نصیر الدین ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

فیروز شاہ ہانسی کے باہر مقیم ہو گیا اور اس نے قطب الدین منور کو ایک خط روانہ کیا اور اس میں لکھا تھا۔

”حسنو دلا! ناچیز فیروز شاہ کو حضرت نصیر الدین روشن چرخ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ علاقہ حضرت قطب الانام شیخ قطب الدین منور کی ولایت میں داخل ہے انہوں نے اس گناہ گار کو آپ کے سپرد فرمایا ہے اب جیسا مناسب ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔“

نور اُہی اس کا جواب بھی آگیا حضرت قطب الدین منور نے جواب میں لکھا تھا۔
”حضرت شیخ نصیر الدین روشن چرخ نے تجھے اس ضعیف کے حوالے کیا ہے اس لیے مجھے الشرفا کی کفصل و کرم سے یہی امتیاز ہے دہلی کی بادشاہت تیرے قبضے میں لگ جائے گی“

دہلی میں مرحوم بادشاہ کا وزیر فیروز شاہ سے جنگ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا لیکن عالم یہ تھا کہ ہوا اکھڑی جا رہی تھی سلطنت کے امراء اور خاںین چوری چھپے بھاگ بھاگ کر فیروز شاہ کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے یہاں تک کہ اس کے قریب ترین ساتھیوں تک اس کا ساتھ چھوڑ دیا آخر کار ہر طرف مایوس ہو کر خواجہ جہاں بھی فیروز شاہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہو گیا کہ لوہے کی زنجیر اس کے گلے میں پڑی تھی اس نے دستار کی جگہ ٹوپی پہن رکھی تھی اور برہنہ شمشیر گلے میں ڈال رکھی تھی وہ اس حیلے میں فیروز شاہ کے خیمے کے بائیں طرف موڈ بانڈ کھڑا ہو گیا۔ نماز ظہر کے بعد جب خیمہ شاہی کا پردہ اٹھایا گیا تو بادشاہ کی نظر خواجہ جہاں پر پڑی، حیرت سے خدام کو مخاطب کیا ”خواجہ جہاں سے دریافت کیا جلائے کس نے اپنی گردن میں فولادی زنجیر اور عمریاں شمشیر کیوں ڈال رکھی ہے؟“ خواجہ جہاں نے جواب دیا ”تحقیق اپنی تقصیر پر نادم اور بادشاہ کی کرم گسری کا منتظر اور امیدوار ہے۔“

فیروز شاہ نے خدام کو حکم دیا ”خواجہ جہاں کے سر پر دستا باندھی جلائے اور اس کے لیے شاہی خیمے سے متصل ایک خیمہ نصب کر دیا جائے“

حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور خواجہ جہاں کو اس خیمے میں پہنچا دیا گیا فیروز شاہ خود بھی اس خیمے میں پہنچا اور خواجہ جہاں سے کہا ”حضرت روشن چراغ نے اس خاکسار کو تاج و تخت کی بشارت دی تھی اور حضرت قطب الدین منور نے اشاروں کنایوں میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تو دہلی کی فکر کیوں کرتا ہے دہلی تو خود ہی تیری خدمت میں دست بستہ حاضر ہو جائے گی اب آج جب ہم تجھے اپنے روبرو عاجز اور ناجار دیکھتے ہیں تو حضرت روشن چراغ اور قطب الدین منور کی عزت دو بالا ہو جاتی ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ان حضرات کا دور اور صحبت میسر آئی“

بادشاہ خواجہ جہاں کو معاف کر دینا چاہتا تھا لیکن درباری امراء اور خاںین نے بادشاہ کو دھم دلی سے باز رکھا اور خواجہ جہاں کے قتل کا فرمان حاصل کر لیا جس کے نتیجے میں خواجہ کو قتل کر دیا گیا۔ بادشاہ دہلی کے تاج و تخت پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد ہانسی جانے پر آمادہ ہوا روشن چراغ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے جب بادشاہ ہانسی میں داخل ہوا، قطب الدین منور نماز جمعہ کی غرض سے مسجد اشرف لے جاتے تھے راستے ہی میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ قطب الدین منور اور حضرت نصیر الدینؒ ایک دوسرے کے قدموں میں جھکے جیسے وہ دونوں ایک ۲۸۲ دوسرے کے پاؤں پکڑ کر رہیں گے۔

لیکن روشن چراغ سے پہلے قطب الدین ان کے قدموں میں جھک چکے تھے پریشان حال بادشاہ اور لشکریوں کو لوگوں اسی لئے تو زیادہ مانتے لگے تھے کہ انہیں دہلی کا تاج و تخت انہی دونوں حضرات کی دعاؤں سے ہاتھ آیا تھا۔

قطب الدین نے بادشاہ سے کہا: ”فقیر جمعے کی نماز کی نیت سے نکلا تھا کہ بادشاہ کو آتے دیکھ کہ حیران ہو گیا یہ ناچیز سوچتا ہے کہ اب گھر کس طرح جایا جائے گا“
فیروز شاہ چپ مٹھے کھڑا رہا۔

نصیر الدین چراغ اور قطب الدین منور کی آنکھیں چار ہوئیں ان نظروں میں بیتہ نہیں کیا پیام تھا کہ قطب الدین منور سب کچھ سمجھ گئے بادشاہ سے کہا: ”دعا گو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو مے خواری کا بے حد شوق ہے اور اس شغل کی وجہ سے اہل حاجت کی کار براری میں رخنہ پڑتا ہے“
بادشاہ نے عاجزانہ عرض کیا: ”ان اللہ ائندہ یہ ناچیز شغل مے کشی سے محفوظ رہے گا“
آپ نے پھر ارشاد فرمایا: ”دعا گو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو حیدر افگنی کا بھی بہت شوق ہے اپنے شکار کے شوق کے لئے ایک عالم کو پریشان اور سرگرداں رکھنا اچھا مشغلہ نہیں ہے شکار اس حد تک جائز ہے کہ تیری اس سے حاجت پوری ہو جائے“

فیروز شاہ نے عاجزی سے جواب دیا: ”حضرت شیخ اس ناچیز کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مشغلے سے باز رکھے“

قطب الدین منور نے طرے سے ارشاد فرمایا: ”سبحان اللہ ہماری دعا کا منکر ہوا کیونکہ تجھے کل کی بات بھی یاد نہیں کہ نصیر الدین آدم نے تیرے حق میں کیسی دعائیں کی تھیں۔ تو تو ہماری دعا کا منکر ہے تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں نے تو بکر لی اور آئندہ اس مشغلے سے باز رہوں گا“
بادشاہ نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی اور آہستہ آہستہ توبہ کرنی شروع کر دی۔
حضرت نصیر الدین مسکراتے رہے۔



فیروز شاہ کا وزیر خان جہاں پہلے ہندو تھا اور تلنگانے سے تعلق رکھتا تھا اسلام قبول کر کے حضرت چراغ دہلوی کا مرید ہو گیا اور پوچھا: ”حضرت! یہ عاجز عبادت اور ریاضت کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہے اگر حکم ہو تو دریافت کرے“
آپ نے کہا: ”پوچھو!“

خان جہاں نے کہا: ”غلام کو کس طرح ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہونا چاہیے؟“
 آپ نے جواب دیا: ”خان جہاں! تو وزیر ہے اور یہی تیری عبادت ہے حاجت مندوں
 کی حاجت براری کرتا رہ، غریب کا خاص خیال رکھ اور دل آزادی سے باز رہ۔“

خان جہاں نے پھر سوال کیا: ”اور اوراد و وظائف کی بابت بھی کچھ ارشاد ہو؟“
 آپ نے جواب دیا: ”اوراد و وظائف بھی یہی ہیں کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی
 کوتاہی نہ اختیار کرنا، مندر وزارت پر نشست کے دوران بھی اگر وضو ٹوٹ جانے کا احساس ہو جائے
 تو فوراً اٹھ کھڑے ہونا اور وضو کر کے دوبارہ بیٹھ جانا۔ رات کو جب آنکھ کھلے تو پہلا کام وضو کرنا ہوگا
 زندگی بھر اس پر کار بند رہو اور پھر دیکھ کہ خدا تیرے لئے کیا کر رہا ہے۔“

خان جہاں زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کرتا رہا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اسے حضرت نظام
 الدین اولیاءؒ کے قریب دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت چرغ دہلویؒ کا جب آخری وقت آیا تو آپ کے پاس آپ: ”حیدر بیٹھے تھے
 ان مریدوں میں حضرت میر سید محمد گیسو دراز بھی شامل ہیں آپ نے وفات سے قبل اپنے مرید شیخ رکن الدین
 (ہمیشہ زادہ چرغ دہلوی) سے فرمایا: رکن الدین! خواجگانِ چشت کی نعمتوں میں سے جتنا بھی تمہاری
 قسمت میں تھا مے دیا گیا لیکن خرقہ، کاسہ، چوبیں، تسبیح، نقیلین اور عصا میں کسی کو بھی نہ دے سکوں گا۔“
 رکن الدین نے ملول ہو کر جواب دیا: ”حضرت کی مرضی۔“

حضرت گیسو دراز کو اس وصیت سے صدمہ پہنچا اور پوچھا: ”حضرت! گستاخی معاف
 کیا یہ ناجائز بھی اس سے محروم رکھا جائے گا؟“

آپ نے جواب دیا: ”میرا خرقہ لے سکتے ہو لیکن اپنے پیر کا خرقہ اور دیگر متبرکات میں
 نہیں دوں گا۔“

رکن الدین نے ابدیدہ نظروں سے آپ کو دیکھا اور دریافت کیا: ”حضور! متبرکات حضرت
 شیخ المشائخؒ کے لئے اور کیا ارشاد ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”جب تم مجھے قبر میں آنا زانو کا سہ سچیں گے تو سر کی نیچے، خرقہ پہنے پر، تسبیح
 انگلیوں کے نیچے، ایک طرف نقیلین اور دوسری طرف عصا رکھ دینا۔“

بعد وصال وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ ۱۱۷۰ھ اور ۱۸ رمضان کی درمیانی شب اور
 ۱۲۸۴ھ (ستمبر ۱۳۵۶ء) کو یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایشائے

متبرکہ کا اپنے ساتھ لے جانا اور کسی مرید کو نہ دینا بہتوں کو شاق گذرنا تھا یہاں تک کہ حضرت گیسو دراز نے پیر کی مفارقت اور خرقہ متبرکہ کے نہ ملنے کا اتنا دکھ محسوس کیا کہ دہلی کو فوراً چھوڑ دیا۔ حضرت چراغ دہلوی نے جس چارپائی پر وصال فرمایا تھا اس کا جھلکا اپنے گلے میں ڈال لیا اور کہا: ”یہی میرا خرقہ ہے“ اور دکن چلے گئے۔

کچھ عرصے بعد حضرت چراغ دہلوی کا ایک ارادت مند آپ کے مزار پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھ کر دل میں سوال کیا: ”حضرت اب تو بتلا دیجئے کہ آپ نے ایسے متبرکہ اپنے مریدوں میں سے کسی کو کیوں نہ مرحمت فرمائیں؟“

جب یہ ارادت مند رات کو سو گیا تو حضرت چراغ دہلوی نے خواب میں جواب دیا: ”تیرا یہ خیال درست ہے کہ میرے بعض مرید صاحب کرامت ہیں اور مقامات بلند رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سب کے دلوں میں تعصبات کی رقیں پھر بھی پائی جاتی ہیں جس دل میں تعصب ہو وہ کس طرح اس مقدس امانت کا حقدار ٹھہر سکتا ہے“ پھر آپ نے مزید فرمایا: ”لیکن بعض مریدوں کو میں نے اپنا خرقہ ضرور دیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ انشاء اللہ سلسلہ پیرانِ چشت ان سے جاری ہے گا۔“

شاہجہان آباد سے چھ کوس پر جنوب میں یہ ذات بارات ابدی خواجگاہ میں موجود ہے۔ وہ ذات جیسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے روشن چراغ دہلی کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ کی دمکا کا گنبد فیروز شاہ نے آپ کی زندگی ہی میں تعمیر کر دیا تھا اور دمکا کا دروازہ بارہ برس بعد فیروز شاہ ہی نے تعمیر کرایا۔ بارہ دری والے اس گنبد میں سنگِ خارا کے ستون بنائے گئے ہیں اور جملہ دروں میں سنگِ سرخ کی جالیاں لگائی گئیں۔ گنبد پر سنہری کلس آج بھی سورج کی روشنی میں اس طرح چمکتا ہے جیسے روشن چراغ دہلویؒ اس کلس میں منعکس ہو کر قرب و جوار کو منور کر رہے ہیں۔



حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ

پانچویں بیت میں ایک عثمانی خاندان رہتا تھا خاندان کے بزرگ کا نام محمود تھا ان کی اولاد میں تو کوئی تھیں لیکن نثر نامی چٹے کی بات ہی کچھ اور تھی ان کے آس پاس رہنے والوں نے اس بچے کے سلسلے میں یہ عجیب بات محسوس کی کہ اس عہد کے مشہور بزرگ بولعل شاہ قلندر ہر روز اس گھر میں حاضری دیتے محمد کو دیکھتے ان سے پیار محبت کی باتیں کرتے اور واپس تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ محمد ذرا سن شعور کو پہنچے تو خود بھی ادھر ادھر جانا شروع کر دیا ان کی عدم موجودگی میں بولعل شاہ قلندر تشریف لاتے تو اس وقت تک واپس نہ جاتے جب تک محمد ملاقات نہ ہو جاتی ایک ایسے ہی موقع پر جب بولعل شاہ قلندر محمد کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا، محمد اپنی زمینوں پر گئے ہوئے ہیں یہ زمینیں وہاں سے کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں۔ بولعل شاہ قلندر جس گھوڑے پر تشریف لائے تھے اس کا رخ موڑ دیا اور اس خاندان کے مزید پر وفانہ ہو گئے محمد نے انہیں دور ہی آتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے بہت سارا غلہ ایک تھیلی میں بھر لیا اور اسے لیکر استقبال کی نیت سے آگے بڑھے جب یہ ذرا قریب پہنچے تو بولعل شاہ قلندر نے مسکرا کر دریافت کیا ”محمد! اس تھیلی میں کیا ہے؟“ انہوں نے جواب دیا ”غلہ“۔

بولعل شاہ نے دریافت کیا ”اسے لے کر کہاں ہے پاس آنے کا مقصد؟“
انہوں نے جواب دیا ”آپ پہلے تو اس ناچیز کے گھر تشریف لے گئے ہوں گے اس کے بعد یہاں تشریف لائے ظاہر ہے اس سفر میں گھوڑا بھوکا ہو گیا ہو گا یہ غلہ اس کی بھوک مٹانے کی غرض سے لے کر حاضری ہوا ہوں“

بولعل شاہ اب بھی مسکرا رہے تھے بولے ”سعادت مند بچے! اخلا تھجھے صاحب کمال کرے کر تو نے ہمارے جانور کا اتنا خیال رکھا لیکن دانہ کھلانے سے پہلے گھوڑے سے تو پوچھ لے کر یہ بھوکا بھی ہے یا نہیں؟“

انہیں جانور سے اس قسم کا سوال کرنے میں تاثر تھا تو بولعل شاہ نے فرمایا ”سوچا کیا ہے؟“
۲۸۶ گھوڑے سے سوال کر یہ تھجھے جواب دے گا

محمد نے مذہب انداز میں سوال کیا ”موسیٰ! کیا تم بھوکے ہو؟“
گھوڑے نے نفی میں گردن ہلادی۔ محمد نے تعجب سے دوبارہ سوال کیا ”کیا تم نے میرے
سوال کے جواب میں گردن ہلائی تھی؟“

گھوڑے نے اثبات میں گردن ہلادی انہوں نے پھر پوچھا۔ ”کیا تم بھوکے ہو؟“
گھوڑے نے پھر نفی میں گردن ہلادی۔ بوعلی شاہ نے کہا ”محمد تو حیرت نہ کر، گھوڑا تیرے سوالوں کا جواب
دے رہا ہے، خواہ مخواہ گردن نہیں ہلا رہا۔“
”بچے رکھا۔“ لیکن میں غلہ گھوڑے کے لئے لایا تھا اب میں اس کا کیا کر لوں؟“
بوعلی شاہ نے جواب دیا ”ہم نے یہ غلہ تجھے بھجنا۔ خدا تجھے طویل عمر عطا فرمائے اور
اسی طرح کثیر اولادوں سے نوازے۔“

اس واقعے کو ایک عرصہ گزر گیا محمد نے جوانی میں قدم رکھا وہ اپنی زمینوں کا گھوڑے کی پشت
پر بیٹھ کر دور درازے طبعیت کی بر دباری اور سنجیدگی لوگوں کو مرعوب رکھنے لگی تھی اس دن سورج طلوع
ہوئے صرف دو ساعتیں گزری تھیں نوجوان محمد نے گھوڑے پر زین کسی اور رکاب میں پیر رکھ کے گھوڑے کی
پشت پر سوار ہو گئے وہ اپنی زمینوں پر جا رہے تھے ایک جگہ ٹھہر کے کہہ رہے ایک درخت کی چھائوں میں بوعلی شاہ
بیٹھتے تھے انہوں نے نوجوان محمد کو دیکھتے ہی فرمایا ”کیا گھوڑا ہے اور کیا اس کا سوار ہے؟“

ان لفظوں نے نوجوان محمد کے سینے میں ایک آگ سی لگا دی وہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے
اور جوش میں اپنا گریبان چاک کر ڈالا، گھوڑا کہیں گیا اور خود کہیں گئے یہ سالہا سال جنگوں میں خاک چھاتے
ہے مدتوں بعد جب ذرا ہوش آیا تو انہوں نے شہر کا رخ کیا۔ جنگل میں انہیں کچھ اور فقیر بھی ملے ان کے
ساتھ انہوں نے بھی شہر کا رخ کیا جنگل سے قریب ترین شہر ہانسی تھا یہ ہانسی میں داخل ہو گئے اس
وقت ہانسی کے مشہور بزرگ شیخ جمال بقید حیات تھے یہ وہی شیخ جمال ہیں جن کا سلسلہ حضرت
ہابر پیانے فرمان پھار پیئے کی دجہ سے چاک کر دیا تھا۔ شیخ جمال ہانسی کو ایک غیب کی آواز نے
بشارت دی، ”شیخ جمال! ہوشیار! شیخ محمد جو عنقریب شیخ جلال کی لاد لیا کہلا میں گئے ہانسی میں آ رہے
ہیں ان کی خدمت میں حاضری دے کر ان سے درخواست کرو کہ وہ خدا سے دعا کر کے تمہارے سلسلے کو بحال کر دیں۔“
شیخ جمال نے اپنے کئی خادم شہر کے مختلف سمتوں میں روانہ کر دیے اور انہیں حکم دیا کہ اس
دوران جو درویش بھی شہر میں داخل ہوں انہیں احترام کے ساتھ شیخ جمال کے پاس پہنچا دیا جائے،
خادموں نے نوازہ دفعتاً کو روک لیا اور انہیں اپنے شیخ کی خدمت میں لے آئے۔ شیخ

جمال دروازے پر کھڑے نہایت بے چینی سے ان فقراء کے منتظر تھے انہوں نے ہر درویش کو نہایت غور

سے دیکھا اور ان میں شیخ محمد کو تلاش کرتے رہے۔ اُنکھوں کے ساتھ ہی وہ قوتِ شام سے بھی کام لے رہے تھے ان بصارت اور شام نے انہیں بالوس کر دیا۔ فقر سے پوچھا: ”اے درویشو! میں تم سب سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنی مجموعی تعداد میں حاضر ہوئے ہو یا ابھی تم میں کا کوئی شخص باقی ہے؟“

ایک عرصہ درویش نے جواب دیا: ”ایک نوجوان کے سوا سبھی یہاں آگئے ہیں۔ کیوں، کیا بات ہے؟“ شیخ جمال نے افسوس سے سر ہٹا لیا بولے ”وہ نوجوان کہاں ہے؟“ عرصہ درویش نے جواب دیا: ”ہم سب اپنے سامان کی نگہداشت اور نگرانی کے لیے اس نوجوان کو سرے میں چھوڑ دیلے ہیں۔“

شیخ جمال نے کہا: ”درویشو! افسوس کہ ہم نے جس شخص کی وجہ سے تم سب کو بلایا وہی نہیں آیا۔“ اس کے بعد شیخ جمال نے درویشوں کی ایک شاندار ضیافت کی، جب یہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو گئے تو شیخ جمال نے ان سب کو مخاطب کیا: ”حضرات! اب آپ میں سے کوئی ایک شخص اس نوجوان کی خدمت میں جائے اور اسے عزت و احترام سے لے آئے۔“

ایک درویش نے اس درخواست پر عمل کیا اور شیخ محمد کو اپنے ہمراہ لے آیا شیخ جمال نے اس نوجوان کی شاندار پزیرائی کی اور صدر محفل میں بٹھایا درویشوں کو رخصت کر کے شیخ محمد کو کھانا کھلایا اور آخر میں علاء الدین مبارکگیریؒ کا پورا واقعہ سنکے گزارش کی ”حضرت! حضرت صابر نے جوش میں یہ کہہ دیا تھا کہ میں تمہارا سلسلہ چاک کرتا ہوں، اس کے بعد بابا فرید گنج شکر نے مجھے بشارت دی تھی کہ ایک درویش کی مدد سے یہ سلسلہ پھر بحال ہو جائے گا اور وہ شخص جس سے میرا سلسلہ جاری ہوگا از رُءے کشف مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ آپ کی ذات بابرکات ہے خدا کیلئے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائیے اور میرا سلسلہ جاری فرمائیے۔“

شیخ محمد نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائیے اور جمال ہانسوی کے سلسلے کو دوبارہ جاری کر دینے کیلئے خدا سے دعا کرتے رہے۔

یہ جب دوبارہ اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچے تو درویشوں نے ان کی بڑی عزت کی۔ اس بار درویشوں نے اپنا سامان بھی ان کے سر یا کاندھوں پر نہیں رکھا لیکن شیخ محمد نہیں مانتے اور انہوں نے اپنی سابقہ خدمات انجام دینے پر اصرار کیا۔ درویشوں نے نہایت معمولی اور ہلکا سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ”وہ نوجوان! اگر تم بضد ہی ہو تو اسلئے کانڈھے پر رکھ لو۔“ شیخ محمد نے اس سامان کو اپنے کانڈھے پر رکھ لیا۔ درویشوں کو راستے میں یہ کیفیت دیکھ کر

بڑی حیرت ہوئی کہ شیخ محمد کا کاغذ ہا بالکل خالی ہے اور ان کا سامان کاغذ سے کے ایک یاد و بالشت اوپر ہوا میں معنی ہے درویشوں کو اپنی لاعلمی اور کم آگہی پر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے شیخ محمد کے قدروں میں گراں سے معافی مانگی۔

یہ لوگ ابھی چند ہی گئے ہوں گے کو ایک ہانتا کا پتہ آدی ان کے پاس پہنچا اور شیخ محمد کا رستہ رد کر کہنے لگا ”شیخ! مجھے شیخ جمال ہانسوی نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، براہ کرم واپس تشریف لے چلیں!“

شیخ محمد نے جانے سے انکار کر دیا لیکن جمال ہانسوی کا خادم انہیں اپنے ساتھ لے چلے رہا۔ جب یہ شیخ جمال کی خدمت میں دوبارہ پہنچے تو انہوں نے کہا ”شیخ محمد! تم اللہ کے محبوب ہو اور خدا نے تم میں بہت سارے کمالات دیے ہیں تمہارا اس طرح مارا مارا پھر نا خدا کو پسند نہیں ہے تم اپنے وطن واپس جاؤ۔“

شیخ محمد نے رقت زدہ آواز میں عرض کیا ”بزرگ شیخ! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ایسا نہیں ہے، میرے سینے میں ایک بھٹی جل رہی ہے اور تلووں میں آگ دلی ہے جو مجھے ادھر ادھر دوانہ دار بھٹکاٹے پھرتی ہے اور ابھی تک میں اس بزرگ ہستی سے محروم ہوں جو میرے پیروں میں اطاعت و مریدی کی زنجیروں ڈال کے ٹھیرا پیدا کرے گا؟“

شیخ جمال نے جواب دیا ”عزیزم! تم اپنے گھربانی پت واپس جاؤ اور ان بزرگ کا وہیں انتظار کرو۔ اُن صاحب کی بہت جلد تم سے ملاقات ہو جائے گی اور وہ تمہیں تمہاری منزلِ مراد تک پہنچا دیں گے تم مطمئن رہو۔“

شیخ جمال کے ارشاد پر یہ پانی پت چلے گئے اور وہیں کچھ عرصے بعد ان کی ملاقات شمس الدین ترک پانی پتی سے ہو گئی۔ شیخ محمد ان کی مریدی میں چلے گئے انہوں نے ان کا نام شیخ جلال الدین رکھ دیا۔ شیخ جلال نے ایک بار پھر سفر اختیار کیا اور اس بار انہوں نے پوربک رُح کیا قریب شام ایک ایسے گاؤں میں داخل ہوئے جہاں افراتفری مچی ہوئی تھی لوگ اپنا سامان سمیٹ کے بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے بار بار دروازوں کی پیٹھ پر بندھا ہوا سامان رکھا تھا اور عورتوں بچوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس گاؤں میں کسی خوبخوار دشمن کا حملہ ہونے والا ہے اور لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کی خاطر ہجرت کر رہے ہیں۔ شام قریب ہونے کی وجہ سے شیخ جلال کو اسی گاؤں میں قیام کرنا پڑا انہوں نے لوگوں سے اس افراتفری کا سبب جاننا چاہا لیکن انہوں نے ان کے ہر سوال کا بے رخی سے جواب دیا۔ شیخ جلال ایک سرکش گھوڑے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کے

سوار سے پوچھا تو تم لوگ آخر یہاں سے بھاگ کیوں ہے ہو؟

نوجوان نے گھوڑے کی راس کھینچ لی اور جلدی جلدی غصے میں بولا ملے اجنبی! تم میرا راستہ مت روکو، ورنہ میں تمہیں کچلتا ہوا نکل جاؤں گا۔

شیخ جلال نے ناگوار سی سے کہا۔ ”ایسی بھی کیا لکھڑاٹ، اگر تم مجھے کچل کے جاسکتے ہو تو ضرور الیسا کرو۔“

نوجوان سوار نے ایک بار بھر متنبہ کی۔ آخری بار، میرا سچھوڑ دو اور میرا وقت نہ برباد کرو۔ شیخ جلال نے کہا۔ تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آخر تم لوگ گاؤں خالی کر کے کیوں بھاگ رہے ہو؟

نوجوان سوار نے غصے میں کہا۔ تم حاکم علاقہ کے جاسوس معلوم ہوتے ہو جو شاید اس گاؤں میں بھیجا ہی اسی لئے گیا ہے کہ ہیں باتوں میں الجھا کے اس وقت تک روکے لکھے جب تک کہ اس کے خونخوار سپاہی یہاں نہ پہنچ جائیں۔

دو الی کی کوئی بات نہیں۔ شیخ جلال نے جواب دیا۔ ”نوجوان! میں تمہارا غصہ ہوں اور اگر تم لوگ اپنی پریشانی سے مجھے مطلع کر دو گے تو شاید ممکن ہو جائے کہ میں اسے دور کر دوں اور تمہیں یہاں سے بھاگ پڑے۔“

نوجوان نے غصے میں گھوڑے کے پیٹ پر گدگدی کی اور راس دھیمی پھوڑ کے ایڑ لگاتا ہوا بولا۔ ”تم یوں نہیں مانو گے، مجھے کوئی پروا نہیں کہ میرا گھوڑا تمہیں کچل دے۔“

اس کے بعد اس نے گھوڑے کو رہ کر ایڑ لگائی اور اسے بھگنے کی بار بار کوشش کی لیکن وہ تو زمین سے چپک کر رہ گیا تھا شیخ نے مسکاتے ہوئے لاپرواہی سے فرمایا۔ ”نہیں دیتے میرے سوال کے جواب تو نہ دو، جاؤ، میں بھی تم سے کچھ نہیں پوچھتا، جاؤ مجھے کچلتے ہوئے بھاگ جاؤ۔“

نوجوان سوار کی بوکھلاہٹ اور پریشانی قابل دید تھی وہ ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہو گیا اور شیخ جلال نے بے نیازی سے اپنی راہ لی۔ سوار نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تو گھوڑے کی پشت سے پھانڈ کر ان کی طرف دوڑا اور بھاگ کے ان کے قدموں میں گر گیا بولا۔ ”حضرت! میں اپنی گستاخی پر نادم ہوں آپ ہیں کون؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہارے سوالوں کا جواب دوں۔“

سوار نے شیخ کے پاؤں پکڑ لیے، بولا۔ میں اس وقت تک آپ کے پاؤں نہ چھوڑوں گا جب تک آپ مجھے معاف نہ فرما دیں گے، حضرت میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔“

آپ نے جواب دیا ”جاؤ گاؤں چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔ ورنہ حاکم علاؤ کے سپاہی کل صبح صبح نازل ہو جائیں گے اور تمہارا سامان چھین کر لے جائیں گے“

سوار نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ”حضرت غلطی ہو گئی معاف فرمادیں“

شیخ جلال نے غصے میں کہا ”..... نادانو! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تقدیر الہی سے بھاگا نہیں جاسکتا، وہ تمہیں ہر جگہ پکڑ سکتی ہے اگر تم میں اتنی طاقت اور آتنا اختیار ہے کہ تقدیر الہی سے بھاگ جاؤ۔ تو تم یہاں اس گاؤں میں ایک لمحے بھی نہ رو، اسی وقت بھاگ جاؤ، ابھی بھاگ جاؤ۔“

سوار نے بے بسی سے کہا ”بھاگ کیسے جاؤں حضرت میرا گھوڑا تو زمین میں اس طرح گر گیا ہے جیسے کوئی میخ، میں گھوڑے کے بغیر کیسے بھاگ سکتا ہوں“

”یوں ہی پیدل بھاگ جاؤ، خدا نے تمہیں بھی تو دویر دی ہے میں ان سے دوڑ کر گاؤں سے کہیں

دوڑ چلے جاؤ۔“

سوار نے آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور روتا ہوا بولا ”اب میں یہ پاؤں نہیں چھوڑوں گا آپ مجھے اپنی ٹھوکروں کی ضربات سے ہلاک کر دیں“

یہ تماشہ دیکھنے کے لئے گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آگئے اور انہیں جب اس نوجوان کی زبانی سارا واقعہ معلوم ہوا تو ان میں ایک عمر رسیدہ اور چھدری دارٹھی والا ذرا آگے بڑھا اور کہنے لگا -

”نوجوانی میں، میں بھی بہت بد عقیدہ تھا لیکن جب تجربات اور عقل کی گھنیری پھاؤں میں بیٹھ کر ذرا استیلا نو تیر چلا کر جوانی کی سرکشی اور تعجیل پسندی نے مجھے آنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں حقائق دیکھ سکتا۔“

پھر نوجوان کو گدی سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ڈانٹا ہوا بولا ”تو نے ان کی شان میں کون سی گستاخی کی تھی بس پر تو پچھتا رہا ہے“

نوجوان نے جواب دیا ”میں نے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دیے اور آپ کو کچل کر جانے کی دھمکی دی تھی جس کی مجھے یہ سزا ملی کہ میں یہ گاؤں چھوڑنے سے معذور ہو گیا ہوں اور میرا گھوڑا زمین میں میخ کی طرح گرے کھراہ گیا ہے“

بوڑھے نے شیخ جلال کی خوشامد کی، اپنی سفید دارٹھی مٹھی میں پکڑتا ہوا بولا ”حضرت! اس سنت رسول کا واسطہ، اس نوجوان کو معاف فرمادیں یہ نادان ہے اور نہیں سمجھتا کہ آپ کا مرتبہ کیا ہے“

آپ نے کہا ”میں نے اسے سزا ہی کون سی دی ہے جو معاف کر دوں، بس آنا ہی تو کیا ہے اسے تقدیر الہی سے بھاگنے نہیں دیا“

بوڑھے نے کہا ” بجا ارشاد لیکن اب میں نہ اس کی طرف سے بلکہ پورے گاؤں کی طرف سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں کا کوئی فرد بھی آپ کی مرضی اور حکم کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا آپ جیسا چاہے دیا ہی ہوگا “

آپ نے فری سے کہا ” تم لوگ جس ڈر سے گاؤں خالی کر رہے ہو کیا خیال ہے، بھانگے تم آؤں سے بچ جاؤ گے؟ حاکم علاقہ تم سب کا دُور تک پیچھا کر سکتا ہے۔ “

بوڑھے نے پورے گاؤں کی نمائندگی کی بولا ” حضرت! آپ سے کیا چھپانا، آپ بتائے بغیر ہی سب کچھ جانتے ہیں پھر بھی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا دکھڑا آپ کے سامنے بیان کریں اور آپ سے دادرسی ہوں “ پھر ذرا دم لینے کے لئے نکا اور گاؤں کے دوسرے آدمیوں پر ایک اچھٹی نظر ڈال کے کہنے لگا ” درشاہ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ اس علاقے کا حاکم ہم سے مال داموال کا مطالبہ ہے بادشاہ نے کمرہ جنگ کے مصارف کی خاطر اس حاکم سے کچھ رقم طلب کی ہے اور حاکم علاقہ وہ رقم خود دینے کے بجائے ہم سب وصول کر کے دینا چاہتا ہے اور ہم سب عاجز آئے یہاں سے راہ فرار اس لئے اختیار کر رہے ہیں کئی برسوں جب حاکم علاقہ کے سپاہی یہاں آئیں تو یہ گاؤں انہیں خالی ملے اور ہم لوگ اپنا معمولی سا مال ان ظالموں سے بچا لینے میں کامیاب ہو جائیں “

شیخ جلال نے جواب دیا ” لیکن فرار ہونے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ معاملہ بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے، اس سے بھانگے کے تم کہا جاسکتے ہو “

بوڑھے نے بے بسی سے کہا ” آدمی اپنی عقل اور اختیار کی حد تک کوشش تو کرتا ہی ہے وہاں کرتا ہے لیکن انسان کو ایسی تدبیر نہیں اختیار کرنی چاہیے جس میں انجام کا رے شرمندگی اختیار کرنی پڑے “

” پھر یہیں کیا کرنا چاہیے؟ “ بوڑھے نے سوال کیا۔

شیخ جلال نے کہا ” وہاں سے پاس ایک تدبیر ہے اور وہ یہ ہے کہ حاکم علاقہ کو مطلوب مال یا اتنی ہی قیمت کی رقم ملنی چاہیے “

بوڑھے نے یا دوسی سے گردن جھکالی اور آہستہ سے کہا ” یہ ایسی ترکیب ہے جو ہم بھی جانتے تھے شیخ جلال نے کہا ” اپنے گلوں کے سردار کو بلاؤ۔ بقیہ باتیں اسی سے ہوں گی “

ذرا سی دیر میں گاؤں کا وہی سردار گھٹے ہوئے جسم کا سردار بھی دھوٹی باندھے سر پر بگڑی سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کے مضبوط اور دزنی ہرے والی لاٹھی تھی۔ سردار شیخ جلال

کی عظمت اور اہل کرامت شخصیت سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ آتے ہی سردار کے ملنے سے پوچھا
 ”شاہ جی مجھ سے کوئی کام؟“

شیخ جلال نے نرمی سے کہا: ”ہاں تجھی سے چند باتیں کرنا ہیں۔ تو پہلے اپنے دماغ سے سرداری
 کا مظنہ نکال دے اس کے بعد ہم سے بات کر۔“

شیخ جلال کے تو ہیکل کے لیے سے گاؤں کے سردار کی انا کو بڑا دھکا لگا لیکن مصلحت اندیشی
 نے اسے مشتعل نہیں ہونے دیا۔ انکار سے بولا: ”شاہ جی! اگر میں نے بات چیت میں کوئی غلطی کی ہے
 تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔“

شیخ جلال نے کہا: ”اگر کسی طرح تمہیں اتنی دولت مل جائے کہ حاکم علاقہ کو دے کے گاؤں
 والوں کی جان بچاؤ تو کیسا ہے گا؟“

سردار نے خوش ہوتے ہوئے کہا: ”اگر کسی طرح ایسا ہو جائے تب پھر فرہ ہی آجائے۔
 اپنے کہا: ”ہم تمہیں اتنی دولت ضرور دیں گے کہ تم حاکم علاقہ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤ۔“
 سردار کا جوش بھڑاپا لڑ گیا۔ امیدوارنا امید میں مبتلا ہو کے آہستہ سے کہا: ”ایسی
 کوئی امید نہیں لیکن آپ شاید اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ آپ کی دعا
 کے طفیل ہی کچھ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں کوئی امید نہیں۔“

آپ نے جواب دیا: ”سردار! تم یہ گاؤں ہمارے حوالے کر دو اور ہمیں یہاں کا مالک
 و مختار بنا دو۔ تم لوگ اپنا اپنا سامان اپنے اپنے گھروں میں لے جا کے بند ہو کے بیٹھ جاؤ لیکن ایسا کرنے
 سے پہلے تم لوگ ہمیں اپنے کی ایک جگہ دے دو اور تمہارے پاس لوہے کے جتنے بیکار آلات و
 اوزار ہیں انہیں ہمارے پاس رکھوا دو۔“

سردار کے حکم پر گاؤں والوں نے شیخ جلال کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور ذرا
 سی دیر میں لوہے کے سامان کا شیخ جلال کی اقامت گاہ کے سامنے ڈھیر لگ گیا۔ انہوں نے
 سب کے سامنے لوہے کے سامان کے چاروں طرف لکڑیوں کا اڑم لگا لے اس میں آگ لگا دی اور
 گاؤں والوں کو حکم دیا کہ: ”جاؤ اپنے اپنے گھروں میں جا کے کلی صبح تک بیٹھ بند ہو جاؤ۔“

شیخ جلال کی یہ باتیں گاؤں والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں وہ ان کے حکم پر اپنے اپنے
 گھروں میں جا کے بند ہو گئے۔ ان کی پوری رات نہایت کرب و اضطراب میں گزری اور صبح سویرے ہی
 شیخ جلال کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لوگوں نے گھر میں کھس کر دیکھا انہیں تلاش کیا

لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا وہ کہیں جا چکے تھے۔

گاؤں کے سردار نے غصے میں کہا: ”یہ شاہ صاحب تو بہر پیسے ہی بکے کیسا شعیبہ ہے! تھا یہ شخص کیسا دھوکا دے گی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا ان باتوں سے مقصد کیا تھا؟“

یہاں وہ بوڑھا بھی موجود تھا جس نے شیخ جلال سلجانت اور انھار سے باتیں کی تھیں بولا ”سردار! وقت سے پہلے ہی تم ان کے لئے ایسی باتیں مت کرو، میں نے انہیں پہچان لیا تھا، وہ مستجاب الدعوات تھے، انہیں تلاش کرو وہ یہیں کہیں ہوں گے۔“

سردار نے ہنستے ہوئے کہا ”زمین کے اندر سما گئے ہوں تو اور بات ہے وہ نہ گھر کے اندر تو وہ کہیں موجود نہیں۔“

بوڑھے نے کہا یہ انہوں نے لوہے کے سامان کو آگ کیوں لگوائی تھی؟ اس کوئی تو مطلب ہو! سردار پھر ہنسا بولا ”بڑے میاں عمر کے ساتھ ساتھ تمہاری عقل بھی رخصت ہوتی جا رہی کیتم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ ان شاہ صاحب کو اپنی لاف و گزاف پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی شے کا انتظام تو کرنا ہی تھا، چنانچہ لوہے کا سامان جمع کر کے اس کے پاس بکریوں کا اڑم لگا کے اس میں آگ لگا کے وہ شعیبہ دکھایا جس سے تم بس سوچتے ہی رہ جاؤ کہ شاہ صاحب تمہیں گھروا میں بندھوڑ کے اپنی راہ لیں۔“

بوڑھا لاجواب ہو رہا تھا پھر یہی بولا ”چلو اپنا اپنا لوہے کا سامان تو اٹھالیں چل کر، اب تو بھر ہونا تھا ہوسہی چکا۔“

سردار نے کہا ”وہ دق تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ذرا سی دیر میں حاکم علاقہ کے سپاہی پہنچنے والے ہیں ان کے لئے کیا سوچا جائے؟“

بوڑھا مسلسل لاجواب ہوتا جا رہا تھا وہ اکیلا ہی اس کی طرف چلا گیا جسے کل شاہ صاحب نے سلا جلا یا تھا اس نے امیں سے لوہے کا سامان نکال شروع کیا اور اس وقت تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اس نے لوہے کے جگہ منہرے سامان کا دھیر لگا ہوا دیکھا اس نے دور ہی سے سردار کو آواز دی ”سردار! یہاں آؤ میرے پاس یہاں آ کے شاہ صاحب کا کمال دیکھو۔“

سردار آہستہ آہستہ چل کے بوڑھے کے پاس پہنچ گیا بوڑھے نے ایک پھکنی سردار کی طرف بڑھا دی بولا ”سردار! لوہے کا سامان سونے کا بن چکا ہے بو تو تمہیں کتنی دولت چلیے یہاں تو ہر طرف سونے کا دھیر لگا ہوا ہے تم ان شاہ صاحب کی ایسی نقوڑی دیر پہلے مذاق

”سہ تھ بولواب ان کے لئے کیا کہتے ہو؟“
 سر دار نے شرمندہ ہونے کے
 اپنی گردن جھکا لی۔



سالہا سال کا سیر و سیاحت کے بعد جب یہ اپنے وطن واپس پہنچے تو ان کے پیر و مرشد
 خواجہ شمس الدین ترک نے ان سے کہا ”شیخ جلال اب تمہیں شادی کر لینی چاہیئے“
 شیخ جلال نے خاکساری اور عاجزی سے جواب دیا ”میں نے اپنے دلہن یہ لے
 کر رکھا ہے کہ زندگی بھر شادی نہ کروں گا“

شمس الدین نے کہا ”بہن تمہاری محبت کا یقین ہے اور تم تمہیں اپنا فرزند سمجھتے
 ہیں تم نے عبادت و ریاضت میں جتنی مشقت برداشت کی ہے ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے لیکن ہم
 یہ نہیں چاہتے کہ قیامت میں جب تمہارا رسول اللہ سے سامنا ہو تو تمہیں ان کے سامنے یہ شرمندگی
 اٹھانی پڑے گی کہ تم نے ان کی ایک سنت پر عمل نہیں کیا“
 شیخ جلال نے شرمندگی سے کہا ”آپ کا ارشاد بجا ہے لیکن میں اس بات سے بھی
 خوفزدہ رہتا ہوں کہ میں اپنی نالائق اولاد کے اعمال سے قیامت کے دن رسول اللہ کی نظر میں
 میں شرمندگی نہ اٹھاؤں“

شمس الدین ترک نے جواب دیا ”تم اس طرف سے بے فکر ہو میں وعدہ کرتا ہوں کہ
 نیک اولاد تمہارے نام سے اور بد میرے نام سے منسوب ہوگی اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری
 اولاد پر جب بھی برا وقت پڑے گا، میں اس کی مدد کروں گا۔ میں نے تمہاری لوح محفوظ دیکھ لی ہے
 اس کی رو سے اس دنیا میں جتنی تمہاری اولاد پھیلے گی، دوسرا اس کا شمار بھی نہ کر سکے گا“
 شیخ جلال نے کہا ”اس لوح محفوظ کا مجھے بھی مشاہدہ کر دیجئے“
 شمس الدین ترک نے اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین شیخ جلال کی طرف بڑھا دی اور کہا
 ”وہ لو اس میں جھانک کے دیکھ لو“

شیخ جلال نے اس آستین میں جو جھانکا تو وہاں لوح محفوظ میں بے شمار اولادیں
 دکھائی دیں انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس لوح کو مٹا دینا چاہا لیکن شمس الدین ترک نے فوراً ہاتھ
 کھینچ لیا اور کہا ”جلالی! یہ کیا کرتے ہو؟ کیا تم مشیت ایزدی میں دخل دینے کی گستاخی کے
 مرتکب ہونا چاہتے ہو؟“

شیخ جلال نے اپنا ہاتھ کنچ لیا اور معذرت چاہی۔

شمس الدین نے پوچھا وہاں تو تم نے اپنی شادی کی بابت کیا فیصلہ کیا؟

شیخ جلال نے سر جھکا کے عرض کیا۔ ”آپ کے حکم پر سر جھکانا ہوں۔“

شمس الدین نے کہا یہ شادی سے پہلے کوئی شرط؟

”ہاں ہے،“ شیخ جلال نے کہا ”وہ میں ایک ایسی لڑکی یا عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں

جو بھری بھی ہو، گونجی بھی ہو، اندھی بھی ہو اور ساتھ ہی بھولی بھالی بھی ہو۔“

شمس الدین نے مسکرا کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ شرط کیوں لگائی تم یہ سمجھتے ہو کہ نہ اس قسم کی کوئی عورت ملے گی اور نہ تم شادی کر گے۔ کیوں ہے یہی بات؟“

شیخ جلال نے مسکرا کے سر جھکا لیا۔ شمس الدین نے کہا یہ لیکن میں تمہیں ایک ایسی ہی

عورت تلاش کر دوں گا۔“

شمس الدین ترک نے اپنے مریدوں کو ایسی عورت کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ یہ لوگ اپنے پیرو

مرشد کی رہنمائی میں ایسی عورت کو تلاش کرتے ہوئے کرنا ل پہنچ گئے۔ وہاں کے شیخ زادوں

میں ایک ایسی ہی پاکیزہ خاتون موجود تھیں۔ مریدوں نے معلومات حاصل کر کے اپنے پیرومرشد کو مطلع

کیا اور شمس الدین ترک، شیخ جلال الدین کو لے کر وہاں پہنچ گئے شادی میں دشواری ہی کیا تھی

شمس الدین نے گفتگو چھوڑی اور لڑکی والوں نے ہاں کر دی، یہیں نہایت سادہ طریقے سے ان کی

شادی ہو گئی یہ لوگ دلہن کو رخصت کر کے وطن پانی پت لے آئے۔

رات کو جب میاں بیوی یک جا ہوئے تو شیخ جلال اپنی اندھی، بھری اور گونجی بیوی

کو دیر تک دیکھتے رہے بیوی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کا عظیم شوہر اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس کی زندگی

میں ایک حیرت انگیز انقلاب لانے کا ارادہ کر چکا ہے شیخ جلال آہستہ آہستہ چل کے دلہن کے قریب

پہنچ گئے اور بیوی سے کہا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ میں اس وقت نماز پڑھتا ہوں؟“

بھری اور گونجی دلہن اس کا کیا جواب دیتی۔

آپ نے بیوی کو حکم دیا۔ ”میں وضو کروں گا میرے لئے پانی لاؤ۔“

دلہن چپ چاپ اٹھی اور ابھی وہ جانا ہی چاہتی تھی کہ آپ نے حکم دیا۔ ”جائے پہلے میری

طرف دیکھو۔“

اندھی دلہن نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور حیرت اور خوشی سے شوہر کو دیکھنے لگی۔

پیر شیخ جلال نے دوسرا حکم دیا۔ ”وضو کیلئے پانی لاؤ۔“
 بہری بیوی کو سماعت بھی مل چکی تھی وہ فوراً پانی لینے چلی گئی۔ جب پانی آگیا تو شیخ
 جلال نے اپنا جھوٹا پانی بیوی کو پلا دیا اور حکم دیا۔ ”قرآن پاک اٹھا لاؤ اور پڑھ کر مجھے سناؤ۔“
 بیوی قرآن پاک لے آئی اور اسے رحل پر رکھ کے فر فر پڑھنے لگی۔



باہر سے شیخ احمد قلندرنامی ایک بزرگ تشریف لائے ان کی عظمت اور بزرگی کا
 یوہے ملک میں غلغلہ بلند ہوا۔ ان نووارد قلندروں کو بھی اس بات کی جستجو تھی کہ ہندوستان کے
 صاحب کمال حضرات کا امتحان لیا جائے پانی پت کے قریب کبھی جنگل میں قیام فرمایا اور تمام مشائخ
 اور فقر کی دعوت کر دی۔ جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا فقر اور مشائخ میں شیخ جلال بھی شامل تھے
 سبزے پر لمبی لمبی چادروں کا دسترخوان بچھا دیا گیا اور جملہ فقر اور مشائخ اس کے دونوں طرف
 آمنے سامنے بیٹھ گئے شیخ احمد قلند کے مریدوں نے دسترخوان پر بڑے بڑے طباق لاکر رکھ دیے
 یہ طباق سرپوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے کناروں سے گرم گرم کھانے کی ہلکی ہلکی بھاپ
 نکل رہی تھی کچھ دیر بعد شیخ احمد قلند نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ”طباقوں سے سرپوش ہٹا دیے
 جائیں۔“

حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ قلند نے فقر اور مشائخ کو حکم دیا۔ ”بسم اللہ شروع کریں“
 لیکن فقر اور مشائخ کتے میں مبتلا تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھانے کے لئے
 ہاتھ بڑھا سکتے۔

قلند نے دوبارہ کہا۔ ”بسم اللہ شروع کیجئے، آپ سب خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟“
 کسی درویش نے جواب دیا۔ ”یہ کھانے، ناشروع اور حرام ہیں ہم انہیں کس طرح
 کھا سکتے ہیں۔“

ایک درویش نے شیخ جلال کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”حضرت! اس
 بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ہم سب آپ ہی کو حکم مانتے ہیں۔“
 شیخ جلال نے جواب دیا۔ ”اس میں حیرانی اور پریشانی کی کیا بات ہے؟ پھر کھانے کی طرف
 منہ کر کے حکم دیا۔ ”وے خدا! جن چیزوں کے کھانے سے خدا نے منع فرمایا ہے وہ دسترخوان پر
 کیوں موجود ہو؟ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔“

دستر خوان پر دو دریہ بیٹھے ہوئے مشائخ اور فقر نے یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا کہ حرام اور نامشروع چیزیں آہستہ آہستہ دسترخوان سے کھسکنے لگیں وہ وہاں سے کہاں چلی گئیں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ شیخ احمد قلندر یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں شیخ جلال کی عظمت اور بزرگی کے قابل ہوتے جا رہے تھے کچھ دیر خاموش رہ کے شیخ احمد قلندر شیخ جلال کے قدموں میں گر گئے اور عاجزی سے عرض کیا یہ فقیر نے یہاں کے فقراء اور مشائخ کا امتحان لیا تھا اور میں خوش ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

اس کے بعد انہوں نے فقراء اور مشائخ کے لئے واقعی کھانے کا انتظام کیا اور انہیں کھلا پلا کے رخصت کر دیا۔

شیخ جلال سے جواب بھی وہاں موجود تھے، قلندر نے درخواست کی۔

”حضرت! مجھے اپنے مریدوں میں شامل فرمائیں اب تو میں یہاں سے کہیں بھی نہ جاؤں گا۔“
شیخ جلال نے انہیں اپنا مرید بنالیا اور کچھ عرصے بعد شیخ احمد قلندر کو خرقہ خلافت سے سرفراز کیا۔

ایک بڑی بیانیہ سرپرانی کا گھڑ لے چلی جا رہی تھیں ان کے ہاتھ پیروں میں دھتے تھا اور سب بھائی بھی کم ہی دیتا تھا کسی کسی لمحے بھڑک کھاکے گرتے گرتے جھپتی، سامنے سے شیخ جلال چلے آ رہے تھے انہوں نے بڑی بی کو روک لیا اور پوچھا ”اماں! کیا آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے؟“
بڑی بی نے بے بسی سے جواب دیا ”بیٹے! اگر گھر میں کوئی مرد ہوتا تو کیا میں خوشی سے یہ دیکھ جھیل جاتی؟“

شیخ جلال نے کہا ”اچھا یہ گھر مجھے دیجئے“

بڑھیا نے ذرا پس و پیش سے پانی کا گھڑا شیخ جلال کے حوالے کر دیا۔ آپ نے یہ گھڑا بڑھیا کے گھر پہنچا دیا اور گھر سے دوسرا خالی گھڑا ہاتھ میں لے کر کنوئیں کا رخ کیا گھڑے کو رسی میں باندھ کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پھر پانی بھر کے گھڑا کاندھے پر رکھ لیا اور گھر پہنچا کے دعا دی ”اے اللہ اس پانی میں برکت فرما میں اس قابل دم ضعیف کے اسی طرح کام آسکتا ہوں“

بڑی بی نے دریافت کیا ”لے لے بیٹا! تمہاری اس دعا سے مجھ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

آپ نے جواب دیا ”اماں! فائدہ آپ خود ملاحظہ فرمائیے گا“

آپ اتنا کہہ کر چلے آئے۔ دوسرے دن بڑھیا نے جب گھڑے کو بھر نئے کپڑے اٹھایا تو پتہ

چلا وہ کل جیسا اب لب بھر اٹھا ہے تیسرے دن پھر گھر لے کو ہلا جلا دیکھا تو پتہ چلا وہ اب بھی بھرا دکھا ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر بڑی بکی کو گھر ابھرنے کی نوبت نہ آئی۔

شیخ جلال اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے خاندان میں کسی کے توسط سے ایک کیمیاگر آگیا اس نے اس گھر میں چار، ہر طرف افلاس ہی افلاس کا فرما دیکھا، خاندان والوں نے کیمیاگر کو چاروں طرف گھیر لیا ان میں شیخ جلال کے ایک صاحبزائے بھی موجود تھے کیمیاگر نے ازراہ ہمدردی خاندان کے بڑوں سے کہا: ”حضرات! میں نے اس گھر میں ہر طرف افلاس ہی افلاس دیکھا، مجھے آپ سب کی حالت زار پر رحم چلا رہا ہے۔“

خاندان والوں نے دم سلاہ لیا وہ چپ چاپ کیمیاگر کی بات سن رہے تھے۔ کیمیاگر نے مزید کہا: ”اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے گھر کی حالت سدھاریں فقر اور فلت سے نجات ملے تو میں پیشکش کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے فن کیمیاگری سیکھ لیں اور اس سے اپنی رغبت و افلاس دور کریں۔“

خاندان والوں نے سکوت اختیار کیا۔ شیخ جلال کے صاحبزائے بھاگے بھاگے اپنے باپ کے پاس پہنچا اور خوش ہو کر عرض کیا۔
”رہا بولجان! آج ہمیں ایک ایسا آدمی میسر آ گیا ہے جو ہماری تنگدستی اور افلاس کا علاج کر سکتا ہے۔“

شیخ جلال نے چونک کر سوال کیا، ”رغبت و افلاس کا علاج، کیا مطلب؟“
صاحبزائے نے جواب دیا: ”ہات تنگدستی اور افلاس کا علاج۔ اس شخص کو فن کیمیاگری آتا ہے اور اس نے ہم سب کو یہ پیشکش کی ہے کہ اس سے کیمیاگری سیکھ کے اپنے دلدر دور کریں۔“
اپنے طیش میں آکے دیوار پر تھوک دیا اور فرمایا: ”کس کیمیا کی بات کر رہے ہو؟ اس کیمیا کا جو مجھے بھی آتی ہے تمہیں کتنا سونا درکار ہے صاحبزائے اس سامنے کی دیوار سے جتنا سونا چاہو لے لو اور اپنی غریبی دور کرو۔“

لڑکے دیکھا آپ نے جہاں تھوکا تھا وہاں کی دیوار سونے کی بن چکی تھی وہ سخت شرمندہ تھا۔

اپنے فرمایا: ”بیٹے جس کیمیا کی تم بات کر رہے تھے وہ ایک پیچیدہ اور مشتبہ عمل ہے اور اس میں ہمیشہ ناکامی کا خطرہ رہتا ہے لیکن جس کیمیا سے میں واقف ہوں اس میں اس قسم کا کوئی خطرہ ۲۹۹

نہیں اس لیے میرا کہنا نا تو اور کیا ہے سعادت سیکھ لو ۛ

بیٹے نے شرمندہ ہو کے گردن جھکالی اور دیر تک معافی طلبی کے انداز میں بیٹھا رہا۔

عبادت و ریاضت میں اتنی زیادتی ہوئی کہ استغراق کا غلبہ پہنچنے لگا نماز کا وقت آتا تو میرا آپ کے کان میں آہستہ آہستہ حق حق جل جلالہ کہتے۔ آپ ہوش میں آ جاتے اور وضو کر کے نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد پھر استغراق میں چلے جاتے۔

آپ کے پانچوں صاحبزادے آپ کے قرب بیٹھے ہوئے تھے اور آپ استغراق کا عالم طاری تھا۔ مرید اور صاحبزادگان گھڑیاں گن گن کے وقت گزرتے تھے عصر کی نماز کا وقت قریب آتا جا رہا تھا ابھی لوگ حق حق جل جلالہ کان میں کہنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپ نے خلاف توقع خود بخود آنکھیں کھول دیں اور اپنے بڑے صاحبزادے خواجہ عبدالقادر کو مخاطب کیا

”و بیٹے! مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک عجب حکم دیا ہے“

عبدالقادر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ شیخ جلال نے فرمایا بیٹے دہلی میں سید جلال مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری سخت علیل ہیں ان کی زندگی پوری ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی عمر کا کچھ حصہ انہیں بخش دوں تمہاری کیا رائے ہے؟

عبدالقادر نے جواب دیا: ”باوا جان! خدا آپ کو ہماری عمر میں سے بھی کچھ دے دے ہم کیسے طرح گوارا کریں گے کہ آپ کی عمر میں کچھ کمی ہو جائے۔“

آپ نے اپنے دوسرے بیٹے ابراہیم سے مخاطب ہوئے فرمایا: ”بیٹے! ابراہیم! اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟“

ابراہیم نے غمزدہ ہو کر جواب دیا: ”دی جوا بھی ابھی بھائی عبدالقادر فرمایا چکے ہیں“ اس کے بعد آپ اپنے تیسرے صاحبزادے شبلی سے مخاطب ہوئے اور شبلی: ”تم کیا کہتے ہو؟“ شبلی نے اپنی اندوئی اذیت پھیلاتے ہوئے پھر عرض کیا: ”باوا جان! میرا جواب اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے۔“

شیخ جلال نے کہا: ”ہاں ہاں کہو جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو، شرمناک نہیں“ شبلی نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا: ”باوا جان! میری دعا ہے کہ خدا آپ کی عمر داز کرے لیکن اگر حکم الہی یہی ہے کہ آپ اپنی عمر کا کچھ حضرت جہانیاں جہاں گشت کو مرحمت فرمادیں تو آپ کو تعمیل حکم میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنی چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ عدم تعمیل کے باعث آپ کو

شرمندگی اٹھائی پڑے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ایسی ایسی ہزار جاہیں نثار کر دی
جائیں تب بھی کوئی بات نہیں۔“

شیخ جلال شبلی کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا: ”شبلی! ذرا میرے قریب آؤ“
شبلی اللہ کے باپ کے قریب پہنچ گئے باپ نے بیٹے کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے قریب کیا اور پیشانی
پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: ”خدا تمہاری عمر دوا کرے شبلی۔ تمہارے جواب نے ہماری طبیعت خوش کر دی۔“
اس کے بعد آپ نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اور خود استغراق میں چلے گئے کچھ
دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں اور اپنے آس پاس دیکھا بڑے صاحبزادے عبدالقادر اب بھی موجود تھے
آپ نے انہیں مسکرا کے دیکھا اور دریافت کیا: ”تم نہیں گئے، ابھی تک بیٹھے ہو؟“

عبدالقادر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا: ”باوا جان! مجھے آپ کی فکر پریشان کر رہی ہے۔“
شیخ جلال نے کہا: ”جب تم یہاں بیٹھے ہی رہ گئے ہو تو ذرا میرے ساتھ چلو۔“
عبدالقادر نے پوچھا: ”کہاں باوا جان؟“

آپ نے جواب دیا: ”جہاں میں جا رہا ہوں۔“

”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“ عبدالقادر کو حیرت تھی کہ جو شخص ایک عرصے

سے خانقاہ سے باہر نہ گیا ہو اس نے اس وقت کہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟

شیخ جلال کھڑے ہو گئے اپنا دامن پیر عبدالقادر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”عبدالقادر
میرے پیروں پر اپنے پیر رکھ دو۔“

بیٹے نے باپ کے حکم کا تعمیل کر دی۔

باپ نے مزید حکم دیا: ”اسی آنکھیں بند کر لو۔“

بیٹے نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اپنے حکم دیا: ”آنکھیں کھول دو۔“

بیٹے نے آنکھیں کھول دیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی، یہ پانی پت سے بالکل مختلف جگہ تھی
ڈرتے ڈرتے باپ پوچھا: ”باوا جان! یہ کون سی جگہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”دہلی، ہم مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پاس چل رہے ہیں، سامنے
دیکھو وہ ان کا آستانہ ہے۔“

بیٹے نے حیرت سے جہانیاں جہاں گشت کے آستانے کی طرف دیکھا اور باپ کے ساتھ

چل دیا۔ جب یہ لوگ آستانے میں داخل ہوئے اس وقت جہانیاں جہاں گشت پر نزع کا عالم

طاری تھا۔ ان کے اس پاس مریدوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ
فیروز شاہ تغلق بھی جہانیاں جہاں گشت کا مرید تھا۔ اس وقت وہ بھی آیا ہوا تھا لیکن اپنے
پیر کی آخری حالت کا اندازہ کر کے وضو کرنے چلا گیا تھا۔ شیخ جلال نے جہانیاں جہاں گشت
کے سرہانے کھڑے ہو کر آواز دی یہ مخدوم جلال بخاری ؒ

جہانیاں جہاں گشت نے آنکھیں کھول دیں اور شیخ جلال کو دیکھ کر مسکرائے لگے۔
اپنے پوچھا: ”کیا حال ہے؟“

جہانیاں جہاں گشت نے کمزور آواز میں جواب دیا ”اللہ کا شکر ہے، ایسا لگتا ہے
جیسے چل چلاؤ کا وقت قریب آگیا ہے ؎

اپنے کہا یہ نہیں ایسا نہیں ہوگا، اٹھو اور وضو کرو ؎
جہانیاں جہاں گشت بمشکل اٹھے، شیخ جلال نے انہیں وضو کرایا اور دو رکعت
نماز پڑھائی۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ان کے جسم پر پھیرتے ہوئے فرمایا یہ مخدوم
جلال! میں حکم خدا پرانی زندگی کے دس سال تمہیں بخشا ہوں ؎

جہانیاں جہاں گشت کو ایسا محسوس ہوا جیسے توانائی کی تیز روان کے جسم میں اچانک
داخل ہو گئی۔

شیخ جلال نے اپنے بیٹے عبدالقادر سے کہا: ”بس بیٹے اب واپسی کی تیاری
کرو، اپنا کام ختم ہو گیا ؎
بیٹا باپ کے حکم کی تعمیل میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ باپ نے حکم دیا ”میرے پیروں
پر اپنے پیر رکھ لو ؎

بیٹے نے باپ کے پیروں پر اپنے پیر رکھ دیے حکم ملا ”آنکھیں بند کر لو ؎
عبدالقادر نے آنکھیں بھی بند کر لیں اس کے بعد پھر حکم ملا ”آنکھیں کھول دو ؎
بیٹے نے آنکھیں کھول دیں اور خود کو پانی پت میں پایا۔

آپ کے چلے جانے کے بعد بادشاہ فیروز شاہ تغلق بھی وضو کر کے اپنے پیر کی خدمت میں حاضر
ہوا اور اسی وقت یہ محسوس کر لیا کہ اب ان کی حالت بہت ٹھیک سمجھ دیافت حال پر جب اصل
واقعہ معلوم ہوا تو اسے شیخ جلال سے ملاقات نہ ہونے کا سخت ملال ہوا اور کہنے لگا ”ہم کتنے
خوش قسمت حکمران ہیں کہ ہمارے عہد میں ایسے ایسے عظماء موجود ہیں اور ہمیں افسوس ہے

کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

کسی مصاحب نے عرض کیا، در حضور والا! اگر ان سے ملاقات ہی کر لے ہے تو آپ پانی پت چلے چلیے، وہاں تفصیل سے کہیں، سنیں۔



فیروز شاہ تغلق مصاحب کی بات مان گیا اور پانی پت پہنچ گیا اور آستانے پر کھڑے ہو کے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اپنے سے اندر بلایا اور پوچھا، ”اس غریب کے در پر بادشاہ کی آمد کا مقصد؟“ بادشاہ نے کہا، ”آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آپ دہلی تشریف لے گئے لیکن بد قسمتی سے یہ خاکسار شرف نیاز نہیں حاصل کر سکا تھا اس لیے یہاں پانی پت چلا آیا۔“

آپ نے کہا، ”تم نے یہیں اچھی طرح دیکھ لیا، اب واپس جاؤ۔“

بادشاہ نے خوشامد سے کہا، ”میں آپ سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔“

آپ نے کہا، ”پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

بادشاہ نے سوال کیا، ”حضرت! کیا آپ خدا کے عزوجل کو بھی دیکھا ہے؟“

آپ نے جواب دیا، ”حق سبحانہ، تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھنا از روئے ثبوت محال ہی

نہیں، ناممکن ہے لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سامنے کو ضرور دیکھا ہے۔“

بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور آپ کے وقت وافر مقدار میں نقد اور

جنس آپ کا خدمت میں پیش کیا لیکن آپ نے اپنے لینے سے انکار کر دیا اور کہا، ”بابا! ہم اہل فقر انہیں لے کر کیا کریں گے؟“

فیروز شاہ نے اصرار کیا، ”اگر آپ انہیں قبول نہیں کریں گے تو ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔“

آپ نے جواب دیا، ”بابا! جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہم فقیر لوگ ہیں ان کی حفاظت کے لیے

دربان پاسبان کہاں سے لائیں گے، یہ چیزیں آپ ہی کو زیب دیتی ہیں، ہم تو معاف ہی رکھیں۔“

فیروز شاہ تغلق کچھ دیر گم صدم کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے شیخ جلال کے آستانے کے باہر کسی شخص سے پوچھا، ”حضرت کی اولاد میں کتنی ہیں؟“

اس شخص نے جواب دیا، ”کئی ہیں۔“

بادشاہ نے پوچھا، ”ان میں کوئی بڑا کاہر گونا گوا بھی ہے؟“

”وہاں ایک بڑا گونا گوا بھی ہے۔“ کسی نے جواب دیا۔

بادشاہ نے اس شخص سے پوچھا ”اس کو ننگے بہرے سے مجھے بھی ملاؤ“
 اس شخص نے جواب دیا ”ابھی حاضر کرتا ہوں لیکن حضور کا اس سے کام کیا ہے؟“
 بادشاہ نے ناگواری سے کہا ”تم بحث مت کرو اور جلد از جلد اس رطے کو حاضر کر دو“
 اس شخص نے دراز دیر بعد اس کو ننگے اور بہرے کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔
 بادشاہ نے کچھ دیر تک ان صاحبزادے کو بغور دیکھا اور پھر اشاروں میں کہا ”یہ چند چیزیں میں تمہیں تحفے
 میں دینا چاہتا ہوں“

گو ننگے بہرے بیٹے نے بادشاہ کو، پھر ان چیزوں کی طرف دیکھا پھر ہاتھوں کے اشارے
 اور ہنٹوں کی حرکت سے دریافت کیا ”یہ چیزیں کس کام آتی ہیں؟“
 بادشاہ نے اپنے مصاحب خاص کو حکم دیا کہ وہ اس بات کا اشارہ ہی میں جواب دے
 مصاحب خاص نے پہلے انگلیوں کو اس طرح یک جا کیا گویا نوار بنار ہا ہو پھر اسے منہ تک لے گیا اور
 فوراً اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا گویا اس نے جواب دیا تھا ”اس سے روزی کا مسئلہ حل ہوتا ہے
 کھانے پینے کا سامان آتا ہے اور اس کے ذریعے پیٹ کا جہنم بھرا جاتا ہے“

گو ننگے بہرے بیٹے نے اشاروں ہی میں اس طرح جواب دیا کہ پہلے تو اس نے آسمان کی طرف
 ہاتھ اٹھایا پھر انگلیوں سے نوار بنار کے منہ تک لے گیا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر پھر آسمان کی طرف
 دوبارہ اشارے کرنے لگا گویا کہہ رہا ہو ”یہ میرے کس کام کا جس نے پیدا کیا ہے وہی رزق بھی
 دے گا اور رزق دینے والا اللہ ہے جس نے منہ اور پیٹ کی تخلیق کی ہے“ وہی اس جہنم کا ایندھن
 بھی عطا کرے گا“

بادشاہ حیران و ششدر اس کو ننگے بہرے کی شکل دیکھتا رہا گیا۔ اس نے شرمندہ و خفیف
 ہو کر وہ ساری چیزیں خانقاہ کے باہر غریبوں میں تقسیم کر دیں۔



فیروز شاہ تغلق کے خالہ زاد بھائی کا نام فتح خاں تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے
 تھے بادشاہ کے پاس رسول اللہ کے قدم مبارک کا ایک نشان موجود تھا اور بادشاہ نے یہ طے کیا تھا کہ
 انتقال سے پہلے وہ وصیت کر جائے گا کہ اس نشان مبارک کو تکفین سے پہلے اس کے سینے پر رکھ
 دیا جائے لیکن فتح خاں نے کہا کہ نشان میں لایا ہوں اس لئے اصولاً یہ حق مجھے پہنچتا ہے
 کہ مرنے کے بعد تکفین سے پہلے میرے اپنے سینے پر رکھواؤں گا“

انصاف پسند بادشاہ دیرنگ اپنے خالہ زاد بھائی فتح خاں سے بحث و مباحثہ کرتا رہا دونوں ایک دوسرے کو دلیلوں اور مثالوں سے رُک دینے کی دیرنگ کوششیں کرتے رہے لیکن جب اس کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بادشاہ نے نہایت عمدہ اور قابل قبول تجویز پیش کیا۔ اس نے کہا ”فتح خاں یہ ایک ایسی بحث ہے جس میں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا جی جیتنا ناممکن ہے اس لئے میں اس کا ایک نہایت مناسب حل پیش کرتا ہوں۔“

فتح خاں نے دریافت کیا۔ ”وہ کیا؟“

بادشاہ نے جواب دیا ”ہم میں سے جو پہلے مرجائے یہ نشان مبارک تکھنیں سے پہلے اس کے سینے پر رکھ دیا جائے اس طرح ہم دونوں اپنی خوش قسمتی کے منتظر رہیں گے اور کوئی نہیں جانتا کہ ہم میں سے کون پہلے مرے گا اور کون بعد میں۔“

فتح خاں بھی اس تجویز سے متفق ہو گیا کیونکہ اس میں دونوں ہی کے لئے موقع موجود تھا اس کے باوجود فتح خاں کے دل و دماغ ہر وقت اس فکر میں رہتے کہ یہ بازی بادشاہ سے کس طرح جیتی جائے کسی دن بعد اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی اس نے شیخ جلال اور جہانیاں جہاں گشت کا واقعہ آنکھوں سے دیکھ رکھا تھا اس نے سوچا کہ یہ سعادت شیخ جلال ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اس نے فوراً اٹھوڑا نکالا اور اس پر بیٹھ کے پانی پیت روانہ ہو گیا۔

خاندانہ کے باہر شیخ زینا نامی مست قلندر ہاتھی کی طرح جھوم رہے تھے اور ان کی قلندری اور تول کی زوداثری کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ ان سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوتے تھے فتح خاں نے اپنا اٹھوڑا ان کے سامنے رکھا اور خاندانہ کے اندر داخل ہونا چاہا۔

شیخ زینا فتح خاں کو دیکھتے ہی جھومتے ہوئے اُٹھے اور راستہ روک کر کھڑے ہو گئے قلندرانہ آن بان سے پوچھا ”کہہ جانا ہے؟“

فتح خاں نے نہایت تحمل سے جواب دیا ”بابا شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء کے پاس“

شیخ زینا نے دونوں ہاتھ پھیلا کے راستہ روک لیا بولے ”اندر مت جانا دیر پچھتے گا۔“

فتح خاں نے ان کے ہاتھ ہٹانا چاہے بولے ”شیخ زینا! میرے سا! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب اندر جانے سے مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔“

شیخ زینا نے کہا ”تجھے میں روک سکتا ہوں۔ ابھی اسی وقت لیکن مشیت ایزدی۔“

ہائے مشیت ایزدی۔

فتح خاں نے کہا: ”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا اندر جلا مشیتِ ایزدی میں داخل ہے تو میرا واسطہ دوں کیوں کھڑے ہو؟ سامنے سے ہٹ جاؤ اور مجھے اندر جلنے جا دو۔“
 شیخ زینل نے بہم ہو کے کہا: ”بچے! تو اندر تو چلا جاؤ گے گا لیکن یاد رکھو کہ اندر سے زندہ سلامت نہیں نکلے گا۔“

فتح خاں نے طنز کیا: ”جناب! میں اندر زندہ و سلامت پہنچوں گا اور زندہ سلامت ہی واپس آؤں گا۔“

شیخ زینل نے پرجوش لہجے میں کہا: ”او یا شاہ کی خالہ کیسے! اگر تو اندر سے زندہ و سلامت نکل آیا تو میں تجھے اس بات کی اجازت دے دوں گا کہ میرا سیرا بن پھاڑ دے لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں تیرا جامہ ہستی خود چاک کر دوں گا۔“

فتح خاں تو یہی چاہتا تھا۔ شیخ زینل کے دونوں ہاتھ ہٹکے اندر چلا گیا۔ اندر شیخ جلال استغراق میں تھے۔ فتح خاں ایک گوشے میں ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا اور استغراق سے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد شیخ جلال نے آنکھیں کھول دیں اور فتح خاں کو سرسری نظر سے دیکھ کے ارشاد فرمایا: ”کھڑے کیوں ہو، جاؤ لے لو۔“

فتح خاں سلام کر کے اٹھنے قدموں واپس ہوا۔ باہر شیخ زینا بدستور کھڑے جھوم رہے تھے فتح خاں نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا: ”واہ شیخ جی! میں تو زندہ و سلامت واپس بھی آگیا اور آپ کو سلام کر کے گھر واپس جانے کی اجازت طلب کر رہا ہوں۔“

شیخ زینا نے چہرے کے جواب دیا: ”فتح خاں! یہ اتفاق کی بات ہے کہ تیرا تیرا نشتانہ پر لگ گیا اور میں ذرا بے بس ہو گیا لیکن یہ بات بھی کان کھول کے سن لے کہ تو پانی پت سے دہلی تک نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ میں نے تیرا جامہ ہستی چاک کر دیا ہے۔“

فتح خاں نے ہنس کر کہا: ”حضرت یہی تو خاکسار چاہتا تھا۔“

فتح خاں نے گھوڑے پر بیٹھ کر اسے ایڑھ لگائی اور آٹا آٹا وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس سفر میں اس نے یہ عجیب سی بات محسوس کی کہ جیسے جیسے دہلی قریب آرہی تھی فتح خاں پر نیند کا شدید غلبہ ہوتا جا رہا تھا جب یہ نیند ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ گھوڑے سے اتر کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ نیند تھی کہ اس کے وجود پر چھائی چلی جا رہی تھی وہ اپنے انجام سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر چادر ڈال لی اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ کی

نیز سو گیا۔ فتح خاں کا موت کی خبر بجلی کی رو کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ بادشاہ نے اس کی نہایت شاندار طریقے سے تجہیز و تکفین کا رسم ادا کیا۔ اس نے تکفین سے پہلے فتح خاں کے سینے پر رسول اللہ کا نشان مبارک دکھ دیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر افسردہ لہجے میں کہنے لگا: ”فتح خاں تم جیت گئے۔ مجھے حیرت ہے یہ ترکیب میری سمجھ میں کیوں نہ آئی تھی، خیر جو ہوا سو ہوا۔“

فتح خاں کو اس کی خواہش کے مطابق دفن کر دیا گیا۔

آپ نے ایک سو ستر سال سے زیادہ زندگی پائی اور اس مدت میں آپ نے اسلام اور انسانوں کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آپ کو گوگ زندگی ہی میں کبیرا لادیا اور قطب ربانی جیسے گرانقدر لقب دے چکے تھے ان کے جنریدوں نے غیر معمولی شہرت پائی، وہ ہیں شیخ زینا شیخ احمد قلندر شیخ احمد عبدالحق کار دولوی اور سید محمود۔ شیخ زینا کا مزار اندری، شیخ احمد قلندر کا ملتان میں اور شیخ عبدالحق کار دولوی میں ہے آپ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۷۶۵ھ میں ہوئی۔



حضرت سیدی مولہؒ

دو گھنٹے دن چڑھے ایک خوبصورت اور باریش شخص حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شانِ استغنا سے گویا ہوا۔ ”السلام علیکم“ بابا فرید نے اس اجنبی کو بہ نظر خاص ملاحظہ فرمایا اور افسوس زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام بابا سیدی مولہ“

اجنبی نے مسکرا کر سوال کیا۔ ”بابا فرید! آپ ہم سے واقف ہیں؟“
 ”ہاں، خوب“ بابا فرید نے جواب دیا۔ ”اس بات سے بھی کہ تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟“
 اجنبی نے کہا۔ ”فی الحال تو یہ ناچیز آپ کی خدمت میں پہنچے گا اور جو قدم بھی اٹھائے گا پہلے آپ کی مرضی معلوم کرے گا“

”دکاش تم ہی کرتے“ بابا فرید نے اداسی سے کہا۔ ”لیکن یہیں معلوم ہے کہ تم وہی کرو گے جو تقدیر الہی ہے، سیدی مولہ! ہماری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ امر الیٰ صحتیں ہم فقراء کو داس نہیں آتیں اگر ہم ایسا کریں گے تو خود کو برباد کر لیں گے تم بھی اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ ملوکیت اور امارت کا سایہ تک تمہیں داس نہ آئے گا ان سے اس طرح بھاگنا جس طرح سورج سے ستارے“

سیدی مولہ بابا فرید کے سامنے دو زانو بیٹھ گئے، بولے۔ ”بابا! جیسا آپ فرمائیں گے یہ گناہگار اس پر عمل کرے گا“ فیری اور امیری کا کیا میل؟ ایک دن کا نور ہے تو دوسرا شب کی سیاہی، اس فرق سے یہ ناچیز بھی آگاہ ہے“
 بابا فرید نے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“
 سیدی مولہ نے جواب دیا۔ ”چند دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، اس کے بعد مدعا عرض کروں گا“

بابا فرید نے ہنسنے کی اجازت دے دی، سیدی مولہ ان کی خدمت میں پہنچے لگے۔

بابا فرید نے سیدی مولہ کو سخت ترین عبادت و ریاضت میں مشغول دیکھا اور دل سے ان کی عزت کرنے لگے لیکن جب بھی سیدی مولہ سے ان کی نظریں ملتی، بابا فرید اُداس ہو جاتے اور کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے۔ سیدی مولہ بھی بابا فرید کی اس ذہنی کیفیت اور روحانی کوفت سے واقف تھے لیکن کوئی سوال نہ کرتے تھے۔ کئی دن بعد ظہر کی نماز پڑھ کر بابا فرید جیسے ہی ذرا فراغت سے بیٹھے، سیدی مولہ سلام کر کے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے سیدی مولہ؟“
سیدی مولہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! ناچیز دہلی جانا چاہتا ہے بس بابا کی اک ذرا اجازت درکار ہے۔“

بابا فرید کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور چند ثانیے اسی حالت میں گزار دیے، پھر آنکھیں کھول کر دریافت فرمایا۔ ”کیا یہ جتنی فیصلہ ہے؟“
سیدی مولہ نے ادب سے جواب دیا۔ ”جیسا کہ یہ ناچیز پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اپنا مدعا بعد میں ظاہر کرے گا وہ مدعا یہ ہے کہ دہلی چلا جائے، بس ذرا حضور کی اجازت درکار ہے۔“

بابا فرید نے کرب ناک لہجے میں کہا۔ ”ہم تمہیں دہلی جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں دہلی جانا مقدرات میں سے ہے آسمانی فیصلہ کس طرح بدل سکتا ہے۔“
سیدی مولہ نے انکار سے سوال کیا۔ ”کوئی نصیحت، کوئی ہدایت؟“
بابا فرید نے جواب دیا۔ ”سیدی! ہم وہی باتیں پھر دہرائیں گے جو تم سے پہلے کہہ چکے ہیں، تم دہلی جا رہے ہو اور وہاں پہنچ کر تم یہ چاہو گے کہ اپنا دروازہ سب پر کھلا رکھو اور نام پیدا کرو۔ ٹھیک ہے تم جس طرح چاہو اور جس طریقے میں اپنی بہتری اور بھلائی دیکھو اسے اختیار کرو لیکن ہم تمہیں ایک نصیحت ضرور کریں گے اگر تم اس پر عمل کرو گے تو فائدے میں ہو گے ورنہ ہلاکت میں پڑو گے۔“

سیدی مولہ نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی سوال کیا۔ ”ارشاد؟“
بابا فرید نے افسوس سے کہا۔ ”ملوک اور امرا سے پرہیز، اپنی خانقاہ میں ان کی آمد کو مہلک اور وجہ تباہی سمجھنا، ہمارا یہ قول ہمیشہ یاد رکھنا کہ جو درویش ملوک اور امرا سے میل جول کا دروازہ کھولتا ہے وہ اپنا دین اور دنیا دونوں خراب کر لیتا ہے۔“

سیدی مولہ نے کسی خیال میں ڈوب کر آہستہ سے کہا : ”بہتر ہے ناچیز ان گراں مایہ ہدایت کا بطور خاص خیال رکھے گا لیکن تقدیر الہی سے کوئی انسان کس طرح بچ سکتا ہے ؟“

سیدی مولہ بابا فرید سے رخصت ہو کر دہلی چلے گئے ۔ بابا فرید نے ایک سردارہ بھری اور مغموم آواز میں ارشاد فرمایا : ”بابا تم بھی کیا کرو گے لوح محفوظ میں تو کچھ اور ہی رقم ہے جاؤ اور اپنے حصے کا کام انجام دو“



سیدی مولہ نے دہلی پہنچ کر ایک شاندار خانقاہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، یہ منصوبہ معمولی سرمائے کا نہیں تھا اس پر اتنا سرمایہ خرچ ہوا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لوگ حیران تھے کہ ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی فردوروں اور کاریگروں کو کام سے چھوڑتے ہی چاندی کے نئے نئے سکے تقسیم کیے جاتے۔ دہلی والے حیران تھے کہ سیدی مولہ ایک بے نوا اور بے سہارا اجنبی جن کا دہلی میں کوئی شناسا نہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی وظیفہ مقرر نہیں، جاگیر میں کوئی گاؤں نہیں۔ پھر ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آگئی؟ لوگ اس جگہ کی جستجو کرنے لگے جہاں سیدی مولہ نے اپنا خزانہ چھپا رکھا تھا سرکاری حکام کو یہ شبہ تھا کہ سیدی مولہ دنیا دار انسان ہیں اور کہیں کچھ سال لگا رکھی ہے جس میں چاندی کے سکے ڈھالا کرتے ہیں انہوں نے بھی سیدی مولہ کے شب و روز کا خاموش محاسبہ شروع کر دیا۔ محاسبے سے ایک بات کی تو تصدیق ہو گئی وہ یہ کہ سیدی مولہ نماز جماعت سے نہیں پڑھتے خانقاہ میں کہیں چھپ کر پڑھ لیتے ہوں تو دوسری بات ہے وہ نہ کسی نے انہیں نماز پڑھتے یا ریاضت و مجاہدے میں مشغول نہیں دیکھا۔

خانقاہ کے تعمیر ہوتے ہی لنگر جاری ہو گیا اور دونوں وقت ہزاروں آدمیوں کے لئے لذیذ ترین کھانے پکھے لگے۔ زمانے کے ستارے ہوئے پریشان حال یہیں پناہ لیتے اور پیٹ کی آگ بجھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے۔ دہلی کے امرا اور حکام اس عجیب غریب شخص کی زیارت کو حاضر ہونے لگے سیدی مولہ ہر ایک سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے اور جب یہ امرا اور حکام ان سے مل کر واپس جاتے لگتے تو سیدی مولہ انہیں ہزار دو ہزار چاندی کے سکے یا اشرفیاں بطور انعام عطا فرماتے ان کا یہ طرز عمل اور زیادہ چونکائی دینے والا تھا۔

سیدی مولہ ایک چار درجہ جسم پیلیٹے دراز تھے ان کے آس پاس مصیبت زدوں کا ہجوم تھا یہ سب حاجتمند تھے کسی کو اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور اس میں روپے دوکار

تھے کوئی بول نہ بول سکتا تھا اور لا ولد ہونے کی وجہ سے بے سہارا تھا اور بڑھاپے کا ضعف اسے محنت و مشقت سے روکے ہوئے تھا کوئی صاحب اولاد تو تھا لیکن ناکارہ، نالائق اور کام نہ لانے والی اولاد کے ہاتھوں تنگ تھا اور سیدی مولہ سے مدد کا طالب تھا، کسی کی ملازمت چھوڑ چکی تھی یا کاروبار ختم ہو گیا تھا، کوئی سرکاری معتب تھا اور دانے دانے کو ترس رہا تھا، حاجت مندوں اور مصیبت زدوں کا یہ ہجوم ان کے گرد و پیش امداد کا طلب گار تھا۔ سیدی مولہ سبھی سے خوش اخلاقی سے پیش آ رہے تھے۔

کسی سے کہہ دیا ”اُدھر ہمارے بستر کے پاس جاؤ اور تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے (روپے) نکال لو۔“

کسی سے کہتے ”دیکھو اس ہانڈی میں جو کچھ رکھا ہے نکال لاؤ۔“
تکیے والے نے تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے حاصل کر لیے اور ہانڈی والے نے ہانڈی کے اندر سے دو سو اشرفیاں نکال لیں۔

ایک ادھیر ٹمٹم شخص ہجوم کو جیتا رہا سیدی مولہ کے قریب پہنچا اور ان کے روبرو کھڑے ہو کر زار و قطار آنسو بہانے لگا۔ سیدی مولہ نے ہنستے ہوئے اُسے دیکھا اور دریافت فرمایا ”کیا بات ہے؟ تم رو کیوں رہے ہو؟“

اس شخص کی آنکھیں پر زلالا بن گئیں اور داڑھی کے بال اولتی، جس سے آنسو کے قطرات ٹپ ٹپ قدموں میں گر رہے تھے۔

سیدی مولہ کے دل پر ان آنسوؤں نے کوئی اثر نہ کیا بدستور دلاپڑ والی سے پوچھا۔
”آخربات کیا ہے اور تم یہ مگر مجھ کے آنسو کیوں بہا رہے ہو؟“

اس شخص نے رقت زدہ آوازیں کہا ”افسوس کہ میں آپ کو نہایت ہمدرد اور انسان دوست درویش سمجھتا تھا لیکن آپ جو کچھ مجھ سے فرما رہے ہیں اس سے پتہ چلا کہ آپ نہایت سخت دل اور ظالم انسان ہیں، میں فلک زدہ، زمانے کا مارا، دل نگار انسان ہوں اور آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے اپنے درد کا درمان چاہوں گا لیکن آپ نے میرے زخم خوردہ دل سے بہنے والے آنسوؤں کو مگر مجھ کے آنسو کہہ کر میرے دل پر آرا چلا کے رکھ دیا ہے۔“

سیدی مولہ نے ترشی سے کہا وہ لفاظی کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں جو کچھ کہنا ہے

اُس شخص نے کہا: حضرت! میں کل تک بادشاہ کی فوج میں اعلا منصب پر فائز تھا لیکن معلوم نہیں کس بات پر بادشاہ کی نظر مجھ سے پھر گئی اور میں بادشاہ کا معتب قرار پائی اب عالم یہ ہے کہ میں بھاگتا اور منہ چھپاتا پھر رہا ہوں اور بادشاہ کے ملازمین مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت گرفتار کر لیا جاؤں اور قتل کے گھاٹ اتار دیا جاؤں اور اگر قتل کے گھاٹ نہ بھی اتارا گیا تو یقینی امر ہے کہ اب میں کہیں ملازمت نہیں پاسکتا۔ ایک لڑکے اور چار جوان جہاں لڑکیوں کا ساتھ ہے سدا کی روگی بیوی ہے جس کا آٹے دن علاج ہوتا رہتا ہے ان گراں مصارف پر بیکاری اور بادشاہ کا عتاب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ میں اندر سے کتنا دکھی اور پریشان انسان ہوں۔

سیدی مولہ نے غیر متاثر لہجے میں پوچھا: تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟

اس شخص نے جواب دیا: صرف یہ کہ میں معاشی بد حالی اور تباہ کاری سے محفوظ

رہوں۔

”اور کچھ؟“

”اور یہ کہ میں اپنی چاروں لڑکیوں کی فوراً ہی شادی کر دینا چاہتا ہوں ان کے لئے کم از کم دس ہزار اشرفیاں درکار ہیں اگر میں ان چاروں کے بار سے سبک دوشی حاصل کر لوں تو میرا بوجھ بہت زیادہ ہلکا ہو جائے گا اور میں زلمے کی ستم دانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکوں گا۔“

”اور کچھ؟“ سیدی مولہ کا ٹیکہ کلام معلوم ہو رہا تھا۔

”اور یہ کہ میری بیوی کی بیماری آناری پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے اس میں کم از کم دو ڈھائی ہزار اشرفیاں مزید عطا فرمادیں کہ میں اس کا علاج جاری رکھ سکوں۔“

”اور کچھ؟“

”اور یہ کہ مجھے اپنے روزمرہ کے لئے کم از کم تین چار ہزار اشرفیاں مزید عنایت فرمادیں تاکہ اگر دو چار سال ملازمت نہ بھی ملے تب بھی میں اپنا کام باسانی چلا سکوں۔“

سیدی مولہ کے پاس ایک ہی سوال تھا: ”اور کچھ؟“

اس شخص نے جواب دیا: ”اور یہ کہ میں کم از کم چھ ہزار اشرفیوں کا مقروض ہو چکا ہوں، چاہتا ہوں آپ قرض کا یہ بوجھ بھی اتر وادیں تو بڑا کم ہو گا۔“

سیدی مولہ نے جواب دیا: ”جو چاہتے ہو ہو جائے گا، اور کچھ؟“

”سہر دست اگر یہی ہو جائے تو بندہ پروری ہوگی، آگے کیا عرض کروں؟“

سیدی مولہ نے بے نیازی سے ارشاد فرمایا: ”جن رقوم کا تم نے ذکر کیا ہے
 ذرا ان کا میزان تو کرو، کل کتنی رقم بنتی ہے اور اپنی یہ مجموعی رقم اسی وقت لیتے جاؤ۔“
 یہ شخص کچھ دیر حساب لگاتا رہا پھر بولا ”حضرت! یہ کل رقم پچیس ہزار اشرفیاں بنتی
 ہے آپ خود بھی حساب لگالیں۔“

سیدی مولہ نے ہنستے ہوئے کہا: ”ہمیں حساب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ
 ہم جانتے ہیں کہ کل رقم بائیس ہزار پانچ سو اشرفیاں بنتی ہے لیکن تم ایک حریفیں اور دغا باز
 انسان ہو، تم جو بات کرو گے مبالغے اور جھوٹ کی آمیزش کے بغیر نہ کرو گے، بہر حال ہم یہ
 بھی نہیں چاہتے کہ تم پشیمانی اٹھاؤ جاؤ اور جہاں خانقاہ کی بڑی دیگ رکھی ہے اسے ذرا
 کھسکا کر ایک طرف کر دو، اس کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے تم اس گڑھے میں جو کچھ بھی پاؤ
 ہمارے پاس لے آؤ۔“

یہ شخص بھاگ بھاگ دیگ تک پہنچ گیا اور زور لگا کر دھکا دے کر دیگ کو ایک طرف
 کھسکا دیا، اس کے نیچے ایک گڑھا تھا اور گڑھے میں اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں پڑی ہوئی
 تھیں اور ہر تھیلی میں پانچ پانچ ہزار اشرفیاں تھیں، یہ ساری کی ساری بالکل نئی چمچاتی ہوئی
 تھیں اس شخص کی آنکھیں خیر ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دیگ کے نیچے گڑھے میں
 اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں کہاں سے آگئیں اور ان میں مطلوبہ تعداد ہی میں اشرفیاں کیوں نکلیں؟
 یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر سیدی مولہ کے پاس پہنچ گیا بولا: ”حضرت!
 تھیلیاں تو مل گئیں، بڑی نوازش، اس کرم گزری اور غریب پرورداری کا کس زبان سے شکریہ
 ادا کروں۔“

سیدی مولہ نے اسے ڈانٹ دیا: ”فرمایا: ”ہم جانتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو لیکن
 ہمیں بھوٹے سوال کو بھی رد کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی اس لئے تم جو کچھ چاہتے
 تھے اسے پورا کر دیا گیا پھر پوچھا: ”کیا سب کچھ بھوٹ نہیں تھا۔ جو داستان تم نے ہمیں سنائی
 کیا اس میں ذرا سا بھی سچ موجود ہے؟“
 یہ شخص تھرتھہر کانپنے لگا۔

سیدی مولہ نے نرمی سے کہا: ”ڈرو مت، تم صرف اس بات کا اقرار کر لو کہ تم نے ہم
 سے جو کچھ بھی کہا وہ سب جھوٹ ہے، دروغ گوئی ہے افسانہ طرازی ہے داستان نوازی ہے۔“

اس شخص کی قوت گویائی جواب دے گئی وہ کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا لیکن زبان

ساتھ نہیں دے رہی تھی ۔

سیدی مولے نے کہا ”تم بادشاہ کے جاسوس، مخبر اور سرِ رخ رساں ہو جس کے سپرد بادشاہ نے یہ خدمت کی ہے کہ ہم سے ملے، اپنے دکھ درد کی ایک فرضی داستان سناؤ اور امداد طلب کرے پھر جب ہم اشرفیوں سے مدد کریں تو یہ سمجھنے کا کوشش کی جائے کہ یہ رقم کہاں سے دی جا رہی ہے اور کہاں سے پاس کہاں سے آتی ہے؟ ہم یہ سب کچھ دیکھ لیا، ہم نے تمہیں پچیس ہزار اشرفیاں بھی عطا کر دیں۔ اور وہ جگہ بھی دکھا دی جہاں یہ اشرفیاں رکھی تھیں۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں چند اور جگہیں بھی دکھا سکتے ہیں جہاں سے یہ اشرفیاں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن یہ ساری معلومات تمہارے اور تمہارے بادشاہ کے لئے فضول ہیں، اس سے کہو ہم فقیروں کی ٹوہ لگا کر کیا پائے گا، ہم تو وہ ہیں کہ پتھر پر نظر ڈالیں تو وہ اشرفیوں کی تھیلی بن جائے، اللہ والوں کو کیوں چھوڑا ہے۔“

یہ شخص سیدی مولے کے قدموں میں گر گیا اور رو کر معافی مانگنے لگا اور اس بات کا اقرار کیا کہ اس کی بابت سیدی مولے نے جو کچھ بھی کہا ہے درست ہے حرف بہ حرف سچ ہے۔ سیدی مولے نے اشرفیاں واپس نہیں لیں اور یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر چلا گیا ۔



سیدی مولے کی خانقاہ کا خرچ روز بروز بڑھتا ہی رہا اور آخر کار اتنا بڑھا کہ ہزاروں آدمی شب و روز خانقاہ سے کھانا کھاتے اور دو در دو سے آنے والے ادھر اُدھر سر لے کر خرچ کرنے کے بجائے اس خانقاہ کا خرچ کرتے۔ صبح و شام آٹے اور میدے کی ہزاروں بوریوں اور گھی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن، دودھ اور معلوم نہیں کیا کیا خانقاہ میں آتا اور سب کچھ خرچ ہو جاتا۔ لوگوں کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے اور کون لاتا ہے؟ اور یہ کہ سیدی مولے کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟

سیدی مولے ہندوگان خدا کی ایک ہی خدمت کرنے کے قابل تھے وہ خدمت حتیٰ معاشی بد حالی کا علاج اور تدارک۔ ان کا قول تھا کہ ساری خرابیوں کی جڑ معاشی بد حالی ہے اس موذی مرض کا علاج کرو تو بہت سارے مرض خود بخود ختم ہو جائیں گے

اس غیر معمولی صوفے کو دیکھتے ہوئے خود سیدی مولہ کی زندگی پر غور کیا جاتا تو وہ نہایت سادہ تھی، جسم ڈھانپنے یا ستر پوشی کے لئے انہیں ایک تہبند ایک چادر کی ضرورت رہتی تھی کھانے میں چاول کی روٹی کو پانی اور کبھی کبھی شوبے میں ڈبو کر کھالیا کرتے تھے۔

فرماں رواٹے ہند غیاث الدین بلبن کا انتقال ہوا تو سیدی مولہ کے مصارف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا کیقبا و حکمران ہو گیا۔ سیدی مولہ اپنی روش پر قائم رہے وہ امرا اور سرکاری ملازمین جو ایک فرماں روا کے انتقال اور دوسرے کی آمد پر اس کی لاپرواہی اور ناقدی سے بے کاریا بے روزگار ہو گئے تھے ہزاروں کی تعداد میں تھے سیدی مولہ کا لنگر خانہ کھلا ہوا تھا اور اس کے در ہر ایک پر و تھے۔ ان پریشاں حال اور آشفتمند سر بے کاروں نے سیدی مولہ کی خانقاہ کا رخ کیا، سیدی مولہ نے خوشی خوشی ہر ایک کو خوش آمدید کہی اور ان کی یہاں تک پزیرائی کی کہ یہ لوگ جب کھائی کر گھر جانے لگے تو سیدی مولہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد بھی مرحمت فرماتے۔

کوئی کہتا: ”حضرت! خاندان کے دس افراد کی ذمہ داری مجھ تنہا پر عائد ہوتی ہے آپ مستجاب الدعوات ہیں میرے حق میں دُعا فرمائیں“

سیدی مولہ ارشاد فرماتے: ”تمہیں دُعا سے زیادہ دوا کی ضرورت ہے کیونکہ معاش بد حال و کُلفت ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان خدا تک سے منکر ہو جاتا ہے، اس کے بعد حکم دیتے: ”سامنے کی طاق میں جو کچھ رکھا ہے خاموشی سے اٹھا لاؤ۔“ وہ شخص طاق سے ایک پھیلی اٹھا لاتا، سیدی مولہ حکم دیتے: ”دیکھنا تو اس میں کتنی رقم ہے؟“

وہ شخص پھیلی کا منہ کھول کر سیدی مولہ کے روبرو الٹ دیتا اور گنتا تو پتہ چلتا ایک ہزار اشرفیاں ہیں۔ اتنی نئی اور چمک دار گویا ابھی ابھی دار الضرب (نکال) سے نکلی ہیں۔

ایک بوڑھا آدمی کھانسیا ہوا سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ زور زور سے سانس لیتا ہوا بولا: ”سیدی! میں مرحوم سلطان کا رکاب دار رہ چکا ہوں۔ نئے بادشاہ نے مجھے الگ کر دیا ہے اور عالم یہ ہے کہ میں مرحوم بھائی اور اپنے کنبے کا تنہا کفیل ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ دوبارہ ملازمت کس طرح حاصل کروں، نیا بادشاہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتا۔“

میرے حق میں بھی دُعا فرمائیں؟

سیدی مولہ نے اُسے حکم دیا ”دیکھو، سامنے کی دیوار کے نیچے جو چنڈا نیٹیں رکھی ہوئی ہیں انہیں اٹھاؤ اور ان کے نیچے سے جو کچھ بھی تمہیں ملے میرے پاس لے آؤ۔“
اس بوڑھے نے حکم کی تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں اینٹوں کے نیچے سے تین پھیلیاں اٹھا لیا۔ سیدی مولہ نے ان کی رقم بھی گنوائی یہ تین ہزار اشرفیاں تھیں آپ نے بوڑھے کو حکم دیا ”یہ اشرفیاں لے جاؤ اور ہاں دیکھو نہایت احتیاط سے خرچ کرنا۔“
بوڑھے نے زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اشرفیاں لے کر رخصت ہو گیا۔
ایک شخص بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا اور سیدی مولہ سے کہا ”حضرت! میری ایک ٹانگ لڑائی کی نذر ہو چکی ہے، اب جبکہ میں کمانے کے لائق نہیں رہا نئے بادشاہ نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ اب ذرا آپ ہی انصاف فرمائیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

سیدی مولہ نے سوال کیا ”تمہارا کنبہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟“
لنگڑے نے جواب دیا ”پانچ افراد پر۔“

سیدی مولہ نے کہا ”تم ہمارے کسی آدمی کو اپنا گھر دکھا دو، وہ ہر روز پانچ آدمیوں کا کھانا گھر پہنچا دیا کرے گا۔“
لنگڑے نے سیدی مولہ کا شکریہ ادا نہیں کیا گھر سے انداز میں بولا ”واہ حضرت واہ! آپ نے کس طرح فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اور میرے کنبے والوں کو کھانے کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔“
سیدی مولہ نے ہنس کر کہا ”اوجلد باز انسان! تو نے ہماری پوری بات تو سنی ہی نہیں“ پھر آپ نے حکم دیا ”ہمارے مُصلّے کا داہنا حصہ اٹھاؤ اور“
لنگڑے نے داہنا کونا اٹھایا تو اس کے نیچے نئی نئی اشرفیاں بھری نظر آئیں۔
وہ گھبرا گیا اور انہیں چھونے کی ہمت تک نہ کر سکا۔

سیدی مولہ نے اسے نرمی سے حکم دیا ”یہ تمہاری ہی ہیں سادہ دل نوجوان! ڈرو مت، انہیں اپنے دامن میں بھر لو۔“
لنگڑے نے ساری اشرفیاں دامن میں بھر لیں۔

جب یہ تینوں چلے گئے تو سیدی مولہ نے اپنے مرید خاص کو بلایا اور دریافت کیا ”آج خانقاہ میں کتنے ایسے آدمی جمع ہیں جو پہلے غیاث الدین بلبن کے دربار سے وابستہ تھے؟“

مرید چلا گیا اور کافی دیر بعد یہ اطلاع لے کر واپس آیا کہ سیدی مولہ کے اس پاس کئی ہزار افراد ایسے ہیں جو پہلے سرکاری ملازمت کرتے رہے تھے۔

”اچھا!“ سیدی مولہ کو اچانک بابا فرید کی نصیحت یاد آگئی کہ دہلی پہنچ کر ملوک اور امرا کی صحبت اور دوستی سے بچنا کیونکہ فقر اکوان کی صحبت اور دوستی اس نہیں آتی۔ سیدی مولہ سوچتے سوچتے چونک پڑے اور زیر لب خود سے ارشاد فرمایا ”بابا آپ ہی بتائیں یہ ناچیزان سرکاری آدمیوں سے کس طرح بچ سکتا ہے ان میں گردش زمانے کے سائل ہوئے امرا بھی ہیں اور سرکاری حکام بھی وہ خدا جو رب العالمین اور جانداروں کا رازقی ہے اس نے ان کے رزق کی تقسیم اس ناچیز کے سپرد فرمائی ہے کیا میں اپنے رب کے اس حکم کی خلاف ورزی کر سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں۔“

سیدی مولہ کو ایسا لگا جیسے بابا فرید افسوس سے کہہ رہے ہوں،
”سیدی! ہماری بات نہیں مانو گے تو چھٹاؤ گے۔“

سیدی مولہ نے گویا انہیں جواب دیا ”خدا کی مرضی پوری ہو کر ہے گی۔ یہ ناچیز کیا کر سکتا ہے؟“

آپ نے نظریں اوپر اٹھائیں تو معلوم ہوا خانقاہ میں چاروں طرف حاجت مندوں کا ہجوم ہو رہا ہے انہوں نے اپنے ملازمین اور خدام کو حکم دیا ”انہیں شکم سیری کی حد تک کھانا کھلایا جائے اور اس وقت تک برابر کھلایا جاتا رہے جب تک ان کے معاشی مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکلتا۔“

پھر ایسا ہوا کہ یکباد کے ہاتھ سے بھی حکومت نکل گئی اور اقتدار کی باگ ڈور جلال الدین خلجی کے ہاتھ میں چلی گئی ایک بار پھر سرکاری عملے میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ہزاروں آدمی بے روزگار ہو گئے اور یہ سب مل ملا کر ہزاروں کی تعداد اختیار کر گئے، ان سب کی تے داری بھی سیدی مولہ نے اپنے سر لے لی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سیدی مولہ ہزاروں آدمیوں میں گھرے کھڑے تھے
۳۱۷

کہ ایک جوان شان بے نیازی سے اپنے گھوڑے کو ڈلکی چال سے لے کر خانقاہ کے دروازے تک آگیا۔ سیدی مولہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے اس شخص کو دیکھا تو لوگوں سے سوال کیا وہ لوگو! یہ کون ہے؟

کسی نے جواب دیا۔ ”سُطان جلال الدین کا سب سے بڑا بیٹا اختیار الدین خان خانان۔ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضور ایک رحم دل درویش ہیں اور ان کے دروازے پر ایک کتب پر کھلے ہیں اس لیے شرف قدم بوسی کی خاطر شہزادے خان خانان نے بھی حضور کے دربار میں حاضری دی ہے۔“

شہزادہ ایک دم گھوڑے سے کود پڑا۔ لوگوں نے ادب سے راستہ دے دیا شہزادہ دوڑتا ہوا سیدی مولہ کی طرف بڑھا اور جھک کر ان کے پیر پڑ لیٹے اور گڑ گڑاتا ہوا بولا۔ ”حضرت اکِ نظرِ کرم ادھر بھی، اس مشاق دید کو یا بس نہ کیجئے گا۔“ سیدی مولہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن شہزادہ اپنی آنکھیں ان کے تلوے سے ملنے لگا۔ بولا۔ ”بس یہیں اسی جگہ آپ کے قدموں میں صبح ہوں۔“

سیدی مولہ نے پوچھا۔ ”تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”حضرت کی نظرِ کرم۔“

سیدی مولہ نے کہا۔ ”شہزادے تم ولی عہد ہو لیکن افسوس کہ تم جلال الدین کے فرمودہ ولی عہد ہو، خلائی فرمودہ نہیں۔“

شہزادے نے حسرت بھری نظروں سے سیدی مولہ کو دیکھا پوچھا۔ ”حضور کے ارشادِ گرامی کا مطلب؟“

سیدی مولہ نے جواب دیا۔ ”تمہاری قسمت کی لوح محفوظ میں تمہاری ولی عہدی کا خانہ خالی ہے۔“

شہزادے نے مایوسی سے سوال کیا۔ ”میری زندگی کتنی ہے؟“

سیدی مولہ نے لمحے بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے کھول لیں بولے۔

”شہزادے تم تمہارے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے ہیں وہ تمہارے سوگ میں رو رہا ہے۔“ شہزادہ خان خانان نے غمگین ہو کر خاموشی اختیار کی لیکن سیدی مولہ کو

گویا بار بار بابا فرید سرزنش کر رہے تھے کہ سیدی یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ امرا اور سلاطین زادوں سے خدا کے لئے بچو، شر، آفت اور فتنے ان کے دامنوں سے لگ کر خانقاہ میں بھی داخل ہو جائیں گے۔

اپنے وہی کیا جو فرمان خداوندی تھا امرا اور سلاطین زادوں میں سے ایک بھی خانقاہ سے نہیں نکالا گیا۔ اگر خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو اسے پورا ہونا چاہیے، مگر سیدی مولہ نے اطمینان کی سانس لی۔

خانقاہ کے باہر زبردست شورغل برپا ہوا، ہزاروں آدمیوں کے اثر دھام اور ان کے واوینے سے کان پڑی آواز نہ سائی دیتی تھی۔ ان کی آہ و فغاں بے ہنگم آوازوں کا مجموعہ تھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی سیدی مولہ نے چادر اپنے جسم پر لپیٹ لی اور خانقاہ کے باہر نکل گئے لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی اور زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا اور یک بیک آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ ایسا لگتا جیسے ہزاروں مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہیں۔

یہ کیا یک سیدی مولہ کی کرٹک دار آواز گونجی؟ تم اپنا ایک نمائندہ یا چند آدمی ہمارے پاس بھیجو جو ہمیں تمہاری پریشانی یا مصیبت سے مطلع کر سکے، جمع نے یک سوئی سے یہ آواز سنی اور پھر آپس کی چرمیگوئیوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

کچھ دیر بعد پانچ آدمی آہستہ آہستہ سیدی مولہ کی طرف بڑھے جب وہ قریب آگئے تو سیدی مولہ انہیں اپنے ساتھ لے کر خانقاہ میں داخل ہو گئے اور سوال کیا ”کیا تمہیں بادشاہ سے کوئی اذیت پہنچی ہے؟“

دفد کا ایک شخص اپنے چاروں ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ”سیدی! ان پریشان حال لوگوں کی وکالت سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنا تعارف کرادوں“

سیدی مولہ نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا ”خیر کہو، ہم سمجھتے ہیں“ اس شخص نے سیدی مولہ کی بات کا کوئی اثر ہی نہ لیا، کہنے لگا ”بندے کو

جلال الدین کاشانی کہتے ہیں، اس خاک رکو بادشاہ کی طرف سے ایک منصب بھی حاصل ہے
میران پریشان حال حضرات سے یوں تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میری دلی ہمدردی اور
طبیعت کے ترحم نے مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ میں آپ کی خدمت میں ان کی سفارش کروں۔
سیدی مولہ نے نرمی سے کہا: ”تمہید میں وقت ضائع کرو، مقصد بیان کرو۔“
امیر جلال الدین کاشانی نے کہا: ”ملک الامرا فخر الدین کو تو مال سے جناب

بھی واقف ہوں گے ان کا انتقال ہو چکا ہے ان کے ہزاروں پروردہ اور ملازمین اب
بے کار ہو چکے ہیں اور سردست ان کی روزی کا متبادل کوئی انتظام نہیں کیا جاسکتا۔ ان
میں کا ہر شخص ایک کنبہ، ایک خاندان رکھتا ہے یہ لوگ اپنے معاشی مرض کے علاج
کے لئے یہاں آئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کا خزانہ اور شاہی باورچی خانہ
بھی جو ان کے لئے نہیں کر سکتا وہ جناب کی خانقاہ سے ممکن ہے؟“

سیدی مولہ نے جواب: ”پھر ان سے کہہ دیا جائے کہ جب تک وہ بے روزگار
ہیں اور ان کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہماری خانقاہ سے ان سب کو کھانا اور خرچہ
کی رقم ملتی ہے گی۔“

امیر کاشانی نے سیدی مولہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور وفد کے باقی ساتھیوں
کو لے کر خانقاہ سے باہر نکل گیا۔ اُس دن سے خانقاہ نے کئی ہزار آدمیوں کے
کھانے پینے اور روزمرہ اخراجات کی مزید نئے داری قبول کر لی۔

اسی دن رات کو امیر کاشانی نے دوبارہ حاضری دی اور کہا: ”حضرت!
مجھے آپ کی صحبت میں ایک ناقابل بیان روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اگر اجازت ہو تو
بندہ روزانہ حاضری کی سعادت حاصل کر لیا کرے۔“

سیدی مولہ نے جواب دیا: ”یہ ایک فقیر کی خانقاہ ہے، اس میں حاضری کی
اجازت کیا معنی؟ کوئی شاہی محل یا بادشاہ کا دربار تو نہیں کہ تم حاضری کی اجازت طلب کرو۔“
امیر کاشانی بہت خوش ہوا اور سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ کر ادھر
اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

اسی رات دو آدمی اور آئے، ایک برناحقن نامی ہندو جو عہد بلبن میں
شہر کو تو مال رہ چکا تھا دوسرا ہتیا یا ننگ پہلوان۔ یہ بھی ہندو تھا اور بلبن کے

دربار سے وابستہ رہ چکا تھا یہ دونوں بھی اب بے کار تھے اور معاشی بحالی
 انہیں ایک مسلمان درویش کی خانقاہ تک لے آئی تھی۔ یہ دونوں دھوٹیوں میں منہ چھپائے
 سیدی مولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کی نظریں امیر کاشانی پر پڑیں تو واپس جانے
 لگے لیکن سیدی مولہ نے انہیں روک لیا اور پوچھا ”تم دونوں واپس کیوں جا رہے تھے؟“
 برناتھن نے بات بنائی ”باباجی! آپ کے درشن کرنے آئے تھے دیکھ کر جی خوش
 ہو گیا، اب واپس جا رہے تھے؟“

امیر کاشانی کی پیشانی پر تسکین پڑ گئی تھیں۔

ہتیا پانگ پہلوان سیدھا داد آدمی تھا اس کے پاس برناتھن کو تو ال جیسی عقل
 نہیں تھی صاف بتا دیا ”مہاتما جی! بلبن بادشاہ ہمارا آن داتا تھا ہم دونوں اس کے
 سیوک تھے وہ یکنگھ سدھارا تو دوسرے بہت سے سیوکوں کی طرح ہم دونوں بھی
 بے اس و بے سہارا ہو گئے اب ہمارے آن دھل کا کوئی ٹھکانا نہیں، آپ کی دیا کا چرچا
 چاروں طرف پھیلا ہوا ہے لوگ کہتے ہیں آپ اس یگ کے سب سے بڑے دیالو ہیں آپ
 کا اُپکار ہماری جیون نیا کو آسانی سے پار لگائے گا“

سیدی مولہ نے جواب دیا ”زندگی کی ناؤ کو پار لگانے والا خدا ہے ہم تو اس
 کے نائب ہیں بہر حال تم دونوں بھی کوئی فکر نہ کرو، اللہ نے جہاں تو تم دونوں کو بھی معاشی
 پریشانیاں نہیں اٹھانی پڑیں گی“

برناتھن کو واپسی کی جلدی تھی، فوراً اجازت طلب کی ”اچھا باباجی! پھر کسی
 وقت حاضری دیں گے، اجازت دیجئے“

”اجازت! سیدی مولہ نے ہاتھ اور گون کے اشارے سے جانے کی اجازت

دے دی۔

جب یہ دونوں چلے گئے تو امیر کاشانی نے منہ بنا کے کہا ”حضرت! یہ تو آپ سمجھ
 ہی گئے ہوں گے کہ یہ دونوں ہندو تھے؟“

”غوب اچھی طرح! سیدی مولہ نے جواب دیا۔

امیر کاشانی نے تعصب کا انداز اختیار کیا، کہا ”دونوں کافر ہیں۔ ایک کافر اور

مسلمان میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہے آپ اس فاصلے کو کس طرح ختم کر دیں گے؟“

”خلجی امیر“ سیدی مولہ نے بے چینی سے کہا ”جب خدا خود ہی قرآن پاک میں یہ فرما رہا ہو کہ وہ رب العالمین ہے تو معاشی مسئلے میں ہم مسلمان اور کافر کی تفریق کیوں کریں اگر خدا سورہ فاتحہ میں یہ فرماتا کہ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْمُسْلِمِينَ

تو ہم بھی معاشی مسئلے میں ہندو مسلم کی تفریق پر کاربند ہو جاتے“

امیر کاشانی نے لاجواب ہو کر کہا ”ظاہر ہے میں آپ سے کس طرح بحث کر سکتا ہوں لیکن اگر اس خائفہ کے فیوض محض مسلمانوں کے لئے مختص ہو جائیں تو بہت اچھی بات ہو“

”نامکن“ سیدی مولہ نے مضبوط لہجے میں کہا ”ایسا قطعی نامکن ہے“

امیر کاشانی نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔



دوسرے دن صبح ہی صبح امیر کاشانی کی عدم موجودگی میں برہانقن اور ہتیا پانگ سیدی مولہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا ”باباجی اکل رات ہم دونوں اس خلجی امیر کی وجہ سے واپس چلے گئے تھے، آپ اس سے ہوشیار رہیں لوگ کہتے ہیں یہ امیر فساد ہی ہے شربھیلاتا رہتا ہے“

سیدی مولہ نے جواب دیا ”ہاں آدمی تو اچھا نہیں نظر آتا لیکن ہم بھی کیا کریں، خدا نے ہمارے اوپر جس شخص کو مسئلہ کر دیا ہے اس کا پاس لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا“

دونوں لاجواب ہو کر چپ ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سیدی مولہ نے انہیں حکم دیا۔

”جاؤ سامنے پانی کے گھروں کے نیچے جو کچھ رکھا ہے اٹھاؤ اور اس سے اپنا کام چلاؤ“

دونوں گھروں کے پاس پہنچے اور ان کے نیچے سے بہت سارے سونے کے سکے نکال کر اپنی اپنی جیبوں میں بھر لیے اور دوبارہ پھر سیدی مولہ کی خدمت میں دو زانو بیٹھ گئے۔

سیدی مولہ نے کہا ”اب یہاں وقت برباد کرو، گھر جاؤ اور بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کرو، وہ پریشان ہو رہے ہوں گے“

دونوں دوبارہ باریابی کی پیشگی اجازت لے کر چلے گئے۔

اب خانقاہ کے لنگر خانے کا خرچہ کئی گنا زیادہ ہو چکا تھا اور اشرافیوں اور چاندی کے سکوں کی تقسیم بھی نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔

اب امیر کاشانی کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی اس کے آنے جانے کا کوئی خاص وقت نہیں تھا وہ اپنا زیادہ وقت سیدی مولہ کی خدمت میں گزارنے لگا۔ دوسری طرف برناٹھن اور ہیتا پانک کی حاضری اور نشست و برخاست میں بھی اضافہ ہو گیا تھا پہلے تو امیر کاشانی ان دونوں سے جلتا تھا اور درمیان میں کفر اور اسلام کی خلیج حائل کر دی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ خلیج رواداری کے بلے سے پاٹی جانے لگی اور کچھ ہی دنوں بعد یہ خلیج بالکل پیٹ گئی۔ اسی مجلس میں جلال الدین خلجی کا ولی عہد شہزادہ خان خانان بھی حاضری دیتا رہا، اسے سیدی مولہ نے اپنا فرزند قرار دیا تھا۔ خود سیدی مولہ نے شادی نہیں کی تھی۔

ایک رات غشا کی نماز کے بعد امیر کاشانی نے سیدی مولہ سے کچھ تامل سے کہا۔
”حضرت! یہ خاکسار چند ایسی باتیں چاہتا ہے جو ممکن ہے بار خاطر ہوں لیکن ان کی افادیت پر ہرگز شبہ نہیں کیا جاسکتا۔“

سیدی مولہ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ”بے تامل کہہ گزرو، گھبراؤ مت!“
امیر کاشانی نے ہندو مصاحبین کی طرف دیکھا تو چالاک برناٹھن نے کہا: ”باباجی ہم دونوں مجلس سے اٹھ جاتے ہیں کاشانی جی جو باتیں کہنا چاہتے ہیں ہمارے پیچھے آسانی سے کہہ لیں گے۔“

سیدی مولہ نے کہا: ”نہیں نہیں مجلس سے اٹھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں جو کچھ کہنا ہے ہم سب کے سامنے کہیں گے ورنہ زبان کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو شخص دوسروں کی موجودگی میں کسی کے کان میں بات کرنے کی خواہش کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ عیار اور خطرناک ہے، حق بات کے لئے تخلیع یا کان میں کھسر پھسر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

امیر کاشانی بہت شرمندہ ہو گیا۔ کچھ دیر کی ندامت کے بعد آہستہ سے گویا ہوا۔
”حضرت! بات حقیقت یوں ہے کہ اس ناچیز نے جناب کو ہزار طرح آزما کے دیکھ لیا ہے آپ میں کسی عظیم مصلح کی روح حلول کر گئی ہے۔“

دونوں ہندوؤں نے بیک زبان تائید کی۔ ”بے شک بے شک، اس میں کیا

شک ہے

امیر کاشانی نے کہا ”یہ ناچیز ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو اوصاف اور خصوصیات حضور والا کو عطا فرمائی ہیں ان سے اس دور کا ہر انسان محروم ہے اس رات جب حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ خداوند تعالیٰ رب العالمین نہیں ہے تو اس خاکسار کی آنکھیں فرط حیرت و استعجاب سے کھلی کھلی رہ گئیں۔ ذات الہی کی صفات اور اوصاف کا جیسا علم حضور والا کو حاصل ہے کسی اور کے لیے اس کی بابت سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ سلطانی اور بادشاہت ایسے ہی آدمیوں کا حق ہے اس خاکسار کی تو یہ رائے ہے کہ حضور والا اقتدار اور فرائض کے تحت پتہ نہیں ہونے کی کوشش فرمائیں۔ آپ رحم اور خدا پرست ہیں، مخلوق اور رعایا کے دکھ درد کا جیسا احساس اور خلوص حضور والا رکھتے ہیں، جلال الدین خلجی کے پاس بھی ویسا رحم اور خلوص نہیں ملے گا آپ کو چاہیے کہ اپنے حامیوں اور فرائض کے توسط سے حکومت کا تختہ الٹ دیں اور خود اقتدار سنبھال لیں۔ اگر حضور والا ایہ نہیں کریں گے تو اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کر دیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر دنیا میں بھیجا ہے اگر خباب نے اس ملک کو ظالموں کے پنجوں سے نجات نہ دلائی۔۔۔۔۔ تو کل قیامت میں خدا اور رسول کو کیا منہ دکھائیں گے؟“

برناتھن سینہ تان کر کھڑا ہو گیا، خوش اور دلہلے سے بولا ”فلانی کی خدمت یہ ناچیز انجام دے گا“

ہتیا پاک نے پوچھا ”وہ کس طرح؟“

برناتھن نے جواب دیا ”جب بادشاہ کی سواری گزرے گی تو بادشاہ کی زیارت کرنے والے ہجوم میں، میں گھٹنائل ہو جاؤں گا پھر جیسے ہی بادشاہ میرے قریب آئے گا میں پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دوں گا“

امیر کاشانی برناتھن کا منصوبہ نہایت غور سے سن رہا تھا پوری تجویز سن کر دہشت

کیا ”لیکن بادشاہ کے قتل کے بعد تمہارا کیا حشر ہوگا؟“

”مجھے اپنے حشر کی کوئی پروا نہیں“ برناتھن نے جواب دیا ”کیوں کہ اگر میں اپنے

جیون کی بھینٹ دے کر بابا جی کو بادشاہ بنا دوں گا تو یہ پورے دیش کے بامیوں کی

سیوا ہوگی“

ہتیا پانک ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے بھی زبان کھولی، بولا، ”بادشاہ کو
 مانے کا جو منصوبہ بھی بنے ضروری ہے کہ اس کے ہر پہلو پر نہایت عقل مندی سے غور کر لیا جائے
 اور اگر برنا تھن جی کے جیون کا کسی طرح بچاؤ ممکن ہو تو اس کا بھی خیال رکھا جائے۔“
 ”میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب بھی ہے جس سے بادشاہ کو ہلاک کر کے برنا تھن
 کو بچایا جاسکتا ہے،“ امیر کاشانی دماغ پر زور دیتا ہوا بولا۔

سیدی مولہ ان کی باتیں نہایت توجہ سے سُن رہے تھے اور خود مزے سے ایک لفظ بھی
 نہ نکال رہے تھے۔

ہتیا پانک نے پوچھا، ”برنا تھن جی کا بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟“
 امیر کاشانی نے جواب دیا، ”حضرت جی کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد
 غیر معمولی ہے ہزاروں میں پھیلے ہوئے ہیں جس روز بھی برنا تھن جی کو اپنے منصوبے پر عمل
 کرنا ہو حضرت اپنے دس بارہ ہزار معتقدوں کو بھی اس ہجوم میں شامل فرما دیں اور برنا تھن جی
 جیسے ہی اپنا کام پورا کر چکیں، یہ ہجوم انہیں اپنی حفاظت میں لے لے۔“
 برنا تھن اور ہتیا پانک اس تجویز پر ہلچل پڑے۔ ہتیا پانک نے خوش ہو کر کہا
 ”مجمعی ہم پھر شہرے پہلوان ہمارے پاس تو ابس شہر میں ہی شہر ہے بدھی تو سرکار دربار
 کے عہدے داروں ہی کے پاس ہوتی ہے امیر کاشانی کی بدھی کا ہم کیا مقابلہ کریں گے۔“
 جبکہ تینوں اس منصوبے پر متفق ہو گئے تو انہوں نے تائید اور منظور سی کے
 لئے سیدی مولہ کی طرف دیکھا۔ سیدی نے پوچھا، ”پھر ہمارے تخت نشینی کس طرح عمل
 میں آئے گی؟“

امیر کاشانی نے فوراً جواب دیا، ”حضور والا کے جملہ مرید اور معتقد جو اس
 موقع پر موجود ہوں گے ایک جلوس کی شکل میں اپنے درمیان میں لے کر شاہی محل میں
 داخل ہوں گے اور وہاں تخت نشینی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔“
 برنا تھن نے کہا، ”اگر بابا جی ہم سب کی کوششوں سے تاج و تخت حاصل
 کر لیں گے تو شاید میں ایک بار پھر شہر کو تو ال ہو جاؤں۔“
 ہتیا پانک نے کہا، ”اور مجھے درباری پہلوان ہو جانے کا موقع مل جائے
 گا جس سے دال روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

امیر کاشانی نے غشی سے منکھول دیا ، بولا : ” اور یہ خاکسار اس وقت حضرت جی سے یہ درخواست کرے گا کہ اس ناچیز کو بھی استقلال اپنے قدموں میں پہننے کی اجازت مرحمت فرمادیں ، میرے لیے یہی سب سے بڑا اعزاز ہوگا “

سیدی مولہ ماضی میں پہنچ چکے تھے انہوں نے محسوس کیا بابا فرید انہیں گھوڑے ہیں اور ہونٹوں پر انگلی لکھے اشاروں سے منع فرما رہے ہیں کہ خبردار جو انہیں اس منصوبے پر عمل پیرا کرنے کی اجازت دی آپ نے بلند آوازیں ارشاد فرمائی ” ہم نے تم سب کی تجویزیں سنیں اور تمہارے وہ احکامات جو مجھ ناچیز سے تعلق رکھتے ہیں ہمارے علم میں آئے لیکن اگر ہم تم سے اتفاق کرتے ہیں تو اس سے بابا فرید کی ناراضگی کا خدشہ رہتا ہے اور انہوں نے ہمیں منع کر رکھا ہے کہ ہم امرا اور حکام کو اپنی صحبت میں نہ آنے دیں ، اس سے راہ و رسم نہ بڑھائیں کیونکہ امیری اور فقری کا کوئی جوڑ نہیں انہوں نے اس ناچیز کو یہاں تک سرنش فرمائی تھی کہ اگر ہم نے ان کی نصیحت پر عمل نہ کیا تو گویا ہم اپنے لیے ہلاکت خرید لیں گے “

امیر کاشانی نے کہا : ” آپ امرا اور حکام کو اپنی خدمت میں آنے دیں یا نہ آنے دیں یہ تو بات ہی دوسری ہے ہم سب تو یہ چاہتے ہیں کہ حضور والا خلیفۃ المسلمین بنا قبول فرمائیں اگر خلافت اور امارت ایسی ہی بڑی چیز ہے تو پھر خدا نے رسول مقبولؐ کے معزز اور مقدس ساتھیوں کو خلافت کا منصب کیوں عطا فرمایا خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین ہونا حقیقتاً آپ ہی جیسے انسان کا حق ہے آپ مائیں یا نہ مائیں یہ کار خیر انجام ضرور دیا جائے گا “

سیدی مولہ نے انکار کیا : ” جلال الدین خلجی بھی کوئی بڑا حکمران نہیں ہے اسے اس لیے اسے ہٹا کر یہی بھٹا مناسب نہیں ہے “

برناتھن نے کہا : ” اگر وہ بڑا آدمی نہیں ہے تو پھر اور کون بڑا ہے اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہزاروں عہدے دار بے کار اور بے روزگار ہو گئے ان کا قصور کیا تھا ؟ صرف یہ کہ وہ پچھلے بادشاہ کی ملازمت میں رہ چکے تھے “

ہتیا پانگ نے کہا : ” اگر بابا جی پناہ نہ دیتے تو یہ برسوں کا پالہ ہوا ہاتھی جیسا شیر بھلنگا چارپائی کی طرح زمین سے لگ چکا ہوتا “

سیدی مولہ اپنی ضد پر قائم ہے اور مضبوط لہجے میں کہا ”بہر حال کچھ بھی ہو ہم تمہیں بادشاہ کے قتل کا مشورہ ہرگز نہ دیں گے اور نہ ہی تمہیں اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیں گے، آخر خدا نے ہمیں کیا نہیں دیا، دولت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں، ہزاروں انسان ہماری خانقاہ سے دونوں وقت کا کھانا حاصل کرتے ہیں اسی طرح سینکڑوں کی ہر روز مالی مدد کی جاتی ہے“

امیر کاشانی نے ڈرتے ڈرتے کہا ”اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو یہ ناچیز کچھ دریافت

کے“

سیدی مولہ نے کہا ”پوچھو“

امیر کاشانی نے کہا ”آپ کے پاس اتنا بڑا خزانہ آیا کہاں سے؟ اتنی دولت آپ

کے ہاتھ آئی کہاں سے“

سیدی مولہ نے جواب دیا ”مولا کا کم ہے بس اس کے سوا کوئی جواب نہیں“

امیر کاشانی نے خوشامد سے کہا ”حضور والا کاسچا ہم در و اور غم خوار اگر

کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ناچیز ہے خدا حضور کو ہزاروں سال زندہ و سلامت رکھے، یوں موت زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، اگر حضرت مناسب سمجھیں تو اس ناچیز کو بھی وہ عمل بتائیے جس کے پورا کرنے سے دست غیب حاصل ہو سکتا ہے“

سیدی مولہ نے کہا ”ریاضت کرو ریاضت۔ خدا محنت رائیگاں نہیں کرتا،

جب دل سے ریا کاری دماغ سے دعوت اور اندر محبت باطنی نکل جائیں گے تو تمہاری

نظر بھی کیمیا اثر ہو جائے گی“

امیر کاشانی نے بڑی کوشش کی کہ سیدی مولہ دست غیب کا عمل بتا دیں لیکن

انہوں نے نہیں بتایا۔ آخر جب وہ اُن سے رخصت ہونے لگا تو کسی مرید نے سنا

امیر کاشانی یہ کہتا ہوا خانقاہ سے نکلا تھا کہ ہم تو حضرت کو بادشاہت دینے کو تیار

ہیں اور حضرت ہمیں دست غیب کا وظیفہ دینے تک کو تیار نہیں، حضرت جی نے دانا، کر کے

ہمارا دل توڑ دیا ہے جواب شاید کبھی بھی نہ جڑ سکے۔

امیر کاشانی نے ایک رات دیکھا کہ سیدی مولہ نہایت سوز اور جذبے سے چند

اشعار پڑھ رہے ہیں۔

در مطبخ عشق جز نکورانه کشند لاغر صفتان وزشت خورانه کشند
گر عاشق صادق زکشتن مگر نیز مردار بود بر آنچہ اورانه کشند
(عشق کے باورچی خانے میں بیگوں کے سوا کسی کو بھی نہیں ملے تھے بری صفاتوں اور بری
عادتوں والے نہیں ملے جاتے۔ اگر تو سچا عاشق ہے تو موت سے نہ بھاگ، جس
کو نہ ماریں وہ مردار ہے)

امیر کاشانی نے پوچھا: ”حضرت جی! ان اشعار کے ورد اور گروان کا مطلب ہے؟“
سیدی مولہ نے جواب دیا: ”چند دنوں بعد مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا،
لیکن ہم نے تجھے معاف کیا۔“

امیر کاشانی نے پریشان ہو کر سوال کیا: ”یہ ناچیز آپ کی اشاروں کی
بات چیت سمجھنے سے قاصر ہے۔“
سیدی مولہ نے جواب دیا: ”باتیں اشاروں کی نہیں مستقبل کی ہیں۔ وقت
معانی و مطالب خود ہی سمجھا دے گا۔“

پھر ذرا فرسوں سے کہا: ”لیکن تم یہ مت سمجھو کہ دنیا ہی سب کچھ ہے تم ہماری
خانقاہ میں کثرت سے آتے جاتے رہے ہو اور ہمارے مقربین میں شمار کیے جاتے ہو
یہی وجہ ہے جو ہم تمہیں معاف کر رہے ہیں۔“
امیر کاشانی نے ہنسی بھرا سوال کیا: ”آخر میری خطا کیا ہے جسے آپ معاف
فرما رہے ہیں؟“

سیدی مولہ نے کہا: ”خطا؟ تمہاری خطا؟ تمہاری باتوں میں ہاتھی کی
بو آ رہی ہے تمہارے جسم تمہارے لباس سے ہاتھی کی بو آ رہی ہے اور یہی تمہاری خطا ہے
کہ تمہارے پاس سے ہاتھی کی بو آ رہی ہے۔“
امیر کاشانی جھنجھلا کر چلا گیا۔ وہ سخت برہم تھا کہ یہ درویش آخر اس سے اشاروں
میں بات کیوں کرتا ہے؟



کسی مخبر نے بادشاہ کو اس سازش سے مطلع کر دیا اور شر کاٹے سازش کے
نام بھی گنوایے۔ بادشاہ نے اسی وقت امیر کاشانی کو طلب کر لیا اور اس سازش کے بارے
۳۲۸

میں پوچھ کچھ شرع کر دی۔

امیر کاشانی نے کہا: ”جہاں پناہ نے جو کچھ بھی سنا ہے اس کا ایک ایک لفظ درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ گناہ کا بھی شرکائے سازش میں پیش پیش تھا لیکن اس ناچیز کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ خدا خواستہ حضور کو قتل کر کے سیدی مولہ کو بادشاہ بنا دیا جائے یہ گناہ کا تو محض اس لئے ان میں شامل ہو گیا تھا کہ اس سازش سے کماحقہ، واقفیت حاصل کر کے جہاں پناہ کو مطلع کر دے۔“

بادشاہ نے پوچھا: ”لیکن تو اب تک خاموش کیوں تھا یہ خبر تیرے ذریعے ہم تک کیوں نہیں پہنچی؟“

امیر کاشانی نے جواب دیا: ”محض اس لئے کہ یہ ناچیز اس مثل کا قائل نہیں ہے کہ کاتا اور لے دوڑی، ناچیز جانتا تھا کہ جب تک اس سازش کے دن، وقت اور لمحوں تک کا تعین نہ ہو جائے، زبان کھولنا مصلحت کے خلاف ہے اب جبکہ سازش قبل از وقت بے نقاب ہو چکی ہے تو پھر یہی مناسب ہے کہ میں گواہ کی حیثیت سے اس کی تصدیق کر دوں۔“

بادشاہ نے پوچھا: ”آخر تو کس طرح ہمیں اس سازش سے آگاہ کرنا؟“

امیر کاشانی نے جواب دیا: ”جب اس ناچیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں دن اور فلاں وقت یہ سازش رو بہ عمل ہوگی تو میں حضور کو اس سے مطلع کر کے یہ مشورہ دیتا کہ حضور اُس دن اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیں اور جب اس فرضی بادشاہ پر قاتلانہ حملہ کیا جاتا تو حضور کے پہلے ہی سے متعینہ سپاہی سازشیوں اور قاتلوں کو گرفتار کر کے حضور کے رو بہ پیش کرتے۔ اس طرح حضور کو ان کے خلاف گواہی شہادت کے لئے آدمی نہیں تلاش کرنے پڑتے لیکن اب؟ جہاں تک اس ناچیز کی سمجھ کا تعلق ہے یہ سمجھتا ہے کہ سیدی مولہ اور اس کے رفقاء نے کار کے خلاف میرے سوا ایک شہادت بھی نہ مل سکے گی اور شرعاً ایک گواہ کی شہادت ہی کیا، مجھے بھٹلایا بھی جاسکتا ہے۔“

بادشاہ نے انہوں سے کہا: ”خیر اب تو جو کچھ ہوا اس کا ملال بے سود ہے اب یہ بتاؤ کہ کیا تو اب بھی اس مکار اور دنیا دار فقیر سیدی مولہ کے خلاف لب کشائی کی ہمت رکھتا ہے؟“

”بالکل، حصہ و حجب چاہی اس کا امتحان لیں۔“

”تو سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں کے سامنے اس سازش کا اقرار کرے گا؟“

”بالکل کروں گا، مجھے کس بات کا ڈر اور ایک حقیقت کو جھٹلانا کیا معنی؟“

بادشاہ نے پوچھا۔ اس سازش میں کون کون شریک ہے؟

امیر کاشانی نے جواب دیا۔ ”برناتھن، بلینی، ہندکاشہر کو تو الہتیا پانک، بلینی دربار

کا پہلوان، ان دونوں کے علاوہ غالباً پچھلی حکومتوں کے بعض امرا، خان زکے اور

شاہی خاندان کے افراد بھی شریک ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہم ان سب کی گرفتاری کا فرمان اسی وقت جاری کیے دیتے ہیں

اگر تو نے سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت سے بیان نہ دیا تو تیری بھی خیر نہیں۔“

امیر کاشانی نے جھک کر بادشاہ کے قدموں میں زمین کو بوسہ دیا اور کھڑے ہو کر عرض

کیا۔ ”اور اگر اس ناچیز نے اس دنیا دار حریف فقیر سیدی مولہ کے خلاف گواہی دے دی

تو جہاں پناہ انعام کیا عطا فرمائیں گے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”صلے میں تجھے بدایوں کا قاضی بنا دیا جائے گا۔“

امیر کاشانی نے بادشاہ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

اسی وقت سیدی مولہ، برناتھن اور ہتیا پانک کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا

گیا۔ ”آنا نا نا ان سب کی گرفتاری عمل میں آگئی سیدی مولہ کو رستوں سے جھک کر بادشاہ کے

روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ بادشاہ سے کچھ فاصلے پر سیدی مولہ کے دائیں جانب امیر کاشانی

شاہی رعب اور جلال سے مؤہبانہ سر جھکا کھڑے کھڑا تھا۔ شاہی نقیبے باواز بلند

سیدی مولہ کو ان کا جرم بتایا جس سے سیدی مولہ نے صاف انکار کر دیا۔

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”اودنیادار مکار درویش تو جھوٹا ہے۔“

سیدی مولہ نے تحمل سے جواب دیا۔ ”ہم جھوٹ نہیں بولتے بادشاہ کو غلط فہمی

ہو گئی ہے یا شاہی مخبروں نے بادشاہ کو صحیح خبر نہیں پہنچائی۔“

بادشاہ نے امیر کاشانی کو حکم دیا۔ ”تو سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت

سے جو کچھ جانتا ہے صاف صاف بیان کر دے۔“

امیر کاشانی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”یہ ناچیز خدا کو حاضر و ناظر جان کر

عرض کرتا ہے کہ سیدی مولہ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے وہ صد فی صد درست ہے
سیدی مولہ اپنے ذراٹیوں کی مدد سے جہاں پناہ کو قتل اور خود سریر آرائے سلطنت
ہونا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اس خاکسار کو ملتان کی ولایت عطا فرمائے
کا وعدہ کیا تھا۔

سیدی مولہ نے سختی سے انکار کیا۔ کاشانی! تو حقیقت حال سے باخبر ہے
اور تو ہی جھوٹ بول رہا ہے، خدا سے ڈر، یہ بہت بڑی بات ہے۔
امیر کاشانی نے مزید کہا۔ اس ناچیز نے جو کچھ کہا ہے خدا کو حاضر ناظر جان
کر عرض کیا ہے۔

بادشاہ نے مفتیان دین سے پوچھا۔ کیا جلال کاشانی کے بیان پر
سازشیوں کو سزا دی جاسکتی ہے؟
درباری مفتی نے جواب دیا۔ نہیں، جلال کاشانی کی شہادت حتمی اور معتبر
نہیں قرار دی جاسکتی۔

بادشاہ بے بس ہو گیا، اس نے مشورہ طلب کیا۔ پھر ہمیں اس سلسلے
میں کیا قدم اٹھانا چاہیئے؟

مفتی نے جواب دیا۔ جب تک سیدی مولہ اور شرکائے سازش پر جرم ثابت
نہ ہو جائے ان کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔
بادشاہ نے حکم دیا۔ جب تک سیدی مولہ اور ان کے ساتھیوں کی سازش
کا جرم ثابت نہ ہو اور کوئی ایسا معقول اور مستند طریقہ کار نہ دریافت ہو جس سے
جرم کی قطعی تصدیق ہو جائے انہیں قید خانے میں رکھا جائے۔
سیدی مولہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا برناتھن اور ہتھیا پانک پہلے ہی
قیدیوں پڑے ہوئے تھے۔

کئی دن کے غور و فکر کے بعد بادشاہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزموں کو آگ
کے لاوٹیں سے گزرا کر جھوٹ سیج کی تصدیق کرائی جائے جب حکم کی تعمیل میں
آگ روشن کی جا چکی تو بادشاہ نے اعلان کیا کہ اس آگ پر سے سیدی مولہ اور ان
کے رفقاء کو گزرا جائے اگر وہ اس پر سے صحیح سلامت گزر جائیں گے تو انہیں سچا

مان لیا جائے گا لیکن اگر وہ جل میں گے تو گویا اس طرح وہ کفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔

بادشاہ کے لئے آگ کے الاؤ کے قریب ایک خاص کو شک تعمیر کرائی گئی جس میں بادشاہ نے اپنے امرا، اعزّاء اور خواتین کے ساتھ قیام کیا ان میں مفتیان دین علماء اور مشائخ بھی موجود تھے اس عبرتناک نطائے کو دیکھنے کے لئے ہزاروں شہری بھی وہیں پہنچ گئے۔

سیدی مولہ، برنا تھن اور ہتیا پانک شاہی کو شک کے سامنے ڈال دیے گئے۔ یادشاہ نے ایک بار پھر مفتیان دین، علمائے کرام اور مشائخ عظام سے فتویٰ طلب کیا اور پوچھا: کیا ان ملزموں کو ان کے جرم کی تصدیق یا تکذیب کے لئے آگ کے الاؤ پر سے گزرا جانا جائز ہے؟

تمام علماء، مشائخ اور مفتیان دین نے بیک زبان کہا: آگ کا کام جلانا ہے ملزم حق پر ہو یا ناحق پر، آگ سے گزریں گے تو جل جائیں گے۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا: ”پھر ان سے ان کے جرم کی تصدیق کس طرح کرائی جائے؟“

علماء نے جواب دیا: ”بہر حال یہ طریقہ ناجائز ہے۔“ بادشاہ نے ایک گز بردار کو حکم دیا: ”بلینی پہلوان ہتیا پانک کو گرز کی ضربات سے ہلاک کر دیا جائے۔“

گرز بردار دیوار وار آگے بڑھا اور ہتیا پانک پر گرز کی مسلسل ضربات لگا کر چپّی کر دیا، دم توڑتے ہتیا پانک کی خوفناک اور دلزدہ چیخوں سے لوگوں کے دل دہل گئے۔ اس کے بعد بادشاہ نے شاہی فیل بان کو حکم دیا: ”برنا تھن پر سے ہاتھی گزار دیا جائے۔“

فیل بان نے ہاتھی کی گردن میں آنکھس آنا دیا۔ ہاتھی چنگھاڑ مار کر تیزی سے برنا تھن کی بڑھا اور چشم زدن میں اسے روند کر آگے بڑھ گیا فیل بان نے ہاتھی کو موڑ کر ایک بار پھر برنا تھن پر سے گزار دیا۔ یہ عمل کئی بار دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ برنا تھن کی لاش ہتیا پانک کی لاش سے زیادہ مسخ ہو گئی۔ شہری اور شاہی متعلقین اس دلزدہ

منظر کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔

اب سیدی مولہ کی باری تھی۔ بادشاہ نے سیدی مولہ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ سیدی مولہ نے بادشاہ کے سوالات کے جوابات نہایت بے باکی اور بے خوفی سے دیے۔ اسی دوران اس عہد کے درباری شیخ ابو بکر طوسی حیدری اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے بادشاہ نے انہیں اپنے قریب بلایا اور شکایت کیا: ”شیخ! آپ ذرا سیدی مولہ کو ملاحظہ فرمائیں آپ خود بھی درویش ہیں اور سیدی مولہ بھی درویش ہے دیکھیے تو سہی اس درویش نے ہمارے خلاف کیسا خطرناک منصوبہ بنایا تھا، اگر منصوبے میں یہ شخص کامیاب ہو جاتا تو آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ ملک میں کیسا فساد برپا ہو جاتا۔“

شیخ طوسی حیدری نے پوچھا: ”بادشاہ کا اس شکایت سے منشا کیا ہے؟“
بادشاہ نے جواب دیا: ”انصاف، صرف انصاف اس شخص کو ہم خود کوئی سزا نہیں دینا چاہتے یہ درویش ہمارے آپ جیسا درویش ہی کوئی سزا دے سکتا ہے یا جیسا مناسب سمجھیں فیصلہ صادر فرمادیں۔“

ابھی طوسی حیدری نے اپنا فیصلہ سنایا بھی نہ تھا کہ اس کا ایک مرید حیب سے اُسترا اور جوال دوزر (بوری سینے کا سوا) نکال کر سیدی مولہ پر چھڑا اور اُن پر پیرے لٹی دار کے زخمی کر دیا۔ بندھے ہوئے سیدی مولہ نے بلند آواز میں بادشاہ سے کہا: ”بادشاہ! ہم اپنی موت سے ہراساں نہیں ہیں اب بھی وقت ہے کہ ہمیں ہماری خانقاہ میں پہنچا کر آنے والی مصیبت سے نجات حاصل کی جائے۔“

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا اور طوسی حیدری کا مرید بدستور اُسترا سے اور سوئے کے زخم لگاتا رہا۔ جب سیدی مولہ زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تو آخری بار بادشاہ کو متنبہ کیا: ”بادشاہ! ہمیں اپنی موت کا کوئی غم نہیں کیونکہ ہمیں تمام ذی حیات کی طرح ایک ایک دن تو موت کا مزہ چکھنا ہی تھا لیکن تجھے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور یہ ایک ایک دن رنگ لاکر رہے گا، تجھے نہیں معلوم کہ درویش کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں۔“

بادشاہ خاموشی سے یہ عمل دیکھ رہا تھا، اس کے قریب ہی شہزادہ اہل خانہ

بیٹھا تھا چونکہ سیدی مولہ نے اس کے بڑے بھائی اختیار الدین خان خانان کو بیٹا بنالیا تھا اسلئے ارکلی خان سیدی مولہ سے نفرت کرتا تھا اسے شبہ گزرا کہ شاید بادشاہ سیدی مولہ کو معاف کر دے گا اس لئے اس نے فوراً ہی فیلبان کو اشارے سے حکم دیا کہ سیدی مولہ کو ہاتھی سے کچل دیا جائے۔

فیلبان نے ہاتھی کو پھنس مار کر سیدی مولہ پر چڑھکا دیا اور پلک بھینکتے ہی سیدی مولہ کی روح پرواز کر گئی۔

شہریوں نے آہ و فغاں بلند کی۔ ابھی بادشاہ اور شہری واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ سیاہ آندھی نے پورے شہر کو اپنی پلیٹ میں لے لیا اور لوگ پاگلوں کی طرح پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے اور آپس میں متصادم ہونے لگے۔

جب بادشاہ محل میں واپس پہنچا تو پتہ چلا کہ ولی عہد خان خانان بیمار پڑ چکا ہے شاہی اطباء علاج میں لگ گئے لیکن یہ مرض علاج کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ خان خانان وفات پا گیا، بادشاہ پر ولی عہد شہزادے کی موت قیامت کی طرح گزر گئی۔

امیر کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کیا گیا۔



سیدی مولہ کی خانقاہ سو فی ہو گئی، تنویر بھگئے، ہزاروں متوسلین خانقاہ بے آسرا ہو گئے۔ ہزاروں خاندان بھوکوں مرنے لگے اسی سال شہر میں زبردست قحط پڑا اور شہر پر موت کے سائے منڈلانے لگے۔ ہزاروں آدمیوں نے فاقے کی موت پر جہنائیں ڈوب مرنے کی موت کو ترجیح دی۔

اس واقعے کے چند سال بعد جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین اس سے ناراض یا خوف زدہ کہ الہ آباد میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے اسے منلے اور واپس بلانے کی بہتیری کوشش کر ڈالی، لیکن علاء الدین واپسی پر رضامند نہ ہوا۔ علاء الدین نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ خود تشریف لائیں اور غلام کو پا بجولاں واپس لے جائیں اس کے ساتھ ہی علاء الدین نے اپنے خسر اور چچا بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے جو سونا اور جواہر جمع ہیں انہیں بھی حاصل کر لیں۔

بادشاہ بلجھت دیوائی سفر سے الہ آباد روانہ ہو گیا علاء الدین مانک پور میں اس کا منتظر تھا۔ دیوائی سطح پر اسے جیسے ہی شاہی چتر نظر آیا وہ بادشاہ کے استقبال کو آگے بڑھایہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی۔ اس وقت بادشاہ تلاوت کلام پاک میں مشغول تھا علاء الدین نے نہایت ادب سے بادشاہ کا استقبال کیا اور اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

بادشاہ نے پیار سے بھتیجے کے گال پر ایک چپت رسید کر دی اور کہا۔ ”ہم نے تجھے کتنے لاڈ اور پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور ہمیشہ تجھے اپنے حقیقی بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا، تیرے بچپن کی بوسہ لے لباس میں ابھی تک محفوظ ہے پھر یہ کیا بات کہ تو ہم سے بدظن اور بدگمان ہے۔“

اس بعد بادشاہ نے علاء الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلنے کے لئے قدم اٹھائے۔

علاء الدین نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ سنا نامی علاء الدین کے سپاہی نے بادشاہ پر تلوار کا وار کیا۔ بادشاہ کی چیخ نکلی گئی، دلہ روز آواز میں کہا۔ ”اے بد بخت علاء الدین یہ تو نے کیا کیا۔“

لیکن ایک دوسرے سپاہی نے بادشاہ کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہ دیا، اس نے بادشاہ کو پھچاڑ دیا اور سینے پر چڑھ کر نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا پھر سر کاٹ کر علاء الدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔

بادشاہ کے تمام ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور علاء الدین نے اسکندرنانی السلطان الاعظم، علاء الدین و الدین محمد شاہ خلجی کے نام اور لقب سے ہندوستان کا اقتدار سنبھالا۔

اکلی خان جس نے سیدی مولہ پر ہاتھی چڑھوایا تھا، جب علاء الدین کے قابو میں آگیا تو اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھر وادی گیش اور زندگی بھر کے لئے قید کر دیا گیا نہ صرف ارکلی خاں کو یہ سزا دی گئی بلکہ علاء الدین خلجی نے جلال الدین خلجی کے کسی وارث کو بھی معاف نہیں کیا اور چند ہی دنوں میں بادشاہ کا خاندان نیست و نابود ہو گیا۔

بابا فرید نے سیدی مولہ کو متنبہ کیا تھا کہ۔ ”امرا اور حکام کی صحبتیں تمہیں راس نہیں آئیں

گی بلکہ ڈرتے رہو کہ یہ تمہیں ہلاکت کی طرف لے جائیں گی۔
 لیکن سیدی مولہ نے اپنی خانقاہ میں لنگر خانہ عام جاری کر کے بلا تخصیص
 بے سہاروں اور بھوکوں میں رزق کی تقسیم شروع کر دی تھی اس میں عوام بھی آتے تھے اور
 شاہی ملازمین اور حکام بھی۔ وہ خدا کو رب العالمین سمجھتے تھے، رب المسلمین نہیں اور اپنے اس
 اعتقاد اور یقین میں اتنے راسخ اور مضبوط تھے کہ دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر خدا کی
 مشیت یہی ہے کہ میں بابا فرید کا تنبیہ کے مطابق ہلاک کر دیا جاؤں تو مجھے مشیت الہی
 میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔
 چنانچہ وہ مشیت الہی پر قربان ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد بادشاہ کو بھی اسی طرح
 اپنی عبرت ناک موت کو خوش آمدید کہنا پڑا۔



حضرت ولایت شاہؒ

ہلینہ ہنورؒ سے تین سیدان بن سید حسن الحسینی نامی ایک بزرگ ہندوستان میں داخل ہوئے اور شمالی ہندوستان میں بارہ ہجری کے ردولی نامی قصبے میں سکونت پذیر ہو گئے حکومت نے انہیں انعام و اکرام اور بخشش و عطا سے آمانوازا کہ یہ بہت جلد صاحب ثروت اور اہل جامدہ ہو گئے۔ یہیں ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ ان کی آخری اولاد علاء الدین نامی ایک بچہ تھا۔ یہ ابھی پانچ سال ہی کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ علاء الدین کے دوسرے بھائی جو ان یاں جو ان تھے وہ چاہتے تو بل جلی کر رہتے اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی کفالت میں لے لیتے لیکن ان کے ارادے کچھ اور تھے۔

ماں اپنے جوان بیٹوں کی ماہمی سرگوشیوں اور نظروں کے تیور سے کچھ خطرات محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹوں کو حکم دیا۔ ”نماز عشاء کے بعد تم سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں چند نصیحتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

خود غرض اور دلچسپی بیٹے دلوں میں کھوٹ اور چہروں پر سعادت مندی کے آثار لیے عشاء کی نماز کے بعد ماں کی خدمت میں حاضر ہو گئے ماں کو کڑا آتی سردی میں مکر کے دروازے بند کئے لحاف میں دہکی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی گود میں علاء الدین تھا بیٹے مسمی صورت بناٹے سامنے کے تخت پر بیٹھ گئے۔

ماں نے انہیں بغور دیکھا اور ان کی قلبی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ سب سے بڑے بیٹے نے کھٹکا کر سوال کیا: ”اماں! آپ نے ہمیں کس لیے یاد فرمایا ہے؟“ ماں نے نہایت پرسوز آواز میں کہا: ”میرے بیٹو! تمہارا باپ مدینہ منورہ سے یہاں آیا تھا۔ تمہارا نسب حسنی الحسینی ہے۔ یہاں خاندان کی کچھ عظیم الشان روایات ہیں۔ ایک اور اتحاد اگر تم واقعات کر بلا پر غور کرو گے تو تمہیں بھائی بہنوں اور چچا بھتیجیوں وغیرہ کے بے مثل اتحاد اور یکجہالت کی ایک ایسی مثال ملے گی جو تمہیں کہیں اور نہیں نظر آئے گی۔“

بڑے بیٹے نے اکتا کر کہا: ”اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں اس طولانی تمہید سے تو ہمارے

سروں میں درد ہونے لگا ہے۔“

دوسرے بھائی نے کہا: ”کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنی خاندانی روایات تک سے واقف نہیں؟“
 ماں نے قطع کلام ہو جانے سے دکھ محسوس کیا لیکن ضبط کر گئیں، بولیں: ”میرے بیٹو! تمہارے باپ نے کافی املاک اور نقدی چھوڑی ہے میں چاہتی ہوں کہ تم سب مل جل کر سو اور اپنے چھوٹے بھائی علاء الدین کی سرپرستی قبول کرو، یہ تمہاری محبت اور خلوص کا بھوکا کلمہ ہے اور اپنے باپ کی املاک اور نقدی میں برابر کا حصہ دار ہے۔“

بڑے بھائی نے ریاکاری سے جواب دیا: ”علاء الدین ہم سب کا بھائی نہیں بیٹا ہے آخر آپ ہماری طرف سے بدگمان کیوں ہیں ہم اسے اپنی آنکھ کا تار بانا کے رکھیں گے، آپ ہرگز فکر مند نہ ہوں، اور یہی کلمات تقریباً ہر بھائی نے باری باری ادا کئے لیکن ماں کو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں۔“

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ چچی دارمھی دلا چالیس پینالیس سالہ رسول بخش پچھنے سے اس خاندان کی خدمت کر رہا تھا، وہ علاء الدین کو گود میں لے کر ادھر ادھر نکل جاتا اور سیر و تفریح کرتا رہتا۔ ایک دن وہ علاء الدین کو امرتدوں کے باغ سے لئے چلا آ رہا تھا کہ راہ میں علاء الدین کا سب سے بڑا بھائی مل گیا۔ اس نے علاء الدین کو محبت سے گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ پھر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور رسول بخش کو ایک طرف لے گیا، کہنے لگا: ”رسول بخش! کیا تجھے نہیں معلوم کہ امردوں کے باغ کے آس پاس کہیں ایک بھیرڑ یا موجود ہے جو آبادی کے کئی بچوں کو اٹھالے جا چکا ہے۔“

”معلوم ہے“ رسول بخش نے گردن ہلا کر جواب دیا: ”لیکن میں اسے باغ کی طرف اس وقت لے جاتا ہوں جب اس کے آس پاس کے کھیتوں میں کام شروع ہو چکا ہوتا ہے اور باغ کے رکھوالے طوطوں اور دوسرے پرندوں سے باغ کی رکھوالی کر رہے ہوتے ہیں۔“

بڑے بھائی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا: ”اگر تو چاہے تو تبھی دس بیگھ زمین اور دو سو روپے فوراً مل سکتے ہیں۔“

رسول بخش کی طمع سے آنکھیں کھل گئیں، پوچھا: ”اگر ایسا ہو جائے تو آپ کا یہ غلام شادی کرنے کے لائق ہو جائے گا اور زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہے گا۔“

علاء الدین نے تنہائی کی وجہ سے منہ بانا شروع کر دیا اور بورتے ہوئے رسول بخش کو آواز دی۔

بڑا بھائی غصے سے علاء الدین کی طرف بڑھا اور دو طمانچے رسید کر دیے۔ ”مر اکیوں

جاتا ہے، باتیں تک نہیں کرنے دیتا تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا رہ، درنہ مار مار کے پلٹتین نکال دوں گا تیرا۔ میں بے حاجت کا قائل نہیں ہوں ۝

علاء الدین سہم گیا۔ بڑا بھائی رسول بخش کے پاس واپس گیا بولا ”رسول بخش! بس تجھے یہ کہنا ہے کہ تو ایک دن صبح سویر جھنگل سے پہلے علاء الدین کو میری قفرت کرا نے اس باغ میں لے آ، میں یہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ تو علاء الدین کو میرے حوالے کر کے ”بھڑیا بھڑیا“ چیتے، خوف زدہ ہو کر بھاگ جانا اور ہر شخص سے یہی کہنا کہ علاء الدین کو بھڑیا لے گیا“ رسول بخش کو کچھ تامل ہوا۔ بڑا بھائی سمجھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔ دہمکی آمیز لہجے میں کہا: ”اگر تو نے میری تجویز پر عمل کی تو ہوسکتا ہے کہ میں تجھے دس کے بجائے بیس بیگھہ اور دوسو کے بجائے چار سو روپے دے دوں لیکن اگر تو نے میری بات نہ مانی اور اس کا دوسروں پر اظہار بھی کر دیا۔ تو یہ سمجھ لینا کہ تو قتل کر دیا جائے گا ۝

رسول بخش نے بے بسی سے کہا ”صاحب! میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ آپ میرے بعد علاء الدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“

بڑے بھائی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا ”میں جو کچھ کروں گا اس میں سارے بھائیوں کی مرضی شامل ہے میرے پاس شیر کا پنجہ موجود ہے۔ میں انگلیوں میں شیر کا پنجہ پھینسا کہ علاء الدین کا پیٹ اس طرح چاک کر دوں گا اور اس کی پشت اوپر سے کوکچا اس طرح فوج فوج کر زخمی کر دوں گا کہ بعد میں دیکھنے والے ہرگز یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ علاء الدین کو بھڑیا نے نہیں ہلاک کیا ۝ رسول بخش نے اپنے خوف کو نہایت ضبط اور احتیاط سے چھپائے دکھا پوچھا ”لیکن صاحب! آپ ایسا کیوں کر ناچاہتے ہیں؟“

بڑے بھائی نے قدرے ترشی سے کہا ”ہر چند تجھے اس قسم کے سوال و جواب کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی جو کچھ میں نے تجھے اپنے اتماد میں لیا ہے اس لیے میں محدود حد تک تیرے چند سوالات کے جوابات ضرور دوں گا ۝

رسول بخش کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں لیکن وہ بڑے ضبط سے سیدھے کھڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑے بھائی نے کہا ”ہاں تو تو جو پوچھ رہا تھا کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ تو سن لے باپکے انتقال کے بعد جو جائیداد مالک اور زمین ہم سب کے حصے میں آئی ہے اس کے حصے بخرے میں بڑی زحمت پیش آرہی ہے اگر اس میں سے علاء الدین کا حق نکال دیا جائے تو پھر بھائیوں میں بڑی آسانی سے

تذکرہ یا ورثہ تقسیم کیا جاسکتا ہے پھر ہم سب کو یہ شبہ بھی ہے کہ علاء الدین ہماری ماں کا بیٹا نہیں ہے ہائے
 باپ نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی۔ علاء الدین اس کا بیٹا ہے پھر جب علاء الدین کی ماں کا انتقال
 ہو گیا تو باپ نے علاء الدین کو میری ماں کے حوالے کر دیا۔ میری شریف النفس ماں نے اپنی موت کی اولاد کو
 بالکل اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا شروع کر دیا، یہ ہے اصل واقعہ، جس کا ہم بھائیوں اور ماں کے
 علاوہ کسی کو بھی علم نہیں۔“

رسول بخش کو بڑے بھائی کے اس زبردست جھوٹ پر بڑی حیرت ہوئی وہ بچپن سے اسی
 گھر میں رہ رہا تھا اسے اس گھر کی ایک ایک بات کا علم تھا یہ جھوٹا واقعہ جس کا بڑے بھائی نے نہایت سنجیدگی
 سے اظہار کیا تھا اس کے لیے قطعاً ناقابل یقین تھا کیونکہ وہ دائی جس نے علاء الدین کی پیدائش میں
 خدمت کی تھی بقید حیات تھی اور اب بھی مختلف تیوہاروں اور تقریروں کے موقعوں پر حاضری دے
 کر اپنا حق لے جایا کرتی تھی لیکن رسول بخش کے خوار کی کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

بڑے بھائی نے ترش روئی سے پوچھا۔ ”تو میری تجویز پر کب عمل کر رہا ہے؟“
 رسول بخش نے جواب دیا۔ ”ایک مہینہ بعد، کیونکہ آپ کی تجویز پر عقل مندی سے کام کرنے کیلئے
 مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے، بڑے بھائی نے کہا۔ آج سہ شنبہ (منگل) ہے اگلے چہار شنبہ (بدھ)
 تک کا مجھے موقع دیا جا رہا ہے۔ پنج شنبہ کو تو علی الصباح علاء الدین کے ساتھ اس باغ میں مجھے
 ملیگا۔“

رسول بخش نے جواب دیا۔ ”بہت بہتر جواب! آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوگی لیکن
 یہ بھی تو بتائیے کہ انعام کا روپیہ اور زمین ہمیں کب ملے گی؟“

بڑے بھائی نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”دوسروں نے تم مجھ سے کل ہی لے لیا، بقیہ روپے
 اور زمین تمہیں کام ہو جانے کے بعد ملے گی۔“

رسول بخش نے خوش ہو کر کہا۔ ”پھر تو میں پوری طرح تیار ہوں جیسا آپ چاہتے ہیں
 دیسا ہی ہوگا۔“

بڑے بھائی نے اپنی راہ لی اور رسول بخش علاء الدین کو گود میں اٹھا کر گھر چلا گیا۔
 بڑے بھائی نے حسب وعدہ دوسرے دن رسول بخش کو دوسو روپے دے دیے۔ روپے
 پا کر اس کے چہرے پر ایسی تازگی چھا گئی، گویا جوانی واپس آگئی ہو، تمام بھائی اس کی نگرانی کر رہے تھے
 کہ کہیں وہ اس منصوبے کو ماں پر نہ ظاہر کر دے لیکن رسول بخش کا لباس رومیہ اور ہر دم مسکراتے

رہنے کا انداز انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ رسول بخش حرص و طمع کے دام میں پھنس چکا ہے
 جمعے کو اول پہر جبکہ سب بھائی ادھر ادھر کام میں مصروف تھے اور نماز جمعہ سے پہلے پہلے ضروری کام
 پٹلے میں لٹکے ہوئے تھے رسول بخش نے بڑے بھائی کے منصوبے کا ذکر ماں کے سامنے کر دیا
 اور کہا: ”اماں! اب بہتری اسی میں ہے کہ مجھے جو دوسو روپے پیشگی ملے ہیں انہیں لے کر ہم تینوں
 یہاں سے چپ چاپ نکل چلیں کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم اب بھی یہاں رہے تو بچھوٹے
 بھیٹا علاء الدین اور میں خود کسی نہ کسی طرح ہلاک ضرور کر دیے جائیں گے۔“

ماں کانپ گئیں، رز کر بولیں: ”اگر علاء الدین کے بھائی برادرانِ یوسف بن چکے ہیں تو
 ہیں واقعی مجبوراً یہاں سے چلا جانا پڑے گا، ہم اپنے علاء الدین کو یوں ہرگز نہ مرنے دیں گے۔“
 لیکن سوال یہ تھا کہ یہ لوگ جائیں تو جائیں کہاں؟ بہت غور و فکر کے بعد ماں نے اتنی
 دور چلے جانے کا ارادہ کر لیا جہاں ان کے بڑے بیٹوں کی رسائی بہت مشکل تھی۔ مدینہ منورہ
 واپس چلے جانے کا ارادہ۔ وہاں ان کا خاندان موجود ہی تھا۔

پیر کی رات کو جبکہ ان کے سارے بیٹے اپنے اپنے لحافوں میں گھسے گہری نیند کے مزے
 لے رہے تھے۔ ماں نے علاء الدین کو شال میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔ رسول بخش نے تیز رفتار
 بیل گاڑی کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا تھا۔ تینوں اس پر سوار ہوئے رسول بخش بیل کو خود ہی
 ہانک رہا تھا۔ یہ تینوں صبح ہوتے ہوتے جنوب مغرب میں اتنی دور جا چکے تھے کہ برادرانِ یوسف
 انہیں باسانی نہیں پاسکتے تھے اور اس صورت میں کہ انہیں ان تینوں کی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ان کا
 تعاقب کس سمت میں کرتے۔

یہ تینوں بد وقت تمام سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے جدے کے لئے روانہ ہو گئے
 کنارے کنارے چلنے والا جہاز انہیں جڑے تک لے گیا جڑے سے انہوں نے مکے کا رخ کیا۔ خانہ کعبہ
 میں حاضری دیکر ماں نے علاء الدین کے حق میں دعائیں کیں اور یہاں سے مدینہ منورہ چلی گئیں۔
 وہاں ان کا بہت بڑا کنبہ موجود تھا اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علاء الدین دیار نبی میں پرورش
 پانے لگے۔

نتھے علاء الدین کو بھی اصل واقعات کا کسی حد تک علم ہو چکا تھا۔ دولت، املاک،
 روپیہ اور جائیداد کسی چیز میں ہیں جس کے لئے لوگ انسان کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ اکثر تنہائی
 میں یہ سوال دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ یہ رسول اللہ کے مزار پر
 حاضری دیتے اور نہٹھے منٹے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے کہ یا رسول اللہ! دولت اور املاک کی محبت

کے ناپاک جذبے سے میرے دل کو محفوظ رکھیے ، میں آپسے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔“
 دل کی گہرائیوں اور معصوم زبان سے نکلی ہوئی دعائیں بابِ اجابت کو پہنچیں اور علامہ الدین
 کے دل کو دولت اور مال کی حرص و طمع کی آلائش سے محفوظ رکھ دیں گے۔

علامہ الدین مدینے کے اساتذہ کی خدمت میں بٹھائیے گئے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔
 زندگی سکون سے گزرنے لگی۔ ماں کو اپنی وہ اولادیں بھی یاد آئیں جن کی شہادت سے خوف زدہ
 ہو کر انہوں نے ہندوستان کو خیر باد کہا تھا وہ گھڑی دو گھڑی کیے لئے اُداس ہو جاتیں آنکھیں بھیگ
 جاتیں دپٹے کے آنچل سے انہیں پونچھتیں اور زبردستی دنیا داری میں اُلجھ کر سکون حاصل کرنے کی
 کوشش کرتیں۔ ان کی زندگی ایک نمکدہ تھی۔ ایک ایسا نمکدہ جو موت کی طرح ناقابلِ رد، اٹل اور
 لازمی تھا۔ علامہ الدین کیے لئے انہوں نے ساری اولادیں چھوڑ دیں اگر وہ چاہتیں تو علامہ الدین کو
 قربان کر کے وہ ساری اولادوں کی قربت حاصل کر سکتی تھیں لیکن مشیتِ ایزدی ایسا نہیں
 چاہتی تھی وہ وہی چاہتی تھی جس پر انہوں نے عمل کیا۔

ابھی درس کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ماں بیمار پڑنے لگیں انہیں جو نعم اندر ہی اندر کھا رہا تھا
 اب وہ روح سے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور انہیں گفن کی طرح کھوکھلا کرنے لگا۔ ادھر رسول بخش
 بھی اند کو پیار ہو گیا۔ علامہ الدین کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ کچھ عرصے بعد ماں بھی چل بسی۔ علامہ الدین
 پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب تک دینے نہ انہیں دکھ ہی دکھ دیتے تھے دینے سے نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔
 کچھ عرصے مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اس کے بعد رسول کے مزار اقدس پر آخری بار حاضری دی
 اور رخصت کی اجازت چاہی۔

مدینے سے نکل کر یہ طلب علم میں ایک استاد سے دوسرے استاد تک جاتے رہے
 اور علم کی پیاس بجھا کر اور آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ عرب سے نکل کر ایران میں داخل ہو گئے
 اور وقت کے بڑے بڑے علماء سے درس لیتے رہے ایران سے ہندوستان پہنچے اور دہلی میں
 حضرت بختیار کاکیؒ کے مزارِ مطہریؒ کی رحلت کشی میں مصروف ہو گئے ان پر جذب کی کیفیت طاری
 ہو چکی تھی اور لوگ انہیں مجذوب کہنے لگے پھر عرصے بعد حضرت بختیار کاکیؒ نے انہیں عالمِ رویا
 میں آکرے جانے کا حکم دیا۔ یہ تعمیلِ حکم میں آکرے چلے گئے اور جہنم کے کنارے قیام کیا، ان کا
 چرچا، ان سے پہلے ہی آکرے پہنچ چکا تھا۔ یہاں لوگ انہیں گھیرنے لگے لیکن یہ ان پر کم ہی توجہ
 فرما کر خود بازار جاتے، سودا سلف خریدتے اور واپس آکر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے۔ اس وقت

جو بھی موجود ہوتا اسے اپنے کھانے میں شریک کر لیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ کھانے پر بہت سارے لوگ جمع ہونے لگے یہ سب کے لیے خود ہی کھانا پکاتے اور سبھی کو کھانے میں شریک کر لیتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس مشغلے نے ان کی عبادت و ریاضت میں فتور ڈال دیا۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر تقریباً پچاس آدمی حاضر تھے اپنے سب کو پکا کر کھلایا اور پانی پلا کر خج جانے والی روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹ لیں، کٹیا سے باہر نکلے اور کپڑے میں لپیٹی ہوئی روٹیوں والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آواز بھرا گئی گلا رندھ گیا باؤ از بلند فرمایا۔ بولے جبرئیل تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ میرے پاس، اے میکائیل! کیا تم تک میری آواز نہ پہنچ رہی ہے؟ اگر پہنچ رہی ہے تو تم بھی میرے قریب آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور اسرافیل! کیا تم نے میری آواز سنی؟ سن لی تو اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ تم بھی یہاں آ جاؤ تم تینوں مقرب بارگاہ ایزدی ہو، مجھ عاجز و ناتواں کا حال زار بارگاہ ذوالجلال میں عرض کر دو۔ اور کہو کہ یہ فقر داری جو مجھے سوچی گئی ہے کسی بہت بڑے ولی اللہ کے سپرد کر دی جائے، یہ عاجز اس بار عظیم کے اٹھانے کی خود میں سکت نہیں پاتا۔

اتنا کہہ کر زار و قطار روتے لگے اور کچھ سوکے بعد مزید فرمایا: "اس خدمت کی وجہ سے میں عبادت نہیں کر سکتا۔ دن رات لوگوں کے نان و لقمے کے لیے حیران و پریشان رہتا ہوں، آخر اس غلام کو کب تک غولہ رکھا جائے گا؟"

اس کے بعد اٹھ کر وضو فرمایا اور کپڑے میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر سامنے رکھ لیں انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے ہی ڈھیر لگایا اور پھر جو جانور بھی سامنے آیا اسے کھلانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس فیض عام سے طوطے، کوءے، کبوتر اور مینا تک محروم نہ رہے آخر میں چند ٹکڑے باقی بچے وہ خود کھالیے۔

یہ ابراہیم لودھی کا عہد تھا۔ اس نے ازراہ عقیدت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور وظیفہ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے ان کے سارے ارادت مندوں اور خادموں کا خراج چلنے لگا لوگوں نے آپ کو علاء الدین کی نسبت سے محبت میں علاء اول بلا دل کہنا شروع کر دیا ابراہیم لودھی کے بعض امراء جنہیں آپ کی دعاؤں کا فیض نہیں حاصل ہو سکا تھا، شاہ صاحب سے ناراض رہنے لگے۔ وہ جب بھی موقع ملتا ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے۔ پرانی مثل کے مطابق کہ سوچو ہمیں ملنے سے گیل لکڑیاں بھی جلنے لگتی ہیں ابراہیم لودھی بھی چیلنج روں کی باتوں سے متاثر ہوا، پوچھا۔

کیا تم لوگوں کو حضرت علاول بلاول کی بزرگی کی کسی قسم کا شبہ ہے؟

ایک حاسد امی نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ شے کی بات کرتے ہیں اس ناچیز کی رائے میں تو وہ پکا دنیا دار اور لالچی انسان ہے حضور کی خوش اعتقادی سے فائدے اٹھا رہا ہے۔“
بادشاہ نے کہا۔ ”کیا ہم اس کا وظیفہ بند کر دیں؟“

وہ نہیں حضور والا! ایک حاسد امی نے جواب دیا۔ ”حضور والا کی ذات چشمہ وجود بنا ہے، ایک تخت پورا وظیفہ بند کر دینا حضور والا کی شان کی کمی کے خلاف ہے ہاں اس میں تخفیف ضرور کی جاسکتی ہے۔“

بادشاہ نے فی الفور حکم صادر کر دیا۔ ”علاول کے وظیفے میں دو تہائی کی کمی کر دی جائے۔“
جب یہ کل وظیفے کی ایک تہائی رقم لے کر شاہی خدمت گار آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو اس کمی کا علم ہوا تو منہس کر فرمایا۔ ”بابا! تو کیا کہاں کا رازق ہے تو تو درمیان کا واسطہ ہے ہمارا حق مار کے تو بددیانتی اور خیانت کا مرتکب ہوا، اب یہ خائن زیادہ دن حکومت نہیں کر سکے گا۔ ہم کوئی دوسرا بندہ تسلیم کرتے ہیں؟“ اس کے بعد شاہی خدمت گار سے فرمایا۔ ”اپنے بادشاہ سے جاکر کہہ دو ہم نے اس کی مدتِ سلطنت میں دو تہائی کی کمی کر دی اور اس کی جگہ کابل سے دوسرے امانت دار کو طلب کر لیا ہے۔“

خدمت گار نے ماہے ڈر کے شاہ صاحب کا یہ پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچایا۔
کچھ عرصے بعد اگر عرصے میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ کابل سے فرغانہ کا خانہ بدوش فرماں روا ظہیر الدین بابر قسمت آزمائی کی غرض سے ہندوستان کی طرف چل پڑا ہے اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دو کرنا، آندھی طوفان کی طرح بڑھا چلا کر رہا ہے۔

ابراہیم بدھمی اپنی عظیم الشان فوج لے کر پانی پت پہنچ گیا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مغل قسمت آزمایا کو پانی پت سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

اسی دوران حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلسلہ چشت کا ایک گہرا ابدال حاضر ہوا اور نیاز مندانہ انداز میں حضرت علاول بلاول کی بزرگی اور عظمت کا اعتراف کر لیا۔ آپ نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور فرمایا۔ ”سلیم چشتی! ہم نے سیکری کے پہاڑ کو تمہارے لیے سونے کا کر دیا فرماں روا یوں وقت تیرے درپہ حاضری دیں گے، ہم تجھے سیکری کی حکومت دیتے ہیں۔“
سلیم چشتی اس وقت سیکری چلے گئے۔

پانی پت میں ابراہیم لودھی اور بابر کی افواج میں خوفناک مقابلہ ہوا جس میں ابراہیم لودھی نے شکست فاش کھائی اور بابر دہلی سے گزرتا ہوا آگرے میں داخل ہو گیا۔ نئے بادشاہ نے شاہ صاحب کی بڑی عزت کی اور ان کی رضا جوئی اور خوشنودی کو عین خوش قسمتی سمجھنے لگا۔

ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی اور فاتح ظہیر الدین بابر بستر علالت پر دراز موت اور زندگی کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ اطباء اور حکماء عاجز آچکے تھے۔ کسی مصاحب نے دبی آواز میں عرض کیا۔ ”صاحبان! جہنم کے کٹہرے ایک کٹیا میں علاء الدین نامی ایک خدا شناس ٹھہرا ہوا ہے، ہم سب کو اس سے مل کر دُعا کی درخواست کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے خدا ان کی دُعا سن لے۔“

مصاحب کے مشورے پر عمل کیا گیا اور ایک چھ نفری وفد حضرت علاء الدین کی کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر داخلے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اندر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز آرہی تھی۔

وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”حضرت شاہ صاحب! چند نیا مند آپ کی قدم بوسی کی تمنا میں حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔“

اندر سے جواب ملا۔ ”والپس جاؤ، چھوٹا بادشاہ بڑے بادشاہ سے ملاقات کر کے ہے گا۔“

وفد مایوسی کے یہ کلمات سن کر کٹے قدموں والپس گیا اور ولی عہد بہاولیوں کو شاہ علاء الدین کا جواب سنایا۔

بہاولیوں نے کہا۔ ”آپ لوگ ایک بار پھر اس بزرگ کی خدمت میں والپس جائیں۔ ان اللہ والوں کو اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر یہ چاہیں تو کسی اور کی عمر کم کر کے قریب المرگ شخص کو زندگی بخش سکتے ہیں۔“

ولی عہد کی ہدایت پر وفد پھر شاہ علاء الدین کی کٹیا پہنچ گیا لیکن اب کٹیا خالی تھی وہاں کوئی بھی نہ تھا شاہی وفد ان کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گیا دور دور ان کا کوئی پتہ نہ تھا وفد ان کی تلاش میں ناکام رہ کر ولی عہد کے پاس پہنچا اور اس کے رو برو اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا۔ بہاولیوں نے کہے کہا ”تم لوگوں نے انہیں اس پاس دل جمعی سے نہیں تلاش کیا، ورنہ وہ ضرور مل جاتے۔“

وفد کے سربراہ نے اپنی رائے دی۔ ”حضور والا! خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ۳۴۵

ہوتی تو سہم بہمت ہانے والے نہیں تھے، ان سے ملنے اور ایک ہی مسئلے پر سوال و جواب کرتے ہیں ایک ڈر باقی رہتا ہے وہ یہ کہ کہیں ان کی زبان سے کوئی ایسا ویسا کلمہ نہ نکل جائے جس سے نصیب دشمنان مغلیہ سلطنت ہی“

ہمایوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا: ”اچھا، خاموش رہو اور اس موضوع پر اب کوئی بات نہ کی جائے“

مختصری دیوبند کول (علی گڑھ) سے ایک سوار اگرے میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ کی منزل پر سی کیے گئے آیا تھا اور علاء الدین کے ارادت مندوں میں داخل تھا۔ جب اس کے سامنے علاء الدین کی خدمت میں دوبارہ جانے کا ذکر آیا تو اس نے کہا: ”وہ اگرے میں ہیں کہاں؟ انہیں تو میں کول میں حضرت جمال الدین العارفینؒ کے پاس حوض کے کنارے چھوڑے آ رہا ہوں اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں اگرے جا رہا ہوں تو انہوں نے بادشاہ کیلئے یہ پیغام دیا۔ ہے کہ بادشاہ سے کہو اس کی جس شہنشاہ سے ملاقات ہونے والی ہے اس میں وقت کی رُدہ بدل نہیں ہوتی، جو وقت طے پا گیا ہے اس پر حاضری ضروری ہے۔“

بابر کا انتقال ہو گیا اور ہمایوں نے اقتدار سنبھالا، علاء الدین ابھی تک کول ہی میں تشریف فرما تھے۔ ہمایوں نے ان سے اگرے واپس آنے کی درخواست کی لیکن وہ نہیں آئے۔ آخر کار ہمایوں نے یہ کہہ لیا تھا کہ اگر حضرت شاہ صاحب یوں تشریف نہیں لاتے تو بادشاہ خود حاضر ہوگا اور انہیں اپنے ساتھ واپس لانے کی ہر کوشش کر گزے گا ہمایوں کی منت سماجت کام کر گئی اور حضرت علاء الدینؒ اگرے واپس آ گئے۔ لوگوں کا ہجوم انہیں پھر گھیرنے لگا۔

ایک دن ابراہیم لودھی کا وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر آدھی رات کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا: ”حضور! کچھ میرے حق میں بھی دُعا ہو جائے“

آپ نے نذرانہ قبول نہیں کیا۔ فوراً خفگی سے حکم دیا: ”اسے واپس لے جا، میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

سابق وزیر نے کہا: ”حضرت! پھر میں کہاں جاؤں؟ آپ خود ہی سوچیں جس نے وزارت کی ہو، وہ بخما اور بے کار پھرے اس کے دل پر کیا سبب ہوگی؟“

آپ نے غصے میں فرمایا: ”لوگوں کے رزق پر ڈاکے ڈال اور وظیفے کی رچمتوں میں کمی کر

پھر دیکھو خدا تجھے کیسی مکافات میں مبتلا کرتا ہے، تو یہ اشرفیاں واپس لے جا۔“
 لودھی وزیر دل برداشتہ ہو کر اشرفیاں واپس لے گیا۔ اس کے چلے جانے کے
 تقریباً پون گھنٹہ بعد چار آدمی آپ کے پاس پہنچے اور اپنی چچااتی پھریاں ہوا میں لہرا کر بولے :
 ”اوپا گل ان! تو نے اشرفیوں کا طباق کیوں واپس کر دیا؟“
 آپ نے جواب دیا : ”وہ اشرفیاں کب تھیں، آگ تھی انہیں جو بھی چھوٹے گھا، جل مرے
 گا۔“ پھر پوچھا : ”تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟“
 چاروں میں سے سب سے زیادہ وجہیہ اور متحرک شخص نے غصے سے آنکھیں نکال کر
 جواب دیا : ”ہم لیٹے ہیں اور آج ہمیں ہر جگہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔“
 ”اچھا“ آپ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا : ”اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“
 اس شخص نے جواب دیا : ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہ اشرفیوں والا طباق دوبارہ منگالیں
 اور اسے ہم ضرور تمندوں میں تقسیم فرمادیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہماری یہ چچااتی پھریاں ہیں
 اور آپ ہیں بے رُو و رعایت بیٹے میں گھونپ دیں گے۔“
 ”اچھا ذرا صبح ہونے کا انتظار کرو۔“ آپ نے جواب دیا : ”ہم وہ اشرفیاں دوبارہ منگوا
 دیں گے۔“

اس رات لودھی وزیر نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علاؤل بلاق فرما رہے ہیں :
 ”بیٹے! وہ اشرفیوں والا طباق لے کر فوراً حاضر ہو جاؤ۔“
 صبح فجر کے فوراً بعد لودھی وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر حاضر ہو گیا آپ نے تھوڑی
 دیر بعد یہ اشرفیاں چاروں لیٹروں کے حوالے کر دیں اور ایک بار پھر فرمایا : ”تم سب خوب
 اچھی طرح سن لو، ان اشرفیوں میں آگ ہے انہیں جو چھوٹے گھا جھلس جائے گا،“
 لیٹروں نے شاہ صاحب کی باتیں لاپرواہی سے سُنیں اور اشرفیاں لے کر شراب
 خانے چلے گئے اور وہاں خوب ڈٹکے شراب پی۔ جب نشے میں دھت مے خانے سے
 باہر نکلے تو انہیں اچانک اشرفیوں کی تقسیم کا خیال آگیا ان کے سر غصہ نے کہا : ”اب ہمیں یہ
 اشرفیاں بھٹہ مساوی آپس میں تقسیم کر لینی چاہی ہیں۔“
 ایک نے جھوٹے ہوئے کہا : ”بے شک، لیکن اس بات کا بطور خاص خیال رہے کہ
 یہ راز میں نے بتایا تھا۔ اس لیے زیادہ حقہ کا بھی میں ہی حقدار ہوں۔“

دوسرے نے اسی خیال کی مخالفت کی، بولا ”تو نہیں زیادہ حصّے کا حقدار ہیں ہوں
کیونکہ شاہ صاحب کو چھری دکھانے میں، میں سب سے آگے تھا اور یہ میری چھری ہی کا کرشمہ
ہے جو شاہ صاحب نے خوفزدہ ہو کر اشرفیاں دوبارہ منگوادیں“

تفسیر نے ان دونوں کو دانٹ دیا، کہنے لگا ”تم دونوں زیادہ پی گئے ہو اور
نشے میں دھت بہک رہے ہو، کیا تمہیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ ہمیشہ حصّے بخرے میں کرتا
رہا ہوں اور تم سب میری دیانت کے پیش نظر حصّے سے کچھ زیادہ ہی دیتے رہے ہو۔“
چوتھا ہنسا اور نہایت تمکنا نہ لہجے میں کہا ”میں تمہارا سردار ہوں، کیا نشے میں تم
مجھے پہچان بھی نہیں رہے؟ اپنے سردار کے ہوتے ہوئے ایسی بے سرو پایا اور فضول باتیں کر رہے
ہو، سردار کا حصّہ ہمیشہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔“

سردار کی بات پر تینوں چھریاں کھینچ کر اس پر پل پڑے اور ذرا سی دیر میں اس کے ٹکڑے
اڑا دیے۔ اس کے بعد یہ تینوں آپس میں لڑنے لگے اور آخر تینوں ہی زخمی ہو کر سرسکے
لگے جب شہر کو تو والی موقعہ واردات پر پہنچا تو ان قریب المرک میں سے ایک نے اپنا نرا اعلیٰ بیان
دے کر ساری کیفیت شہر کو تو وال کے گوش گزار کر دی اور مرگیا۔

کو تو وال اشرفیاں لے کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا قصہ سنا کر
اشرفیاں پیش کرنے لگا۔ آپ نے جواب دیا ”اُسے یہاں سے لے جاؤ۔ ان میں اُگ چھپی ہے
جو چھوٹے کا جل جائے گا۔“

کو تو وال نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور گھر چلا آیا۔ کئی دن بعد شہر کو تو وال کے
گھر پر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور شہر کو تو وال کو اس کے پوئے کلبہ کے
ساتھ قتل کر دیا۔

مغل قریاں رواہاویوں اپنے چند امرا کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے
دھماکی درخواست کی۔ اس وقت آپ شاہ ولایت کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے آپ نے ایک
نگاہ غلط انداز بہاویوں پر ڈالی اور حکم دیا۔ ”و بادشاہ اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔“
بہاویوں نے مطلب نہیں سمجھا حیرت سے پوچھا ”حضرت کیا فرما رہے ہیں؟ کچھ

وضاحت سے فرمادیں۔“

آپ نے ترشی سے کہا ”میری صاف بات کا بھی مطلب نہیں سمجھتا، میں کہہ رہا ہوں

کہ تو یہاں سے اپنے وطن چلا جا۔ خدا ایک تہجد سے زیادہ لائق انسان کو چند سال حکمرانی کا موقع دینا چاہتا ہے۔“

ہایوں گھبر گیا۔ آپ نے ہایوں کو بالواسطہ خبردار کیا: ”بادشاہ سے کہہ دو، شیر کو بچھاڑنے والا آرہا ہے وہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔“

ادھر یہ مکملے ادا ہو رہے تھے دوسری طرف شیرخان سوری بہار سے مغرب کی طرف چلا آرہا تھا مقابلے پر جانے سے پہلے امرانے کہا: ”ایک بار حضرت ولایت شاہ کی بارگاہ میں پھر حاضری دینی چاہیئے اور ان سے اس مقابلے کے لئے واضح حکم حاصل کرنا چاہیئے۔“

بیرم نان کی سرکردگی میں ایک فدا شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا حال سنائے ان کی رائے طلب کی۔

آپ نے ناراضی سے فرمایا: ”میں دو مہینے سے یہ کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ سے کہہ لو اپنے وطن واپس چلا جائے۔“

بیرم خان نے کہا: ”کیں حضور والا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا بادشاہ چند لڑیوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے۔“

آپ نے فرمایا: ”امتی سردار! جب تو خود ہی کوئی فیصلہ کر چکا ہے تو پھر مجھ سے رائے لینے کیوں آیا؟ جا، جوتیرے جی میں آئے کہ میں خاموش رہوں گا۔“

بیرم خان ڈر گیا، بولا: ”حضرت! یہ علام تو آپ کا مابعدا ہے بھلا یہ میری مجال کہ آپ کے حکم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔“

آپ نے کہا: ”تب پھر سہارا فیصلہ ہی سچا اور اچھا ہے۔ اپنے بادشاہ سے کہو وہ یہاں سے پہلے ہی چلا جائے اس سے یہ بھی کہو کہ وہ بابوس نہ ہو، ہم اسے دوبارہ بلا لیں گے۔“

دکھتے عرصے بعد؟ بیرم خان نے سوال کیا۔

آپ نے ترشی سے کہا: ”یہ مت پوچھو، جب جی میں آئے گا بلا لیں گے۔“

اس کے بعد آپ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن پاک کو گلے میں لٹکا کر اگرہ سے لہیں اور چلے گئے۔

ہایوں کو جب آپ کے ارشادات کا علم ہوا تو بہت بد دل ہوا۔ امرانے کہا: ”حضور والا یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب شہر اور حکومت پر کوئی برا وقت پڑنے والا ہوتا ہے تو حضرت ۳۴۹

ولایت شاہ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں، ان کا اگر سے چلا جانا اچھی بات نہیں ہے؛“
 ہمایوں نے منور بیگ نامی ایک امیر کو حکم دیا، وہ تم حضرت ولایت شاہ کے خادموں کو
 چالیس روپے اور اونٹ دیکر کہو کہ وہ کسی بھی طرح انہیں اگر سے واپس لائیں“
 ہمایوں یہ حکم دے کر قونج روانہ ہو گیا کیونکہ شیر خان کی فوجیں وہاں سے اگر سے کی طرف بڑھنے
 کا ارادہ کر رہی تھیں۔ لوگ حضرت ولایت شاہ کو تلاش کرتے ہوئے وہیں پہنچ گئے۔ جہاں وہ قیام
 فرماتے، مریدوں نے عاجزی سے عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحب، اگر سے میں آپ کی جلدی کے غم
 میں ملائکہ اور شاہ پریاں بہت لمبی ہیں اور رور و کر برا حال کیے لے رہی ہیں۔ براہ کرم وہاں تشریف
 لے چلیے“

حضرت ولایت شاہ صوفیا اور صلیح کو ملائکہ کہتے تھے اور پردہ نشین عبادت گزار خواتین
 کو شاہ پریاں کا خطاب دے رکھا تھا مرید مشکل انہیں اگر سے واپس لائے۔
 آدھی رات گزر چکی تھی، مریدوں نے دیکھا، حضرت ولایت شاہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور
 جلدی جلدی آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگے کسی مرید نے دریافت کیا: ”حضرت یہ روٹیاں
 کس کے لیے پکا رہے ہیں؟“

عصے میں جواب دیا: ”بادشاہ کے لئے۔ ہزار مرتبہ کہہ دیا تو اپنے وطن واپس جا لیکن نہیں
 مانتا، اپنی سی کئے جاتا ہے آخر مجبور ہو کر زاد راہ تیار کیئے دیتا ہوں اب بھی نہیں مانے گا تو بہت
 پچھٹائے گا“

میسوری دیر بعد چند گھنٹہ سوار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پہنچے، گھوڑے سے اتر
 کر آپ کی خدمت میں دو زانو ہو گئے آپ نے ان میں سے ایک پر نظریں جمائیں اور ترمشی سے کہا دو کیا
 تمہیں میرا پیام نہیں ملا تھا کہ اب تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ؟“
 نواز نے جواب دیا: ”حضرت آپ کا پیام مل تو ضرور گیا تھا لیکن خدا کے آخری فیصلے
 کے انتظار میں مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا؟“

اپنے پوچھا: ”بھیر کیا ہوا؟“
 نواز نے جواب دیا: ”ہمیں شکست فاش ہوئی اور شیر خانی لشکر بہت جلد اگر سے
 میں داخل ہونے والا ہے“

جو روٹیاں پک چکی تھیں حضرت ولایت شاہ نے وہ نواز کے حوالے کر دیں

اور حکم دیا۔ دو تو اسی وقت ایران چلا جا اور ان رویوں کو زارِ راہ سمجھ “
 نووارد نے تو بے پروائی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کر کے ہوئے پوچھا: ”کیا اس
 میں میرا کوئی حصہ نہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بھی تمہاری ہی ہے لیکن یہ اس وقت ملے گی جب تم ایران سے
 دوبارہ واپس آؤ گے۔“

مریدوں نے اس نووارد عقیدت مند کو پہچان لیا۔ یہ ہایوں تھا جو شیرخان سے
 شکست کھاکر حضرت ولایت شاہ کا حکم سننے آیا تھا۔

ہایوں نے التجا آمیز لہجے میں کہا: ”اس وقت زمین اور آسمان دونوں ہی ہمارے
 دشمن ہوئے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بخیریت تمام ایران پہنچ جائیں؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”بک بک کیا کرتا ہے، اپنا راستہ لے کیا ہم نے یونہی تجھے زارِ راہ
 دی ہے۔“

ہایوں نے اسی وقت اُگڑے سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔



شیرخان، شیر شاہ ہو گیا، اس نے اپنی عسکری قوت میں بے پناہ اضافہ کیا، مشہور
 داروغہ توپ خانہ رومی خان کو حکم دیا گیا کہ توپیں ڈھال جائیں اور اس حکم سے تیزی سے عمل
 درآمد ہوتے لگا۔ حضرت ولایت شاہ بازار سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے رومی خان آ گیا۔
 وہ نیاز مندانہ آپ کے سامنے جھک گیا آپ نے لاپرواہی سے اس پر نظر ڈالی۔ رومی خان نے
 ادب سے عرض کیا: ”حضرت اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ ناچیز آپ کو اپنا کارنامہ دکھانے
 کی سعادت حاصل کرے۔“

آپ نے دریافت فرمایا: ”کیسا کارنامہ؟“

رومی خان نے جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کے حکم پر توپیں ڈھلوا رہا ہوں، اب تک جو کام
 ہو چکا ہے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔“

آپ خاموشی سے رومی خان کے ساتھ ہو لیے۔ رومی خان نے انہیں توپیں ڈھلنے کے کاغذ
 میں پہنچا دیا۔ وہاں ہر طرف بھٹیاں جل رہی تھیں۔ بولہ گلیاں پگھلایا جا رہا تھا بہت سی توپیں تیار
 کھڑی تھیں کچھ ناقص حالت میں تھیں ایک طرف تانبے کا ذیفرہ تھا جسے توپ میں لٹکایا جا رہا تھا

تقریباً ایک ہزار مزدور اور کاریگر کام میں لگے ہوئے تھے۔

حضرت ولایت شاہ نے کربے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ کینٹیوں پر رکھ کر بولے: ”اللہ اکبر! دومی خان تو آدمی ہے یا موت کا فرشتہ؟ تو انسانوں کی ہلاکت کا سامان اتنے اہتمام سے کر رہا ہے۔ توبہ توبہ“ پھر ان توپوں کی طرف عجیب انداز سے اشارہ کیا اور پھر ادھر ادھر موجود لوگوں سے کہا۔ ”دیکھتے کیا ہو آگے بڑھو اور انہیں توڑ پھوڑ کر بیچ کھاؤ“

آپ کے ان کلمات کا شیر شاہ سوری کے عہد میں اس طرح عمل ہوا کہ جب پورا شہر انفراتری اور ہنگاموں کا شکار تھا بلوائیوں نے توپ خنہ پر حملہ کر دیا۔ انہیں توڑا پھوڑا اور توپوں کے بوسے اور تانبے کو بازار میں بیچ کر کھانے پینے کا سامان خرید لیا۔



شیر شاہ کا لجنر پر فوج کشی کرنے جا رہا تھا۔ اس نے بابا فرید گنج شکرؒ کے گھرنے کے ایک بزرگ عزیز شیخ کبیرؒ سے درخواست کی: ”ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ ہماری طرف سے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دیں انہیں ہماری طرف سے کچھ اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم کا لجنر کی تسخیر ہو جا رہی ہے“

شیخ کبیرؒ نے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دی اور اشرفیوں کو کاغذ میں لپیٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: ”اس کاغذ میں کیا ہے؟“ شیخ کبیرؒ نے جواب دیا: ”اشرفیاں حضرت۔ سوری بادشاہ کا لجنر جہاد کرنے جا رہا ہے اور وہ آپ کے دُعائیہ استمداد کا خواہش مند ہے“

آپ نے اشرفیوں کو فٹو کر مادی اور منہس کر فرمایا۔

”و سبحان اللہ۔ کیا خوب! آگ لگ رہی ہے آگ۔ ادھر امیری آنکھوں سے

دیکھ، پتھر اور پیاڑ قہر کی آگ میں جل رہے ہیں اور رہا تیرا بادشاہ، آگ تو اس کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ کالجنر قلعے کا تسخیر کے لئے کب جا رہا ہے وہ تو آگ میں جلنے جا رہا ہے شیخ کبیرؒ! تم وہاں ہرگز نہ جانا“ پھر اشرفیاں اٹھائیں اور شیخ کبیرؒ کے سر پر مار دیں۔ جلال میں بولے۔

”کیا تم مجھے بابا فرید کی نظر میں شرمندہ کرنا چاہتے ہو، خبردار جو شیر خان کے ساتھ گئے تو اس کے

ساتھ ہی تم بھی جل جاؤ گے“

شیخ بکیر نے واپس جا کر شیر شاہ کو من و عن سنا دیا شیر شاہ کچھ دیر ساکت رہا، کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد کہا ”شاہ ولایت تو ایک مجذوب انسان ہیں اخلاسی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ان کلمات میں کون سا بھید چھپا ہے“

جب شیر شاہ فوج لے کر کالنجر چلا گیا تو اپنے دامن بھارتے ہوئے افسوس سے فرمایا ”افسوس کہ آگ لگ رہی ہے، افسوس کہ آگ لگ رہی ہے“
عین حالت جنگ میں شیر شاہ کے بارودی ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ بھلس کر انتقال کر گیا۔

شیر شاہ کی ناکامی موت سے ملک میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اسلام شاہ جو بعد میں سلیم شاہ سوری کہلایا اپنے بڑے بھائی کی عدم موجودگی میں تخت نشین ہو گیا۔ درباری امرا اس کی مخالفت میں لگ گئے۔ سلیم شاہ بھی ان سے خوف زدہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر دولت خان سے کہا۔
”اس عالم انتشار اور سراپائی میں یہیں کیا کرنا چاہیے؟“

دولت خان نے جواب دیا ”حضور ولایت شاہ مجذوب کے پاس تشریف لے چلیں، وہ جو کچھ کہیں گے وہی حضور کا مستقبل ہوگا“

اتفاق کی بات کہ جب سلیم شاہ اپنے وزیر کے ساتھ حضرت ولایت شاہ کے پاس پہنچا۔ باغی امرا بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بادشاہ اور وزیر کو دیکھ کر ایک طرف چھپ گئے بادشاہ حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے کئی دوسرے نذرانوں کے علاوہ پچاس بیڑے بھی لایا تھا۔ یہ بیڑے ایک رومال میں بندھے تھے جب وہ بیڑوں والا رومال حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا تو دل میں یہ سگون لیے ہوئے تھا کہ اگر حضرت ولایت شاہ اسے ان بیڑوں میں سے چار واپس کر دیں گے تو وہ اس سے یہ سگون لے گا کہ وہ مخالف اور باغی امرا پر غالب آجائے گا۔

حضرت ولایت شاہ تھوڑی دیر پہلے کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، قرآن پاک کو نہایت ادب سے رحل پر رکھ دیا اور بادشاہ کے بیڑوں میں سے چھالیس خود لے کر چار اُسے واپس کر دئے اور فرمایا۔

”اَتَجْعَلُكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاَحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْعَدْلِ“

”بلاشبہ تم نے تجھے زمین میں خلیفہ (نائب) بنادیا ہے پس تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کر“

پھر خود سے فرمایا۔ ”سبحان اللہ! غریب کو ذرا سا تو ملک ملا ہے اس میں بھی حاسد اور بدخواہ حصہ لگانا چاہتے ہیں“ پھر دولہ خان کو حکم دیا۔ ”دولہ خان! تم چند وزیعت خاطر کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت میں زیادہ حاضری دو خدا حافظ ہے“

دولہ خان نے بادشاہ کے کان میں کہا ”حضور! اب ہمیں فوراً چلا جانا چاہیے کیوں کہ اگر کچھ دیر اور ٹھیرے اور حضرت ولایت شاہ کی زبان سے کچھ اور نکل گیا تو بہت بُرا ہوگا“

اسی وقت ایک مرید نے دولہ خان سے سرگوشی میں کہا۔

”حضور! باغی امرا بھی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے حاضر ہوئے ہیں آپ ابھی والپنہ جائیں اور کسی طرح چھپ کر ان کی قسموں کا فیصلہ بھی سننے جائیں“

سلیم شاہ سوری اور دولہ خان باہر نکل کر شاہ ولایت کے ایک مرید کی مدد سے ایسی جگہ دیویش ہو گئے جہاں سے باغی سرداروں کی باتیں صاف سنی جاسکتی تھیں۔

جلال خاں نامی سردار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں ادب سے جھک گیا اور اس کے ساتھیوں کے بقول اس نے اپنے دل میں نیت کی کہ اگر شاہ ولایت اسے ہندوستان پر حکمرانی کی خوش خبری سنائیں گے تو وہ پرکھ آگاہ نڈلے میں آپ کو پیش کر دے گا۔

اپنے جلال خاں کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ بولے، ”جلال خاں! خدا سے شرم کرو! تم نے شیر شاہ کا نام لکھایا ہے اب اس کے بیٹے سے نرک حرامی نہ کرو۔ سلیم شاہ خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر ہوا ہے اس لیے ہم بھی اس کی طرف راہی کریں گے جاؤ اس کے دوست بن جاؤ، ورنہ وہ تمہیں قتل کرانے یا پھوڑے اس پر اسے پوری قدرت عطا ہوئی ہے“

جلال خاں فوراً پیچھے ہٹا اور خواص خان اور سعید خان نامی سردار کے بڑھے انہیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا۔ ”بے وقوفو تمہارے سر نہ ہارے کاندھوں سے کہاں چلے گئے؟ وہ تو میدان میں دھکے پھیر رہے ہیں، جن کا سر کٹ چکا ہو وہ بادشاہ سے جنگ کس طرح کریں گے؟“

باغی سردار اپنے نوشتہ تقدیر پڑھ چکنے کے بعد بھی سلیم شاہ کے مقابلے میں اتر پڑے اور اسے حکم دیا کہ۔ حکومت ہمارے حوالے کر کے گوشہ نشینی یا اطاعت اختیار کر لو۔

سلیم شاہ نے دولہ خان کو ایک بار پھر ولایت شاہ خدمت میں روانہ کیا اور پوچھا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

آپ اس وقت مٹی کی دیوار کھڑی کر رہے تھے دولہ خان کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ”تو ناحق آیا،

ہم تو پہلے ہی سے اس کا پشت تیان تعمیر کر رہے ہیں، یہ کہہ لینی مٹی دیوار پر کھینچ ماری جو چپک گئی۔
دولہ خان سے اس پھوپھے کی طرف۔۔۔۔ اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”سلیم شاہ کا آقا زار جم چکا۔
بالکل اسی طرح جس طرح یہ مٹی چپک گئی ہے۔“

باغی سہ داروں سے زود کا معرکہ کا رزار گرم ہوا اور ان میں سے بعض سہ دار شکست
کھا کر قتل ہوئے اور بعض نے بھاگ کر دود دراز پہاڑیوں میں روپوشی اختیار کی۔



آپ کی زبان سے جو بھی نکلا، ظاہر ہو کر رہا، احکام اشاروں میں صادر ہوتے تھے اور
اس کا مفہوم حقیقی اس وقت سمجھ میں آتا تھا جب آپ کا حکم واقعے کی شکل میں ظاہر ہو جاتا تھا
ایک صاحب آپ کے حجرے کے باہر سے اندر کی طرف جھانکنے لگے آپ نے ہی اُسے
دیکھ لیا، فرمایا: ”اندر کیا دیکھتا ہے، اپنے سر پر دیکھ لے“

اس نے گھبرا کر اپنا سر ٹٹولا اور کہنے لگا: ”وہ سر پر تو کچھ بھی نہیں حضرت شاہ صاحب!“
آپ نے حقارت سے فرمایا: ”خوب اپنے سر کا تو اتنے نظر نہیں آتا۔“
وہ شخص خوش خوش وہاں سے ہٹ آیا اور لوگوں سے فخریہ کہنے لگا: ”آج تو شاہ
صاحب نے میرے لیے بھی کچھ ارشاد فرمایا۔“

لوگوں نے پوچھا: ”شاہ صاحب نے کیا فرمایا؟“

اس نے جواب دیا: ”آپ نے میرے سر پر کوٹے کی موجودگی کی بشارت دی،“
اور اس بشارت کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ کچھ عرصہ بعد اُسی شخص کو سولی پر چڑھادیا گیا اور
جب وہ مر گیا تو اس کی ٹانگی ہوئی لاش کے سر پر کوٹے بیٹھنے اور کانٹیں کانٹیں کر کے شور مچاتے رہے
اسی طرح ایک سید زادے گڑا درپختے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ
نے ان چٹوں میں سے چار مٹھیاں سید زادے کے حوالے کر دیں اور فرمایا: ”ہم کیا کریں تیری
قسمت، یہی چار مٹھیاں تیری قسمت میں ہیں۔“

سید زادہ ان کلمات پر غور کرتا گھر پہنچا تو معلوم ہوا، سرکاری دیوان کا ہر کارہ آیا تھا
وہ کہتا تھا کہ تنخواہیں تقسیم ہو رہی ہیں حاضر ہو کر اپنی تنخواہ وصول کر لو۔

سید زادہ چار سال سے پریشان تھا اور اسے تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ سید زادے نے
کہا: ”میں تو سرکاری ملازمت ہی سے بیزار ہوں۔ مجھے نہیں چاہیے تنخواہ۔ تنخواہ۔ چار سال سے

تو ملی نہیں اب کیلے گی ۛ

دیوان کا آدمی پھر آیا اور سید زائے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں دیکھا ایک ہجوم اکٹھا ہے اور لوگ اپنی تنخواہیں وصول کر رہے ہیں، انہیں تین تین ماہ کی تنخواہیں دی جا رہی تھیں سید زائے کو دیکھتے ہی دیوان نے منشی کو حکم دیا۔ ”ان کا سارا حساب بے باقی کر دیا جائے“ منشی نے ناگواری سے کہا۔ ”سب کو تین تین ماہ کی تنخواہ دی جا رہی ہے انہیں پورا حساب کس طرح دیا جائے ہاں ان کے ساتھ اتنی رعایت ضرور کر سکتا ہوں کہ بیٹائے تین ماہ کے چار ماہ کی تنخواہ دے دوں۔“

دیوان نے کہا ”اچھا چارہ ہی ماہ کی تنخواہ دے دو بقیہ کا حساب کتاب ہوتا ہے گا۔“ چنانچہ سید زائے کو چار ماہ کی تنخواہ دے دی گئی اور بقیہ کا حساب انہیں زندگی بھر نمل سکا۔ یہ عظیم ہستی نوے سال زندہ رہی اور مرجع خاص و عام رہی، بڑے بڑے بادشاہ یہاں معمولی آدمیوں کی طرح اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے آبا کر تے تھے اور بڑے بڑے سرکش جب اس چوکھٹ میں داخل ہوتے تو ان کی حیثیت حضرت ولایت شاہ کی نظر میں رو باہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔



حضرت شاہ بلاولؒ

ہمایاں ہندوستان سے پانچ سال غیر حاضر رہ کر جب دوبارہ واپس آیا تو ایران اور افغانستان کے بہت سے خاندان بھی اس کے ساتھ آئے۔ انہی خاندانوں میں ہرات کا ایک خاندان لاہور کے موضع شیخ پورہ میں مقیم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس خاندان کے سید عثمان نامی ایک شخص کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ گھر والوں نے اس کا نام بلاول رکھ دیا۔

بلاول ابھی چھ سات سال کے تھے کہ محلے کے لڑکوں سے بڑی دوستی ہو گئی۔ یہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ خوب کھیلتے ایسا لگتا تھا گویا پڑھنے لکھنے سے کوئی سم و کار نہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی باپ سے زیادہ دادا کو فکر تھی۔ دادا اکثر یہی کہہ کر تے کہ بس چند دنوں کی بات اپنے میں اپنے پوتے کو لاہور بھیج دوں گا۔ پھر یہ وہیں بسے گا اور تعلیم و تربیت حاصل کرے گا۔ ایک روز صبح دادا کے ساتھ ہی بلاول بھی بیدار ہو گئے ان کے ساتھ ہی نماز فجر ادا کی اور پھر باہر جانے لگے دادا نے روکا کہ بلاول کہاں چلا؟ بلاول نے جواب دیا ”میں اپنے دوستوں کے پاس جا رہا ہوں تھوڑی دیر کھیلوں کو دوں گا اس کے بعد واپس آ جاؤں گا“

دادا نے کہا ”آج اتنی جلدی؟ روز تو ذرا دیر میں گھر سے نکلتا تھا“

بلاول نے جواب دیا ”ہاں دادا، روز میرے تمام دوست جلدی اٹھ جاتے تھے لیکن آج ایک دوست کی گہری آنکھ لگ گئی ہے اور جب تک میں اسے بیدار نہیں کروں گا نہیں جاؤں گا“

دادا کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات تھی کہ بلاول کا ایک دوست گہری نیند سو گیا ہے اور جب تک بلاول اسے بیدار نہیں کریں گے وہ نہیں جاوے گا۔ انہوں نے سوچا یہ کیا بات ہوئی، جگائیں تو گھر والے جگائیں یہ بلاول اسے جگانے کیوں جائے گا؟ یہ عقدہ زیادہ دیر تک لاسمائل نہیں رہا۔

بلاول کے گھر سے اس دوست کا مکان تقریباً آدھے فرلانگ پر تھا۔ پچھ سات سالہ بلاول تین تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک عورت روتی ہوئی دکھائی دی جب

عورت قریب آئی تو بلاول نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا، یہ اسی دوست کی ماں تھی جسے بلاول جگانے جا رہے تھے۔

بلاول نے عورت سے پوچھا، ”ماں آپ کیوں رو رہی ہیں؟“

عورت نے فرط محبت میں بلاول کو اپنے سینے سے لگایا۔ کہا، ”بیٹے بلاول!

تو میرے بیٹے کا دوست ہے نا؟“

بلاول نے جواب دیا، ”ہاں ماں کیا بات ہوئی؟“

عورت نے کہا، ”بیٹے بلاول بات یہ ہوئی کہ تیرا وہ دوست آج فجر سے ذرا پہلے مر گیا۔ میں غم کی ماری اپنے رشتے کٹنے والوں کو اس کی اطلاع دینے جا رہی ہوں۔“

بلاول کو ہنسی آگئی پوچھا، ”ماں! کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ واقعی مر گیا ہے؟“

ماں نے جواب دیا، ”اس میں یقین کی کیا بات ہے سبھی متفق ہیں کہ وہ مر گیا۔“

بلاول نے کہا، ”لیکن مجھے اس کا یقین نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے۔“

کیا آپ مجھے میرے دوست کے پاس لے چلیں گی؟“

ماں نے کہا، ”وجہ تو نہ اسے دیکھا نہیں تو اس کی نیند اور موت کے بارے میں کوئی بات

کس طرح کر سکتا ہے۔“

بلاول نے جواب دیا، ”ماں یہ تو آپ بچا فرما رہی ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ کو میری بات

ملنے میں تاثر کیوں ہے؟“

ماں نے کہا، ”تاثر اس لئے ہے کہ میں اپنے بچے کی موت سے ابھی طرح واقف ہوں۔“

بلاول نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور واپس لے جانے کی کوشش کی۔ ماں نے مزاحمت

نہیں کی وہ تو مجھے واپس چلنے پر مجبور کر رہا ہے تو میں خود ہی چل چلتی ہوں میرا ہاتھ نہ پکڑ۔“

بلاول نے ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر یہ دونوں سوئے ہوئے لڑکے کے گھر بے غم ہو گئے۔

گھر کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا اور فضا میں نوبان کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ بلاول سیدھے

مرے ہوئے دوست کے پاس پہنچے۔

گھر والوں نے عورت سے پوچھا، ”تو واپس کیوں آگئی؟ اور یہ بلاول کیوں آیا ہے؟“

عورت نے جواب دیا، ”میں تو میت کی خبر دینے جا رہی تھی لیکن یہ بلاول راستے میں مل

گیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ میرا دوست کوئی مرنے والا ہے گہری نیند سو گیا ہے، میں اسے جگانا دوں گا۔“

عورت کے شوہر نے بکھر کر کہا، ”اور تو اس بچے کی باتوں میں آگئی؟“

عورت نے جواب دیا: میں باتوں میں نہیں آگئی بلکہ میں خود نہیں جانتی کہ میں کیوں واپس آگئی بلاول نے مجھ سے کہا کہ ماں واپس چلو، میں اپنے دوست کو بیدار کر لوں گا۔ بس میں واپس آگئی اس کے ساتھ ۛ

شہر نے زور سے پیر پٹنے۔ بولا: "تیرا ستیاناس ہو گھر، میں بیٹے کی لاش پڑی ہے اور تو بخول میں وقت گزار رہی ہے۔"

بلاول لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور اس کی بند آنکھوں میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی، پھر نختوں پر اپنی تھیلی رکھ دی۔ بولے: "وہ بیٹی کمال ہے کوئی اس طرح سانس روک کر سوتا ہے میں تو تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں اور تو ہے کہ سانس روکے سو رہا ہے میں کہتا ہوں اب وقت نہ ضائع کر اور اٹھ، میں تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں۔"

لڑکا بدستور پڑا رہا۔

بلاول کو غصہ آگیا۔ شانہ پڑ کر بھنچوڑ دیا اور کہا: "تو مٹی مائے پڑا ہے اور تیرے ابا اُمّال اور دوسرے رشتے دار یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید تو اللہ کو پیارا ہو گیا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ تو سو رہا ہے اب تو اٹھ جا اور اس طرح سو سو کر عمر نہ ضائع کر۔ میں تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں۔"

شانہ ہلانے سے لڑکا کمنا یا اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلاول کو دیکھتے ہی پوچھا: "دیکھا میں زیادہ دیر تک سو رہا ہوں؟"

بلاول نے جواب دیا: "ذرا باہر نکل کر دیکھ سو رنج و نیاز ہے اور چڑھ چکا ہے۔" لڑکے نے اپنے آس پاس غمزدہ لوگوں کو جو دیکھا تو پوچھا: "یہاں یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟" بلاول نے جواب دیا: "یہ تو خود ان لوگوں سے پوچھا، اس کا میں کیا جواب دوں؟" لڑکے کے ماں باپ اور دوسرے عزیز رشتے دار لڑکے کے جی اٹھنے سے حیرت زدہ رہ گئے اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا؟ آپس میں طرح طرح کی چرمیگوئی کرنے لگے۔

لڑکے نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا: "آؤ باہر چل کر کھلیں۔"

بلاول نے جواب دیا: "میں تو تیرے پاس کھیلنے ہی کے لئے آیا تھا لیکن تو ذرا دیر کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس رک تاکہ تیرے جانے کی خوش مناسبت پھر کھیل بھی رہ جائے گا۔" لڑکے کے جی اٹھنے کی خوشی میں سارا گھر پاگل ہو رہا تھا ہر شخص باری باری لڑکے کو

گود میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور رٹکا حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے آخر ؟
 بلاول اپنی گھر واپس چلے گئے اُن کے گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد رٹکا اور اس کے ماں
 باپ بلاول کے گھر پہنچے اور بلاول کا رنامہ ان کے گھر والوں کے سامنے بیان کیا۔ سب سے
 زیادہ دادا کو خوشی ہوئی لیکن تشویش بھی۔ انہوں نے بلاول کو تھیلے میں لے جا کر پوچھا۔
 بلاول ! یہ میاں بیوی جو کچھ کہتے ہیں کیا یہ سچ ہے ؟

بلاول نے جواب دیا۔ ”میں سچ بھڑٹ سے واقف نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں
 کہ میرا دوست گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ اگر یہ بیدار کر دینا کوئی بڑا کارنامہ
 ہے تو میں نے واقعی ایک کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ ایک
 معمولی بات تھی۔“

دادا نے پوتے کو سمجھایا ”بلاول ! اب میں تجھے کیا سمجھاؤں ؟ تو نے جو کچھ کیا ہے
 کیا دیکھ نہیں رہا کہ اس کا پورے شیخوپورے میں کیا چرچا ہے ؟ میں تجھ کو سمجھاتا ہوں کہ ابھی تیری عمر ہی
 کیا ہے اگر تجھ میں کچھ ہے تو اس کا یوں بڑا اظہار نہ کرنا پھر ۛ

دادا نے پوتے کو سمجھانے کو سمجھا دیا۔ لیکن بعد میں یہ سوچتے رہے کہ بلاول کو
 شیخوپورے ہی میں رکھا جائے یا یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ موضع کے لوگوں کا اتنا بندھا ہوا تھا
 اور وہ صبح سے شام تک بلاول کے دیدار کو آنے لگے تھے ایک دن دادا نے پوتے کو میل
 گاڑی میں بٹھایا اور لاہور روانہ ہو گئے اُن دنوں لاہور میں شیخ فتح محمد لاہوری علیاٹے عصر
 میں جیل مانے جاتے تھے۔ بلاول کو ان کے حوالے کرتے ہوئے دادا نے کہا ”حضرت !
 اس رٹکے کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اسے علوم عقلی و نقلی میں کامل
 کر دیا جائے گا۔“

شیخ فتح محمد نے پوچھا ”اس پہلے اس نے کہاں تک پڑھا ہے ؟“
 دادا نے جواب دیا ”حضرت یہاں آنے سے پہلے اس نے الف ب تک نہیں پڑھا۔
 ابتدا حروف شناسی سے کرنا ہوگی۔“
 استاد نے کہا ”بہتر ہے۔“
 اس کے بعد بلاول کو اپنے سامنے بٹھا کر حروف تہجی کا قاعدہ کھول کر کہا۔
 ”و پ پٹھو الف ب۔“

بلاول نے الف ب سے شروع کر کے پورا قاعدہ استاد کے بغیر بتائے ہی پڑھ ڈالا۔

استاد حیرت قاعدہ سنتے ہے اس کے بعد بلاول کے دادا سے کہا: ”واہ حضرت آپ تو کہتے تھے سچے کو الف بے پڑھانا ہوگا اور اس کی ابتدا حروف شناسی سے کرنا ہوگی۔ لیکن یہ تو پڑھا پڑھا معلوم ہوتا ہے۔“

دادا نے جواب دیا: ”حضرت میں نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا میں یہاں بلاول کو لے کر کیوں آیا۔ یہ بھی اتنے ہی اچھے کی بات ہے جتنی حیرت کی یہ بات کہ اسے پڑھایا تو کچھ بھی نہیں گیا لیکن پڑھنا جانتا ہے۔“

اس کے بعد دادا نے مردہ لڑکے کو جلا دینے کا پورا واقعہ سنایا۔ استاد نے بلاول کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور دادا کے کان میں کہا: ”آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیے یہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مستقبل کا کوئی غیر معمولی انسان ہے۔“ دادا چھوڑ کر چلے گئے۔ استاد نے انہیں پٹھانا شروع کر دیا۔ اور اس وقت استاد پھر حیرت زدہ رہ گئے جب بلاول نے چھ ماہ کے مختصر عرصے میں قرآن پاک کو حفظ کر ڈالا۔

بلاول کا دستور تھا کہ فرصت کا وقت، دریائے راوی کے کنارے گزارتے تھے اسی طرح ایک دن آپ راوی کے کنارے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ کوئی بزرگ کشتی میں بیٹھے دو رہی سے آپ کو اشارہ کر رہے تھے۔ بلاول اس جگہ رک گئے جہاں کشتی کے رکنے کا امکان تھا۔ کچھ دیر بعد کشتی کنارے سے الگی اور اس میں سے ایک بزرگ اتر کر آپ کے پاس آئے اور بڑے اشتیاق سے کہا: ”بلاول تو یہاں ٹہل رہا ہے اور میں تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

بلاول نے جواب دیا: ”حضرت! میرا تو روز کا معمول ہی یہی ہے کہ مکتب سے فرصت پا کے راوی کے کنارے آ جاتا ہوں۔ فرمایا میرے لائق کوئی کام؟“ ان بزرگ نے فرمایا: ”بلاول! میرا نام شمس الدین قادری ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے بلاول کا ہاتھ پکڑ لیا: ”کیا تو جانتا ہے خدا نے تجھے کیوں پیدا کیا ہے؟“ بلاول نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا نے آپ کو میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟“

شمس الدین قادری نے تبسم فرمایا۔ بولے ”بیشک تو جانتا ہوگا۔“ ۳۶۱

لیکن میرا یہ فرض ہے کہ میں تجھے تیری تلاش کی غرض و نیت سے مطلع کر دوں۔ خدانے تجھے اپنی ذات کی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے بلاول تو میری صحبت میں رہ اور فیض باطن ہجو میرے پاس تیری امانت ہے اسے حاصل کر ۛ

بلاول نے عقیدت مندی سے جواب دیا ۛ مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے میں ابھی اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں ۛ

اس کے بعد آپ شاہ شمس الدین قادری کے پاس رہنے لگے انہوں نے بلاول کو اپنے ارادت مندوں میں داخل کر لیا۔ وہ علوم ظاہری اور باطنی حاصل کرنے لگے اور یہ سب اتنی جلدی حاصل کر لیا۔ کہ دوسرے زندگی بھر کی ریاضت اور مشقت سے بھی یہ نہیں پاسکتے تھے شاہ شمس الدین قادری نے آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا۔

آپ ہر وقت اپنے پیرومرشد کے ساتھ رہنے لگے سفر و حضر کہیں جس ساتھ نہ چھوڑتے تھے۔ ایک دن شاہ شمس الدین قادری انہیں اپنے ساتھ لے کر دیا کے کنارے کہیں جا رہے تھے کہ دوپہر کا وقت ہو گیا اور دھوپ کی تمازت پریشان کرنے لگی۔ پیرومرشد نے بلاول سے کہا ۛ بلاول! تیرا کیا خیال ہے؟ اگر میں کچھ دیر کے لئے سفر موقوف کر دوں اور سامنے درخت کے نیچے لیٹ کر ایک نیند لے لوں تو کیسا ہے گا؟ ۛ

بلاول نے جواب دیا ۛ کیا مجھ میں اتنی بہت ہے کہ آپ جو کچھ فرمائیں میں اس سے اختلاف کروں؟ ۛ

شاہ صاحب نے فرمایا ۛ تب پھر میں اس درخت کے نیچے لیٹ جاتا ہوں۔ آؤ ابھی میرے پاس بیٹھ جا ۛ

شاہ قادری درخت کے نیچے لیٹ گئے اور بلاول ان کے پاس بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگے۔ کچھ دیر بعد شاہ قادری کو نیند آ گئی۔ اسی دوران کسی طرف سے ایک جاٹ آیا اور کھاڑی کو کمر سے باندھ کر درخت پر چڑھنے لگا اپنے اُسے روکا اور پوچھا ۛ اے بھائی! تو اوپر کیا لینے جا رہا ہے؟ ۛ

جاٹ نے اُجڑے لہجے میں پوچھا ۛ تو کون ہوتا ہے مجھ سے یہ سوال کرنے والا؟ ۛ بلاول نے جواب دیا ۛ میں تو اس لئے تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ میرے پیرومرشد اترتے فرما رہے ہیں کہیں تو ایسی حرکت نہ کرے جس سے ان کے آرام میں خلل ہو اور میں شرمندگی اٹھاؤں ۛ

جاٹ نے گھڑے پہنچے میں کہا ”میں لکڑیاں کاٹنے جا رہا ہوں۔ اگر میرا آرام نہ ہو گا تو گھر جا کر آرام کرے یہ آرام کرنے کی کونسی جگہ ہے؟“

بلاول نے ناگواری سے منہ بنایا اور کہا ”تو ذرا دیر کے لیے رک جا۔ ابھی اوپر نہ جا۔ میں تجھ سے خدا اور رسول کے نام پر درخواست کرتا ہوں۔“

لیکن جاٹ نہیں مانا۔ وہ اوپر چڑھ گیا اور پھر کمر سے گھڑی کھول کر کھٹ کھٹ لکڑیاں کاٹنا شروع کر دیں۔

بلاول نے غصے میں کہا ”او جاٹ کے بچے! میں نے تیری خوشامد کی لیکن تو باز نہیں آیا۔ کیا خیال ہے، کیا میں اپنا غضب دکھاؤں؟“

جاٹ نے اوپر ہی سے کہا ”غضب بھی دکھالے۔ گویا میں تیرے غضب سے ڈر رہا ہوں۔ بلاول نے پھر خوشامد نہ انداز میں کہا ”اے بھائی خدا کے لئے میری بات مان لے

اور نیچے اتر آ۔ بھڑی دیر کی تو بات ہے پھر کاٹ لینا لکڑیاں۔“ جاٹ ہنسنے لگا۔ بولا ”میاں! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کبھی تم خوشامد کرتے ہو کبھی غصہ دکھاتے ہو لیکن مجھ پر ان میں سے کسی کا بھی اثر نہیں ہو گا۔“

بلاول نیچے سے ڈانٹ کر کہنے لگے ”وہیں نے ابھی اپنا غضب تجھے کہاں دکھایا ہے اگر تو میرا غضب دیکھنا ہی چاہتا ہے تو لے دیکھ لے۔“

جاٹ نے نیچے جو دیکھا تو اسے معلوم نہیں کیا دکھائی دیا کہ چیخ مار کر زمین پر آ رہا اور زمین پر گرتے ہی اس کی جان نکل گئی۔

شاہ شمس الدین قادری کی آنکھ کھل چکی تھی انہوں نے پوچھا ”بلاول کیا بات ہے؟“ بلاول نے جاٹ کا پورا قصہ سنا دیا۔ شاہ قادری نے بلاول سے پوچھا ”یہ تو نے

کیا کیا؟“

بلاول کہنے لگے ”حضرت! میں نے اُسے بہت سمجھایا لیکن یہ باز ہی نہ آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی کھٹ کھٹ سے آپ کی آنکھ نہ کھل جائے۔“

شاہ قادری نے افسوس سے کہا ”بہر حال مجھے بے حد افسوس ہے ہم فقیروں کے لئے اس قدر غضب جلال کا مظاہرہ کرنا ہرگز روا نہیں ہے۔“

بلاول نے کہا ”اب تو جو ہوتا تھا ہو چکا، اب میں کیا کر سکتا ہوں؟“

پیر نے جواب دیا: اب اس کی تلافی یوں کر دو کہ میرے ساتھ شاہ ابواسمٰعی کے مزار کے ایک حجرے میں بند ہو کر تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو جاؤ اور اس وقت تک اس حجرے میں قید رہو جب تک وہاں سے باہر نکلنے کا حکم نہ مل جائے۔“

چنانچہ بلاول، شاہ اسمٰعی کے مزار کے ایک حجرے میں متکلف ہو گئے اور اپنے شب و روز تلاوت قرآن پاک میں گزارنے لگے۔ اس شغل میں کئی سال گزر گئے مگر باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی۔ آپ نے یہ چند سال تلاوت قرآن ہی میں نہیں بلکہ روزہ نماز اور ذکر میں بھی صرف کیے۔



شاہ بلاول کی شہرت اور ان کی کرامات کا پھر چادہلی تک پہنچ چکا تھا یہ شاہجہاں کا زمانہ تھا جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں تھا اس لیے شاہجہاں اپنے باپ کے مزار پر پہنچا۔ اُس نے قرآن خوانی کے لیے حافظوں کی فوج بٹھادی۔ ان دنوں لاہور میں حضرت میاں میر کی ذات بھی مرجع خاص و عام تھی۔ شاہجہاں میاں میر کی خدمت میں پہنچا اور دو ہزار روپے ان کی مذکور کرنا چاہے کہ انہیں قبول فرمائیں، لیکن میاں میر نے یہ رقم نہیں لی۔ بولے: ”افسوس کہ یہی یہ رقم نہیں لے سکتا“ شاہجہاں نے پوچھا: ”آخر قبول کرنے میں تاثر کیا ہے؟“

میاں میر نے جواب دیا: ”یہ میری روایات اور وضع داری کے خلاف ہے۔“ شاہجہاں نے زیادہ خواہش نہیں کی۔ وہ یہ رقم اپنے ساتھ لے کر شاہ بلاول کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور درخواست کی: ”حضرت! یہ دو ہزار کی حقیر رقم حاضر خدمت ہے قبول فرما کر شکر گزار فرمائیے۔“

شاہ بلاول نے یہ روپے قبول کر لیے اور اس میں سے کچھ رقم اسی وقت درویشوں اور مستحقوں میں تقسیم کر دی جو رقم بچ گئی اسے خادم مطبخ کے حوالے کر دیا اور کہا: ”یہ درویشوں اور مسافروں پر خرچ کیا جائے۔“

شاہجہاں یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ آخر عرض کیا: ”حضرت! اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو میں کچھ عرض کروں۔“

شاہ بلاول نے جواب دیا: ”اجازت ہے۔“

شاہجہاں نے کہا: ”حضرت! پہلے میں یہ دو ہزار روپے لیکر میاں میر کی خدمت میں پہنچا تھا

میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ میرا یہ نذرانہ قبول کر لیں لیکن انہوں نے نہیں قبول کیا اُدھر سے یا یوں ہو کر میں آپ کے پاس آیا اور آپ نے بے چون و چرا اسے قبول کر لیا۔ آخر یہ فرق کیوں ہے آپ دونوں میں؟

شاہ بلاول نے جواب دیا ”میاں میر فرشتوں جیسی صفات رکھتے ہیں اُن کی توجہ دنیا کی طرف بالکل نہیں۔ رہا میں، تو یہاں مسافر اور درویش آرام پاتے ہیں یہاں لنگر خانہ بھی ہے جہاں سے ان کو کھانا ملتا ہے اس لئے میں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

شاہجہاں یہ جواب پا کر دوبارہ میاں میر کی خدمت میں پہنچا اور کہا ”حضرت! آپ نے میرا نذرانہ قبول نہیں کیا لیکن شاہ بلاول نے اسے قبول فرمایا۔“

میاں میر نے جواب دیا ”شاہ بلاول، بزرگ، ولی کامل دیا کی طرح ہیں میں اُن کے سامنے معمولی تالاب کی طرح ہوں۔ دریا میں اگر کوئی پلید چیز گر جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا لیکن اگر یہی پلید چیز تالاب میں پڑ جائے تو تالاب ضرور پلید ہو جاتا ہے۔“

شاہجہاں دونوں کے جوابات سن کر جب قلعے میں گیا تو مسجد سے میں گھر گیا اور گھر گرتے ہوئے کہا۔ ”و رب العالمین! میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ میرے زمانے میں ایسے ایسے بزرگ پلٹے جاتے ہیں جن کا رضائے الہی کے سوا کوئی مقصد نہیں۔“



آپ کا قیام محلہ ابواسمٰحی میں تھا۔ ایک دن آپ کے پڑوس میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ گھر والوں نے بڑی خوشی منائی لیکن ان کی اس خوشی میں یہ غم بھی شامل تھا کہ اس گھر کی مالی حالت بہت خراب تھی اور ان میں اتنی استطاعت بھی نہیں تھی کہ وہ لڑکے کی پیدائش کی خوشی میں کسی کو کچھ دے دلا سکتے۔

محلے کے بھانڈوں کو لڑکے کی پیدائش کا علم ہوا تو وہ اپنی مبارک باد لینے پہنچ گئے اور گاکا اور دعائیں دے دے کر وپے طلب کرنے لگے۔ راجہل خانہ کے پاس تھا ہی کیا جو بھانڈوں کو دیتا۔ آپ نے بھانڈوں کی آواز جو سنی تو مٹی کا بھنٹا لے کر باہر نکل آئے اور صاحب خانہ کو آواز دی۔ ”اے بھائی! ذرا باہر آ۔ اندر کیا کر رہا ہے؟“

صاحب خانہ باہر نکل آئے دریافت کیا۔ ”اے یہ بھانڈوں کو کیوں روک رکھا ہے کچھ دے دلا کر رخصت کر۔“

صاحب خانہ نے خیر مار جواب دیا ”حضرت آپسے کیا پردہ! گھر کا جو حال ہے آپ اچھی طرح جانتے ہیں“

شاہ بلاول نے کہا ”اب کچھ بھی ہو ان بھانڈوں کو تو زریہ مبارک دینا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا ”جب میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو میں کچھ دول کا کہاں سے؟“ شاہ بلاول نے بدھنے والا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”اس کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی پڑے گا۔“ اس کے بعد اپنے بدھنے کو دیکھ کر بے مارا — بدھنا ٹوٹ گیا۔ اور اس کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ آپ نے اس سے کہا ”جان بھائیوں کو اٹھالے اور بھانڈوں کو دینے کے بعد جو کچھ بچ رہا ہے اپنے صوفے میں لا“

اس غریب نے بدھنے کے ٹکڑوں کو سمیٹنا اٹھنا شروع کر دیا اور پہلا ٹکڑا اٹھاتے ہی اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے بدھنے کے سارے ٹکڑے سوزان چمکے تھے اس نے چند ٹکڑے تو بھانڈوں کو دے دیئے، بقیہ کو لے کر آپ کی خدمت میں پہنچا۔ بولا ”حضرت بھانڈوں کو دینے کے بعد یہ بچے ہیں جیسا حکم ہوا اس پر عمل کیا جائے“

آپ نے جواب دیا ”انہیں تو لکھ لے۔ یہ تیرے کام آئیں گے“ اس کو پورے کے پورے قبول کرنے میں تامل ہوا۔ بولا ”حضرت یہ اتنے بہت سارے؟“ میں اتنے لے کر کیا کروں گا؟“

آپ نے جواب دیا ”یہ اتنے بہت سارے نہیں ہیں۔ جب خروج کرے گا تو پتہ چلے گا کہ زندگی جتنی لمبی ہے یہ سونے کے ٹکڑے اتنے دنوں تک نہیں چل سکیں گے“ اس نے یہ سونے کے ٹکڑے رکھ لئے اور شاہ بلاول کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرتا رہا۔



آپ نے معمول کے مطابق فجر کی نماز ادا کی اور چاشت تک مراقبہ اور عبادت میں مشغول رہے اس کے بعد آپ نے خادم مطبخ کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا ”کیا اہل احتیاج موجود ہیں؟“ خادم مطبخ نے جواب دیا ”جی حضرت“

اپنے حکم دیا۔ ”اُن کو کھانا میں خود تقسیم کروں گا۔“
 چنانچہ اپنے ظہر کے وقت تک انہیں کھانا تقسیم کیا اور کسی شخص کو مالوس یا رنجیدہ
 نہیں کیا اور دھڑ سے فارغ ہو کر اپنے ظہر کی نماز باجماعت ادا کی۔ ذرا سا قیلولہ کر کے آپ اپنے مریدوں
 میں پہنچ گئے اور ان کے ساتھ ذکر و فکری مشغول ہو گئے۔ جب ادھر سے فارغ ہوئے
 تو پتہ چلا کہ بیماروں کا ہجوم اپنے اپنے ہاتھوں میں پانی کے کوزے لے کر آپ کی دعاؤں کا منتظر
 ہے آپ ان بیماروں میں پہنچے۔ ہجوم کا پہلا شخص دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا کر رہا
 تھا آپ نے پوچھا ”تیری آنکھ کب آئی ہوئی ہے؟“

اس نے جواب دیا ”وہ حضرت دودن سے۔“
 آپ نے پوچھا ”پھر کل کیوں نہیں آیا تھا؟“
 اس نے جواب دیا ”کل اتنی تکلیف نہیں تھی۔“
 آپ نے کوئی دعا پڑھی اور آنکھوں پر دم کرتے ہوئے فرمایا ”اے شخص! کسی تکلیف
 کو کبھی کم نہ سمجھنا۔ جا، اللہ شفا دے گا۔“

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا کیونکہ اُسے یوں لگتا تھا کہ بھونک لگتے ہی درد کھینچ گیا ہے۔
 دوسرے تیسرے اور چوتھے کو بھی، پانی کے کوزوں پر دم کر کے رخصت کر دیا۔
 پانچواں آدمی سر پٹے کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا ”تجھے کیا تکلیف ہے؟“
 اس نے جواب دیا ”حضرت! درد شقیقہ نے تنگ کر رکھا ہے۔“

آپ نے فرمایا ”تو خوش قسمت ہے جو آدھا سر ہی درد میں مبتلا ہے ورنہ دنیا
 کے بیشتر لوگوں کا پورا سر اغراض دنیا اور طبع مال و زر سے درد میں مبتلا ہے۔“
 اس کے بعد آپ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کوئی دعا پڑھ کر بھونک ماری۔
 اس شخص نے اپنے سر کو ادھر ادھر جھٹکایا اور خوش ہو کر بولا۔ ”میرے آدھے سر کا درد چلا
 گیا! اتنی جلدی حیرت ہے۔“

آپ نے فرمایا ”جا اور اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت اپنے رب کے لئے بھی نکال۔“
 انہی بیماروں میں ایک طبیب بھی تھا۔ آپ نے اُسے پہچان لیا اور پوچھا ”اے دوسروں
 کا علاج کرنے والے! تو کس مرض میں مبتلا ہے؟“

طبیب نے جواب دیا ”حضرت! میں وجع مفاصل کا مریض ہوں اور میرا اپنا کوئی

سخہ مجھ پر کارگر نہیں ہوتا،

آپ نے فرمایا تیری تشخیص میں تو کوئی غلطی نہیں اور نسخے کی دوائیں بھی درست ہوتی ہیں۔
طیب نے پوچھا: ”حضرت! جب میری تشخیص بھی درست ہے اور دوائیں بھی صحیح
ہیں تو وہ اثر کیوں نہیں کرتیں؟“

آپ نے جواب دیا: ”تجھے بیک وقت دو مرض لاحق ہیں ایک تو یہ کہ تو دماغ متاثر
کامریض ہے دوسرا مرض بے یقینی کا ہے تجھ اپنے علم اور اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے اسی
عدم اعتمادی میں جب تو دواؤں کے اجزائے ترکیبی کی مقدار لکھتا ہے تو ان میں غلطی ہو جاتی
ہے تو فوری فائدے کے لئے تو بھر کی جگہ مقدار دو گنی کر دیتا ہے اس طرح دوائیں اپنا
صحیح اثر نہیں دکھاتیں اور اس کا رد عمل یوں ظاہر ہو سکتا ہے کہ تو کسی دوسرے مرض کا شکار
ہو جاؤ۔“

طیب نے اعتراف کیا کہ شاہ بلاول درست فرما رہے ہیں۔

آپ نے اس کے کوزے پر دم کیا اور کوئی دوا پڑھ کر اس کے جھوڑوں پر پھونکی۔
آخر میں آپ نے اس کے دل والے حصے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور فرمایا: ”اب جا، انشاء اللہ عدم
اعتمادی اور بے یقینی سے نجات پا جاؤ گا۔“

اس طرح آپ نے ایک بڑے ہجوم کو پٹا دیا۔

ادھر سے فرصت پا کر آپ نے اپنے دو منشیوں کو بلایا اور ایک نئے ہجوم سے
مخاطب ہوئے یہ ان غرض مندوں کا ہجوم تھا جن کی بادشاہ، امرا اور شاہی حکام تک رسائی نہیں
تھی مگر اپنے اپنے کام کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ہجوم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”لوگو! میں تم
میں سے ہر ایک کی سفارش کروں گا لیکن تم سب کو بھی ایک بات کا خیال رکھنا چاہیئے“
ہجوم نے سوالیہ نظروں سے آپ کی طرف دیکھا۔

آپ نے فرمایا: ”تم مجھ سے جو بھی سفارش کرو، وہ جائز کاموں کے لئے ہونا چاہیئے
کسی ناجائز کام کے لئے نہ تو تم شرمندہ ہو نا پسند کرو گے اور نہ میں۔“

لوگوں نے بیک زبان اقرار کیا کہ ہم آپ سے کسی ناجائز معاملے میں سفارش نہیں لیں گے۔

آپ نے ایک حاجت مند سے پوچھا: ”تجھے کیا مشکل آگئی ہے؟ تو کس معاملے

میں سفارش چاہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”حضرت! میری زمین پر ایک مرکب نے قبضہ لیا ہے آپ
شہر کو تو ال کو لکھ دیجئے کہ وہ میری زمین واپس دلا دے“
آپ نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ”اللہ بس باقی ہو“
اس شخص نے مایوسی سے پوچھا ”بھلا ان چار لفظی اشاروں سے کس طرح کام
ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا ”میں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کو کو تو ال پاس لے جا۔ چار
لفظوں کے نیچے میں نے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اپنا معاملہ تفصیل سے کو تو ال کو سہجی دینا۔
پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ تیرا کام کس طرح نہیں کرے گا“
ایک دوسرا شخص بے چینی سے آپ کی طرف بٹھا اور عرض کیا ”حضرت میں ایک
شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور تقریباً ایک سال سے بیکار رہ رہا ہوں۔ میری
کہیں ملازمت کر دیجئے۔“

آپ نے قاضی شہر کو لکھ دیا ”اللہ بس باقی ہو“
اس شخص کو یاد آیا کہ یہی سفارشی کلمات پہلے کو بھی لکھے گئے تھے شاید شاہ
صاحب ہر ایک کو ایک ہی لکھتی ہے ہانک ہے ہیں بھلا اس کا کیا اثر ہوگا؟
آپ نے اس کے خدشات کو محسوس کر لیا فرمایا ”متردد شخص! اندیشہ ذکر افسوس
کہ میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور اللہ نے چاہا تو یہی فقرے کام کر جائیں گے“
یہ شخص بھی چلا گیا۔ اب ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا ”حضرت میرا کام کسی
معمولی آدمی سے نہیں ہے خاص بادشاہ سے ہے۔ مجھے شاہجہاں کے پاس دہلی یا آگرے
جانا پڑے گا۔“ آپ نے فرمایا ”تیرا شاہ سے کیا کام آ پڑا؟“

اس نے جواب دیا ”میرے والد کا گزشتہ ماہ انتقال ہو گیا“
”وہ بادشاہ کے ملازم تھے چنانچہ ان کے بعد دستور کے مطابق ان کی جاگیر اور جائیداد کو
حکومت نے لے لیا اب میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ اسے میرے نام پر بحال کر دے اور اتنا بڑا کام ہے کہ بادشاہ کسی
معمولی سفارش سے یہ کام نہیں کرے گا۔“

آپ نے اس شخص کو بھی لکھ دیا ”اللہ بس باقی ہو“
اس نے سفارشی پرنہ ہاتھ میں لے کر بے یقینی سے پوچھا ”کیا اس میرا کام ہو جائیگا؟“

اپنے جواب دیا ”کیوں نہیں! اس فقرے میں جو شاندار اشارہ موجود ہے اس کا صحیح اثر وہی شخص محسوس کرتا ہے جس کے نام میں سفارش لکھا کرتا ہوں، چنانچہ اس بادشاہ پر بھی وہی اثر ہو گا اور بادشاہ جب میرے دستخط دیکھے گا تو کیا مجال جو تیرا کام نہ کرے۔“

غرضیکہ جتنے لوگ آتے آپ سب کو ”الذی بس باقی ہوں“ لکھ دیا کرتے۔ آپ کا یہ فقرہ تیر کی طرح نشاے پر لگتا اور ہر شخص کا کام ہو جاتا۔ کسی نے آپ سے کہا ”حضرت! یہ جو آپ تھوک کے بھاؤ سفارشیں فرماتے رہتے ہیں تو آگے چل کر کہیں اس کا یہ اثر نہ ہو کہ آپ کی سفارش خالص چلی جایا کرے۔“

- اپنے جواب دیا ”میں اس سے ذرا بھی نہیں ڈرتا کہ لوگ میری سفارش پر کام کریں گے یا نہیں۔ میں تو صرف اس لئے سفارش کر دیتا ہوں کہ اس طرح خلقِ خدا کے کام ہو ہی جاتے ہیں یہی دین ہے یہی مذہب اور یہی انسانیت ہے کہ کام آئیں دنیا میں انسان کے انسان۔“
- لوگ خوشی خوشی آپ سے سفارشیں لے کر چلے گئے۔ درادم لے کر عصر کی نماز پڑھی اور پھر ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز سے پہلے پانی کے گھونٹ سے۔ روزہ افطار کیا، اس کے بعد شام کے کھانے کی تقسیم شروع ہو گئی جب سب کو تقسیم کر چکے تو اپنے لیے جو کی روٹی اور چولائی کا ساگ نکال کر اس سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ اس کے بعد عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر حجرہ خاص میں چلے گئے وہاں تہجد کی نماز ادا کی اور اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے۔



کسی مطلع کی ”حضور آپ کا مرید شیخ ابوطالب جو دو ہزاری منصب دار بھی ہے باریال کا امیدوار ہے۔“

آپ نے فرمایا ”اُسے حاضر کرو، رک رک کیوں رکھتا ہے؟“

شیخ ابوطالب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کر کے ایک طرف ادب سے بیٹھ گیا۔

آپ نے پوچھا ”کہو ابوطالب! کیسے آنا ہوا؟“

ابوطالب نے عرض کیا ”حضرت! کیا عرض کروں۔ اب آپ کے مریدوں کو بھی آزمائشوں سے گزرتا پڑ رہا ہے میرا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے طفیل ہی ہماری مشکلیں آسان کر دیا کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔“

آپنے دریافت فرمایا: ”اپنی مشکل بیان کرتا کہ اس کے لئے دُعا کی جائے“
 ابوطالب نے عرض کیا: ”محض میری جاگیر پر بارش ہی نہیں ہو رہی پورا سال خشکی میں
 گزر جا رہا ہے“

آپنے مسکاکر فرمایا: ”ابوطالب ایسی اتنی سی بات!“
 ابوطالب نے عرض کیا: ”محض آپ کی نظر میں یہ اتنی سی بات ہوگی ورنہ میرے دل
 سے پوچھیے۔ بارش نہ ہونے کی فکر دیک کی طرح قلبی سکون کو چاٹے جا رہی ہے“
 آپ حجرے سے باہر نکل آئے اور ابوطالب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا بولے: ”اے
 ابوطالب! تیری جاگیر کدھر ہے؟“

ابوطالب نے جنوب کی طرف اشارہ کیا: ”حضرت اُدھر“
 شاہ بلا دل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: ”اے ابرا! تو کدھر ہے؟ ذرا
 سامنے آ“

ابوطالب نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔ شاہ بلا دل کے ارشاد کو ابھی مشکل سے چنڑ ثانیے
 گزرے ہوں گے کہ مشرق سے ابرا کا ایک بہت بڑا ٹکڑا نمودار ہوا۔ وہ ہوا میں حیرتا ہوا بالکل آپ
 کے سر پر آکر ٹھہر گیا۔ آپنے اسے حکم دیا: ”یہاں کیوں ٹھہر گیا، جا ابوطالب کی جاگیر پر برس جا“
 ٹھہرا ہوا ابرا ٹکڑا جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔

آپنے ابوطالب سے کہا: ”ابوطالب! جا، اپنی جاگیر کی خبر لے وہاں تیرے پہنچنے سے
 پہلے ہی بارش شروع ہو چکی ہوگی“

ابوطالب اپنی جاگیر پر روانہ ہو گیا جب وہ اپنی جاگیر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا، وہاں
 جل تھل ایک ہو چکا ہے۔

آپ کی خالقاہ میں لنگر عام جاری تھا صبح وشام کا کھانا لوگوں کو ملتا تھا۔ لنگر خانے کا
 گودام ہر قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ گھی، کھانڈ، چاول، آٹا، گیہوں، تیل، دالیوں
 نمک، مرتز، مصلحے غرضیکہ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں آتی رہتی تھیں۔ خالقاہ سے
 جن لوگوں کو کھانا ملتا تھا ان میں سے ایک شخص کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے دن کی روشنی
 میں خالقاہ کے اس حصے کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا، جہاں اشیائے خوردنی کا ذخیرہ رکھا تھا۔
 اس نے سوچا اگر وہ اس ذخیرے سے سامان اڑالے جائے تو کچھ دن مزے سے گھر میں بیٹھ کر

کھا سکتا ہے یہ سوچ کر وہ رات تک خانقاہ میں ہی موجود رہا۔ خانقاہ کے ایک حصے میں باورچی خانہ تھا اور باورچی کھانے سے لمبی اشیائے خوردنی کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ یہ چور رات کو لوگوں کی نظروں سے بچ کر اس حصے میں گھس گیا۔

جب اس کو یہ اندازہ ہو چکا کہ خانقاہ میں کوئی طاری ہو چکا ہے اور شاہ بلاول کے علاوہ سب سوچکے ہوں گے تو وہ سامان کا جائزہ لینے لگا۔ چادروں کے بورلوں کو ٹوٹا تو زمین پانی بھر آیا۔ اس کے بعد والوں کو ٹوٹا۔ گئی میں ہاتھ ڈالا تو کوئی چٹویوں ہی پگی کیا۔ والیں چبانے لگا، غرضیکہ وہ ہر چیز کا جائزہ بڑے اضطراب سے لیتا رہا اور اس کا دل زرد زور سے دھڑکتا رہا پھر اس نے ان میں سے سامان الگ کرنا شروع کر دیا اور ہوس میں آنا سامان الگ کر لیا کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا چور نے سوچا ۱۰ اے کاش اس کے ساتھ ایک آدمی اور ہوتا تو مزہ آجاتا۔ ایک آدمی اور ہوتا تو اپنا حصہ ضرور بٹھواتا۔ لیکن چور کے پاس اس کا بھی حل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر نکلنے کے بعد اس دوسرے شخص کو ٹھکانے بھی لگا سکتا تھا۔

اس نے سامان اٹھانے کا کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بدرجہ مجبوری اس نے سامان کچھ کم کر دیا لیکن یہ اب بھی اتنا زیادہ تھا کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا اس نے کچھ اور کم کر دیا اور اب وہ اتنا تھا کہ وہ اسے جیسے تیسے لے جاسکتا تھا۔ اس نے سامان اٹھایا اور آہستہ آہستہ باورچی خانے کی طرف بڑھا کیونکہ باورچی خانے میں ایک ایسا دروازہ بھی موجود تھا جو باہر کھلتا تھا۔ وہ جیسے ہی باورچی خانے میں داخل ہوا اسے وہاں بڑا گہرا اندھیرا محسوس ہوا، حالانکہ جب وہ یہاں آیا تھا تو اسے ایک دیا مٹھا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندر دھڑکیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ آخر کچھ دیر بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ باورچی خانے میں دیا ابھی روشن ہے لیکن خود اس کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی ہے۔ اس نے پریشانی میں بار بار دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے سامان کا اندازے سے ایک طرف رکھ دیا اور ٹوٹا ہوا ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اس وقت اس کی ہر حس جواب دے چکی تھی۔ بینائی، عقل و خرد ہوش و حواس ان میں سے ایک چیز بھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی۔



صبح، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے خادم مطبخ کو بلایا اور کہا کہ رات میرے پاس ایک حاجت مندا آیا تھا تم اس وقت موجود نہ تھے۔

خادم مطبخ نے عرض کیا، ” حضور اس وقت تو میں موجود ہوں، وہ حاجت مند کہاں ہے؟“

آپ نے جواب دیا، ” میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جا، اشیائے خوردنی کے گودام میں چلا جا اور جتنا سامان درکار ہو اپنے آپ نکال لے۔“

خادم مطبخ نے کہا، ” تو وہ اپنی ضرورت بھر کا سامان لے گیا؟“
 آپ نے جواب دیا، ” نہیں، ابھی وہ نہیں لے گیا بد قسمتی نے اس کو دھوکا دیا ہے اور عین اس وقت جبکہ وہ سامان لے کر نکل رہا تھا باورچی خانے میں اچانک اس کی بینائی جاتی رہی اور جب بینائی چھن جائے تو یہ بات کسی کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ بہت بڑا بوجھ اٹھا کر گھر لے جائے۔“

خادم مطبخ نے پوچھا، ” حضرت! اس وقت وہ ہے کہاں؟“
 آپ نے جواب دیا، ” باورچی خانے ہی کے ایک گوشے میں بیٹھا، تمہارا انتظار کر رہا ہے، وہ بھوکا بھی ہے۔ جاؤ پہلے اسے کھانا کھلاؤ پھر اسے ہاگے پاس لے آؤ۔“
 خادم مطبخ باورچی خانے میں پہنچا تو اسے ایک گوشے میں وہ نایاب بیٹھا دکھائی دیا خادم مطبخ نے عاجزی سے کہا، ” بھائی! مجھے معاف کرنا، میں رات کو خالقہ میں موجود نہیں تھا ورنہ تم کو زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔“

چور نے شرمندگی سے پوچھا، ” تم ہو کون؟“
 خادم مطبخ نے جواب دیا، ” میں اس مطبخ کا نگران ہوں۔“
 چور نے پوچھا، ” ابھی تم نے کیا کہا تھا؟“

اس نے جواب دیا، ” ابھی ابھی مجھے شاہ بلاول نے یہ بتایا کہ تم باورچی خانے میں میرا انتظار کر رہے ہو اور یہ کہ تم بہت بھوکے بھی ہو۔ میں تمہارے لئے جلد از جلد کھانا تیار کر رہا ہوں کھانا کھانے کے بعد میں تمہیں شاہ صاحب کی خدمت میں لے چلوں گا۔“
 چور نے جواب دیا، ” میں کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک میں شاہ بلاول سے چند باتیں نہ کر لوں۔“

خادم مطبخ نے کہا، ” لیکن میں وہی کروں گا جس کا مجھے شاہ بلاول نے حکم دیا ہے میں کھانا کھلائے بغیر تمہیں ان کے پاس نہیں جانے دوں گا۔ وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔“

چور نے کہا ”تم ضد نہ کرو اور شاہ بلاول سے جا کر کہہ دو کہ وہ شخص اس وقت تک کچھ نہیں کھائے گا جب تک آپ سے چند باتیں نہ کر لے“

خادم مطبخ نے شاہ بلاول کو مطلع کیا کہ وہ شخص آپ کے ملنا چاہتا ہے۔

آپ نے حکم دیا ”اے فوراً میرے پاس لاؤ“

خادم مطبخ اس کو کچھڑ کے آپ کے پاس لے آیا۔ اُس نے انداز سے اپنے دونوں ہاتھ

آپ کی طرف بڑھائے۔ آپ نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس نے آپ کا

ہاتھ چوم لیا اور آنسو بہاتے ہوئے عرض کیا ”حضرت! کیا میں کچھ عرض کروں، اجازت ہے؟“

شاہ بلاول نے خادم مطبخ کو حکم دیا ”ذرا دیر کے لئے تو باہر چلا جا، میں اس شخص سے

کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں“

خادم مطبخ باہر چلا گیا۔ آپ نے چور سے کہا ”ہاں اب بتاؤ کیا کہنا چاہتا ہے؟“

چور نے قدموں میں گر کر عرض کیا ”حضرت! میں آپ کا گناہ گار، خطا کار ہوں۔ میں ایشیائے

خوردنی چرلے جانا چاہتا تھا لیکن نابینا ہو گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سزا ضرور دیں تاکہ میرا ضمیر

مطمئن ہو جائے“

آپ نے جواب دیا ”بھائی میرے! میں تجھے کس جرم کی سزا دوں؟“

چور نے کہا ”ایشیائے خوردنی کو چرانے کی سزا“

آپ نے کہا ”لیکن تو نے وہ چیزیں کہاں چرائیں؟ وہ ساری چیزیں تو میرے ہی باورچی

خانے میں رکھی ہیں“

چور نے عرض کیا ”لیکن میری نیت تو تھی“

آپ نے جواب دیا ”یہ بھی غلط ہے کیونکہ ایک زمانہ جانتا ہے کہ یہاں لوگوں کے لئے لنگر

جاری ہے تو یہاں سے جتنا کچھ بھی لے جاتا اپنے حصے کا لے جاتا۔ تو نے یہ پسند نہیں کیا کہ تو ہر روز

میرے لنگر خانے میں قطار لگائے اس لئے اپنے حصے کا سامان نکال لے جانا چاہا۔ اب میں اس پر حیران

ہو رہا ہوں کہ آخر تو میرے سامنے شرمندہ کیوں ہے؟“

چور کی آنکھوں سے آنسو تو پہلے ہی سے جاری تھے اب وہ زور زور سے رونے لگا۔

آپ نے اس کے آنسو پونچھے اور کہا ”اک ذرا میری طرف تو دیکھ“

چور نے جواب دیا ”حضرت! میں اندھا ہوں آپ کی طرف کس طرح دیکھوں؟“

اپنے کہا ” تو انہیں تو کھول کس نے کہہ دیا ہے تو اندھا ہے توینا ہے میری طرف تو دیکھ۔“
 چور نے آپ کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا وہ واقعی بینا ہے اس نے فرط جوش و عقیدت میں آپ
 کے پیروں کو بوسہ دیا۔ بولا ” اب میں ان قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟“
 آپ نے جواب دیا ” میری طرف سے کوئی محاسبہ نہیں۔ تو جہاں جانا چاہے چلا جا اور
 وہ سامان اپنے ساتھ لیتا جا، جسے تو نے نکال کر باورچی خانے میں رکھ دیا ہے۔“
 چور نے تلملا کر عرض کیا ” حضرت! میں بہت گھنگرا انسان ہوں اب ان قدموں
 میں رہ کر اپنے گناہوں کو دھوئے کی کوشش کروں گا، مجھے ٹھکرائیے نہیں، مجھے یلوس نہ کھئے۔“
 اپنے خادم مطیع کو بلا کر حکم دیا کہ خانقاہ کے خادم سے کہہ دیا جائے کہ آج سے
 یہ شخص اسی خانقاہ میں رہے گا لہذا اس کو ایک حجرہ دے دیا جائے۔
 خادم مطیع نے کس سے اس کے حجرے میں پہنچا دیا اور یہ شخص شب و روز مجاہد ہے
 اور ریاضت میں مشغول ہو گیا۔



جب تک زندہ رہے آپ کی ذات لوگوں کو فائدے پہنچتے رہے ایسا لگتا تھا کہ آپ کی
 ذات خود و سخا کا ایک دیباہ ہے اور اس دیباہ سے ہر شخص سیراب ہو رہا ہے بادشاہ، امراء، وزرا اور دیگر
 حکام آپ کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انہیں جب بھی ”الہ لیس باقی ہو“ کا سفارش نامہ ملا، تو وہ کام فوراً کر دیا
 آپ کی موجودگی میں لوگوں کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ انکی رسائی دور تک نہ ٹاؤں اور لاوارثوں کو آپ کی
 وجہ سے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ بادشاہ تک پہنچ جانا کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے جب بھی چاہیں گے بادشاہ
 تک پہنچ جائیں گے۔

آخر آپ کا لمحہ آخر آپ کا آخری پہنچا اور ۲۸ شعبان بروز دوشنبہ ۱۰۲۶ھ کو اپنے سفر آخرت
 اختیار کیا، یہ شاہجہاں کا دور تھا۔ فارسی میں آپ کا قطعہ تاریخ یوں ہے۔

ز دنیا چو در غلہ معلیٰ	جناب شہ بلاول شاہ شاہاں
بگو مقبول حق سر مست تاریخ	دگر کامل مہ فضل است اے جاں
۱۰۲۶ھ	۱۰۲۶ھ
اسی طرح اردو میں قطعہ تاریخ اس طرح بھی لکھا ہے	

شہ بلاول شاہ عالی جاہ تھے	حضرت حق سے ملاؤں کو بہشت
اُن کا نور معرفت ہے خاتمہ	دوسری تاریخ ہے نیکو سرشت
۱۰۲۶ھ	۱۰۲۶ھ

باغ راجہ دینا ناتھ کے قریب آپ کا مزار ہے حالانکہ پہلے آپ
 کا مقبرہ دریائے راوی قریب تھا لیکن جب دریائے راوی مقبرے
 کے قریب بہنے لگا تو اس حد سے کہیں مزار کو نقصان نہ
 پہنچ جائے آپ کے جسد مبارک کو باغ راجہ دینا ناتھ کے قریب
 دفن کر دیا گیا۔ اور اب یہ جگہ شاہ بلاول کا بن کھلاتی ہے۔



حضرت شیخ سلیم چشتیؒ

ہندوستان کے نامی حکمران سلطان غیاث الدین کی حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے عقیدت و شیعہ تھی اتنی بڑھی کہ اس نے اپنی بیٹی زہرہ خاتون کو بابا فرید سے وابستہ کر دیا۔ ان سے شیخ بدر الدین پیدا ہوئے بابا فرید کا سلسلہ رشد و ہدایت کسی بعید ترین ستارے کی روشنی کی طرح زمانی فاصلے طے کرتا ہوا پندرہویں صدی عیسوی تک آگیا۔ اس خاندان کے ایک فرد نے اجدادہن کی سکونت ترک کی اور لدھیانے میں اقامت اختیار کی۔ لدھیانے میں ابھی ایک نسل بھی نہ گزری تھی کہ شیخ بہاء الدین نامی ایک شخص نے اشارہ غیبی پر لدھیانے کی سکونت بھی ترک کر دی اور اپنے کنبے کو لے کر دہلی چلا آیا اور سر لے حضرت شیخ علاء الدین زندہ پیرؒ میں سکونت اختیار کی یہی ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شیخ موسیٰ رکھا گیا۔ شیخ موسیٰ کی پیدائش کے کئی سال بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا، اس کا نام شیخ سلیم رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر شیخ سلیم چشتیؒ کہلایا اور اس کا فیضان اتنا عام ہوا کہ بڑے بڑے شاہان وقت اس کے حضور غلاموں کی طرح دست بستہ حاضری دے کر اپنی درخواستیں گزار کرتے تھے آپ کا سن ولادت ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) ہے ان دنوں ہندوستان پر بھولی بودھی حکومت کر رہا تھا۔

شیخ موسیٰ جوان ہو چکے تھے اور شیخ سلیم ابھی نو سال کے تھے کہ شیخ بہاء الدین اور ان کی اہلیہ کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی ذمہ داری اپنی اولاد کی طرح قبول کی اور شب روز کا بیشتر حصہ اپنے چھوٹے بھائی کی دلجوئی میں گزارنے لگے لیکن اس کے باوجود شیخ موسیٰ نے یہ محسوس کیا کہ ان کا چھوٹا بھائی بہت زیادہ ادا اس اور فکر مند رہتا ہے۔ جب دیکھئے۔ بیٹھا کچھ نہ کچھ سوچ رہا ہے انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آنکھیں کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر یوں جم جائیں گویا وہ پتھر کی ہوں پھر کسی بات اس کو سالہ معصوم بچے کا دل بھڑاتا اور پتھر جیسی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتا ہے۔ بڑا

بھائی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اس کا چھوٹا بھائی والدین کی موت سے حد درجہ سوگوار ہے لیکن وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی اس معصوم کا دل تو خشیت الہی سے لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ اس ننھے سے دل میں تو دیارِ رسول پاکؐ کے دیکھنے کی تڑپ تھی اور یہی تڑپ اپنی محبوبی اور بے بسی کے احساس پر انہوں کو اکھوں سے بہہ نکلتی تھی۔

شام کے جھٹ پٹے میں، شیخ موسیٰ جب گھر میں داخل ہوئے تو وہاں بے چھوٹے بھائی کو نہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ ادھر ادھر تلاش کرتے ہوئے جب گنبدِ زندہ پیر میں داخل ہوئے تو اندھیرے میں اپنے مرحوم والدین کے مزار کے پائنتی کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا طاق میں رکھی ہوئی موسیٰ شمع ہوا کے ایک جھونکے سے جھلک اٹھی۔ موسیٰ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے کہا ”سلیم! تم یہاں ہو؟“

سلیم نے سر اٹھایا اور کھوٹی کھوٹی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

بڑے بھائی نے پوچھا ”سلیم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

ننھے سلیم نے جواب دیا ”بھائی صاحب ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اپنی کوئی

قیمتی چیز گم کر دی ہے وہ کیا چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن اس کی کمی کا احساس ستا رہا ہے۔“

بڑے بھائی کو خیال گزر ا کہ سلیم پر مرحوم والدین کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔

اس رات وہ سو نہیں سکے، پوری رات اسی فکر میں گزار دی کہ آخر اپنے معصوم، پیارے پیارے بھائی کے غم و اندوہ کا کیا علاج کیا جائے؟

دوسرے دن صبح موسیٰ چشتی نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ دہلی کی سکونت ترک کر رہے

ہیں اور آگرے کی طرف چلے جائیں گے اس اعلان پر فوراً ہی ٹہل در آمد بھی کیا گیا۔ موسیٰ

چشتی اپنے چھوٹے بھائی اور سامان کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہو کر آگرے کی طرف روانہ

ہو گئے۔ قافلے کے بیشتر افراد آگرے میں رُک گئے لیکن شیخ موسیٰ آگرے سے بائیس میل

دور سیکری چلے گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ سامنے جنوب میں حد نظر تک اروالی کا کوہستانی

سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سیکری کبھی سیکر وانہ راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا تھا اور اس جگہ کو

راجپوتانے کے دروازے کی حیثیت حاصل ہے موسیٰ یہیں رہ گئے انہوں نے یہیں شادی

کر لی اور سکون سے زندگی گزارنے لگے۔

سلیم کا وہی حال تھا ان کا گھر میں جی نہ لگتا۔ وہ انوں میں نیکل جلتے اور مضطرب

اور بے چین دل کو سکون پہنچانے کی کوشش میں ذکر الہی کرتے رہتے۔ موسیٰ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی حالت سے کچھ بے خبر نہ تھے شادی کے کئی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم تھے پہلے اگر سلیم چھوٹا بھائی تھا تو اب وہ بیٹا محسوس ہونے لگا تھا۔

سلیم اس اضطراب اور اضطراب میں اپنی زندگی کے چودہ سال گزار کر بندھویں میں داخل ہو گئے۔ موسیٰ جب رات کو سونے لگتے تو ایک بار سلیم کے حجرے میں ضرور جلتے اور وہاں انہیں مصروف عبادت دیکھ کر واپس آ جاتے یہی حال ان کی بیوی کا تھا وہ بھی اپنے خاموش طبع اور عبادت گزار دیور کو عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ بھاجی کی ضرورت سے اٹھ کر جب سلیم کے حجرے کی طرف گزریں تو وہاں کچھ غیر معمولی سکوت محسوس کیا۔ انہوں نے ایڑیوں کے بل چل کر حجرے میں بھاٹک کر دیکھا وہ خالی تھا وہاں کوئی بھی نہ تھا یہ پریشان ہو گئیں۔ اس کے بعد انہیں سارے گھر میں تلاش کر ڈالا لیکن سلیم کہیں بھی نظر نہ آئے انہوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی کبھی سوچتیں، شوہر کو اس سے آگاہ کر دیا جائے پھر سوچتیں سارے دن کا تھکا ماندہ شوہر بہت پریشان ہو جائے گا۔ اس کشمکش میں مشرق میں پوچھیں اور مسجدوں سے اذان اور مندریوں سے گفٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ موسیٰ بیدار ہو کر وضو کیا اور جب وہ نماز باجماعت کے لیے گھر سے نکلنے لگے تو ان کے ساتھ ہی سلیم بھی نکلے۔ بھاجی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوچنے لگیں کہ رات والا واقعہ کوئی خواب تھا یا واقعی ایک واقعہ؟

دوسری رات پھر وہی ہوا۔ سلیم اپنے حجرے سے نواب تھے تیسری رات بھی یہی ہوا اور پھر چوتھی رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فجر کی نماز دونوں بھائی مسجد میں جا کر ادا کرتے۔

بھاجی نے تشویش سے سوچا۔ اگر سلیم کو عبادت اور ریاضت ہی کرنی ہے تو انہیں اپنے حجرے میں موجود رہنا چاہیئے۔ لیکن نصف رات کے بعد حجرہ خالی ہو جاتا ہے آخر یہ صاحبزادے جاتے کہاں ہیں؟ طرح طرح کے شکوک اور دوسو سے دل میں گھر کرتے اور نیک اور پاک باز عورت انہیں ایک جھٹکے میں دل سے نکال پھینکتی اور اپنے دوسرے ہائے شیطانی پر خجل اور شرمندہ ہو جاتی۔ بالآخر رات نہ ہائے سینہ گدانے آنا ہلکان کر دیا کہ اپنی تشویش کو شوہر پر ظاہر کر دیا۔ موسیٰ پریشان ہو گئے اور ایک رات انہوں نے اپنے چھتے کی نیچرانی میں رات کی نیند حرام کر ڈالی۔ سلیم نے آہستہ سے اپنے حجرے کا دروازہ بند کیا اور گھر سے باہر نکل گئے رات کی تاریکی

سے موسیٰ نے بھی نالہ لگائی اور ان کے تعاقب میں نیکل کھڑے ہوئے گھر سے بھڑکی دور، مشرق میں، جہاں پہاڑی کا ایک حصہ نشیب کی شکل اختیار کر کے ذرا سطح میدان نظر آتا ہے وہاں چند بڑے بڑے، تناور درختوں کا بھنڈ پایا جاتا تھا، سلیم اس جھنڈ میں پہنچ کر ایک درخت پر چڑھ گئے موسیٰ گھنٹوں کھڑے اپنے بھائی کی داپسی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن سلیم نیچے نہ اترے۔ ارادہ کی بندوبست بالچڑیوں سے درندوں کی خوفناک آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دیتی ہیں اور موسیٰ کانپ جاتے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اسرار کیا ہیں؟

فجر سے دو گھنٹے پہلے سلیم درخت سے نیچے اترے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے پریشان اور تھکے ہارے بڑے بھائی نے آگے بڑھ کر سلیم کا رستہ روک لیا اور پوچھا: ”سلیم! یہ کیا اسرار ہیں؟ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“

چھوٹے بھائی نے مطمئن انداز میں بھائی کو دیکھا اور کہا: ”آپ ہالہ سچا کرتے ہیں؟“

”ہاں! موسیٰ نے کہا۔“ تمہاری بھابی تمہاری اس نئی روش سے بہت پریشان ہیں اور میں خود بھی بے حد گھبرایا ہوں، آخر تم ہمیں بتاتے کیوں نہیں کہ اتنی رات گئے تم یہاں کیوں آئے ہو اور اس درخت پر چڑھ کر کیا کرتے ہو؟“

سلیم نے کوئی جواب دینے کے بجائے رقت سے کہا: ”بھائی صاحب میں جج کے لئے جانا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دیجئے، بہت شکر گزار ہوں گا۔“

موسیٰ نے کہا: ”یہ ہماری بات کا جواب تو نہ ہوا؟“

سلیم نے کہا: ”بھائی صاحب! میرا دل پھٹا جا رہا ہے خشیت الہی اور حب نبویؐ کا بوجھ ایسا نہیں ہے کہ میں آسانی سے اٹھا سکوں۔ مفارقت کی آگ میرے سارے وجود کو چھونک دے رہی ہے خدا کیلئے مجھے اجازت مرحمت فرمادیں، اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“ موسیٰ نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا اور رشتے لگے، بولے: ”میں تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اگر تم اس کا جواب نہیں دے سکتے تو نہ دو لیکن میں تم کو اپنے پاس سے جدا نہیں کر سکتا، سلیم! میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے میں تیری جدائی کا صدمہ نہیں برداشت کر سکتا۔“

ماسوا اللہ سے منہ موڑنے والے بھائی نے کہا: ”آپ کو بیٹا چاہیئے؟“

موسیٰ نے بھائی کو حیرت سے دیکھا کہا: ”بیٹا؟ یہ تو اسی دن سے میری سب سے

بڑی آرزو بن گیا ہے جس دن تیری بھالی تیرے گھر میں میری بیوی بن کر آئی تھی !
 پھر سرد آہ بھر کر کہا ” شاید خدا کو یہ بات منظور نہیں ہے کہ میں کسی بچے کا باپ
 کہلاؤں۔ اُس پاک بے نیاز سے اس محرومی کی شکایت بھی تو نہیں کی جاسکتی ۔“
 سلیم نے کیفیت جذب میں کہا ” آپ کو بیٹا ملے گا، عنقریب بہت جلد، لیکن جب آپ
 باپ بن جائیں۔ تو ہمیں حج پر جانے سے نہ روکیے گا، یہ ہم سے ابھی اسی وقت عہد کر لیجیے ۔“
 موسیٰ نے اپنے نوجوان بھائی کو حالت جذب میں پہلی بار دیکھا تھا۔ انہیں ایسا لگا
 جیسے وہ کسی مجذوب کی برٹن ہے ہوں بے سرو پا، ناقابل یقین بڑ، جس کی کوئی تعبیر نہیں
 ہو سکتی، جس کا کوئی انجام نہ ہو۔



نہایت ہوشیاری سے پیچھا کر موسیٰ نے سلیم کے درخت پر چڑھنے کا راز معلوم
 ہی کر لیا۔ نوجوان کا گرم خون سلیم کو آرام و آسائش پر مائل کرتا رہتا تھا اور حجرے کے پُر سکون
 اور آرام دہ فضا میں نیند منڈلانے لگتی تھی تو ذکر الہی میں خود کو نہاموش کر دینے والے اس نوجوان
 نے اس پر قابو پانے کے لیے یہ انوکھا طریقہ دریافت کیا تھا کہ وہ نصف رات کے بعد کسی درخت
 پر چڑھ کر، کسی شاخ پر بیٹھ جاتے اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہتے، گھڑی گھڑی شیروں کی
 دھاڑ سے فضا دہل جاتی اور سلیم باسانی اپنی نیند پر غلبہ پالیتے۔ موسیٰ کے دل پر اپنے چھوٹے
 بھائی کے زہد و تقویٰ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کے ساتھ تعظیم و احترام سے پیش آتے لگے۔
 تقریباً دس ماہ بعد موسیٰ صاحب اولاد ہو گئے۔ اب وہ ایک بچے کے باپ تھے انہوں
 نے فرط شفقت سے بچے کو گود میں لیا اور میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اسی عالم
 میں سلیم بھی دیں پہنچ گئے اور بھائی سے کہا ” بھائی صاحب! خدا نے آپ کو صاحب اولاد
 کر دیا۔ مبارک ہو، اب تو میں حج بیت اللہ کے لیے اجازت حاصل کر سکتا ہوں ۔“

بڑے بھائی نے کہا ” سلیم! مجھے اپنا عہد یاد ہے، اب تم جا سکتے ہو لیکن اس سے
 یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ صاحب اولاد ہو جانے سے میرے دل میں تمہاری محبت کم ہو گئی ہے ۔“
 پھر ذرا رک کر آہستہ سے کہا ” بلکہ اس واقعے کے بعد تو میں تمہارا احترام کرنے لگا ہوں، سلیم!
 تم ولی ہو ۔“

سلیم نے اجازت پالتے ہی سر نہ کا رخ کیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور شیخ مجدد
 الدین سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ یہاں سے چل کر ایک آدمی جو حکمہ اور ریکے

اور پھر اجودھن پہنچ گئے۔ یہاں بابا فریدؒ کے دیوان اور صاحب سجادہ شیخ ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقہ حاصل کیا۔ اب نوجوان سلیم چشتی ہو چکے تھے۔ کیونکہ بابا فریدؒ جو جگان چشت میں سے تھے۔ اجودھن میں بابا فریدؒ کے مزار پر جو دوسرے حضرات خرقہ کی امید میں شربہ روز عبادت و ریاضت میں لگے ہوئے تھے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان بابا فریدؒ کے مزار پر آیا اور آسانی خرقہ خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو انہیں صاحب سجادہ سے شکایت پیدا ہو گئی۔

صاحب سجادہ ان کے بگڑے تیوروں کو کئی دن برداشت کرتے رہے آخر ایک دن ان سے سوال کیا۔ حضرات! یہ ناحیت کئی دن سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ آپ ہم سے کسی بات پر کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں، کیا اس کا سبب دریافت کر سکتے ہیں؟ ایک عمر رسیدہ زاہد نے جواب دیا۔ آپ نے ہم پر ان نووارد صاحبزادے کو جیسی ترجیح دی ہے کیا اس سے ہمارے دل فگار نہیں ہو رہے؟ کیا ہمارے ساتھ نا انصافی نہیں ہوئی؟ شیخ ابراہیم نے جواب دیا۔ حضرات! ہم نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں کیا ہم آپ کو یہ کس طرح باور کرائیں کہ ہمیں بابا فریدؒ کی ہدایت پر ان صاحبزادے کا انتظار تھا۔ بابا ہمیں بار بار خواب میں یہ ہدایات دے رہے تھے کہ سلیم آ رہا ہے ہمارے تبرکات ان کے حوالے کر دینا۔ پھر ہم کس طرح بددیانتی کر سکتے تھے؟ لوگوں نے سکوت اختیار کیا۔

سلیم چشتی کچھ عرصہ اجودھن میں قیام فرما رہے اس کے بعد پایا دہ جج کو روانہ ہو گئے۔

آپ نے کئی جج کئے اور مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے رہے جب بھی رسول مقبولؐ کے مزار اقدس پر حاضری دیتے۔ حال سے یہ حال ہو جاتے۔ یہ مدینہ منورہ ہی میں رہ جاتا چاہتے تھے لیکن رسول اللہؐ نے انہیں وطن واپس جانے کی ہدایت کی۔ آپ رور و کریم عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہؐ! اپنے اس غلام کو مدینے کا پیوند ہو جانے کا شرف عطا فرمائیں۔ رسول اللہؐ نے خواب میں وطن کو واپسی کا حکم دیتے ہوئے بشارت دی شیخ ابہند وطن واپس جاؤ، تم کو وہیں تمہارے وطن میں جائے دفن کے لئے مدینے کی زمین مل جائے گی۔“

یہ حسب ارشاد نبوی وطن واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے گھر بار سے بے تعلقی اختیار کی اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر اقامت کر لیں ہو گئے۔ شہر اور شہر والوں سے دور لیکن جنگلی درندوں سے بالکل قریب اتنے قریب کہ وہاں کوئی انسان نہ ہونے کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں سنگ مرخ کے پہاڑ دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور دن کو سورج کی روشنی میں سنگتراشوں کی جمعیّتیں پتھر لینے آیا کرتی تھیں۔ ایک دن صبح صبح جب انہوں نے اس خطرناک مقام پر سلیم چشتی کو دیکھا تو ڈرتے ڈرتے عرض کیا: ”جناب آپ نو وارد ہیں اور لاکھ درویش سہی لیکن ایک بات ہماری بھی مانیں۔“

”آپ نے پوچھا۔“ وہ کیا؟ کہو ”ذرا ہم تو سنیں۔“

سنگتراشوں نے کہا: ”ہم ان حدود میں برسہا برس سے تجارت سے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ یہ علاقہ درندوں کا مسکن ہے، ہم یہاں مسلح آتے ہیں لیکن آپ کسی احتیاطی تدبیر کے بغیر ہی فروکش ہو گئے ہیں یہ ایک خطرناک بات ہے۔“

”آپ نے بے نیازی سے پوچھا۔“ اور کچھ؟

ایک ادھیر عمر سنگتراش نے جواب دیا: ”اور یہ کہ آپ یہاں دن میں یسوق رہیں کیونکہ آپ کے اس پاس ہم سبھی موجود رہیں گے لیکن شام کو جب ہم سب یہاں سے جلنے لگیں تو ہمارے ساتھ آپ بھی چلے جائیں، کیونکہ یہاں رات کا قیام خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”آپ نے جواب دیا۔“ یہ فقیر تو جہاں بیٹھ گیا، بیٹھ گیا۔ ہم کہاں کے ایسے ہیں کہ اللہ کی مخلوق سے ڈرتے پھریں۔ تمہارے نیک مشورے کا شکریہ ادا۔“

سنگتراش یہ سمجھ کر اس درویش کو شاید کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اپنی عبادت و ریاضت پر گھنڈا ہے جیسی تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔

سنگتراش اس فندی اور خدا پرست انسان کو پہاڑی پر تنہا چھوڑ کر مغرب سے پہلے پہلے چلے گئے۔

دوسرے دن صبح جب یہ لوگ اُپر جا رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ وہاں کہیں، کسی جگہ اس فندی شخص کی لاش ضرور ملے گی جس کا پیٹ کوئی درندہ پھاڑ چکا ہوگا اور دور تک خون ہی خون بہہ رہا ہوگا۔

یہ لوگ نہایت احتیاط سے چوکے انداز میں جب اوپر پہنچے تو دیکھا سلیم چشتی

نمازیں مشغول ہیں اور اُن کے قریب ہی دوشیر بیٹھے چکسی کر رہے ہیں۔

جب یحییٰ چشتی نے سلام پھیر کر شیروں کی طرف دیکھا تو وہ دُم ہلانے لگے اس کے بعد انہوں نے دور سے آتے ہوئے سنگتراشوں کی طرف دیکھا اور شیروں کو حکم دیا ”تم واپس جاؤ“ شیر دُم ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اُس دن پہلی بار سنگتراشوں کو آپ کی بزرگی، عظمت اور مرتبہ کا صحیح احساس ہوا۔ وہ میدھے آپ کے روبرو پہنچے اور قدموں میں گر گئے آپ نے انہیں اٹھایا اور پوچھا ”تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟“

لوگوں نے جواب دیا ”حضرت! ہمیں اپنے جذبہ شوق کا اظہار کر لینے دیجئے،

آپ منع نہ کیجئے۔“

آپ نے جواب دیا ”لیکن ہمارے قدموں میں اپنا سر رکھ کر ہمیں کتنا ہنگامہ کیجئے“ اس کے بعد رنگ تراشوں نے آپ کے لئے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کر دی جو بعد میں ”مسجد سنگتراشاں“ کہلائی اور آج بھی موجود ہے۔

اسی دوران مصافحات کے راجپوتوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور مسلمان ہونے لگے یہ مسلم راجپوت ”ملکانے“ کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔



پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر بابر ہندوستان کی قسمت کا مالک ہو چکا تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ ہندوستان کی کئی دوسری طاقتیں بابر کے خلاف متحد ہو گئیں۔ ان میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی۔ اس متحدہ محاذ میاواڑ کے سورج ہنسی راجا رانا ساہگا کو اپنا سپہ سالار اعظم مان لیا۔ سیکری کے جنوب میں، پانیخ میل دُور خانوا (کنواہہ) نامی گاؤں کے میدان میں رانا ساہگا دولکھ فوج کے ساتھ خیمہ زن ہو گیا بابر بھی اپنی بیس ہزار فوج لے کر نکلا اور سیکری میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہیں کی ایک مسجد میں بابر نے شراب نوشی سے توبہ کی اور جام و سبزو، ساغرو مینا توڑ کر دینہ دینہ کر ڈٹے۔ اس کے ساتھی ٹھکر دے ہوئے تھے اور انہیں اپنی فتح مندی پر یقین نہیں تھا یہ معرکہ، معرکہ بابر و رانا ساہگا نہیں تھا بلکہ معرکہ کفر و اسلام تھا کیونکہ رانا ساہگانے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو شمالی ہند اور بعد میں پورے ہندوستان سے

مسلمانوں کو نکال باہر کرے گا۔

غضب کا دن پڑا اور شام ہوتے ہوتے زخمی رانا سانگا نے راہ فرار اختیار کی۔ سلیم چشتیؒ کی دُعا میں بابر کے حق میں تختیں اور کم نفری فوج کے باوجود بابر نے اپنی بے پناہ شجاعت، عسکری فرست اور سلیم چشتیؒ کی دعاؤں کے طفیل رانا سانگا کو عبرتناک شکست دی۔ پہلے یہ جگہ سیکری تھی، بابر نے فتح مندی کے بعد اس کا نام شگُری رکھ دیا اور سیکری سے خانواتک شہیدوں کی ایک بستی قائم ہو گئی جو گنج شہیدان کہلائی۔

چند سال بعد بابر اپنے حصّے کا کام ختم کر کے خود کو ہمالیوں پر قربان کر گیا۔ ہمالیوں پر سرِ اقتدار آیا لیکن چند سالوں کے اندر اندر بہار کے افغان جاگیردار فرید خان نے اسے متواتر شکستیں دے کر ہندوستان سے نکال باہر کیا اور خود شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ شیر شاہ کے امیر الامرا خواص خاں نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضری دی اور شرفِ مریدی سے شاد کلام ہوا کچھ عرصہ بعد شیر شاہ خواص خاں سے بذطن ہو گیا اور اُسے قید خانے میں ڈال دیا۔ خواص خاں کے پسماندگان شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور رو دھو کر مدد کے طالب ہوئے۔

آپ نے انہیں تسلی دی اور مستقبل کا فیصلہ سنا دیا۔ ”جو ظلم کرے گا ظلم سہمے گا۔“ شیر شاہی سپاہ آپ کی خدمت میں گستاخانہ پہنچی اور درشت لہجے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ اس نے پوچھا۔

”تم خواص کے حمایتی ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”حمایتی صرف خدا ہے تم تو اس کے اشاروں کے چاکر ہیں۔“

شیر شاہی سردار نے گرج کر سوال کیا۔ ”تم ایک ادنیٰ، گوشہ نشین، خواص خاں شاہی معتبہ کے پسماندگان سے مل کر سازشیں کرتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”سازشیں دینا دار کرتے ہیں وہ لوگ جنہیں ملوکیت جیسی گھناؤنی شے نے اپنا امیر بنالیا ہو۔ دامِ فریب کے بندے ہوتے ہیں۔ تمہارا بادشاہ محض کش ہے۔“

شیر شاہی سردار نے حکم آگیا: ”ہمارا بادشاہ کیسا، شہنشاہ تمہارا بادشاہ بھی ہے۔“

آپ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”ہمارا بادشاہ ہمیشہ رہے گا یہ تو تمہارا ہی بادشاہ

ہے جو چند گھڑی کسی شعلے کی طرح روشنی دے کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔
سردار نے سخت آواز میں کہا: ”بکواس بند کرو۔“

آپ نے ذومعنی جواب دیا۔ ”بکواس بند کر دی جائے گی۔“ پھر پوچھا ”خواص
خاں کا کیا ہوا؟“

شیر شاہی سردار نے جواب دیا: ”اسے شاہی حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“
”بہت برکی تھا ہے بادشاہ نے۔“ آپ نے افسوس کا اظہار کیا ”مرگ ناگہاں تمہارے
بادشاہ کی تباہی میں ہے۔“

شیر شاہی سردار نے اپنے بادشاہ کا دوسرا حکم سنا دیا۔ بولا۔ ”باغی خواص خاں کے
قتل کے بعد بادشاہ نے تمہارے لئے یہ حکم صادر کیا ہے کہ تم جو کچھ شاہی خدار اور اس
کے سپہانہ گان سے دلی ہمدردی رکھتے ہو اس لئے تمہیں احتیاطاً گوالیار کے قلعے میں نظر بند
کر دیا جائے۔“ بادشاہ نہیں چاہتے کہ تم ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تمہارے بادشاہ کے دل میں جو بھی آئے کر گزریں لیکن ہمارا
بادشاہ بہت قوی ہے اس کی گرفت اور دائرہ گرفت میں پوری کائنات ہے۔“

شیر شاہی سپاہ نے آپ کو سیکری سے اٹھوا کر گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ جب یہ
لوگ شاہی فرمان کی بجا آوری کے بعد آپ کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے
ان سے کہا ”تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ مظلوموں کی فریادیں عرش اعظم تک پہنچ چکی
ہیں اور مالک یوم الآخر نے ظالموں کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرما دیا ہے مرگ ناگہانی
تیرے بادشاہ کے تعاقب میں ہے۔“

معلوم نہیں آپ کا یہ پیغام بادشاہ کو پہنچا بھی یا نہیں لیکن کچھ عرصہ بعد ہی جبکہ شیر شاہ
کا انجر کے قلعے کی تسخیر میں لگا ہوا تھا بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ اس
میں جھلس کر ہلاک ہو گیا اور آپ کے عقیدت مندوں نے گوالیار کی نظر بندی سے
آپ کو رہا کر کے سیکری پہنچا دیا۔

شیر شاہ کے بعد اس بیٹوں میں اقتدار کی رکشہ شروع ہو گئی۔ شیر شاہ کا
بڑا بیٹا دارا خلافے سے دُور تھا، چھوٹا قریب تھا امر نے اسی کو اسلام شاہ سوری
کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ دونوں بھائیوں کو حضرت سلیم چشتی سے بڑی عقیدت

تھی۔ عادل شاہ اپنے چھوٹے بھائی کو تاج و تخت سے معزول کرنے کی نیت سے لاؤشکر لے کر آگے بڑھا اور اپنے ایک مصاحب خاص کو حضرت سلیم چشتی کی خدمت میں حصول دُعا کے لیے بھیجا۔ قاضی غیاث الدین نامی یہ امیر، حضرت سلیم چشتی کے خاص مریدوں میں سے تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا: ”حضرت! آپ کا یہ غلام چاہتا ہے کہ اس معرکے میں عادل شاہ مُرخروئی حاصل کرے اور آپ کا یہ بندہ آپ کی دُعاؤں سے کسی قابل ہو جائے۔“

حضرت سلیم چشتی نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا پھر پوچھا: ”تم عادل شاہ کے پاس کب جاؤ گے؟“

قاضی غیاث الدین نے جواب دیا: ”جب بھی حضورِ اجازت مرحمت فرمائیں گے چلا جاؤں گا۔“

آپ نے فرمایا: ”تو اب چلے جاؤ۔“

قاضی غیاث نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: ”حضرت! یہ ناچیز عادل شاہ کو کس طرح یقین دلائے گا کہ یہ حضورِ والا سے اس کے حق میں دُعاؤں کی سوغات لے کر واپس آیا ہے۔“

آپ نے دریافت کیا: ”تم کیا چاہتے ہو؟“

قاضی غیاث نے جواب دیا: ”آپ اس گناہگار کو ایک گھوڑا مرحمت فرمادیں تاکہ اس پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں حاضری دے اور پھر اسی گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کر دے اور اس کی پشت پر وہ بیٹھ کر اپنے حریف کا مقابلہ کرے؟“

آپ نے اپنا عرقی گھوڑا قاضی غیاث کے حوالے کر دیا اور فرمایا: ”عادل شاہ سے کہنا، اس گھوڑے پر وہ خود تو سواری کر سکتا ہے لیکن کسی اور کو ہرگز نہ دے ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ نکلیں گے۔“

قاضی غیاث، اس گھوڑے پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کرتے ہوئے ساری باتوں سے اسے مطلع کر دیا۔ چند گھنٹیوں بعد عادل شاہ کے ایک مصاحب خاص نے اس گھوڑے کو بیدار کیا اور کہا: ”حضورِ والا! یہ گھوڑا تو بہت خوبصورت لگتا ہے کیا تھوڑی دیر کے لیے

مجھے مرحمت فرمادیں گے؟

عادل شاہ کو دینے میں تامل ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں یہ مصاحب ناراض ہو کر اپنے سواروں سمیت اس کے چھوٹے بھائی سے نہ جاملے گھوڑا سواری کی غرض سے اس کے حوالے کر دیا۔ قاضی غیاث کو یہ بات گراں گزری یہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو کر سیکری چلا گیا اور حضرت سلیم چشتیؒ کو سواری رو داؤ سنا دی۔ آپ نے ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار کیا پھر بولے: "افسوس کہ عادل شاہ نے اپنی سلطنت کھودی۔"

جب دونوں بھائی آمنے سامنے آڈٹے تو چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں بیٹھ رہا اس کی فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جاملہ۔ اس نے اس نازک موقع پر ایک خاص ایلچی حضرت سلیم چشتیؒ کی خدمت میں روانہ کیا اور آپ سے طالب دعا ہوا۔

آپ نے ایلچی سے دریافت فرمایا: "اسلام شاہ کیا کر رہا ہے؟" ایلچی نے جواب دیا: "حضرت! وہ اپنے بھائی عادل شاہ سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں روپوش ہے۔"

آپ نے پوچھا: "میدان میں نکل کر مقابلہ کیوں نہیں کرتا؟" ایلچی نے جواب دیا: "فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جاملہ ہے ان حالات میں کس طرح جنگ جیتی جاسکتی ہے؟" "اچھا! آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا۔ پہلے ہم نے عادل شاہ کی مدد کی تھی لیکن وہ اہل ثابت نہ ہوا، جاؤ! اسلام شاہ سے کہہ دو قلعے سے نکل کر میدان میں صف آرا ہو جائے عادل شاہ ہارے گا اور اسلام شاہ کی برگشتہ فوج واپس آجائے گی۔"

ایلچی نے جب یہ پیغام اسلام شاہ کے گوش گزار کیا تو وہ بلا توقف قلعے سے باہر نکلا اور اپنی باقی ماندہ فوج کو صف بستہ کیا اور عادل شاہ سے نبرد آزما ہو گیا۔ ابھی جنگ جاری ہی تھی کہ اسلام شاہ کی فوج واپس آگئی اور اپنے ساتھ عادل شاہ کی فوج کا بیشتر حصہ بھی لیتی آئی۔ عادل شاہ ہراساں و بدحواس شکست اٹھا کر عظیم آباد کی طرف فرار ہو گیا۔

اسلام شاہ نے نو سال دبدبے سے حکومت کی لیکن اس کے فوت ہوتے ہی اس کا چچا زاد بھائی، اسلام شاہ کے بیٹے کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آگیا۔ اس شخص نے یہمول نامی شاطر بیٹے کو وزارت کا منصب بخشا اور سارے اختیارات اس کے حوالے کر کے خود رنگ ریلوں میں لگ گیا۔ یہمول کا دماغ یہاں تک خراب ہو گیا کہ اُس نے اپنے لیے راجہ بکر ماجیت کا خطاب پسند کیا۔ افغانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ہمایوں ایران سے واپس آگیا اور سکندر شاہ سوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گیا ابھی ہمایوں کو تاج و تخت سنبھالے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ قلعے کی بالائی منزل سے لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔ اس نے مغرب کی اذان سن کر بجلت نیچے اتارنا چاہتا تھا لیکن تواریخ قائم نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا نیچے کی آخری نیچلی سیڑھیوں تک پہنچ کر دم توڑ دیا ان دنوں نو عمر بکر اپنے اہلِ اہل اور سپہ سالار بیرم خاں کے ساتھ کلاں اور پنجاب میں مقیم تھا۔ وہیں اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ ہمایوں کی موت نے سوریوں کے حوصلے بلند کر دیے اور یہمول لشکرِ جرار کے کمر دہلی پر حملہ آور ہوا اور چشمِ ناز میں اسے فتح کر لیا یہمول نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا اور اس کی شرارتوں سے حضرت سلیم چشتی بھی محفوظ نہ رہے آپ نے ہندوستان کی طوائف الملوکی اور انتشار سے دل برداشتہ ہو کر اپنا ایک آدمی سورت کی بندرگاہ اس خرض سے روانہ کیا کہ وہ بحری جہاز کا انتظام کرے جس سے وہ اپنے ساتھیوں سمیت حج بیت اللہ کو روانہ ہو جائیں۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو بھی ان کے ساتھ حج کو جانا چاہے آپ اپنے خرچ پر خوشی لے جائیں گے۔

جہاز کا انتظام ہو گیا اور آپ اپنے آخری حج پر روانہ ہو گئے اس بار بھی آپ نے یہی خواہش کی تھی کہ وہیں پیچہ خاک ہو جائیں گے۔ مکہ معظمہ سے آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور رسول اللہ کے قدموں میں معتکف ہو گئے اور خاصی مدت اسی حالت میں گزار دی۔

ایک شب خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ آپ سے فرماتے ہیں۔
 ”و سلیم ہندوستان واپس جاؤ، وہاں کے لوگوں کو فیض پہنچاؤ اور دین کی اشاعت کرو۔“

آپ نے خوشامد اندر درخواست کی ۔ حضور! اس گنگا کو خاکِ مدینہ میں
 مل جلنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، اب یہ درجھوڑ کہہاں جاؤں ؟
 رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا : ” تمہیں پہلے ہی یہ بتایا جا چکا ہے کہ تمہیں وہیں
 مدینے کی زمین عطا کر دی جائے گی “
 اب مزید اصرار کا موقع نہ تھا، خوش خوش واپس ہو گئے ۔



یہ رم خاں اکبر کے ساتھ جالندھر سے پانی پت کی طرف بڑھا اور ۱۵۵۶ء
 میں وہ غورنیزہ واقعہ پیش آیا جس میں یہ مول کو سکست فاش دی گئی ۔ وہ ہاتھی پر سوار
 ہو کر اپنی فوجوں کو لڑا رہا تھا کہ ایک تیرنے اُسے زخمی کر دیا اس نے میدانِ جنگ سے فرار ہو
 جانا چاہا ۔ لیکن گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا ۔ اکبر شہنشاہ ہند ہو گیا ۔
 سلیم چشتیؒ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے راستے
 میں بڑے بڑے صوفیوں اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں ۔ اس سیاحت میں ان کی خواجہ اسماعیل
 شیروانی اور قطب وقت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملاقات ہوئی اسی دوران رسول اللہؐ
 نے خواب میں حکم دیا کہ شام میں شیخ ابراہیم عیاضؒ کے پاس جاؤ ۔ آپ شیخ ابراہیم عیاضؒ کے
 پاس پہنچے اور ان کی بیعت کی ۔ پھر بغداد چلے گئے اور امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مزار پر
 حاضر ہو دی اور یہیں حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار بھی حاضر ہوئے حضرت غوث اعظمؒ نے
 اپنے سجادہ کو خواب میں حکم دیا کہ ہمارا خرقہ خالص اور خلافت نامہ شیخ ہندی سلیم چشتیؒ کو مرحمت
 کر دو ۔

صبح اس حکم کی تعمیل کر دی گئی لیکن بعض مقامی حضرات کو یہ عمل شاقی گزرا اور
 وہ سلیم چشتیؒ کی نامک میں رہنے لگے کہ وہ جیسے ہی اس خرقہ خاص اور خلافت نامے کو
 لے کر چلیں گے ان سے ان پھیزوں کو جبراً اٹھین لیا جائے گا ۔

اُسے کچھ عرصہ بعد بغداد سے چل دیے ۔ ابھی وہ کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ
 چند بدوؤں نے انہیں اپنے محاصرے میں لے لیا ۔ آپ نے اُن سے دریافت کیا ” تم
 لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو “

” انہوں نے تحقیق آمیز لہجے میں جواب دیا : ” حضرت غوث الاعظمؒ کا خرقہ ہمیں واپس کر دو “

اُس وقت آپ کے جسم پر وہی خرقہ تھا آپ نے بدوؤں کو مسکرا کر دیکھا اور فرمایا: ”اگر تمہیں مذکورہ خرقہ میرے پاس سے دستیاب ہو جائے تو ضرور لے لو۔“ بدوؤں نے کہا: ”ہم آپ کے سامان کی تلاشی لیں گے۔“ آپ نے زیب تن خرقے کو دیکھا اور منہس کر پوچھا: ”کیا تمہیں وہ خرقہ میرے پاس نظر نہیں آتا؟“

بدوؤں نے جواب دیا: ”وہ خرقہ یقیناً تمہارے سامان میں بندھا ہو گا ہم اس میں سے نکال لیں گے۔“

آپ نے دریافت کیا: ”کیا تم لوگ اس خرقے کو اچھی طرح پہچانتے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا: ”خوب پہچانتے ہیں۔“ آپ نے حکم دیا: ”اس خرقے کو تم ہمارے سامان سے نکال لو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

بدوؤں نے آپ کا سارا سامان الٹ پلٹ ڈالا لیکن اس میں سے خرقہ نہ نکلا بدوؤں کو حیرت تھی کہ آخر وہ خرقہ کیا کہاں؟

جب وہ لوگ خرقے کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو آپ متبسم ہو کر فرمایا: ”وہ ملا خرقہ؟“

ان لوگوں نے مایوسی سے جواب دیا: ”نہیں، کیا وہ تمہارے پاس واقعی موجود نہیں؟“ آپ نے کہا: ”وہ ہمارے پاس ہی ہے لیکن تم اسے پا نہیں سکتے۔“ اس کے بعد پوچھا: ”کیا تم اس کی آخری بار زیارت کرنا چاہتے ہو؟“ بدوؤں نے جواب دیا: ”ہاں بالکل اور ساتھ ہی ہم یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ اسے آپ سے واپس نہ لیں گے۔“

آپ نے اپنی دستیں اُستین اُن کے روبرو کر دی، فرمایا: ”لو دیکھو اور اسے پہچانو۔“ انہوں نے دیکھا خرقہ مبارک کی اُستین ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ بدوؤں نے پوچھا: ”خرقے کا بقیہ حصہ کہاں ہے؟“

آپ نے بائیں اُستین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ دھڑکیو، یہی“ اور اب بائیں اُستین بھی صاف نظر آنے لگی تھی، پھر اسی طرح گریبان، دامن

اور پھر پورا خرقر انہیں نظر آنے لگا۔

بدوؤں نے حیرت سے سوال کیا: ”حضرت! اگر یہ سارے اجڑے خرقر آپ کے جسم پہ ہی موجود ہیں تو یہ ہیں پہلے کیوں نہ نظر آیا؟“
 آپ نے جواب دیا: ”ہم نے اسے اپنے جسم میں سلب کر لیا تھا۔“
 بدوؤں نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا اپنے دلوں میں اعتراف کیا اور قدموں میں گر کر مرید ہو جانے کی خواہش کی، آپ نے انہیں اپنا مرید کیا اور بدوؤں نے انہیں کئی دن اپنا مہمان رکھا۔

آپ وہاں سے چل کر ہندوستان آئے اور سیدھے ابو ذہن پہنچے بابا فرید کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت غوث الاعظم کا خرقر یہیں بابا فرید کے مزار پر چھوڑا اور کچھ دن قیام فرما کر مسکری کے لیے روانہ ہوئے راستے میں بھالی نامی ایک مقام پر آپ نے قیام فرمایا اور یہاں کی مسجد مخدوم شیخ زین العابدین میں ڈھائی سال معتکف رہے آپ کا شہرہ اکثر تک پہنچ چکا تھا اور وہ نہایت بے چینی سے آپ کا منتظر تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھالی میں تشریف فرما ہیں تو اس نے مروارید سے پُر ایک خولان بطور تحفہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا آپ نے اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ: ”اس کی بہن کوئی حاجت نہیں، اسے طالبان دنیا کو بھیجا دو۔“

✽

اکبر کو اولاد نہینہ کی بڑی خواہش تھی لیکن یہ خواہش کسی طرح پوری ہی نہ ہوتی تھی۔ مصاحبین خاص نے اسے مشورہ دیا کہ آستانہ خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند میں حاضری دے کر اپنی خواہش کا اظہار کرو، ممکن ہے پوری ہو جائے۔
 ۲۸ سالہ شہنشاہ ہند اکبر ایک سو چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے اجمیر پہنچا اور فاتح کے بعد دستِ دعا اٹھا کر عرض کیا۔

”و اے خواجہ معین الدین! آپ مرحشہ اویا نے ہند میں میں شہنشاہ اکبر عاجزی و انکسار سے یہ درخواست پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں، کہ میں اب تک اولاد نہینہ سے محروم ہوں میرے بعد باوجود حکومت سنبھالنے والا کوئی بھی نہیں۔ اگر مجھے اولاد نہینہ کی نعمت سے شادمان کیا گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سے سے اجمیر تک کا فاصلہ پانچا دھ طے کروں

گاہد آپ کی نیاز دہواؤں گا ۛ

اس دُعا کے بعد رات کو جب یہ مغل فرمانروا سویا تو اس نے خواب میں دیکھا،
حضرت خواجہ غریب نواز فرما رہے تھے: ”اگر! سیکری جاؤ، وہاں شیخ سلیم چشتی موجود ہیں
وہ ہمارے ہی خاندان سے ہیں اور شیخ الہندی ہیں، تم ان سے جُوع کرو، وہ تمہاری مراد
پوری کر دیں گے؟“

اکبر جو دھن بھی گیا اور بابا فریدؒ کے مزار پر ولادینہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ ”سیکری جاؤ وہاں ہمارے بھائی سلیم چشتیؒ موجود ہیں ان سے تمہارے نمکین دل کو سکون ملے گا۔“

اکبر سیدھا سیکری روانہ ہو گیا۔

اکبر سیدھا سیکری روانہ ہو گیا۔

حضرت سلیم چشتی نے انھیں کھول کر دیکھا تو انہیں اپنے سامنے ہندوستان کا
مغل فرمانروا دست بستہ کھڑا نظر آیا۔

آپ نے بے نیازی سے دریافت کیا ”خود کو نفل اللہ کہلاتے والے ہمارے رب و
دست بستہ کیوں کہلاتے ہیں؟“

اکبر نے وقت سے حال دل بیان کیا اور پوری روداد سن کر عرض کیا: ”اُجودھن اور اجمیر کے بزرگوں کی سفارش لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ چاہیں تو میری خواہش پوری فرمادیں، ورنہ دُعا کر دیں۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”تو اولادِ نرینہ کا طالب ہے؟“

”جی ہاں! بندہ پرور!“ اکر نے جواب دیا۔ ”اور میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے بیٹے کو آپ کی توجہ اور تربیت میں دے دوں گا۔“

آپ ذرا سی دیر کے لئے مراقبے میں چلے گئے اور ارشاد فرمایا ”بے مت بخشنے والا تجھے تین بیٹے دے گا“

اکبر نے کہا: ”میں پہلا بیٹا آپ ہی کے حوالے کر دوں گا۔ اس کی حمایت اور حفاظت آپ ہی کے ذمے ہوگی۔“

آپ نے کہا ”مبارک باشد، ہم نے بھی اس کو اپنا ہم نام کیا۔“

جب اکبر ان کے سے واپس پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ مریم زانی امید ہے سے اکبر نے ۳۹۳

سیکری میں آپ کے حجرے کے قریب ہی سنگ سرخ سے ایک شاندار محل تعمیر کرایا اور اسی محل میں مریم زمانی کو منتقل کر دیا۔ اس محل کے دو حصے تھے رنگ محل اور بدیع محل۔ بدیع محل آستانہ سلیم چشتیؒ سے ملا ہوا تھا۔ اسی بدیع محل میں جہانگیر پیدا ہوا، یہیں اس کی نال گاڑی گئی اور اس کا نام سلیم رکھا گیا۔

اکبر نے اپنی منت پوری کی اور اگرے سے اجمیر تک سفر پایادہ ط کیا، دوران سفر اس نے جہاں بھی پڑا دیکھا وہاں ایک منارہ تعمیر کرایا یہ منارے ابھی تک موجود ہیں اکبر نے ایک منارہ خاص جے پور میں تعمیر کرایا تھا اس کا نام ہرن منارہ رکھا تھا۔

والسہی پر حضرت سلیم چشتیؒ کے لئے ایک مکان اور خانقاہ تعمیر کرائی جس کی تعمیر تاریخ ”خانقاہ اکبر“ سے نکلتی ہے اور یہیں آپ کی خواہش پر ایک شاندار جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی اور شمال مشرق میں ایک شہر آباد کیا گیا جس میں اکبر کے خاص محلات، محلات خاتین و بیگمات دیوان خاص، دیوان عام، حوض، چمن، باغ، دفاتر، بحکال، عبادت گاہ، دارالمنظرہ، نورتنوں کے مکانات، حکماء کی قیام گاہیں، فیل خانہ، خزانہ، جملہ لوازمات شاہی سے متعلقہ عمارتیں ہیں پہاڑی پر تعمیر ہوئی اور یہ سلسلہ اگر کے کے دروازے تک چلا گیا ہے یہیں محلات شاہی ہتیا پول نامی دروازہ بھی ہے جس کے دونوں طرف سنگ سرخ کے دو باہتھی ایستادہ ہیں۔

کرلے کی سردیوں میں ملا عبدالقادر بدایونی (معتد اکبر) آپ سے ملنے سیکری پہنچا اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شمالی ہند کی بتیسی بجائیے والی سردی کا حضرت سلیم چشتیؒ پر کوئی زور نہ چل رہا تھا، آپ باریک ممل کے کرتے میں بلبوس ملا عبدالقادر سے گفتگو فرماتے رہے۔



اکبر شہزادے سلیم اور مقربین خاص کے ساتھ آپ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور نیاز زندانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس نے دوران گفتگو محسوس کیا کہ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں اکبر نے اچانک سوال کیا ”حضرت کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کُل کتنی عمر عطا فرمائی ہے؟“

آپ تھوڑی دیر کے لئے مراقبہ میں چلے گئے پھر سر اٹھا کر فرمایا ”وصال محبوب حقیقی کے دن کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے“ پھر شہزادے سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”لیکن جس دن یہ شہزادہ ہمیں کوئی کلام سنائے گا وہی ہماری رحلت کا وقت ہوگا“

اکبر نے شہزادے کو حکم دیا ”شیخو بابا! تم منطوم کلام حفظ نہیں کرو گے“

پھر اساتذہ اور آتائیت کے نام فرمان جاری ہوا کہ شہزادے کو منظور کلام نیا دکر لیا جائے۔
اس فرمان کے نفاذ کو دو سال سات ماہ گزر گئے۔ شہزادے کو ہر قسم کی نظم سے
دور رکھا گیا۔

پھر شہزادے کے دل سے حضرت سلیم چشتیؒ کی بات نکل گئی۔

ایک دن شہزادے نے نہایت عمدہ اور جاذب نظر لباس پہنا اور بن سوار کر جب وہ
کینزوں کے سامنے سے گزرا تو وہ عورت جو شہزادے کو نظر بد سے بچانے کے لیے ڈائیٹون
آٹا کرتی تھی اور شہزادے پر سے صدقات اور خیرات بچھا دیکر کرتی تھی۔ شہزادے کو ایک طرف
لے گئی اور کہا ”صاحب عالم! آپ اس وقت تک یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے جب
تک میں آپ کی نظر نہ آتا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے نظر اتاری اور شہزادے سے کہا ”شہزادے! ذرا اس شعر کو تو پڑھنا۔“

الہی غنچہ اُمید بخشا
گلے از روضہ جاوید بنما

شہزادے کو یہ شعر بے حد پسند آیا۔ یہ اُسے رٹا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔
”در حضور والا! آج میری ایک خدمتگار عورت نے مجھے ایک بہترین شعر سنایا ہے ذرا آپ بھی سمجھا
فرمائیں۔“

اس کے بعد فوراً ہی یہ شعر بھی سنا دیا۔

آپ نے حالت اضطراب میں یہ شعر سنا اور بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شہزادے
کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ مجرمانہ انداز میں منہ چھپانے لگا یہ خبر ایسی نہ تھی کہ اگر تک
نہ پہنچتی۔ وہ پریشان ہو گیا اور شہزادے کو ڈانٹا لیکن اس ڈانٹ سے کیا ہوتا تھا تیرکان سے نکل
چکا تھا۔

اسی شب آپ بخار میں مبتلا ہو گئے دوسرے دن صبح آپ نے تان میں ن کو طلب فرمایا
اور اس کو گلے کا حکم دیا۔ اس نے آپ کو گانا سنایا۔ گانا سُن چکنے کے بعد آپ نے مقبسم ہو کر
فرمایا ”دوستو! وعدہ وصال آپ پہنچا۔ اب ہم رخصت ہو جائیں گے۔“
قریب ہی شہزادہ سلیم بھی موجود تھا جو زار و قطار رو رہا تھا۔

آپ نے شہزادے کو روتے جو دیکھا تو فرمایا ”تم کیوں روتے ہو؟ تم نے وہی
کیا جس کا مشیت نے حکم دیا۔“ اس کے بعد آپ نے اپنی دستا آٹا کر شہزادے کے سر پر رکھ دی اور

فرمایا۔ سلطان سلیم بہار جانشین ہے اور ہم اسے خدائے حافظ و ناصر کے سپرد کرتے ہیں۔

یہ ۲۸۔ ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ کی درمیانی شب کی بات ہے کہ آپ رحلت فرما گئے۔

آپ کی وفات سے دو روز ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ بادشاہ نہایت غمگین ہوا۔ نماز جنازہ

قاضی القضاۃ، مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری نے پڑھائی۔ اگر اپنے جملہ وزراء کے

ساتھ کندھا دیتا ہوا پایا وہ جنازے کے ساتھ چلا۔ ہندوستان کا عظیم فرمانروا اکبر اپنے کاغذ

سے بار بار آپ کے جنازے کا بوجھ اٹھاتا، جامع مسجد کے صحن تک لے گیا۔ مسجد کے شمالی گوشے

کے وسط صحن میں آپ کی قبر کھودی جا رہی تھی۔ چھ مہینے تک کھودا گیا تو اس میں سے پتلی

مٹی نکلتی شروع ہوئی۔ صدر الصدور حاجی الحرمین شیخ عبدالنبی بھی دیں موجود تھے۔

انہوں نے حیرت و استعجاب سے وہ مٹی اٹھالی اور اسے تادیر دیکھتے رہے بادشاہ نے

پوچھا۔ عبدالنبی! اس پہاڑی زمین سے یہ ریگستانی مٹی کیوں نکل رہی ہے؟

صدر الصدور نے جواب دیا۔ قبلہ عالم! یہ تو مدینہ منورہ کی مٹی نظر آتی ہے۔

جو لوگ حضرت سلیم چشتیؒ سے بہت زیادہ قریب رہے تھے انہیں رسول اللہؐ کے

اس ارشاد مبارک کا علم تھا جس میں آپؐ نے حضرت سلیم چشتیؒ سے وعدہ فرمایا تھا کہ تم

ہندوستان واپس جاؤ تم کو وہیں تمہارے وطن میں جائے دفن کیلئے مدینہ کی زمین عطا کی جائیگی

جو لوگ اس ارشاد مبارک سے آگاہ تھے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں صدر الصدور نے رقت سے

کہا۔ ہمیں اس مٹی سے کوٹے یار کی بو محسوس ہوتی ہے۔ عقیدت مندوں کے تانے بچ کے ماؤ نے نکلے۔

ایک طرف صدائے تائبہ بلند ہوئی۔ ”خود فانی بحق باقی“ (اپنی ذات فنا ہو گئے ذات حق کا باقی)

کسی دوسرے نے کہا ہوشِ ہندی۔ تیسرے نے کہا۔ ”شیخ حکیم“

لیکن یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ اس نامی گرامی شخصیت کو جتنی شہرت حاصل ہوئی ان

کا ذکر اولیائے کرام کے مجموعوں میں نہیں ملتا۔ تاریخیں ان کا ذکر اختصار سے کرتی ہیں اور ان کے

حالات زندگی معلوم کرنے کیلئے بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے لیکن اُسی قدر یہ ایک زندہ و پابندہ

حقیقت ہے کہ جتنی واضح اور غیر مبہم کرامات آپؐ سے ظاہر ہوئیں انہی شہادتیں دنیا کی عظیم شخصیات

نے دی ہیں۔



حضرت شیخ احمد سرہندیؒ

سُلطان فیروز شاہ تغلق اپنے لاڈلے شکر کے ساتھ دہلی جا رہا تھا جب یہ شکر سرہندی نامی مقام پر پہنچا تو لوگوں نے یہاں سے بہت جلدی گزر جانا چاہا کیونکہ سرہند کا مطلب تھا شیروں کا مسکن۔ اس غیر محفوظ اور خطرناک جگہ کو نرسک سکتا تھا۔ یہ شکر سرہند سے ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا ہو گا کہ پتہ چلا، لشکر کے ایک بزرگ شیروں کے مسکن ہی میں رہ گئے ہیں بادشاہ نے ایک دستے کو حکم دیا کہ ان بزرگ کو جبراً لایا جائے یہ دستہ شاہی حکم نامہ لے کر جب ان بزرگ کے پاس پہنچا تو انہوں نے نہایت نرمی سے تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ دستے کے افسر نے بزرگ کا احترام کرتے ہوئے کہا ”حضرت سلامت! ہم آپ کو ساتھ لیے بغیر کسی طرح واپس جاسکتے ہیں شاہی حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے اس ناگوار فرض کی بجائوری میں، خدا کے لئے ہماری مدد فرمائیں“

یہ بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے فرمایا ”اچھا اگر یہ بات ہے تو ہم ساتھ چلتے ہیں اور بادشاہ سے ملکر پھر واپس آجائیں گے“

جب انہیں فیروز شاہ تغلق کے روبرو پیش کیا گیا اور اس نے سرہندی میں قیام فرما ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو ان بزرگ نے جواب دیا ”سلطان! ہمیں سرہندی میں القابوا ہے کہ اس جگہ ایک ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے جو وحید الامت ہو گا اور دین کو حیات نوبخشے گا ہم سرہند سے شیروں کو نکال کر اسے انسانی بستی میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں“

بادشاہ نے مسکرا کر دریافت کیا ”کیا آپ تین تہا اس خطرناک جگہ کو آباد کر سکیں گے؟“

بزرگ نے جواب دیا ”ان شاء اللہ“

بادشاہ ان کی ہمت اور عزیمت پر ششدر رہ گیا بولا ”آپ ہمارے ساتھ رہیں اور

مطلبن ہیں اگر اللہ کو یہی منظور ہے کہ سہرند آباد ہو اور یہاں اس کا محبوب بندہ پیدا ہو تو اس جگہ کو وہ ہمارے ذریعے ان بستی میں تبدیل فرمائے گا۔

یہ بزرگ بادشاہ کی ہمت افزا گفتگو سے مطمئن ہو کر اس کے ساتھ دہلی چلے گئے

ابھی دہلی پہنچے ہوئے انہیں چند ہی دن گزرے تھے کہ بادشاہ کو مطلع کیا گیا۔ ”اوپر سے

جہاں پناہ کے پیر مرشد حضرت جلال الدین بخاری تشریف لائے والے ہیں۔

بادشاہ ان کی پیشوائی کو نیکل کھڑا ہوا اور سونے پتے سے آگے کوئی تک ان کے

استقبال کو پہنچ گیا۔ بادشاہ اپنے پیر و مرشد کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا اور مصافحے

کو بڑھے ہوئے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”حضرت کی تشریف آوری کا کس زبان

سے شک یہ ادا کروں، کیا یہ گناہگار مقصد تشریف آوری سے آگاہ کیا جائے گا؟

مخدوم جلال الدین بخاری نے دنیا داری اور آداب سلطانی کا خیال کئے بغیر

جواب دیا۔ ”سلطان! اوپر کے آس پاس کے لوگ مالیہ کی رقم دہلی پہنچانے میں قباح

اور دشواری محسوس کرتے ہیں۔“

بادشاہ نے التجائز لہجے میں کہا ”پھر حیا و احسن والا حکم دیں اس پر عمل کیا جائے۔“

مخدوم جلال الدین بخاری نے جواب دیا۔ ”ہم چاہتے ہیں دہلی اور اوپر کے

درمیان ایک نیا شہر بسایا جائے اور شاہی مالیہ اس نئے شہر میں جمع کرایا جائے۔“

بادشاہ کسہرند کا واقعہ یاد کیا معنی خیز سنہسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”حضرت کے

حکم کی تعمیل کیجئے گی اور سہرند میں ایک نئی آبادی بسادی جائے گی۔“

چنانچہ بادشاہ نے اسی وقت خواجہ فتح اللہ نامی مقرب خاص کو دوسرا سوار دیکر

بحکم دیا۔ ”سہرند کی آباد کاری اور قلعے کی تعمیر کا کام فوراً شروع کر دیا جائے۔“

خواجہ فتح اللہ دھامے لائے سہرند پہنچے اور اس پاس کی آبادیوں سے مزدور

فرام کر کے جنگل کی صدقائی شروع کرادی۔ ان میں بہت سے آدمیوں کو فوجیوں نے بیگاریں

پکڑ کر کام سے لگا دیا۔ ان سب کے ذمے پہلا کام تھا قلعے کی تعمیر۔ ہزاروں آدمی قلعے

کی تفصیل صبح سے شام تک تعمیر کرتے اور جب دوسرے دن صبح پھر وہاں پہنچتے تو وہ

فصیل منہدم ہو چکی ہوتی دو چار دن تک لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ مخض اتفاق کا

کرشمہ ہے لیکن جب ہفتے بھر یہی ہوتا رہا تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے خواجہ

فتح اللہ نے بادشاہ کو اس نئی افاد سے مطلع کرتے ہوئے لکھا۔

• دیر روند قلعے کی فصیل اٹھائی جاتی رہے اور رات کو ڈھے جاتی رہے ہم لوگ سخت پریشان ہیں کہ یہ کیا اسرار ہیں اگر یہ عمل یوں ہی جاری رہا تو یہ کام قیامت تک جاری رہے گا اور قلعے کی تعمیر کبھی مکمل نہ ہو سکے گی حضور والا سے التماس ہے کہ وہ اپنے گران قدر مشورے اور تدبیر عالی سے بندگان خدا کو سرفراز فرمائیں کہ یہ کام اپنے انجام کو پہنچے۔ ورنہ یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

بادشاہ نے فتح اللہ کا مرسلہ مخدوم جلال الدین بخاری کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا: حضرت! اس مشکل کا حل ہم کن ہنگاموں کے بس کا کب ہے، اُسے بھی آپ ہی دُور فرمائیں۔

• مخدوم بخاری نے انہیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے ذرا دیر بعد انہیں کھولیں اور اپنے خلیفہ اور امام نماز رفیع الدین کو طلب کیا۔ جب یہ آگئے تو انہیں حکم دیا: رفیع الدین! اپنے بھائی خواجہ فتح اللہ کے پاس سہنہ نہ جاؤ اور اپنی نگرانی میں قلعے کی تعمیر کا کام انجام دو!

رفیع الدین بھی اس مشکل سے آگاہ ہو چکے تھے کیونکہ خواجہ فتح اللہ ان کے حقیقی بڑے بھائی تھے اور انہوں نے رفیع الدین کو سب کچھ پہلے ہی سے بتا رکھا تھا۔ رفیع الدین اپنے پیرو مرشد کا حکم پا کر سہنہ نہ جانے کی تیاری کرنے لگے روانگی سے پہلے حضرت مخدوم بخاری نے انہیں ایک اینٹ دی اور فرمایا: بنیاد میں اسے رکھ دینا یہ اینٹ تمہاری مشکلات دور کرے گی اور وہ صاحب بھی سامنے آجائیں گے جو فصیل کی تعمیر میں مزاحم ہو رہے ہیں۔

رفیع الدین اسی وقت سہنہ نہ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر اینٹ قلعے کی بنیاد میں رکھ کر تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ وہ پہلی رات بڑی بے چینی کی تھی۔ خواجہ فتح اللہ اور امام رفیع الدین کو نتیجے کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ دوسرے دن صبح فصیل کی دیوار جوں کی توں کھڑی تھی مز دور کام میں لگ گئے اور فصیل کا کام مکمل کیا جانے لگا رفیع الدین کام کا جائزہ لیتے ہوئے جب اس حصے میں پہنچے جہاں بیگار کے لوگ کام کر رہے تھے تو فوراً اٹھٹک گئے انہوں نے دیکھا، ایک شخص انہیں نہایت خشنماں نظروں سے گھور رہا ہے۔ امام رفیع الدین نے اس شخص کے کاندر ہے پر ہاتھ رکھ اپنی طرف کھینچ

لیا۔ اور کہا: ”حضرت! آپ یہاں کہاں؟ ادھر میرے پاس آجائیے“
اس شخص نے غصے سے جواب دیا: ”مذہب سے کہہ دینا، ہم نے تیرا خیال کیا ہے

وہ تیری ایک اینٹ کی حیثیت ہی کی تھی، اسے بھی اکھاڑ پھینکتے“
رفیع الدین نے عاجزی سے کہا: ”حضرت! آپ اتنے برہم کیوں ہیں، آخر
ہم گناہگار مرد عذاب کیوں ہیں؟ کیا آپ اس شہر کی تعمیر سے ناخوش ہیں؟“

ان صاحب نے جواب دیا: ”یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تیرے بھائی فتح اللہ کے
آدمی ہمیں بھی بیگار میں پکڑ لائے، ہم نے یہ بھی سوچا کہ چلو بیگار میں کام لیتے ہو تو لیتے رہو
کہ ایک لگے، آخر عاجز آکر بھاگ کھڑے ہو گئے“

رفیع الدین نے عجز و انکسار سے جواب دیا: ”یہ لوگوں کی بد نصیبی اور کور و چشمی
ہے کہ وہ حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر سے واقف نہیں۔ اگر انہیں آپ کی ذات
اقدس کا علم ہوتا تو وہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرتے اب آپ انہیں معاف فرمادیں اور قلعے کی تعمیر
کا کام مکمل ہو جائے دیں“

بوعلی شاہ قلندر نے فرمایا: ”رفیع الدین! تو وہ صحیح آدمی ہے جو اس کام پر
متعین کیا گیا ہے شاید تجھے نہیں معلوم کہ وہ شخص جس کے لیے یہ قلعہ بن رہا ہے اور شہر
تعمیر ہو گا تیری ہی نسل سے پیدا ہوا گا اب ہم خود بھی اس قلعے اور شہر کی تعمیر میں تیرا ہاتھ بٹائیں
گئے“

اس کے بعد امام رفیع الدین اور بوعلی شاہ قلندر کی مگرانی میں قلعے اور شہر کی تعمیر
کا کام شب و روز انجام پانے لگا اور جو پہلے سہند (شیروں کا مکن) تھا ایک مدت
گزرنے کے بعد سرسند ہو گیا اور پھر ایسا وقت آیا کہ اسے سرسند کہا جانے لگا۔



امام رفیع الدین سرسند میں آباد ہو گئے اور ان کی چھٹی نسل میں شیخ عبداللہ
کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، جس دن یہ بچہ پیدا ہوا، اسی رات مغل فرماں روا اکبر اعظم نے
ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ شمال سے ایک تیز و تند آندھی اٹھی
اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اکبر اعظم کو تخت سمیت اپنی گرفت میں لے لیا۔ بادشاہ نے
بڑے ہاتھ پیرائے لیکن بس نہ چلا۔ تند و تیز آندھی نے بادشاہ کو تخت سمیت زمین پر پٹخ دیا۔
اکبر نے بیدار ہوتے ہی معبروں (خواب کی تعبیر بتانے والوں) کو طلب کیا اور

خواب بیان کر کے تعبیر دریافت کی۔ کسی معبر نے ڈرتے ڈرتے تعبیر بیان کی۔
 ”آج کسی ایسے بچے کی ولادت ظہور میں آئی ہے جو بڑا ہو کر آپ کے ائین سلطنت کو منزلزل کر دے گا۔“

تعبیر تشویش ناک تھی لیکن یہ کام بھی بہت دشوار تھا کہ پورے ہندوستان کے ان بچوں کا پتہ چلایا جاتا جو اس رات (۱۲ شوال ۱۵۱۳ھ / ستمبر جمعہ) کو پیدا ہوئے تھے اور اگر ان بچوں کا کسی طرح پتہ بھی چلایا جاتا تو ان کی تشویش ناک بچے کی شناخت کس طرح ممکن میں آتی۔
 عبدالاحد اس بچے کو شاہ کمال کیتھلی کی خدمت میں لے گئے آپ نے بچے کو دیکھتے ہی فرمایا: ”عبدالاحد! تیرے گھر میں تو عالم باعمل اور عارف کامل پیدا ہوا ہے اس کی ہدایت و ارشاد کا نور بدعت و گمراہی کی تاریکیوں کا خاتمہ کر دے گا۔“

اس کے بعد شاہ کمال نے بچے کے منہ میں اپنی انگلی دے دی۔ بچہ انگلی چوسنے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد شاہ کمال نے اپنی انگلی کھینچ لی اور فرمایا: ”بابا بس کرو، بس اتنا ہی کافی ہے کچھ ہماری اولاد کے لیے بھی تو چھوڑ دو، تم نے تو ہماری نسبت ہی کھینچ لی۔“
 بچے کا نام شیخ احمد رکھا گیا جو بعد میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوا۔

اس بچے کی ابتدائی تعلیم تو عبدالاحد کے ذمے ہی لیکن بعد میں مولانا کمال الدین کشمیری اور شیخ یعقوب کشمیری کا شرف تلمذ حاصل رہا مولانا کمال الدین کشمیری نے معقولات کی چند مشکل کتابیں پڑھائیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہیں ملا عبدالحکیم سیاح کوئی بڑے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے شیخ یعقوب کشمیری نے احادیث کا درس دیا۔
 شیخ احمد نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ زہد و ورع کا ماحول تھا لیکن اس سے ہٹ کر اُدور دور تک اکبری عہد کی ساری خبرائیاں موجود تھیں اکبر کو علمائے وقت نے انسان کامل قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو مسجد کے نافرمان عین قرار پایا۔ چہرہ شاہی کو کعبہ مراد اور قبلہ حاجات کہا جانے لگا دین الہی وجود میں آچکا تھا۔ عربی مہینے موقوف ہو چکے تھے ان کی جگہ اکبری سال جلوس سے دین الہی کا نیاس جاری تھا۔ زرتشتیوں کی طرح سال میں چودہ عیدیں منائی جانے لگی تھیں۔ مسلمان کی بی بی اپنی رونق کھو بیٹھیں لیکن جمعے کی نماز اور خطبے کا التزام یوں باقی رکھا گیا کہ خطبے میں بادشاہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ نئی تقویم میں سال کو سن الہی اور مہینوں کو ماہ الہی کا نام دیا گیا۔ سکھ پر تاریخ الف، ثبت کرائی گئی

جس کا مطلب تھا اسلام کے ایک ہزار سال بیت جانے کی وجہ سے یہ مذہب ختم ہو چکا ہے اس کی جگہ دین الہی نے لے لی ہے تاریخ اسلام از سر نو ترتیب دی جانے لگی اور اس کا نام تاریخ الہی رکھا گیا اکبر نے مؤرخین کو حکم دیا کہ سن ہجری کی جگہ سن رحلت لکھا جائے۔ بادشاہ صبح سے شام تک چار مرتبہ آفتاب کی پرستش کرتا۔ آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھتا۔ یہ وظیفہ دوپہر کے وقت پڑھتا تھا۔ وظیفہ پڑھنے کے دوران بادشاہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیتا اور اپنا سر ادھر ادھر ہلا کر کان کی لو پر مٹکے لگاتا۔ یہ تو بد استغفار کی ایک شکل تھی گاؤ کشی ممنوع قرار پائی۔ سورا اور کتے حلال قرار دیے گئے کتوں اور سوروں کو شاہی محل کے نیچے اس غرض سے رکھا جاتا کہ بادشاہ علی الصباح ان کے دیدار کو عبادت تصور کرتا تھا۔ سورا کی نسبت ہندوؤں نے بادشاہ کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ سورا ان دس مظاہرین میں سے ہے جن میں جھگوان نے حلول کیا ہے کتوں کی نسبت بعض مسلمان عارفوں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس میں دس ایسی صفات پائی جاتی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو وہ ولی ہو جائے فیضی اپنے دسترخوان پر کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھنے لگا۔ بادشاہ کی کتوں سے عقیدت اور فیضی کی پیروی میں ہندوستان اور عراق کے بعض شعرافخریہ کتوں کی زبانیں اپنے منہ میں لے کر پیاری کرتے تھے۔ غسل جنابت حرام قرار پایا اور دلیل یہ دی گئی کہ بول و براز کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہے پھر اس پاکیزہ اور لطیف ملک کے اخراج پر غسل کیوں واجب قرار دیا جائے جس سے انسان وجود میں آیا اور جس پر انسانی اور حیات حیوانی کے استقرار اور تسلسل کا انحصار ہے سود اور جو احلال قرار پائے۔ دربار میں قمار خانہ تعمیر ہوا جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر قرض دینے کا حکم دیا گیا کیونکہ اس سے خزانے کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عربی زبان ممنوع قرار پائی۔ عربی پڑھنا یا جانا مطعون اور مردود قرار دیا گیا۔ بادشاہ نے عربی کے خاص حروف، ث، ح، ع، ص اور ط، ظ کو بول چال سے نکال دیا چنانچہ عبد اللہ کو ابدا اللہ، احمد کو اہمد، علم کو اہلم، ثواب کو سواب وغیرہ لکھا یا بولا جاتا تو بادشاہ بہت خوش ہوتا۔ اللہ علیکم کی جگہ اللہ اکبر کہا جاتا کیونکہ اس میں بادشاہ کا نام بھی شامل تھا۔ جواب میں لوگ جل جلالہ کہتے کیونکہ اس میں بھی جلال الدین کا ایک جز موجود تھا۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں شیخ احمد سرمدی پڑش پالے

تھے۔

تعلیم سے فراغت حاصل کر کے آپ اکبر آباد تشریف لے گئے وہاں ان کی بڑی بڑی یگانہ روزگار اور نادرہ صفات شخصیات سے رابطہ قائم ہوئے ان میں ابو الفضل اور فیضی کا نام بھی شامل ہے یہ دونوں بھائی شیخ احمد کی علمیت اور قابلیت کے بڑے معترف ہیں یہاں تک کہ فیضی کو قرآن پاک کی بے نقط تفسیر میں بعض جگہ حروف غیر منقوطہ کا سہارا نہ ملتا تو اس نے شیخ احمد سے رجوع کیا اور انہوں نے وہ مشکل حصہ خود مکمل کر دیا۔

بیٹے کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے جب ایک مدت ہو گئی تو شیخ عبدالاحد کی شفقت پیری کے لئے ان کی جدائی ناقابل برداشت ہو گئی اور وہ بیٹے کو سرہند واپس لانے کیلئے اکبر آباد پہنچ گئے وہاں کا ایک بڑا حلقہ ان کی بزرگی اور فضیلت کا معتقد اور معترف تھا۔ چنانچہ عبدالاحد کے گرد لوگ پروانہ وار جمع ہونے لگے اور بعض نے ازراہ عقیدت موذبانہ عرض کیا کہ اس ضعیف پیری میں بعد مسافت کی یہ مشقت کیوں اختیار فرمائی؟

عبدالاحد نے جواب دیا: کیا کروں شیخ احمد کی محبت یہاں کھینچ لائی ہے۔ کچھ دن قیام فرما کر عبدالاحد نے بیٹے کو ساتھ لیا اور سرہند واپس ہوئے۔ راہ میں تھانیر میں قیام کیا اور وہاں کے حاکم اور رئیس شیخ سلطان کے مہمان ہوئے۔ شیخ سلطان علم و فضیلت میں بلند مقام رکھتے تھے اور انہیں بادشاہ کا قرب بھی حاصل تھا لیکن بادشاہ کے عقائد اور مروجہات سے انہیں نفرت تھی اسی لئے دُور دُور پہنچنے لگے تھے عبدالاحد اور شیخ احمد کی تشریف آوری سے پہلے انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ رسول مقبولؐ فرماتے ہیں۔

”شیخ سلطان اتیری بیٹی اس عہد کی سب سے زیادہ نیک خاتون ہے تو اس کا نکاح میرے فرزند اور نائب شیخ احمد سے کر دے اس میں خود تیرے اور تیری بیٹی کے لئے بڑی سعادتیں ہیں۔“

شیخ سلطان شیخ احمد سے واقف بھی نہ تھے۔ پورا دن اسی فکر میں گزار دیا کہ آخر یہ شیخ احمد کون بزرگ ہیں جن کی بابت رسول اللہؐ بیٹی کی شادی کا حکم فرما رہے

ہیں۔ دوسری رات پھر یہی خواب دیکھا اور دوسرا دن بھی اسی فکر میں گزر گیا۔ تیسری رات پھر یہی خواب نظر آیا اور آخر شیخ سلطان نے رسول اللہ سے پوچھ لیا۔ حضور! یہ گناہ گار شیخ احمد سے واقف نہیں ہے براہ کرم ان سے ملوادیا جائے اور انہیں پہنچا دیا جائے۔ خواب ہی میں رسول اللہ نے شیخ احمد کو ان کے روبرو کھڑا کر دیا اور فرمایا۔ ”لے لے نہیں پہچان لے“ یہ ہے ہمارا فرزند اور نائب شیخ احمد۔

شیخ سلطان نے ان کی شکل خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لی چنانچہ جب شیخ احمد اپنے والد کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہوئے تو شیخ سلطان نے انہیں پہچان لیا اور بے چین ہو گئے پھر بھی مزید تحقیق اور تفتیش کے پیش نظر کئی دن خاموش رہے اور ان کے روز و شب کے لمحات کا بے نظر غائر جائزہ لینے لگے کہ وہ کن نیکے بدامور میں گزرتے ہیں اور پچھڑی دن میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شیخ احمد وہی ہیں جن کی انہیں بشارت اور ہدایت مل چکی ہے پھر بھی وہ بیٹھے تھے اپنی طرف سے بات کرتے ہیں ذرا تاامل اور ندامت محسوس ہوئی لیکن رسول اللہ کی محبت اور ہدایت شرم و ندامت پر غالب آئی اور سب کچھ بخیر الاحد کے سامنے عرض کر دیا باپ نے تسلیم خم کر دیا کہا۔ ”کس میں اتنی ہمت ہے کہ رسول اللہ کے حکم سے سرتابی اور انحراف کرے میں تیار ہوں۔“

شادی کا اہتمام ہوا اور شیخ احمد رشتہ ازدواج سے وابستہ کر دیے گئے اور یہ اپنی بیوی کو لے کر سرسبز چلے گئے۔ شادی کے وقت آپ کی تقریباً پچیس سال تھی۔ شادی کے بعد آپ کو اتنا مال میسر آیا کہ صاحب مال بھی ہو گئے۔

شیخ عبداللہ حداد نہیں فقر و سلوک کا درس دے رہے تھے اور شیخ احمد کے اندر ایک اور ہی انقلاب برپا تھا وہ عہد اکبری کے فتنوں سے نبرد آزما ہونے کے ارادے کر رہے تھے لیکن شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا ہر کام ”ادھر کے اسلئے“ کا تابع تھا۔

آپ کو ذہنی سکون حاصل نہ تھا۔ امت محمدیہ کی بے بسی اور مظلومی پر آپ کا دل کڑھتا رہتا اور اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک اور تکلیف دہ یہ پہلو تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا ہندو جو چاہتے وہی ہو کر رہتا اور ان کا رویہ جارحانہ تھا۔ آپ کے خسر حاجی سلطان تھا نیسری بادشاہ کے نیر غائب آگئے تھا نیسر

کے ہندوؤں نے ان کے خلاف بادشاہ سے بار بار شکایتیں کی تھیں کہ وہ کدو کشتی کرتے رہتے ہیں بادشاہ انہیں اس جرم میں جھک جلا وطن کر دیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد غانچانان کی سفارش پر دوبارہ تھانیسر واپس بلالیے گئے لیکن بادشاہ کا دل اُن سے صاف نہ تھا۔ یہ ساری باتیں شیخ احمد کے آس پاس پیش آ رہی تھیں اور ان کے دل پر ان کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ اسی دوران ایک نہایت ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔

بادشاہ لاہور سے واپس آ رہا تھا راہ میں تھانیسر پڑتا تھا چند دنوں کے لیے یہاں بھی قیام کیا۔ حاجی سلطان نے بادل ناخواستہ حاضری دی۔ بادشاہ کو ان سے بڑی شکایتیں تھیں اس نے حاجی سلطان سے کہا۔ ”سلطان! ہم نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ تم ہمارے لیے قرآن لکھو، کیا بات ہے تم نے اب تک اس کی تعمیل کیوں نہیں کی؟“ حاجی سلطان نے دلیرانہ جواب دیا۔ ”تم خبریل کو آسمان سے بلاؤ یا وہ تمہارے لیے قرآن لاتے تو میں بھی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کر لوں گا۔“

خوشامدی مصاحبین نے بادشاہ کو چڑھایا اور حاجی سلطان کے جواب کو گستاخی قرار دیا۔ بادشاہ نے برہمی سے سوال کیا۔ ”اور اس بات کا تیرے پاس کیا جواب ہے کہ تو نے بارہ سال سے سرکاری خزانے میں ایک پلیہ بھی داخل نہیں کیا۔ وہ بارہ سالہ خرچ کہا گیا؟“ حاجی سلطان نے اسی شان بے نیازی اور دلیری سے جواب دیا۔ ”تو مرتد ہو گیا ہے اور مرتکما مال علماء فقر اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دینا جائز ہے میں نے بارہ سالہ لگان اور مالے کی رقم فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔“

بادشاہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ جوش و غضب میں کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ حاجی سلطان نے ایک پتھر اٹھا کر تاک کے بادشاہ کے چہرے پر پھینچ مارا۔ اکبر کی شکن آلود پیشانی ابھولہان ہو گئی اکبر نے اسی وقت حاجی سلطان کو سولی پر چڑھانے سے حکم صادر کر دیا جس پر فوراً عمل درآمد ہوا اور حاجی سلطان کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ شیخ احمد کے دل پر ایک اور زخم لگا۔ خسر کی موت کے پچیس دن بعد شیخ عبد الاحد کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ بھی جھیل اور حج کے ارادے سے دہلی پہنچ گئے وہاں مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہو گئی اور دونوں میں ربط و ارتباط تان بٹھا کہ شیخ احمد نے خواجہ باقی باللہ سے خرقہ خلافت حاصل کر لیا۔ خواجہ باقی باللہ کے اپنے

اس سرمد کی بابت کیسے احاسات تھے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے آپ نے اپنے کسی دوست شیخ احمد کا اس طرح تعارف کرایا۔

”اہل سرہند سے ایک بزرگ شیخ احمد بڑے عالم فاضل ہیں جو قوت عمل سے بھی متصف ہیں فقیر نے چند وفدان کی صحبت میں نشست و برخاست کر کے بہت سے عجائب و روزگار کا مشاہدہ کیا ہے وہ ایک چراغ ہیں جو ایک عالم کو منور کر دیں گے۔“
آپ نے خواجہ باقی باللہ کی زیر تربیت سلوک کی منزلیں طے کیں اور ان کی ایما پر لاہور تشریف لے گئے۔ کشف و کرامات کا ظہور اور نزول شروع ہو چکا تھا۔

دوران سفر آپ اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے ساتھ ایک سررائے میں فرسٹ ہوئے آپ نے قدسے سکوت اور مراقبہ اختیار کیا پھر فرمایا: ”لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج اس سررائے پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔“
حاضرین صحبت نے دریافت کیا: ”حضرت اس سے مفروضہ بحث کی تدبیر بھی ارشاد فرمائیں۔“

آپ نے ارشاد فرمایا: ”اس دُعاے ماثورہ کا ورد جاری رکھو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یُضَرُّ مَعَ رُؤْسِهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ

اور (عوذ بکلمات اللہ التامات من شَرِّ مَا خَلَقَ)۔“

آپ نے مزید فرمایا: ”جو اس دعا کا ورد رکھے گا اس مصیبت سے محفوظ رہے گا۔“
تھوڑی دیر بعد ہی سررائے میں آگ لگ گئی اور یہ اتنی پھیل کہ بجھانے کی جتنی کوشش کی گئی آگ بڑھتی چلی گئی اور سررائے کا سب کچھ جل گیا لیکن جن لوگوں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا تھا ان کا سامان حیرت انگیز طور پر محفوظ رہا۔

لاہور کے جس مکان میں آپ قیام فرما تھے ایک دن نماز عشاء کے بعد آپ نے اس مکان کی ایک دیوار کے پاس گھرے ہو کر فرمایا۔

”میں گھر کے جملہ افراد کو مطلع کرتا ہوں کہ کوئی شخص بھی اس دالان کے نزدیک نہ آئے اور نہ اس کے نزدیک سوئے۔“

کسی نے سوال کیا: ”حضرت! یہ کیوں؟ یہ تو اچھی خاصی مضبوط ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”میں نے کشف میں اس دیوار کو گرہ دار دیکھ لیا ہے۔“

کسی شخص نے خوش طبعی کے طور پر کہا ۛ حضرت معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں

میں نے تو اس سے زیادہ شکستہ اور کمزور دیواریں دیکھی ہیں یہ تو بہت مضبوط ہے ۛ

ایک خادمہ بھی یہ باتیں سن رہی تھی، اس نے بھی سہی سوچا کہ شیخ صاحب معلوم

نہیں کیا فرما رہے ہیں، اچھا خاما مضبوط دالان اچانک کیوں گرنے لگا وہ اسی دالان

میں سو گئی۔ ایک دوسری خادمہ نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مگر ڈرتے ڈرتے اس دالان

سے ذرا دور سونے کا انتظام کیا اور پڑھ رہی۔ نصف شب کے بعد دالان اچانک گر گیا۔

گرنے کی آواز سن کر لوگ بھاگ کر شکستہ دالان کے پہنچے اور اس میں سوئی ہوئی خادمہ

کو آوازیں دینی شروع کر دیں لیکن اب وہ اس دنیا میں تھی ہی کب جو جواب دیتی، ہاں دوسرے

دالان کے قریب سوئی ہوئی خادمہ کی چیخ پکار اللہ سنائی دے رہی تھی دالان کی اینٹوں نے

اس کی ایک ٹانگ زخمی کر دی تھی اور شدت کرب سے چلا رہی تھی۔

آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور غصے میں فرمایا ۛ کیا ہم نے آفتِ ناگہانی سے سب کو

عشاء کے وقت آگاہ نہیں کر دیا تھا؟

لوگوں نے مسکینوں کی طرح تائید میں گزریں ہلا دیں آپ نے حکم دیا ۛ اس

زخمی خادمہ کو نکالا جائے ۛ

خانمہ نکالی گئی اور اس وقت تو لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے

یہ دیکھا کہ خادمہ چوٹ چپٹ سے بالکل محفوظ تھی اور ٹانگ کا جو حصہ اینٹ سے زخمی ہوا

تھا وہاں اب خراش تک نہ تھی۔



دہلی میں خواجہ باقی باللہ پیر و مرشد رحلت فرما چکے تھے یہ تیزی سے دہلی چل

پڑے۔ سرسند راہ میں پڑتا تھا لیکن آپ وہاں نہیں رُکے۔ دہلی میں پیر کے مزار پر حاضری

دی اور سرسند واپس تشریف لے گئے۔ خواجہ باقی باللہ کے وصال کے دو سال بعد اکبر

اعظم بھی چل بسا اور ہندوستان کے اقتدار کی باگ دوڑ جہانگیر کے ہاتھ میں آئی۔ آپ

نے اپنے مکاتیب کے ذیلے تجدیدِ امت کا کام شروع کر دیا تھا آپ نے اپنے ہزاروں

حلقہ بگوشوں کو خطوط لکھ کر تبلیغ و تلقین کا کام شروع کر دیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے

کہ آپ کی تجدید کا آغاز ۱۲ ربیع الاول ۱۱۱۱ھ سے ہوتا ہے جبکہ رسول اللہ کا سن وفات

۱۱ھ ہے گویا ٹھیک ایک ہزار سال بعد۔ اسی دوران کیتل سے ش
تشریف لائے۔ یہ حضرت شاہ کمال کے پوتے تھے اس وقت حضرت سر
سرنہی مراقبہ میں تھے۔ شاہ سکندر نے اپنا خرقہ ان کے کاندھے پر ڈال دیا
حضرت شیخ سرنہی نے آنکھیں کھول دیں اور دریافت فرمایا یہ کیا ہے؟
شاہ سکندر نے جواب دیا رات حضرت شاہ کمال خواب میں تشریف لائے
تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ وہ جو خرقہ حضرت عبدالقادر جیلانی کی امانت تھا جو
مئی واسطوں سے آپ کے لئے مجھ تک پہنچا تھا۔
حضرت شیخ سرنہی نے وہ جبہ اسی وقت پہن لیا اور اسی حالت میں
زمان خانے میں تشریف لے گئے۔

اسی دوران مشہور اور معزز امرا، خان خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں
مرتضیٰ خان اور مہابت خان وغیرہ حلقہ اراکین منداں میں داخل ہو چکے تھے آپ انہیں
مکاتیب کے ذریعے اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ بادشاہ کو خلاف شرع
اور مرتدانہ روش سے باز رکھیں لیکن ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

آپ اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں پایادہ ایک جنگل میں تشریف
لے گئے۔ گرمی اور گرد و غبار کے زور نے لوگوں کے منہ پھر دیئے ان میں کچھ تو حالات
اور مشکلات پر قانع رہے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو زبان پر حرف شکایت لائے
بغیر نہ رہ سکے۔ آپ نے اپنے پر بھائی مولانا یوسف مہر قدسی سے ارشاد فرمایا۔

”گرمی شدید ہے اور گرد و غبار الگ، دوستوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے“
مولانا یوسف نے جواب دیا۔ آپ کو سارا حال خود معلوم ہے کسی استفسار

کی ضرورت ہی کہاں ہے۔“

آپ نے متبسم ہو کر نیم و آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور معلوم نہیں
چپکے چپکے کیا کچھ کہتے رہے ابھی آپ اسی کیفیت میں تھے کہ اوپر فضا میں ابراہیم ایک ٹکڑا
منو دار ہو کر ان سب پر سایہ نکل ہو گیا اور شمالی ہوا نہایت اعتدال سے چلتی لگی۔

آپ کے بھائی شیخ مسعود قندھار کے لئے سامان تجارت لے کر قافلے کے
ساتھ ہو لیے۔ انہیں لگے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک دن علی الصبح آپ نے

لوگوں سے فرمایا ” عجیب معاملہ ہے آج میں شیخ مسعود کے احوال کی طرف متوجہ ہوا ہر چند میں نے چشم مکاشفہ سے انہیں تلاش کیا لیکن وہ زمین پر کہیں بھی نظر نہ آئے اس کے بعد میں نے زمین کے اندر تلاش کیا تو قندھار کے باہر ان کی قبر دکھائی دی غالباً انہوں نے آج ہی وفات پائی ہے “

سامعین نے وقت، دن اور تاریخ نوٹ کر لی ایک مدت بعد جب قافلہ واپس آیا تو لوگوں سے وہی کچھ معلوم ہوا جس کا آپ ذکر کر چکے تھے۔ شیخ مسعود کی وفات اسی دن وقت اور تاریخ کو واقع ہوئی تھی۔

آپ سے عجیب و غریب کرامتیں واقع ہو رہی تھیں ایک عالم جو اپنا بیشتر وقت آپ ہی کی صحبت میں گزارا کرتا تھا ایک دن پریشان حال اور اداس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے دریافت فرمایا ” یہ آج تم اتنے اداس اور پریشان کیوں ہو؟ “

اس نے غمزہ آواز میں جواب دیا ” حضرت! میرا ایک عزیز بہت سخت بیمار ہے اور میں اس کی زندگی چاہتا ہوں اور آپ سے دُعا کا خواہش مند ہوں “

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور رقبہ میں چلے گئے پھر آنکھیں کھول دیں اور دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا ڈئے کچھ آہستہ آہستہ پڑھتے رہے اور پھر با آواز بلند فرمایا ” ہم نے اس کے لیے دُعا سے مغفرت کر دی ہے “

عالم نے المناک نظروں سے آپ کو دیکھا گویا سوال کر رہا ہو یہ حضرت! یہ کیا بات ہوئی میں نے دُعا سے درازی عمر کی درخواست کی تھی “

آپ نے ارشاد فرمایا ” مشیتِ ایزدی اور تقدیر الہی کو کون بدل سکتا ہے؟ “ وہ عالم گھر کی توپ تیر چلا کر اس عزیز کا انتقال ہو چکا ہے ۔

ایک دن آپ اپنے ارادت مندوں کو مکاتیب لکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے باریابی کی اجازت چاہی۔ آپ نے اپنے قریب بلایا اور دریافت فرمایا ” کہو کیسے آنا ہوا؟ “ نوجوان نے جواب دیا ” بندے کو جمال الدین حنین کہتے ہیں والد بزرگوار کا نام خواجہ حامد الدین احمد ہے جن سے حضرت بخوبی واقف ہوں گے “

آپ نے فرمایا ” خوب اچھی طرح ۔ وہ تو خود بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہیں تمہیں ہمارے پاس کیوں بھیجا ہے؟ “

نوجوان نے جواب دیا ”والد بزرگوار نے فرمایا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے ذکر کی تعلیم سے سرفراز فرمائیں“

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا ”اچھا تو یہ بات ہے“ اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور خدا دیر بعد نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا ”نوجوان! کیا بات ہے؟ ہم نے آنکھیں بند کر کے چشم مکاشفہ سے تمہارا دل ملاحظہ کیا۔ وہاں ہم نے ایک عورت کی محبت کا نقش اس طرح جما ہوا دیکھا جس طرح پتھر مٹی میں پیوست ہو جاتا ہے یہیں سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ عورت اور خدا کے نقوش ایک ہی دل میں ایک ہی جگہ موجود رہیں جب تک عورت کی محبت کا نقش دل میں رہے گا خدا کی محبت سے محروم رہو گے“

اب نوجوان کے لئے دل کی بات پھیلنا بہت مشکل تھا اس نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ”حضرت! میں اپنی پھوپھی کی ایک کینز پر فریفتہ ہوں، لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی محبت دل سے نکال دوں لیکن ناکام ہو جاتا ہوں کچھ آپ ہی مدد فرمائیں“

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک نظر نوجوان کے سینے پر ڈالی اور پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور نظریں ہٹالیں۔ نوجوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل سے کوئی کانٹا کھینچ لیا گیا ہو اس کے بعد اس کے دل میں کبھی کینز کا خیال تک نہ آیا۔

اس دوران آپ اجمیر تشریف لے گئے وہاں جن مسجد میں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے اس کی خوبی دیوار بہت کمزور تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب گری اور جب گری۔ آپ کے مُرد ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے اور بار بار درخواست کرتے رہتے تھے کہ ”آپ اس دیوار سے دور رہیں آپ نے ہنس کر فرمایا ”تم لوگ کیوں ڈرتے ہو، جب تک ہم اور ہمارے فقرا یہاں موجود ہیں۔ یہ دیوار نہیں گرے گی“

اور واقعی آپ جیسے ہی وہاں سے واپسی کی نیت سے ہٹے دیوار گر گئی۔

اسی دوران ایک صوفی خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے سوالیہ انداز میں صوفی کو دیکھا۔ صوفی نے جواب دیا ”حضور والا! میں حج کرنے جا رہا ہوں، اجازت طلب کرنے آیا ہوں امید ہے سفر حج کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی“

آپ نے آہستہ سے کہا ”اچھا“ اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کھول دیں اور فرمایا ”میں تمہیں حج کے میدان میں تماشہ کش کرتا رہا لیکن تم مجھے وہاں نہیں

بھی نظر نہ آئے ۛ

صوفی اداس ہو گیا۔ وہ حج پر جانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن وہ ہر سال جانے کا ارادہ کرتا اور یہ ارادہ کسی نہ کسی طرح ٹوٹ جاتا اسی طرح تیس سال گزر گئے اور وہ زندگی کی آخری سالوں تک حج نہ کر سکا۔



طاعون کی وبا پھیلی۔ یہ تہجد کا چودھواں سال تھا۔ اس وبا میں آپ کے تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی نے دارِ مفارقت دیا۔ یہ ایسی مصیبت تھی کہ آدمی اندر سے منتشر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن آپ نے صبر و استقلال سے کام لیا۔ اس سانحے کے دو سال بعد آپ نے اپنے ایک مُرید خاص شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو اپنی خلافت سے نوازا اور حکم دیا کہ ”اکبر آباد جاؤ اور شاہی لشکر میں تبلیغ و تلقین کا شروع کرو“ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہاں تمہیں بڑی عزت حاصل ہوگی اور لوگ تمہیں بے حد پسند کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ اگر وہاں تمہیں کسی وجہ سے تکلیف پہنچے تو اس کی پروا نہ کرنا، مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہنا ہماری اجازت کے بغیر وہاں سے حرکت بھی نہ کرنا۔

شیخ بدیع الدین نے پوچھا ”حضرت! اگر کسی وجہ سے میرے پائے ثبات میں لغزش آجائے تو کیا ہوگا؟“

آپ نے ناگواری سے جواب دیا ”اگر تم مستقل مزاج نہ رہو گے تو اس سے خود تمہیں بھی تکلیف اٹھانی پڑے گی اور یہیں بھی تکلیف پہنچے گی“

شیخ بدیع الدین اکبر آباد چلے گئے اور وہاں اپنا کام نہایت ہی تن دہی اور انتہاک سے انجام دینے لگے اکبر آباد میں انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہزاروں لشکر کی آپ کے مُرید ہو گئے اور ہر روز آتنا ہجوم ہٹنے لگا کہ بڑے بڑے امرا کو شیخ کی زیارت سے محروم رہنا پڑتا۔

سرہند میں حضرت شیخ سرہندی خوش تھے کہ اکابر صاحبِ دل خواہ انجام پادیا تھا اور دین کی تجدید ہو رہی تھی لیکن ایک دن آپ نے مراقبہ سے سر اٹھا کر اپنے ارادت مندوں سے فرمایا ”لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی تک کس تربیت سے محروم ہوں؟“

کس نے سوال کیا: ”حضرت! آپ کس تربیت کا ذکر فرماتے ہیں وہ کون سی تربیت ہے جس سے آپ جلیسی ہستی محروم رہ سکتی ہے۔“

آپ نے جواب دیا: ”تم نہیں جانتے، ابھی تک میں تربیت جمالی سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہو لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میری تربیت جلالی کا بھی انتظام کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کا فیصلہ ہے جس کے سامنے میں اپنا سر جھکاتا ہوں۔“

لوگ سناتے ہیں آگئے کہ معلوم نہیں ان ارشادات کا اصل مفہوم کیا ہے؟

آپ نے کسی کے سوال کا انتظار کئے بغیر وضاحت فرمائی: ”لوگو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھ پر ایک مصیبت نازل ہونے والی ہے اور یہ مصیبت میرے حق میں مدراج قرب کی ترقیات کا سبب بنے گی۔“

اس وضاحت کے باوجود لوگ آپ کا اصل مفہوم نہ پا سکے۔

دوسری طرف اگر تبادیل نور جہاں کا بھائی اور سلطنت مغلیہ معزز اور بادشاہ امیر آصف

اور اس جیسے دوسرے امرا بادشاہ کو درغلا رہے تھے وہ کہتے ہیں تھے ”جہاں پناہ“ سرہند کے ایک مشائخ زادے نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے یہ شخص علوم عربیہ کا ماہر ہے اس نے اپنے صدر باخلفا مختلف دور دراز ملکوں میں بھیج دیے ہیں اور لاکھوں آدمی اس کے اور اس کے خلفاء کے مرید ہو چکے ہیں بعض غیر ممالک کے فرماں روا بھی ان کے مرید ہو چکے ہیں جس سے مغلیہ سلطنت کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔“

جہانگیر کو تشویش پیدا ہو گئی۔ امرانے اس کے چہرے سے سمجھ لیا کہ بات کارگر ہو چکی ہے گرم لوہے پر مزید چوٹ لگائی اور زیادہ خوف زدہ کرنے کے لئے سلسلہ شکایات جاری رکھا ”ہمارے لشکر میں بھی اس کا ایک خلیفہ موجود ہے اور اکثر امرائے سلطانی بھی اس کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں۔“

جہانگیر نے سوال کیا: ”مثلاً کون کون؟“

چغل خور امرا میں ایک نے جواب دیا: ”مثلاً خان خانان، سید صدر جہاں

خان جہاں، خان اعظم، مہابت خان، سکندر خان، دریا خان، مرتضیٰ خان۔“

جہانگیر نے گھبرا کر مزید نام لینے سے روک دیا ”بس بس۔“

امیر نے کہا: ”حضور والا! یہ نام ایسے نہیں کہ تساہل سے کام لیا جائے،

اگر مزید غفلت اختیار کی گئی تو معلوم نہیں کیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو ۛ

اس کے بعد انہوں نے حضرت شیخ سرہندی کے بعض مکاتیب کے وہ حصے پڑھ کر سنائے جن سے قابل اعتراض عقائد مترشح ہوتے تھے ۔

جہانگیر پر ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے فوراً ہی خان خاناں کو دکن خاں جہاں لودھی کو مالوہ ، خان اعظم کو گجرات اور مہابت خان کو کابل کی صوبے داری پر متعین کر دیا ۔ اس طرح بادشاہ ان امر کے اتحاد اور یک جہتی کو ختم کرنا چاہتا تھا ۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک حکم جاری کیا اور فوجیوں پر پابندی عاید کر دی کہ وہ شیخ بدیع الدین سے نہیں ملیں گے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ شیخ صاحب جادو گر ہیں اور اپنے سمحر کے زور سے لوگوں کو گمراہ اور متاثر کر رہے ہیں اس غلط فہمی نے کچھ لوگوں کو شیخ صاحب سے برگشتہ کر دیا لیکن زیادہ لوگ برابر اُتے جاتے رہے ۔ بادشاہ نے ان آنے جانے والوں کے لئے جاسوس مقرر کر دیے چنانچہ جس کی بابت بھی اسے یہ معلوم ہوا کہ اس نے شیخ صاحب سے ملاقات کی ہے اس پر شاہی عتاب نازل ہوتا ۔ شیخ بدیع الدین بھی زلزلے کی بدلی ہوئی ہوا صاف محسوس کر رہے تھے انہوں نے جب یہ یقین کر لیا کہ ان کی خدمت میں حاضری دینے والے مورد عتاب آجاتے ہیں تو خود ہی ملاقات اور بابائی سے منع کرنے لگے ۔ ان حالات کی اطلاع انہوں نے شیخ سرہندی کو بالتفصیل دی حضرت شیخ سرہندی نے جواب میں انہیں تسلی دی اور حکم دیا کہ وہ اپنے کام میں لگے رہیں اور ذرا بھی نہ گھبرائیں ۔

اس دوران اکبر آباد میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ حضرت شیخ سرہندی کو عقیقہ تہ دربار میں ہلاک کر دیا جائے گا افواہوں کے جھگڑاتے زور شور سے چلے کہ شیخ بدیع الدین گھبر گئے اور اکبر آباد سے سہارنپور چلے گئے کچھ دن سہارنپور میں رہے پھر سرہند میں شیخ سرہندی کی خدمت میں حاضری دی ، شیخ سرہندی ان پر بہت ناراض ہوئے اور ڈانٹ کر کہا ” جب ہم نے تمہیں منع کیا تھا کہ وہاں سے ہماری اجازت کے بغیر حرکت بھی نہ کرنا پھر تم کیوں چلے آئے ، تم اس لائق نہیں تھے کہ خلیفہ بنا کے شاہی لشکر میں بھیجے جاتے اب تم اکبر آباد ہرگز نہ جانا ۛ

شیخ بدیع الدین کانپ گئے اور چپ چاپ دوبارہ اکبر آباد روانہ ہو گئے ان کا

اکبر آباد میں دوبارہ داخلہ بٹانگ لایا، انواہ طرازیوں نے بادشاہ کو یہ باور کرا دیا کہ شیخ بدیع الدین شیخ سرہندی سے مشورہ کر کے کوئی خطرناک منصوبہ لے کر واپس آئے ہیں اور فوج میں بغاوت اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بادشاہ مہابت خان اور خان خاناں وغیرہ کے بائے میں یہ جانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں پہنچ کر اپنے عہدے سنبھال لے ہوئے ہیں یا بغاوت پر آمادہ ہیں چنانچہ بادشاہ کو جیسے ہی ادھر سے اطمینان ہوا اس نے شیخ احمد سرہندی کے نام فرمان جاری کر دیا کہ وہ اپنے صاحبزادگان اور مریدوں کے ساتھ بادشاہ کے دربار حاضر ہوں، کیونکہ بادشاہ ان سے ملنے کا متمنی اور خواہش مند ہے۔

اس کے ساتھ ہی حاکم سرہند کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو کے شیخ سرہندی کو اکبر آباد روانہ کر دیا جائے۔ اسی حکم سے آپ کے متعلقین اور مرید گھبر گئے آپ نے انہیں سمجھایا کہ اس میں گھبر لانے کی کیا بات ہے۔

لوگوں نے تشویش ظاہر کی کہ دربار میں بادشاہ ان سب کے ساتھ معلوم نہیں کیا سلوک کرے۔

آپ نے اپنے صاحبزادگان خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو کسی پہاڑی مقام پر بھیج دیا اور اعزاز سے فرمایا ”گھبراؤ مت، بادشاہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا یہ تکلیف ایک سال کی ہے اس کے بعد آرام ہی آرام ہے۔“

آپ نے پانچ مریدوں کو ساتھ لیا اور اکبر آباد روانہ ہو گئے ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ اس عہد کے مشہور عالم علامہ افضل خان اور خواجہ عبدالرحمن مفتی فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کی غزت سے پزیرائی کی اور پوچھا ”وہ آپ حضرات نے کیوں رحمت فرمائی؟“

خواجہ عبدالرحمن مفتی نے جواب دیا ”منا ہے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں؟“

آپ نے دریافت کیا ”اگر ایسا ہے تو آپ صاحبان اس معاملے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

مفتی نے جواب دیا ”ہمیں شہزادے خرم (شاہجہاں) نے آپ کی خدمت

میں بھیجا ہے شہزادے کو آپ سے جتنی عقیدت اور محبت ہے کسی سے چھپی نہیں ہے
 شہزادے کا خیال ہے کہ دربار میں جو چیز آپ کے حق میں سب سے زیادہ خطرناک اور
 نقصان دہ ثابت ہوگی وہ سجدہ تعظیمی ہے بادشاہ آپ سے اس رسم کی ادائیگی کا
 خواہش مند ہوگا اور آپ انکار کریں گے اور اس اختلاف کا جو نتیجہ بھی نکلے گا اس کے
 تصور ہی سے شہزادہ پریشان ہے۔“

آپ نے سوال کیا ”شہزادے کے خیال میں ہیں کیا کرنا چاہیئے؟“
 مفتی نے جواب دیا ”ہم فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے
 ہیں، شہزادے کا مشورہ ہے کہ آپ زندگی کے تحفظ کا خاطر سجدہ تعظیمی ادا کریں
 اس کے بعد شہزادہ آپ کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے۔“
 آپ نے نفرت کا اظہار کیا، بولے ”یہ کس طرح ممکن ہے؟“

مفتی نے کہا ”فقہ بھی ایسے سجدے کو جائز قرار دیتی ہے جو زندگی کو بچانے
 کے لئے جابر سلطان کو کیا گیا ہو، ان حالات میں تعظیمی سجدہ حرام نہیں رہتا۔“
 آپ نے جواب دیا ”یہ حکم بطور رخصت (مصلحت) ہے جان بچانے کیلئے لیکن
 بطور عزیمت یہ حکم ہے بغیر حق کو ہرگز سجدہ نہ کیا جائے۔“

مفتی اور علامہ کی ہر ممکنہ کوششوں کے باوجود آپ سجدہ تحیتِ سلاطین پر
 آمادہ نہ ہوئے۔

آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر امرا کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور آپ کا
 خیمہ اپنے محل کے قریب نصب کر لیا۔ اس کے بعد آپ ملاقات کے لئے دربار میں طلب
 کیے گئے آپ دربار میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آداب شاہی کا کوئی خیال نہ رکھا
 بادشاہ اس دلیر شخص کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ امرا کا خیال تھا کہ بادشاہ کا عتاب نازل
 ہونے ہی والا ہے لیکن جب بادشاہ نے حیرت اور سکوت کی روش اختیار کی تو ایک امیر
 نے بادشاہ سے کہا ”حضور! یہی وہ شخص ہے جو خود کو تمام انبیاء سے افضل بتاتا
 ہے اور اس کا وہ خط بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں یہ خود کو حضرت ابوبکر
 صدیقؓ سے بلند تر کہتا ہے۔“

اس کے بعد وہ خط بادشاہ کے رو پر پیش کر دیا گیا۔ آپ نے یہ خط اپنے

پیر مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کو تحریر فرمایا تھا اور اس میں آپ کے روحانی سیر عروج کا ذکر کیا گیا تھا اس میں اپنی اس عجیب و غریب روحانی کیفیت اور سیر کا حال بیان کیا گیا تھا جس میں آپ حضرت عثمان کے مقام سے گزر کر حضرت فاروق کے مقام پر پہنچے تھے اور پھر یہاں سے اور بلندی پر اُٹھ گئے اور حضرت صدیق کے مقام پر پہنچ گئے پھر یہاں سے حضرت محمد رسول اللہ کے مقام پر پہنچے، یہ ایک روحانی کیفیت کا اظہار تھا خط کی آخری سطریں آپ نے لکھا تھا ”اس کے بعد اسی کیفیت میں اپنے آپ کو لطیف پایا اور ہوا یا بادل کے ٹکڑے کی طرح اطراف میں پھیل گیا“

بادشاہ نے برہمی سے پوچھا ”کیا یہ درست ہے کہ تم خود کو حضرت صدیق اکبر سے بلند مرتبہ سمجھتے ہو؟“

آپ نے جواب دیا ”ہرگز نہیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس گستاخی کا متروک ٹھہروں“

بادشاہ نے کہا ”پھر آپ کی اس تحریر کا مطلب کیا ہے؟“
 آپ نے جواب دیا ”اس میں میں نے سیر عروج کا حال لکھا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس سے اکثر صوفیا کو گزرنا پڑتا ہے اور انہیں پھر اپنے مرتبے اور حال میں واپس آنا پڑتا ہے“ پھر آپ نے اس کی ایک شاندار مثال دی، آپ نے دس ہزاری، پنج ہزاری امرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”اب اگر ان معزز امرا کی موجودگی میں بادشاہ ان سے کم مرتبہ شخص کو اپنے قریب بلائے اور اس سے کچھ راز کی باتیں کہہ کر واپس کر دے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو سکتا ہے کہ ان امرا کا مرتبہ گھٹ گیا ہے اور اس کم مرتبہ شخص کا مرتبہ بڑھ گیا؟“
 بادشاہ اس دلیل سے بہت خوش ہوا اور اس کا وہ جذبہ سرد پڑ گیا جو آپ کے خلاف کچھ دیر پہلے موجزن تھا لیکن اسی وقت ایک امیر نے بادشاہ سے عرض کیا ”حضور والا! اس شخص کے بکبر اور رعوت کو تو ملاحظہ فرمائیں۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں اور یہ خود بھی آپ کے اس مرتبے سے غیب واقف ہے لیکن حال یہ ہے کہ سجدہ تعظیمی تو بہت دور رہا، معمولی احترام تو واضح بھی نہیں بجالایا،“

بادشاہ نے آپ سے ناخوش گوار لہجے میں کہا ”یہ شیخ صاحب! آپ کو آداب شاہی کا تو خیال کرنا ہی پڑے گا، اور بہتری اسی میں ہے کہ اسی وقت تعظیمی سجدے میں جھک جائیں“

آپ نے سختی سے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں، ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا، غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔“

جہانگیر نے کہا۔ ”اچھا ہم آپ کو اتنی رعایت دینے کو تیار ہیں کہ آپ اپنا سر بس یوں ہی ذرا سا جھکا دیں، ہم اسے سجدہ عظیمی میں شمار کریں گے۔“

آپ نے اسی سختی سے جواب دیا۔ ”یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔“

جہانگیر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے بولوا۔ ”ہم آپ کو یوں شدید اس پر مجبور نہ کرتے لیکن اب ہماری زبان سے نکل چکا ہے ہم اس کی تعمیل چاہتے ہیں اسے پورا ہونا چاہیئے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تیرے حکم کی تعمیل سے زیادہ اللہ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے کیا تجھے یہ معمولی بات بھی نہیں معلوم کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔“ پھر آپ نے ذرا زیادہ پرجوش لہجے میں فرمایا۔ ”جہانگیر! یہ ایک ان ان کی کھل ہوئی حماقت نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے ان کو سجدہ کرے۔“

جہانگیر پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا اس نے چند قوی سپہ سالاروں کو حکم دیا۔ ”ان کا سر بھر مارے سناٹے جھکا دیا جائے۔ اس کے بعد انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا جائے۔“

چند میل تن امرا آگے بڑھے اور آپ کے سر اور گدی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پوری قوت سے خود کو اکڑا لیا اور گردن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ سرکشوں نے پوری قوت سے سر جھکا دینے کی کوشش کی لیکن ذرا بھی نہ جھکا سکے۔ اس دن لوگوں نے یہ عجیب و غریب معرکہ برپا دیکھا کہ ایک طرف بادشاہ تھا، اس کا جاہ و جلال تھا، امرا تھے دیباہی و دبہ تھا و وسیع اختیارات تھے اور اقتدار کُل تھا اور دوسری طرف ایک تنہا شخص تھا جو غوری، خود شناسی اور حق آگاہی کی قوت اور ہمتیاد سے وقت کی سب سے بڑی طاقتور طاقت سے برابر آ رہا تھا امرا بزدل و وحشت شیعہ سر ہندی کی گردن جھکا دینے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ اس کشمکش میں حضرت شیخ سر ہندی کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔

بادشاہ کو کچھ رحم آیا لیکن راج ہٹ کا جذبہ اب بھی سر نہ ہوا تھا حکم دیا۔ ”انہیں اس چھوٹے سے دروازے سے گزارا جائے تاکہ یہ جب اس میں سے جھک

کر سامنے آئیں تو اسی کو سجدہ تعلیمی تصور کر لیا جائے۔

اس نئے حکم کی تعمیل میں آپ کو اُمراء دوسری طرف لے گئے اور اس پھوٹے سے دروازے سے گزر کر بادشاہ کے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے اس دروازے میں پہلے تو ایک پیر داخل کیا اس کے بعد سر کو پیچھے پشت پر جھکا کر دروازے سے نکل گئے۔

اس سخت رویے کو دیکھ کر امراء نے بادشاہ سے کہا: ”حضور والا! اس شخص کا تہمید ملاحظہ فرمایا۔ اس بکج اور سرکش سے کیا بعید ہے کہ دربار سے نکلتے ہی شورش نہ برپا کر دے اس بیٹے بہتری اسی میں ہے اس شخص کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائے اسی وقت اٹھایا جائے ورنہ بعد میں پتھنا پڑے گا۔“

بادشاہ نے انہیں کو ایلا کے قلعے میں قید کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ آپ اسی وقت گوالیار روانہ کر دیے گئے۔

اگر بات قید و بند ہی تک رہتی تو اتنی بڑی بات نہ ہوتی لیکن شاہی فرمان کے ماتحت حضرت شیخ سرہندی کا سارا سامان اور جائیداد کی ضبطی کا کارنامہ بھی انجام پایا آپ کے ساتھ ہی پانچوں مرید بھی قید کر دیے گئے حاکم قلعہ غیر معمولی سختی سے پیش آیا۔ آپ کے ایک مرید سے ضبط نہ ہو سکا اور غصے میں حاکم قلعہ سے کہا دو او ظالم! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ نے ہمیں یہاں قید کر رکھا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے یا درکھ ہم یہاں حکم الہی سے آئے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہیں اور توہین کسی طرح بھی نہیں روک سکتا۔“

اس نے یہ کہا اور اچھل کر قلعے کی بلند و بالا دیوار پر جا بیٹھا۔ حاکم قلعہ اور پاسبان حیران اور پریشان اسے دیکھنے لگے حضرت شیخ سرہندی نے مرید کو بھرپور دیا۔ فرمایا: ”کیا مجھ میں اظہار کرامت کی قدرت نہیں ہے جو تم دکھاتے ہو۔ مشیتِ الہی یہ ہے کہ ہم زمانے کے جو روح جفا برداشت کریں۔“

پاسبان اور حاکم قلعہ بے حد شرمندہ ہوئے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ آپ نے قلعے میں مجبوس قیدیوں میں تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ ہزار ہا ہندو مسلمان ہو گئے اور سینکڑوں مسلمانوں نے مریدی اختیار کی۔

آپ کی گرفتاری اور قید سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ خان خاناں

خان اعظم، خان جہاں لودھی اور دوسرے نامی گرامی امرا نے مہابت خان کو اپنا سردار مان لیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف فوجی کاروائی کرے۔ مہابت خان کا بل سے فوج لے کر چل پڑا، اس نے خطبے اور سکتے سے بادشاہ کا نام نکال دیا، مہابت خان کے ارادے کی خبر حضرت شیخ سرہندی کو بھی ہو گئی انہوں نے مہابت خان کو منع کر دیا کہ وہ ان کا رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائے مہابت خان کی فوجی تیاریوں اور اراکوں کی خبر پا کر بادشاہ مقابلے پر چل پڑا۔ دریلے جہلم پر دونوں کا آمناسنا ہوا اور مہابت خان نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ دوسری طرف گویا ریشمیں یہ کوشش کی گئی کہ حضرت شیخ سرہندی ہندوستان کی حکومت سنبھال لیں لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مہابت خان کو سختی سے ہدایت کی کہ فتنہ و فساد ختم کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔“

مہابت خان نے بادشاہ کو رہا کر دیا اور اس گستاخی کی معافی مانگی۔ جہانگیر نے اسے معاف کر دیا۔ مہابت خان نے کہا: ”لیکن حضور حضرت شیخ سرہندی کو رہا فرمائیں، میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔“

جہانگیر نے وعدہ کر لیا۔ اسی دوران وہ بہت سخت بیمار ہو گیا اور ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحب فرما رہے ہیں: ”جہانگیر! تو نے شیخ سرہندی پر بڑا ظلم کیا وہ امام وقت اور مجدد اسلام ہیں اور تیری بیماری کا اصل سبب ہی وہ ہیں انہیں رہا کر کے شفا حاصل کر۔“

جہانگیر نے فوراً رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور حضرت شیخ سرہندی سے درخواست کی کہ رہائی کے بعد بادشاہ سے ملاقات ضرور کریں۔

آپ نہایت عزت و احترام سے رہا کر دیے گئے سرہند پہنچے اور تین دن قیام فرما کر آباد چلے گئے وہاں شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ شاہی محل میں قیام کا انتظام کیگیا۔ بادشاہ نے آپ کی مندرجہ ذیل شرائط پوری کر دیں۔

- ۱۔ سجدہ تعظیمی یک قلم موقوف ہوا۔
- ۲۔ گاؤ کشی کا فرمان جاری ہو گیا۔

بازاروں میں کھلے عام گائے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ ۳۔ بادشاہ اور کارکنان مملکت نے اپنے اپنے ہاتھ سے گائے ذبح کی اور کباب تیار کر کے کھائے

۴۔ ملک کے جس جس حصے میں مسجدیں شہید کی گئی تھیں انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر ہوا۔ ۵۔ دربار عام کے قریب مسجد تعمیر کرائی گئی۔ ۶۔ مذہبی تعلیم پھر سے عام کا گئی۔ ۷۔ شہروں میں مفتیوں اور قاضیوں کی تقرری عام ہوئی۔ ۸۔ خلاف شرع قوانین منسوخ اور شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔

کہتے ہیں جہانگیر اپنی گذشتہ گستاخیوں پر ہمیشہ شرمندہ رہا۔ اس کی افسردگی اور مذلت کے پیش نظر ایک دن حضرت شیخ سرہندی نے جہانگیر سے فرمایا: ”تم خاطر جمع رکھو میں اس وقت تک بہشت میں نہیں داخل ہوں گا جب تک تمہیں بھی اپنے ساتھ نہ لے لوں۔“ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ سرہندی کے اس قول کے پیش نظر بادشاہ اپنی آخری عمر میں کہا کرتا تھا۔ ”چشم کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نجات اور بخشش کی امید کی جاسکے ہاں شیخ سرہندی کا یہ قول ایک ایسی دتا ویز ہے جسے میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے نجات کا طالب ہوں گا۔“



شہزادے خرم کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر اس کی جگہ نور جہاں کے داماد شہریار کی ولی عہدی کا اعلان کرنے والا ہے تو وہ بدرجہ مجبوری باپ کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا۔ شہزادے خرم کی فوجی قوت غیر معمولی تھی اس پرستم یہ ہوا کہ عین جنگ کے دوران چند فوجی دستے شاہی فوج سے نکل کر شہزادے خرم سے جا ملے۔ جہانگیر پریشان ہو گیا اس نے شیخ سرہندی سے دعا کی درخواست کی آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ”تم مطمئن رہو تم کامیاب رہو گے۔“

ابھی بادشاہ کو یہ نوید سنائی ہی تھی کہ شہر کے کمال بزرگوں نے حضرت شیخ سرہندی کو غصیہ پیغام بھیجا: ”حضرت ہم پر کشف ہوا ہے کہ اس معرکے میں شہزادہ غالب آئے گا اور باپ مغلوب، آپ کیا فرماتے ہیں؟“ آپ نے جواب دیا: ”ہم پر کچھ اور ہی کشف ہوا ہے، شہزادے کو شکست ہوگی لیکن بالآخر شہزادہ کامیاب ہوگا۔“

یہ عجیب غریب پیش گوئی تھی۔ جنگ ہوئی، بادشاہ فاتح ہوا اور بیٹا مفتوح۔ آپ تنہا بیٹھے تھے کہ شہزادہ خرم چھپتا چھپاتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

شکایت کیا کہ ”حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ یہ ناچیز ہمیشہ آپ کے حق میں لڑتا جھگڑتا رہا اور آپ نے میرے حق میں تو دُعا فرمائی نہیں بادشاہ کے حق میں دُعا گوہو گئے۔“ آپ نے جواب دیا ”مت گھبراشہزادے، مجھے حق تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ تو عنقریب تخت پر بیٹھے گا اور تیرا لقب شاہجہاں ہوگا“

شہزادہ بہت خوش ہوا اور اس نے تبرک کے طور پر آپ کی دستار لے لی جو بعد میں عرصے تک شاہانِ مغلیہ کے خزانے میں محفوظ رہی۔

آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے وہ کام لیا جو آج اس ترقی یافتہ دور میں بمفلٹ اور ارداں لٹریچر شائع کر کے لیا جا رہا ہے آپ اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ تحریر کا اثر دیر پا ہوتا ہے آپ نے اپنے ایک مکتوب میں بادشاہ کی حیثیت کے بارے میں تحریر فرمایا۔

”دنیا کے ساتھ بادشاہ کا تعلق ایسا ہے جیسا دل کو جسم سے اگر دل اچھا ہے تو بدن بھی اچھا ہے گا اور اگر دل بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جائے گا بالکل اسی طرح دنیا کی بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے اگر بادشاہ بگڑ جائے تو جہاں کا بگڑ جانا لازم ہے“

ہر دے رام نامی ایک ہندو نے رام اور رحمان کو ایک ہی قرار دیا تو آپ نے اسے تحریر فرمایا۔

”وہ ہندو جن رام اور کرشن کی پرستش کرتے ہیں وہ تو ماں باپ پیدا ہوئے تھے رام و سرتھ کا بیٹا تھا، لچمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا رام جب اپنی سیتا کو نہ بچا سکا تو دوسروں کی کیا مدد کرے گا پس یہ کہنا کہ رام اور رحمان ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ جب تک یہ رام اور کرشن پیدا نہ ہوئے تھے خدا کو رام اور کرشن نہیں کہا جاسکتا تھا ان کی پرورش کے بعد لوگوں نے ذاتِ احدیث پر رام اور کرشن کا اطلاق کیا۔“

آپ بہت زیادہ کام انجام دے چکے تھے۔ عمر کے تریسٹھویں سال میں داخل ہوئے تو انہیں اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا۔ سردیوں کے دن تھے۔

آپ کا دُشیکھے سے ٹیک لگا لگے ٹٹھے تھے آپ نے حاضرین سے فرمایا : ”اُمّہ جاڑوں میں ہم یہاں نہیں ہوں گے“

لوگوں نے پوچھا : ”پھر کہاں؟ حضرت کہیں اور قیام فرما ہوں گے؟“

آپ جواب دیا : ”نہیں، اب ابھی نہیں ہوگا؟“

لوگ مختلف مکانوں کے نام لیتے گئے اور آپ نفی میں سر ہلاتے رہے آخر لوگوں

نے پوچھا : ”حضرت آپ بتائیوں نہیں کہ کہاں رونق افروز ہوں گے؟“

آپ جواب دیا : ”ان مکانوں میں سے کسی میں بھی نہیں! انتظار کرو کیا ظاہر ہوتا ہے۔“ پھر

فرمایا کہ ”لوگو! اب میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ میری اور تمہاری ملاقات قیامت کے دن ہوگی وہاں

رسول مقبول دریافت فرمائیں گے کہ شیخ احمد اتونے کیا خدمت انجام دیں؟ اس وقت تمہیں یہ

شہادت دینی ہوگی کہ میں نے رسول مقبول کی اُمت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔“

لوگوں نے بیک آواز کہا : ”ہم قیامت میں گواہی دیں گے کہ آپ نے اپنے فرائض پوری دیانت

داری اور محنت سے انجام دیے۔“ — آپ نے سکون کی سانس لی اور آب دیدہ ہو گئے۔

آپ کو سب سے پہلے جس ذات نے محمد و الف ثانی کا لقب دیا۔ اس کا نام ملا عبد المجیم سا کوئی

ہے ملا عبد المجیم نے انہی استاد سے تعلیم حاصل کی تھی جن سے حضرت شیخ سرسندی نے درس لیا تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں صدقات و خیرات میں زیادتی ہو گئی تھی کسی شخص نے دے لے لفظوں

میں سوال کیا : ”حضور والا! میرا محسوس کر رہا ہے کہ اب اس عالم معاشی اور دنیائے کشف میں

حضرت کا قیام زیادہ دن تک نہیں رہے گا پھر بخیرات اور صدقات میں زیادتی کا سبب؟“

آپ جواب دیا : ”آج بلاوا کنت سوں سکی سب جگ ویوں دار۔“

آج دوست مٹنے کا دن ہے اس لئے میرے دوست ابیں اس کی خوشی میں تمام دنیا کو قربان کرنا ہوں۔“

اور آخر تریب ٹھہ سال کی عمر میں منگل کے دن ۲۸ صفر ۱۳۳۲ھ (۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

کو بوقت اشراق آپ نے وصال فرمایا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت اور کلام کی اہمیت بڑھتی چلی گئی اور آج

حضرت شیخ احمد سرسندی کو دنیا امام ربانی، محبوب بھائی اور مجدد الف ثانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

❖

حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ

میلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر دوبار حملہ کیا اور ناکام واپس گیا۔ پرتھوی راج چوہان دونوں مرتبہ حاوی رہا۔ غوری حیران تھا کہ وہ ناکام کیوں ہو رہا ہے کسی نے مشورہ دیا: ”خضرو والا غزنی کے میر بک الدین صاحب کشف اور مستجاب الدعوات ہیں کیوں نہ ان سے روحانی اعانت حاصل کی جائے“

بات غوری کی سمجھ میں بھی آگئی اسے خوب معلوم تھا کہ میر بک الدین عرف بنگی میاں کے والد بہاء الدین ذکر یا ملانی اقبالیم گیر شہرت کے مالک ہیں بیٹا بھی روحانی علم ضرور رکھتا ہوگا غوری ہاتھ باندھ کر ان کی خدمت میں کھڑا ہو گیا دل کی رقت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا دست بستہ عرض کیا بد حضرت! اسلام کا حق اس ناچیز پر یہی نہیں، آپ پر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں نے پرتھوی راج پر دوبارہ حملہ کیا لیکن ناکام رہا۔ کیا آپ کے ہوتے ہوئے آپ کا یہ ناچیز اس طرح شکست و ندامت اٹھاتا ہے گا؟

بد الدین نے بے باکی سے جواب دیا بد شہاب الدین تیری فوج میں بایں کے سوتے کھلے ہوئے ہیں انہیں بند کر، اس کے بعد فلاح کی اُس لگا۔

غوری نے عاجزانہ دریافت کیا بد خادم حضرت کا اشارہ نہیں سمجھا۔ آپ نے لا پرواہی اور حقارت سے جواب دیا: ”اس میں اشائے کی کوئی بات ہے تیرے لشکر میں ظلم ہی ظلم ہے عدل نام کو بھی نہیں جہاں عدل نہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ جو زمین شوروں زدہ ہو اس پر فصل کس طرح تیار ہوگی؟“

غوری آپ کے قدموں میں جھک گیا دامن ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور انگوٹوں سے لگا کر ہونٹوں پر رکھ کر بوسہ دیا۔ بولا: ”حضرت بس اتنی سی بات! اچھا آج سے آپ میری فوج میں منصب قضا پر فائز کئے جاتے ہیں“

میر بد الدین نے پہلے تو منصب قضا قبول کرنے میں تامل سے کام لیا، لیکن انہیں بھی تنہائی سے آکاہٹ ہونے لگی تھی مجبوراً سہرہ قضا قبول کر لیا اور فوج میں ایسا

سخت انتظام کیا کہ کوئی شرع و آئین کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔
غوری نے ہندوستان پر تیسرے حملے کی تیاری کی اور فوج کے ساتھ حضرت شاہ
صاحب کو گھنگرہ وستان لیتا گیا اور جب پر تھوڑی راج سے مقابلہ ہوا تو چوہان کو شکست فاش
دیکھنی پڑی۔ دہلی، مسلمانوں کا دارالسلطنت قرار پایا، لیکن بدرالدین نے دہلی سکونت
ترک کی۔ عالم بالا سے انہیں حکم ملا کہ ہانسی جاؤ اور لوگوں کی گمراہی دور کرو۔

یہ حکم بتی ہانسی چلے گئے اور ان کی کئی پشتیں بندگانِ خدا کی خدمت میں مصروف رہیں
انہی کی نسل کے حضرت سید مشرف نے ہمایوں کا سپرد کیا۔ اس خاندان میں منصب قضا و مرثی
چلا آ رہا تھا لیکن سید مشرف نے منصب قبول نہیں کیا۔ رحم دل ہمایوں نے اس خاندان کی عظمت
کا خیال کرتے ہوئے جاگیر بخش دی۔ ہمایوں کے بعد کبیر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا تو اپنے مندرجہ
رجحان کی وجہ سے کئی صوفیوں کی خدمت میں حاضریاں دیں اور اسی سلسلے میں ہانسی بھی آگیا۔
سید مشرف کے گھر پہنچا لیکن یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

بادشاہ کی تشریف آوری کوئی معمولی بات نہ تھی، آبادی کے معزز حضرات ادب
تعظیم بجالائے لیکن سید مشرف کے خاندان کا ایک شخص بادشاہ سے شان بے نیازی
سے پیش آیا بادشاہ کو یہ بات شاید شاق نہ گزرتی۔ لیکن امرا اور مصاحبین خاص نے
اس بات کو ہوا دی۔ بادشاہ نے دریافت کیا: ”کیا یہ لوگ شاہی آداب و رسوم سے واقف نہیں ہیں؟“
کسی چالپوس نے جواب دیا: ”جہاں پناہ! میں کیوں نہیں، لیکن تصوف اور بزرگی
کا ایک خول انہوں نے اپنی شخصیت پر چڑھا رکھا ہے اور حضور کو خود سے برتر نہیں سمجھتے۔“
بادشاہ نے پوچھا: ”انہیں اس کی کیا سزا دی جائے؟“

اسی چالپوس نے مشورہ دیا: ”حضور والا! یہ سلطنت مغلیہ کے نمک خوار ہیں
(اور جنت مکانی) ہمایوں نے انہیں جاگیر بخشی تھی اس ناچیز کی رائے میں، اگر ان کی جاگیر اور
املاک ضبط کر لی جائے تو ان کے دماغ ٹھکانے آجائیں گے۔“

بادشاہ نے حکم دیا: ”اگر بے ہنچ کر یاد دلا دیا جائے۔“

اس بات حجت کا سید مشرف کو بھی علم ہو گیا فرمان ہمایوں نے لے کر بادشاہ کی خدمت
میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو دکھا کر فرمان ریزے ریزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ بادشاہ کے
چہرے کا رنگ فی ہمو گیا اس نے پوچھا: ”آپ نے یہ فرمان کیوں چاک کر دیا؟ کیا اتنی جاگیر آپ
کے خاندان کی کفالت کو ناکافی تھی اگر یہ بات تھی تو آپ کو اس کا ہم سے ذکر کرنا تھا کہ ہم اس میں

کچھ اور اضافہ کرتے ہیں

بادشاہ کا خیال تھا کہ سید مشرف کو اُس گفتگو کا علم نہیں ہے جو اس کے اور مصاحبین کے درمیان ہو چکی ہے۔

سید مشرف نے جواب دیا: بادشاہ کے والد کی عطا کردہ جاگیر ہمارے خاندان کی کفالت کو کافی تھی لیکن یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں کہ بادشاہ جب ہمارے غریب خانے میں تشریف لائیں تو اس کے معاف فیض میں ہم سے ادب و تعظیم کی خواہش کریں۔

بادشاہ بہت شرمندہ ہوا لیکن تیرکمان سے نکل چکا تھا بادشاہ نے بڑی خوشامد کی کہ جاگیر کا فرمان دوبارہ ملے لیا جائے، لیکن یہ تیار نہ ہوئے بادشاہ نادم اور شرمسار آگرے چلا گیا اور سید مشرف کے خاندان نے عسرت اور تنگ دستی کی زندگی اختیار کی اور کبھی شاہی مراعات اور نیازشات کی طرف آنکھ بھی اٹھائی۔ سید مشرف کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے سید عطاء اللہ نے ہانسی کی سکونت ترک کی اور نارنول چلے گئے وہاں حضرت نظام الدین نامی بزرگ بڑی شہرت رکھتے تھے عطاء اللہ ان کی صحبت میں حاضری دینے لگے دونوں حضرات ایک دوسرے کے مراتب سے آگاہ تھے لیکن نظام الدین نارنولوی عطاء اللہ سے کچھ زیادہ مرتبہ رکھتے تھے۔

یہیں نارنول میں سید عطاء اللہ کی ملاقات راجو خان نامی ترکمان سے ہو گئی یہ شخص موداء اللہ سے نیا نیا نارنول پہنچا تھا عطاء اللہ سے راجو خان کی اتنی دوستی ہوئی کہ ترکمان کی بیوی عطاء اللہ کو بھائی کہنے لگی اسی دوران عطاء اللہ کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں مٹھائی لے کر نظام الدین نارنول کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی۔

”حضرت! اس نومولود کے حق میں دُعائے خیر فرمائیں“

شاہ نظام الدین نے ذرا سی مٹھائی چٹکی سے اٹھا کر زبان پر رکھ لی اور فرمایا: عطاء اللہ میں شادی اور غمی کی چیزیں کبھی نہیں کھاتا، ہمیشہ پرہیز کرتا ہوں لیکن جس فرزند کی پیدائش تمہارے گھر میں ہوئی ہے یہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

اس کے بعد مٹھائی چلاتے ہوئے فرمایا۔ ”میں بھی دُعا کرتا ہوں، تم بھی دُعا کرو، لیکن جو مرتبہ اسے خدا کی طرف مل چکا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی“

عطاء اللہ نے بھی شاہ صاحب کی خواہش پر ذرا سی مٹھائی منہ میں رکھ لی۔

نظام الدین نے پوچھا: ”اس بچے کا نام کیا رکھو گے؟“

عطاء اللہ نے جواب دیا۔ ”حضرت خود ہی تجویز فرمادیں“

نظام الدین نے کہا : ” شاہ نعمت اللہ - یہ اللہ کی نعمت ہے جو تمہارے گھر میں
بشکل فرزند دار دہوئی ہے اس کا نام نعمت اللہ رکھو ۛ

چنانچہ اس بچے کا نام نعمت اللہ رکھ دیا گیا - یہ ابھی چند سال ہی کے تھے کہ ماں کا
انتقال ہو گیا - راجو خان ترکمان کی بیوی نے نعمت اللہ کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لیا
باسپنے قرآن کی تعلیم دینی شروع کر دی اور اس غیر معمولی بچے نے چار سال چار ماہ کی
عمر میں قرآن پاک پڑھ ڈالا - اس کے بعد گلستان کا درس شروع ہوا - یہ ابھی پڑھ ہی رہے
تھے کہ راجو خان ترکمان نارول سے جروج چلا گیا - چونکہ بچہ راجو خان کی بیوی کی سرپرستی میں
تھا اس لئے بچے کی خاطر عطا اللہ کو بھی جروج جانا پڑا -

جروج میں عطا اللہ ایسے پیا رہے کہ زندگی کی امید جاتی رہی - ایک دن جبکہ
راجو خان گھر پر موجود نہ تھا عطا اللہ کی حالت اتنی غیر ہوئی کہ گھڑی دو گھڑی زندہ رہنے کی
امید بھی جاتی رہی - انہوں نے حالت نزع میں راجو خان کی بیوی کو بلایا اور کمزور، تھوڑا
آواز میں پوچھا ” تم مجھے کیا کہتی تھیں ؟“

سوگوار خاتون نے افسردگی سے جواب دیا ” بھائی “

عطا اللہ نے نعمت اللہ کا ہاتھ اس سوگوار خاتون کے ہاتھ میں دے دیا کہا ” یہ نعمت
اللہ تمہارا بھتیجا ہے کیا میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر سفر آخرت اختیار کر سکتا ہوں ؟“

خاتون نے جواب دیا ” بھائی عطا اللہ ! جب میں نے آپ کو صدق دل سے بھائی کہہ
دیا تو آپ کچھ کہیں یا نہ کہیں نعمت اللہ کو میں اپنا بھتیجا ہی سمجھوں گی اور آپ کی موجودگی یا عدم موجودگی
میں پنی اولاد کی طرح رکھوں گی چاہے آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں ۛ
مرنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور کچھ دیر ساکت رہ کر پھر زبان کھولی -

” دو بہن ! ایک بات اور ۛ

منہ بولی بہن ان کی صورت تکنے لگی پوچھا ” وہ کیا ؟ فرمائیے ۛ عطا اللہ نے جواب
دیا : ” ایک وصیت ہے اس پر تمہیں پورا پورا عمل کرنا ہے اگر تم نے اس کے پورا کرنے میں کوتاہی
یا تاامل سے کام لیا تو میرے بھتیجے کی قیامت کے دن تمہارا گریبان پڑ لوگا ۛ

منہ بولی بہن نے گھر آکر پوچھا ” بھائی عطا اللہ ! آپ جو کچھ فرمائیں گے میں اس پر
بسر و چشم عمل کروں گی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟“

عطا اللہ نے کہا ” جب میں مر جاؤں تو تم میرا منہ سیاہ کر دینا - کیونکہ میں سیاہ کار

اس کا سختی ہوں، منہ سیاہ کر کے میرے پاؤں میں ایک رسی باندھ دینا اور اسی حالت میں چوراہے پر پھینکوا دیتا۔ کیونکہ مجھ جیسے برے انسان کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔
ابھی بہن نے جواب میں کچھ کہا بھی نہ تھا کہ عطا اللہ نے کلمہ شہادت پڑھا اور ملک عدم کی راہ لی۔

بہن سخت کش مکش میں پڑ گئی یہ عبرت ناک وصیت اور اس پر عمل درآمد کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی اور پھر ایک نرم دل خاتون، عورت تریوں ہی رحم دل ہوتی ہے جب راجو خان ترکمان آگیا تو بیوی نے اُسے پوری بات بتادی اور مشورہ دیا پوچھا وہ کچھ آپ ہی بتائیں کہ اس وصیت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟

شوہر نے بہت کچھ غور و فکر کے بعد جواب دیا ”میری سمجھ میں اس وصیت کو بس ایک ہی طرح پورا کیا جاسکتا ہے۔“

بیوی نے جلدی سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟ خدا کے لئے جلدی سے بتائیں۔ میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔“

راجو خان نے جواب دیا ”عطا اللہ کو غسل دے کہ چہرے پر سیاہ کپڑا لپیٹ دیا جائے اور پاؤں میں ایک چٹ باندھ کر گھر ہی میں تھوڑا کھینچا جائے اس کے بعد چوراہے پر دفن کر دیا جائے۔“

بیوی کا خوشی سے چہرہ کھل گیا۔ اسی وقت شوہر کی تجویز کے مطابق کاروائی شروع ہوئی۔ غسل کے بعد منہ پر سیاہ کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر پاؤں میں ایک مضبوط چٹ باندھ کر انہیں ذرا سا کھسکا یا گیا۔ اس عمل کے بعد انہیں کفن میں لپیٹ کر بیچ چوراہے پر دفن کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے جب راجو خان ان کے مزار پر چاروغ چلانے جاتا تھا تو قبر کی پائنتی رکھا ہوا چاروغ خود بخود روشن ہو جایا کرتا تھا۔ راجو خان نے اس راز کو جاننے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

منہ بولی بہن نے نعمت اللہ کو اپنے بچوں کے ساتھ نہایت پیار و محبت سے رکھا اور یہ راجو خان کے بچوں کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تیرہ برس کی عمر میں اس ترکمان نے انہیں فریہ گری میں طاق کر دیا۔ شمشیر بازی، تلوار زنی اور تیر اندازی میں نعمت اللہ کا جواب نہ تھا ایک دن نعمت اللہ ایک سرکاری عہدے دار دوست محمد خان کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک

زمیندار حاضر ہوا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ دوست محمد خان کے فٹے زمینداروں سے مال گزاری وصول کرنے کا کام تھا۔ دوست محمد خان نے زمیندار سے شکایت کی کہ تم مال گزاری نہیں داخل

کر ہے۔ حکومت تمہارے خلاف سخت کارروائی کرنے والی ہے۔

زمیندار نے عاجزی سے عرض کیا ”جناب! ہمارے ساتھ اپنا آدمی کر دیں۔ ہم مال گزاری کی رقم اس کے حوالے کر دیں گے۔“

دوست محمد خان نے اپنے عملے کے چند دلیر آدمیوں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں یہ حکم پایا جاتا تھا کہ اس زمیندار کے ساتھ جاؤ اور مال گزاری وصول کر لاؤ۔

لیکن اس کے عملے نے نظریں پھرائیں۔ کیونکہ یہ لوگ خوب اچھی طرح واقف تھے کہ زمیندار اپنے علاقے میں لوگوں کو لے جا کر کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے، مار پیٹ کر والیں کر دیتے ہیں۔ نعمت اللہ نے عملے کی بزدلی دیکھ کر عرض کیا ”جناب! میرا چاہتا ہے ذرا میں بھی سیر و تفریح کروں۔ اگر اجازت ہو تو اس زمیندار کے ساتھ میں پیدا جاؤں اور مال گزاری کی رقم لے کر واپس آ جاؤں۔“

دوست محمد خان اٹھ کر اندر چلا گیا اور وہاں نعمت اللہ شاہ کو طلب کیا۔ چپکے چپکے سمجھاتا ہوا بولا ”میاں صاحبزادے! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ زمیندار لوگ سرکاری آدمیوں کو اپنی زمین میں لے جا کر بہت زیادہ خوار اور ذلیل کرتے ہیں۔ تم ابھی نوعمر ہو معلوم نہیں یہ زمیندار تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر اس نے تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچا دیا تو آخر میں تمہیں کہاں سے لاؤں گا؟“

نعمت اللہ نے جواب دیا ”کیا آپ خدا کی طرف سے انسانی جانوں کے تحفظ کی خدمت لے کر آئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو میں کہیں بھی نہ جاؤں گا یہیں رہوں گا!“

دوست محمد خان نے جواب دیا ”صاحبزادے! تم ضرورت سے زیادہ منطقی ہو۔ بھلا ایک فانی انسان دوسرے فانی انسانوں کی جانوں کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہے؟ دو اگر یہ بات ہے تو مجھے اس شخص کے ساتھ جانے دیجئے جس نے ہمیں جان دی ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا!“

دوست محمد خان اس نوعمر بچے کی بات سے عاجز اور بے بس ہو گیا اور مجبوراً زمیندار کے ساتھ چلے جانے کی اجازت دے دی۔ زمیندار انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنی زمین پر چلا گیا اور اس نے نعمت اللہ کو چار پائی پر بٹھا کر لاندہ جاتے ہوئے کہا ”صاحبزادے! آپ ذرا دم لیں، میں پچے جمع کر کے ابھی حاضر کرتا ہوں!“

نعمت اللہ نے تیسکھ لہجے میں کہا ”جناب والا! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا سرکاری واجب الادا رقم وصول کرنے آیا ہوں، آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ ہماری رقم لے کر ہمارے پاس آجائیں“

زمیندار نے کہا ”ہم نے تمہاری دعوت کا انتظام کیا ہے پہلے کچھ کھائیو۔ اس کے بعد مال گزاری کی رقم بھی تمہارے حوالے کر دی جائے گی“

ابھی نعمت اللہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ زمیندار اپنی حویلی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کا طشت لے کر حاضر ہو گیا۔ نعمت اللہ نے پوچھا ”رقم لائے؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا ”کھانا حاضر ہے، پہلے اسے نوش فرمائیں!“

نعمت اللہ نے غصے میں زمیندار کی پشت پر کئی بیت رسید کر دیے۔ زمیندار تملکا گیا لیکن اپنی تکلیف کا احساس کئے بغیر اس نے نعمت اللہ سے کہا۔ ”بیٹے! تم ہمارے مہمان ہویم تمہاری ماری بھی برداشت کر لیں گے اور یہی کہے جائیں گے کہ پہلے کچھ نوش فرماؤ، اس کے بعد مال گزاری کی رقم دی جائے گی“

نعمت اللہ نے سوچا، عجیب خدشی سے واسطہ پڑ رہا ہے۔

بدبوجھ جو دی کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ زخمی زمیندار نے آگے بڑھ کر نعمت اللہ کے ہاتھ دھلائے اور جب یہ کھانا کھانے لگے تو خود سامنے بیٹھ کر کچھ اچھلنے لگا نعمت اللہ زمیندار کے اخلاق اور رویے سے بے حد متاثر ہوئے، لقمے مزہ میں جا رہے تھے دانت انہیں چابنے میں مصروف تھے لیکن نعمت اللہ کے دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے وہ سوچ رہے تھے ”نعمت اللہ! تو کیسا سرکش بندہ ہے کہ اس نرم دل اور خوش اخلاق زمیندار سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ ذرا سوچ تو کر اس کی پشت تیرے تازیانوں کی ضربات سے لہو لہان ہو چکی ہے لیکن یہ فرشتہ صفت انسان اس کی پرواہ کئے بغیر پوری رغبت اور پیار سے تجھے کھانا کھلانے میں مشغول ہے۔ کیا یہ دنیا چند روزہ نہیں ہے؟ کیا اس چند روزہ زندگی میں اپنے اس خالق سے بے نیاز اور غافل رہنا جائز ہے؟ جو اس زمیندار سے زیادہ عفو درگزر کرنے والا ہے“

کھانے کے بعد نعمت اللہ نے زمیندار سے مال گزاری کی رقم وصول کی اور خاموشی سے دوست محمد خان کے حوالے کر دی۔ دوست محمد خان چپ چپ کوچوان سے پوچھا۔

”نعمت اللہ تم چپ کیوں ہو؟ زمیندار تہ نہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟“

نعمت اللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں اس نے مجھے جس قسم کا اضطراب بخشتا ہے اس کا بیان میرے بس کہ بات نہیں اس نے مجھ سے میری دنیا چھین لی۔ دوست محمد خان! وہ زمیندار نہیں، تازیانہ عبرت تھا جو میرے غافل اور لاپرواہ دل و دماغ پر شدید ضربیں لگا کر سہٹ گیا۔“

دوست محمد خان اس نوجوان کی باتیں نہیں سمجھ سکا۔

انکار اور تردیدیں دو باہو ایہ نوجوان جب رات کو اپنی خواہگاہ میں داخل ہوا تو اس کا یہ عالم تھا کہ دل پر مایوسی اور مادی دنیا کی بے وقعتی کے گھوٹے لگ چکے تھے اور وہ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا بالکل اس طرح چل رہا تھا گویا کوئی شرابی نشے میں دھت بستر پر جا رہا ہو، لکڑھٹاتا، گرتا پڑتا ہوش و حواس سے محروم، گم صم بستر پر اوندھے منہ گر کر وہ دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر، جب آنسوؤں کے ذریعے دل کا بوجھ کسی حد تک بہ گیا۔ تو یہ مفعل نوجوان اٹھا اپنی تلوار کٹار، ترکش، کمان، جسم پر سجاوے اور چند اشرفیاں پاس رکھ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے تھوڑی دیر عبادت کی۔ پھر فجر کی نماز ادا کی۔

دریا کے دوسرے کنارے، مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا، چٹریاں چھپ چھپ رہی تھیں اور نرم اور ملائم صبح کی لذت سے نعمت اللہ کا دل معمور ہو رہا تھا اسی عالم میں راجو خان کا ایک ملازم نمودار ہوا۔ یہ انہیں دیکھتے ہی ان کے پاس بھاگ کر پہنچا اور رورور کر کہنے لگا۔ ”جناب والا۔“

آپ کا کیا ہے۔ آپ تو چپ چاپ یہاں تشریف لے آئے، مجھ سے تو پوچھئے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے، چاروں طرف آپ کی تلاش جاری ہے، راجو خان نے ہمیں حکم دیا ہے کہ میں کہیں سے آپ کو تلاش کر کے اس کی خدمت میں حاضر کر دوں۔ براہ کرم آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔“ انہوں نے مایوسی سے جواب دیا۔ ”میں جس دنیا کو لات مار چکا ہوں اس میں دوبارہ

کس طرح دالیں جاسکتا ہوں۔ یہ کام نہ تو مجھے پسند ہے اور نہ ہی میرا خدایندہ کرے گا۔“

ملازم نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میرے ساتھ واپس نہیں چلیں گے تو پھر مجھے اجازت

دیجئے کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“

”بالکل اسی طرح، جس طرح آپ نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور اس دیر لانے میں نکل آئے۔“

آپ کچھ دیر خاموشی سے سوچتے رہے، پھر کہا۔ ”اچھا پھر الیا کرو کہ مجھے دوا اشرفیاں

دے دو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ واپس چلتا ہوں۔“

ملازم نے بے بسی سے کہا: ”اس وقت تو میرے پاس چاندی کے ککے سہہ نہیں دو اشرفیاں کہاں سے لائیں گا؟“

آپ نے پوچھا: ”کہیں سے بھی تو دو اشرفیوں کا انتظام کر سکتا ہے؟“

ملازم نے جواب دیا: ”بالکل کر سکتا ہوں آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ میں وہیں دو اشرفیاں فراہم کر دوں گا۔“

آپ نے مسکاکر بے نیازی سے جواب دیا: ”پہلے گھر سے دو اشرفیاں لے آ، آپ کے بعد مجھے واپس لے چلنا۔ اشرفیوں سے بغیر تو میں ایک تادم بھی گھر کی طرف نہ اٹھاؤں گا۔“

ملازم نے کہا: ”اچھا آپ یہیں بیٹھ رہیے۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔“

وہ اشرفیاں لینے گھر گیا۔ اور یہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ انہوں نے خربوزے والے کے گرد چند آدمی بیٹھے دیکھے انہوں نے اپنے پاس کی رقم خربوزے والے کی حوالے اور اس سے کہا: ”ان سب کو پیٹ بھر کے خربوزے کھلا دے۔“

خربوزے والے کو اشرفیاں ملی تھیں۔ اس نے نہایت خوشی سے ان سب کو خربوزے کھلائے پھر آپ نے ان لوگوں سے پوچھا: ”تم میں سے کون ہے جسے ہتھیاروں کا شوق ہو؟“

کئی آدمیوں نے اُگے بڑھکر اعلان کیا کہ: ”میں ہتھیاروں کا بے حد شوق ہے۔“

آپ نے اپنے ہتھیار، ان کے حوالے کر دیئے اور وہاں سے حیدر آباد دکن چلے گئے وہاں حضرت شیخ محمد کا بڑا شہرہ تھا نعمت اللہ نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور مریدی کا شرف حاصل کیا۔ حضرت شیخ محمد نے ان سے ایک عجیب سوال کیا، پوچھا: ”میاں صاحبزادے! کیا تم نے ظاہری علوم حاصل کر لیے؟“

آپ نے سچ سچ عرض کر دیا کہ ”نہیں، لیکن ابھی پوری طرح نہیں کہہ پائے تھے کہ میرے کہا۔ ”دبئی کمال کے لوگ ہیں علوم ظاہری تو حاصل کئے نہیں اور راہ طلب میں مکمل کھڑے ہوئے بھلا ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ علم کے بغیر کبھی بھی کوئی چیز باتھ لگی ہے۔ یہاں تک کہ خدا بھی نہیں۔ بے علم نتوان خدا را شناخت!“

نعمت اللہ شرم سے پانی پانی ہو گئے، بولے: ”بہتر ہے حضور والا! میں بعد فراغت تعلیم دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں اس قابل ضرور

ہو چکا ہوں گا کہ آپ مجھ پر عنایت کر سکیں ۝

اس کے بعد نعمت اللہ نے دولت آباد کا رخ کیا۔ جہاں جبریل نامی ایک مشہور عالم رہتا تھا فلسفہ و حکمت کا پیغمبر، فرد الش کا مجسمہ۔ جہاں بڑے بڑے لائق و فائق لوگ علم کی تہی بجھانے آیا کرتے تھے جبریل نے نعمت اللہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شرح ملا جامی سے تدریس شروع کی۔ ہونہار اور ذہین شاگرد بہت جلد فلسفہ اور منطق میں کہیں سے کہیں نکل گیا جبریل کا دل پرش کوئی خدا داد ذہانت کا سکہ بیٹھ گیا یہاں تک کہ استاد اپنے شاگرد کو استاد کہہ کر مخالف کرنے لگا جبریل نے ایک دن اپنی خوشی کا یوں اظہار کیا کہ پہلے تو شاگرد کی پشت تھپتھپائی پھر کہا۔ دو (خوند) استاد! خدا کی قسم میرا یہ جی چاہتا ہے کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے اسے لقمہ بنا کر تمہارے اندر منتقل کر دوں ۝

اور ہوا بھی ایسا ہی، غالباً یہ بات استاد خود نہیں کہہ رہا تھا، خدا کا ہمارا ہاتھ۔ کیونکہ ————— اس کے بعد استاد کے سکھانے پر بڑھانے کیلئے کچھ بھی نہ رہ گیا تھا شاگرد استاد سے کچھ زیادہ ہی جان گیا تھا۔

جبریل کی بیوی اور نو جوان لڑکی، دونوں ایران میں تھے اس ہونہار شاگرد کے لئے استاد کے دل میں اتنی جگہ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے شاگرد ہی سے کر دینا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ شاگرد تمام علوم حاصل کر چکا تھا اور اب رخصت ہونے والا تھا اور بیٹی پاس نہ تھی۔ استاد بہر حال استاد تھا اس نے اس مشکل کا حل بھی نکال لیا۔ ایک دن نعمت اللہ سے کہا ۝ ”نعمت! تم میرے شاگرد ہو اور میں استاد، تم اپنے استاد کے مرتبے سے بخوبی واقف ہو گے؟“

نعمت اللہ نے سعادت مندانہ عرض کیا ”خوبی اچھی طرح“ کوئی خدمت میرے لائق ہو تو اس کا حکم فرمادیں ۝

جبریل نے کہا ۝ ”میری بیوی ایران میں ہے اس کے ساتھ میری بیٹی بھی ہے میں تمہیں اس کا پتہ دیتا ہوں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے آؤ ۝“

نعمت اللہ نے پتہ لیا اور ایران چلے گئے اور چند ماہ کے بعد دونوں کو واپس لے کر واپس آ گئے اسی دوران دولت آباد کے صوبے دار کا نائب انتقال کر گیا۔ اسے اس خالی جگہ کے لئے کسی لائق شخص کی ضرورت تھی۔ اس نے جبریل سے مشورہ کیا تو استاد نے نعمت اللہ کا

نام پیش کر دیا۔ صوبے دار نے کہا ”نعمت اللہ کو ساتھ لے کر کل آجائیے۔“

جبریل نے وعدہ کر لیا۔ لیکن جب اس کا ذکر نعمت اللہ کے سامنے آیا تو انہیں بیچ پہنچا۔ ان کا دل پہلے ہی دنیا سے نزار تھا۔ وہ دنیا داری میں الجھنا پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی رات رختِ سفر باندھ دیا اور رات کی تائی میں حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ پیر کی خدمت میں حاضری دی۔ پیر نے اس پڑھے لکھے مرید پر ٹھوسی تو جہدی اور ذکر اشغال میں کامل کر کے فیروز پور جانے کا حکم دیا۔

جب یہ فیروز پور جا رہے تھے تو پیر نے انہیں ذرا دیر روک کر پوچھا ”کیا تم روحِ نیت میں کامل ہو چکے ہو؟“

نعمت اللہ نے جواب دیا ”آپ کی موجودگی میں یہ ناجیز اتنا بڑا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے۔“

پیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے کہا ”وآفرین، تم خود کو کبھی بھی کامل نہ سمجھنا بلکہ یہ سمجھو کہ تمہیں میری طرف سے کاسہ گدائی عطا کیا گیا ہے، اس میں جہاں کہیں سے بھی اچھی باتیں ملیں، ڈال لینا، خود کو غنی نہ سمجھنا، ہمیشہ تشنگی برقرار رکھنا۔“

نعمت اللہ فیروز پور پہنچے اور سولہ برس اس کے نواح کے جنگلات میں عبادت و ریاضت کرتے رہے، جذب کا عالم طاری ہوا تو لباسِ تنک کا ہوش نہ رہا۔ سولہ برس تک کپڑے یوں بھی ساتھ نہ لے سکتے تھے۔ جسم پر لباس نام کا ایک تار تک باقی نہ رہا اور یہ سردی، گرمی اور برسات سے بے نیاز برہنہ جسم لئے ریاضت میں مشغول رہے۔ آخر کے چار برس تولیے گزربے کہ جنگل سے قریب ریگستان میں چلے جاتے، سر پر تپوں کی ٹوپی لکھتے اور نیکلے نصف جسم کو ریت میں دھنسا دیتے اور تیمم کے نماز ادا کرتے، یہ وہ زمانہ تھا جب وہ عالمِ جذب گزر کر سلوک کی منزل میں داخل ہوئے تھے اس کے بعد آبادی میں جانے کا خیال آیا، جنگل سے باہر نکلے، ایک شخص کو بلا کر ستر پوشی کے لئے کپڑے مانگے، اس نے پھٹا پرانا لباس دیا اور ساتھ ہی سوٹی دھاگا بھی دیا کہ خود ہی ٹھیک کر کے پہن لو یہ ان چیتھڑوں میں فیروز پور آبادی میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ دن رہ کر اکبر آباد چلے گئے اکبر آباد سے حیدر آباد گئے اور پیر کی قدم بوسی سے شرفیاب ہوئے۔ کچھ دن رہ کر خاندیش چلے گئے۔ یہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کچے مکان سے لڑکیوں کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ لڑکیاں چکی پیس رہی تھیں

اور گیت گارہی تھیں ان کا گیت نعمت اللہ کو بہت اچھا لگا۔ یہ کھڑے ہو کر سننے لگے پھر اچانک خیال آیا کہ اس طرح کھڑا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ یہ آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ اندر سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے انہیں نظر بھر کے دیکھا اور عرض کیا ”شاہ صاحب! کہاں سے آنا ہوا؟ تشریف لکھئے کچھ کھانے پینے کیلئے حاضر کروں؟“

نعمت اللہ نے جواب دیا ”لڑکی! ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں جہاں ٹھہر سکے وہی ہمارا ٹھکانا ہو گیا ہم پیلے سے ہیں کیا تو یہیں پانی پلا سکتی ہے؟“

لڑکی بھاگی بھاگی اندر گئی اور واپس آکر بعد ادب آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ آپ نے پانی پی کر دعا دی ”لڑکی! تو خوش رہے خدا تجھے صاحب اولاد کرے“

لڑکی شرمائی کینہ کو ابھی وہ کنواری تھی۔ شاہ صاحب نے فرمایا ”شرامت۔ خدا تجھے صاحب اولاد بھی کرے گا اور صاحب ثروت بھی“

لڑکی نے انہیں بہت بہت روکنا چاہا لیکن یہ پھر حیدر آباد بیر کی خدمت میں واپس گئے اور کچھ دن رہ کر گجرات چلے گئے، گجرات کے شاہ عالم نامی بزرگ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے حجرے میں ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ شیخ شاہ عالم کا لڑکا شیخ جلال ان کا اتنا معتقد ہوا کہ انہی سے طریقہ سلوک کی تربیت حاصل کی۔ شاہ نعمت اللہ گجرات میں ایک عرصے تک مقیم رہے یہاں تک کہ شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ نعمت اللہ نے شیخ جلال کی محبت اور سکون اور طمانیت کی خاطر گجرات ہی میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ انہی دنوں مغل فرماں روا جہانگیر گجرات پہنچا اور شیخ جلال نے بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ بادشاہ نے پوچھا ”کیا شاہ نعمت اللہ واقعی کوئی بڑے مرتبے کے بزرگ ہیں؟“

شیخ جلال کے ساتھ ہی کئی دوسرے مقربین خاص نے بھی یہی جواب دیا ”شاہ نعمت اللہ ولی ہیں اور آج ان کے پائے کا بزرگ دُور دُور نہ ملے گا“

سلطنت شاہی تمکنت سے گویا ہوئی۔ انہیں ہمارے حضور پیش کیا جائے“

شاہ نعمت اللہ کو بادشاہ کی یہ ادائیں نہ آئی سرودھری سے جواب دیا ”ہم دونوں کی حیثیتوں میں بعد القابین ہے پھر ہم ایک دوسرے سے کس طرح مل سکتے ہیں“

جب یہ جواب جہانگیر تک پہنچا گیا تو وہ بہت جربز ہوا، شاہ صاحب کے روحانی مرتبے سے ڈرتا بھی تھا اور کسی نہ کسی طرح ملاقات بھی کرنا چاہتا تھا اس نے مجبوراً یہ منصوبہ بنایا

حضرت شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے پہنچے اور وہیں شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کر لے۔ شاہ صاحب بھی بادشاہ کی منشا سے آگاہ ہو گئے بادشاہ جیسے ہی وہاں پہنچا شاہ نعمت اللہ دوسرے دروازے سے نکل گئے بادشاہ کو شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بہت ملال ہوا۔ وہ کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکنے کے ملال سے افسردہ رہا آخر اپنے دیوباری امیر خان جہاں سے کہا ”خان بابا! ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کریں۔ اس سلسلے میں ہماری دونوں کوششیں ناکامی کی نذر ہو گئیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے۔“

خان جہاں نے گردن جھکا کر ہاتھ باندھ دیئے، آپ سے جواب دیا ”جہاں پناہ ملوں نہ ہوں یہ ناچیز اسی وقت شاہ صاحب کے پاس جاتا ہے اور انہیں کسی بھی ملت بادشاہ سلامت کی ملاقات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

خان جہاں شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں مؤدبانہ باریاب ہوا اور ادھر ادھر کی بات چیت کے بعد بادشاہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بولا ”بادشاہ کی دین داری اور فقر نوازی کا جواب نہیں اور خصوصی طور پر جہاں پناہ آپ کی ذات سے تو کچھ غیر معمولی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی حسن عقیدت کا یہ حال ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کی حاضری کی قید بھی اڑادی وہ فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب ہمیں جب بھی چاہیں اپنے غلاموں کی طرح طلب فرمائیں۔ بادشاہ کے اس اشتیاق کو دیکھ کر ناچیز کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ دونوں کی ملاقات کا اہتمام اور انصرام یہ گناہگار خود اپنے ہاتھوں کر سکتا ہے اگر اسے اس حقیر کی درخواست سمجھ کر قبول فرمایا جائے تو یہ عین مرید نوازی ہوگی۔“

شاہ صاحب نہایت انہماک سے خان جہاں کی تقریر سنتے رہے جب موصوف نے ذرا دم لیا تو آپ نے زبان کھولی۔ فرمایا ”خان جہاں! ہم تم سے ایک سوال کریں گے اس کے جواب پر اس ملاقات کا انحصار ہے۔“

خان جہاں نے خوش ہو کر دریافت کیا ”بندے کو بھڑبھڑانے کی تو عادت ہی نہیں، بھڑبھڑ سے نفرت ہے۔“

اپنے پوچھا ”خان جہاں! یہ بتاؤ صحبت اثر کرتی ہے یا نہیں؟“

خان جہاں نے جواب دیا ”صحبت کا اثر امر مسلمہ ہے؟“

آپ نے کہا ”پھر یہ بتاؤ کہ کہاں ایک بادشاہ اور کہاں ایک فقیر رہے تو اگر اس

کی صحبت نے مجھ پر اثر کیا تو میری گڈری چین جلنے لگی اور اگر میری صحبت نے بادشاہ کو زیر اثر لے لیا تو امور سلطنت میں خرابی پھیلے گی اور رعیت تباہ و برباد ہو جائے گی اب ایمان داری سے یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کی ملاقات ایک دوسرے کے لئے کتنی مضرت و تکلیف دہ ثابت ہوگی؟

خان جہاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد فکر مند رہے میں سوال کیا، ”حضرت! یہ تو فرمایا میں کہ یہ عاجز بادشاہ کو کیا جواب دے؟“

آپ نے جواب دیا ”تم میرے وکیل ہو میری طرف سے بادشاہ سے عرض کرو کہ وہ مجھے خواہ مخواہ تکلیف نہ دیں، ہم دونوں کی حیثیت دو متوازی لکڑیوں جیسی ہے جو کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔“

ایک بار جہانگیر نے اپنے علماء کو حکم دیا کہ قرآن پاک کا ایک ایسا ترجمہ کیا جائے کہ جتنے حرفی قرآن پاک میں ہیں اتنی ہی ترجمے میں بھی ہوں۔

علماء کی ایک جماعت سر جوڑ کر بیٹھی اور بدقت تمام ڈھائی پیاروں کا ترجمہ شاہی فرمان کے التزام سے مکمل کیا اور — بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے اپنی عاجزی کا اظہار کیا آخر میں بے لفظیوں بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ اگر شاہ نعمت اللہ چاہیں تو یہ کام پورا کر سکتے ہیں۔

بادشاہ کے دل میں شاہ صاحب ملاقات نہ ہو سکتے کا ناٹا پہلے چھوچکا تھا یا بوسی سے کہا — ”شاہ صاحب ہم سے ملنا تو گوارا کرتے نہیں، ہمارے کہنے سے ترجمہ کیا کریں گے۔“

علمائیں سے کسی نے کہا ”مقران شاہی میں سید جلال الدین حضرت شاہ صاحب کے مرید ہیں اور ان کا بے حد خیال کرتے ہیں اگر سید جلال ان سے کہیں تو یہ کام ضرور پورا ہو جائے گا۔“ بادشاہ نے سید جلال کو حکماً لکھا کہ یہ کام شاہ نعمت اللہ سے کسی بھی طرح نہ کرایا جائے۔

سید جلال اُداس اور افسردہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اس نئی

افتاد کا ذکر کیا۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر بولے ”اچھا اگر کام پرتھہاری ملازمت شاہی کا انحصار ہے تو میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم بادشاہ سے یہ پوچھ لو کہ قرآن میں جہاں جہاں قصے بیان ہوئے ہیں کیا ان کے نوٹ اور حاشیے کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

جہانگیر نے جواب میں کہہ لیا کہ صرف ترجمہ کیا جائے حاشی کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے کہ اصل عبارت اور ترجمے کی عبارت کے حروف برابر ہوں۔

حضرت شاہ صاحب نے اجازت پاتے ہی ترجمے کا کام شروع کر دیا اور دو ماہ میں یہ کام

بائیہ تکمیل کو پہنچا۔ بادشاہ کے حکم پر علما نے وقت نے حروف شمار کی تو دونوں برابر نکلے۔
جہانگیر اس کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اشتیاق ملاقات میں اور احافہ ہو گیا اس ترنہ کے نام ترجمہ
جہانگیر کی رکھا گیا۔ جب جہانگیر کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آئی تو اس نے غصے میں سید جلال کو ملازمت
سے سبکدوش کر کے جاگیر ضبط کر لی اور انہیں یہ حکم دیا کہ اگر تم شاہ نعمت اللہ سے ملاقات
کراؤ تو تمہیں تمہارے منصب پر پھر بحال کر دیا جائے گا اور جاگیر دوبارہ بخش دی جائے گی۔
سید جلال روتے ہوئے گھر پہنچے اور شاہا جب کو پوری بتا سنا دی۔ آپ نے ملکہ بہو کو فرمایا۔

”اچھا تم زیادہ ملال نہ کرو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری ملاقات کے بغیر شاہ کی عنایت تم پر نہ ہوگی
تو تم اس کی ذرا بھی فکر نہ کرو، میں کچھ کر دوں گا۔ سر دست تم بہت زیادہ تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔
شاید دھوپ میں آنے سے تم کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہو تو ٹھوڑی دیر آرام کر لو۔“

اس کے بعد آپ نے ایک خدمت کار کو حکم دیا ”جب جلال لیٹ جائے تو تم پیچھا بھلا
سید جلال لیٹ گئے اور خد متا کر پیچھا بھلنے لگا۔ یہاں تک کہ سید جلال پر بخود کی طاری
ہوئی اور سو گئے شاہ صاحب نے اٹھ کر قلمدان سنبھالا اور سید جلال کے نام ایک خط لکھا۔
”سید جلال! میں تمہاری شکایت کا غوث الثقلین (دونوں جہاں میں مددگار) ہوں
تم مطمئن رہو تمہارے تمام کام حسب خواہش ہو جائیں گے مجھ کو ہمیشہ اپنا معین و مددگار سمجھو۔ اب ہم
تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتے ہیں، حشر میں ملاقات ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔ فقیر نعمت اللہ“
شاہ صاحب نے یہ رقعہ قلمدان میں رکھا اور سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔

سید جلال کی ملازمت پھر بحال ہو گئی اور جاگیر کی واکراشت کا شاہی فرمان بھی جاری ہو گیا نہیں
شاہ صاحب کی جدائی کا اتنا حد مرہوا کہ وہ کچھ عرصے تک انہیں ادھر اُدھر تلاش کرتے رہے اور
جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو شاہ صاحب کی رقعہ پڑھنے بیٹھ گئے اور دیر تک روتے رہے۔
شاہ صاحب گھومتے پھرتے پھر اس گاؤں میں پہنچے جہاں مدتوں پہلے

ایک لپنبہاری نوجوان لڑکی نے انہیں پانی پلا کر دعائیں حاصل کی تھیں۔ اب وہاں کچے مکان کی جگہ
عالیشان محل کھڑا تھا کسی عورت نے شاہ صاحب کو پہچان لیا اور اس لڑکی کو شاہ صاحب کی تشریف
آوری سے مطلع کیا۔ اب وہ لڑکی عورت بن چکی تھی۔ وہ بدحواس بھاگتی ہوئی شاہ صاحب کے قدموں
میں جا گری۔ اس کے پیروں میں جو تہ تک نہ تھی لیکن جسم پر نہایت قیمتی لباس تھا عورت نے رو
کر کہا ”حضرت! ہمارے غریب خانے پر چلیں میرا شوہر شکار پر گیا ہے واپسی پر وہ بھی قدم بوسی

کی سعادت حاصل کئے گا ۛ

آپ نے ہنس کر فرمایا " نادان لڑکی! بس تجھے دیکھ لیا، دل شاد کیا، اب فقیر زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا " ۛ

اس عورت نے آپ کے پیر پکڑ لیے، بولی " حضور! مجھے جو کچھ بھی ملا ہے آپ کی دعاؤں سے ملا ہے اگر ساتھ نہیں چلتے تو یہاں اتنی دیر تو ٹھہرے کہ میں گھر سو کر واپس آ جاؤں " آپ نے جواب دیا " ہاں اتنی دیر البتہ ٹھہر سکتے ہیں " ۛ

عورت بھاگ کر گھر گئی اور وہاں سے سواشر فیوں کی تھیلی اور اپنے لڑکے کو گود میں لے کر واپس آئی اور بٹن کے اوپر تھیلی کو آپ کے قدموں میں ڈال کر کہنے لگی " حضور! اگر قیام نہیں فرماتے تو اس بچے کے سر پر دست شفقت فرما کر دعا سے سرفراز فرمائیں اور اشر فیوں کی تھیلی حقیر زندانہ سمجھ کر قبول فرمائیں! اپنے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور اشر فیوں کی تھیلی بچے کے ہاتھ میں تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " میں نے تیری اشر فیاں قبول کیں اور اب انہیں میں اپنی طرف سے تیرے بچے کی نذر کرتا ہوں؟ " ۛ

عورت چل گئی کہ " نہیں اب نہیں ہو گا یہ رقم تو آپ کو قبول ہی کرنا پڑے گی " آپ نے عورت کے اصرار پر تھیلی سے ایک اشر فی لے لی اور بقید اشر فیاں دہاں کے تیکہ دار کے حوالے کر دیں۔ ۛ

یہاں سے رخصت ہو کر یہ ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے شیر آنا دکھائی دیا۔ آپ بڑک گئے اور شیر سے فرمایا " اے یار عزیز! اگر مشیت خدا یہ ہے کہ تو مجھے حیر بھڑا کر کھا جائے تو آگے بڑھ اور خدا کی مشیت پوری کر۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میری راہ چھوڑ دے اور اپنی راہ لے " شیر گرجا بالکل اس طرح جیسے اپنی عاجزی کا اظہار کر رہا ہو اور جست لگا کر ایک طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے جب تک گئے اور گرمی نے بہت پریشان کیا تو ایک درخت کے نیچے قیام کیا اور مراقبے میں چلے گئے اسی عالم میں ایک سیاہ سانپ آپ کے پنجوں پر سر رکھ کر سو گیا آپ نے سانپ پر نظر ڈالی اور مراقبے میں دوبارہ چلے گئے۔ سانپ نے کچھ دیر آرام کیا اور اپنی راہ لی۔ آپ چند دنوں کے لئے فیروز پور میں، قیام فرما رہے اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئے ان دنوں ٹانڈے میں دو صاحب کشف بزرگ پہنچے ایک تو میر سید احمد اور دوسرے شاہ کریم اللہ شاہ کریم اللہ اپنے مریدوں میں بیٹھے وخط و تلقین میں مشغول تھے کہ اچانک بھڑ بھڑی لی اور

خلاف معمول اٹھ کھڑے ہوئے۔ مریدوں نے دریافت کیا ”حضرت! کوئی خاص بات ہے کوئی خاص واقعہ؟“

مرم اللہ شاہ نے کہا: ”ایک ایسی ذات ہمارے پاس آرہی ہے جو صاحبِ ولایت ہے اور جس کے سامنے ہم دونوں (میر سید احمد اور کرم اللہ) متغیر ہو جائیں گے“
 کسی مرید نے پوچھا: ”یہ کب تک یہاں آجائیں گے؟“

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا: ”بہت جلد، عنقریب، دو دن کے اندر ہی۔“
 دو دن ابھی گزرے ہی نہ تھے کہ شاہ کرم اللہ اپنے مریدوں کے ساتھ گنگا کے کنارے پہنچ گئے۔ بولے: ”وہ صاحب بس اتنے ہی دالے ہیں۔“

مریدوں نے ادھر ادھر دیکھا اور حیرت سے پوچھا: ”حضرت! وہ بزرگ کہاں ہیں اور کدھر سے آئے ہیں؟“

شاہ کرم اللہ نے دریائے گنگا کی موجیں پیر کر آتی ہوئی ایک کشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”اس کشتی میں، جو سامنے سے آرہی ہے وہ صاحب تشریف لائے ہیں اور ہم سب یہاں ان کے استقبال کو جمع ہوئے ہیں۔“

جب کشتی کنارے آگئی تو شاہ کرم اللہ آگے بڑھے اور شاہ نعمت اللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نہایت اعزاز اور تکریم سے اپنی خانقاہ میں لے گئے آپ نے شاہ کرم اللہ سے پوچھا: ”میر سید احمد کہاں ہیں؟“

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا: ”مالتی پور میں۔“

آپ نے کہا: ”وہیں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

شاہ کرم اللہ انہیں لے کر مالتی پور پہنچ گئے۔ میر سید احمد پہلے ہی سے دروازے پر کھڑے ان کے منتظر تھے دیکھتے ہی دوڑ کر آگے بڑھے اور شاہ نعمت اللہ سے بغل گیر ہو گئے شاہ صاحب چند دن ان کے ساتھ رہے، پھر ایک دن جب واپسی کی اجازت چاہی تو سید احمد اُداس ہو گئے اور فرمایا: ”نعمت اللہ میرا وقت قریب ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ میری نماز جنازہ پڑھا کر واپس جائیں۔“

آپ نے جواب دیا: ”سید احمد آپ بے فکر رہیں فقیر نماز جنازہ کے وقت دوبارہ حاضر

ہو جائے گا۔“

اس کے بعد آپ واپس آگئے اور کہیں اور تشریف لے گئے اسی دوران سید کا انتقال ہو گیا اور انتقال سے پہلے یہ وصیت کر دی کہ میری میت اس وقت تک اٹھے جب تک شاہ نعمت اللہ جہانے کی نماز نہ پڑھ دیں۔

لوگوں نے یہ اجماع کو غسل دیا اور کفن پہنکے باہر رکھ دیا اور شاہ نعمت اللہ کا انتظار کرنے لگے اسی وقت ایک طرف سے شاہ نعمت اللہ نمودار ہوئے اور ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے چلے گئے۔

اسلام خان چشتی صوبے دار جہانگیر نگر (ڈھاکا) نے آپ کے بامیں گاؤں کا اوقاف کرنا چاہا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

بنگلہ کے ہفت ہزاری نواب خان خاناں اور بیج ہزاری خان اعظم مہابت خان آپ کے بہت معتقد تھے مہابت خان بنگال کا صوبے دار تھا۔ یاد شاہ نے اسے اکبر آباد بلایا اور اس کی جگہ مہابت خان کے بیٹے خانہ زاد خان کو بنگالے کا صوبے دار مقرر کیا۔ مہابت خان نے رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب سے کہا ”حضرت! یہ گناہگار اکبر آباد جا رہا ہے اس کی بچھ آپ کا غلام فائز ہو رہا ہے عاجز کی دلی غلامی ہے کہ حضرت اس پر نظر عنایت رکھیں“

آپ نے جواب دیا ”میں اسے ایک ماہ پہلے خطرات سے مطلع کر دیا کروں گا ماننا ماننا اس کا اپنا اختیار ہی فعل ہوگا“

شاہ صاحب نے خانہ زاد خان کے ساتھ ہی سکونت اختیار کی۔ اس صحبت نے اس کی طبیعت ہی بدل کر رکھ دی۔

ایک دن خانہ زاد خان کی ڈیوڑھی پر ایک مکار درویش آیا اور اس نے اندر اطلاع کرائی کہ ”صوبے دار سے کہو فیروز پور سے فقیر نعمت آیا ہے!“

اس فقیر نے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ صوبے دار کو شاہ نعمت اللہ سے بڑی عقیدت ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب صوبے دار بنگالے کے ساتھ ہی تشریف فرما ہیں۔

خانہ زاد خان درویش کی عیاری پر لال بھوکا ہو گیا اور سپاہیوں کو یہ حکم دینا چاہا کہ ”مکار درویش کی اچھی طرح مرمت کر کے رخصت کر دو“ تاکہ کہیں اور دھوکے بازی کا ترکیب نہ ہو۔

لیکن حضرت شاہ صاحب صوبے دار کو اس حکم کے اجر سے منع کر دیا۔ فرمایا ”بابا! یہ اخلاقِ محمدی سے بعید ہے خدا جانے بے چارہ کہاں سے اور کس ضرورت سے آیا ہے اور

تمہاری نسبت اچھا سخن رکھ کر یہ حرکت کی ہے اس فقیر کی خواہش ہے کہ تم اس سے بدسلوکی
 نہ کرو، غریب اگر جھوٹ بول کر اپنا پیٹ پالنا چاہتا ہے تو تمہارا کیا نقصان ہے اس کو اندر بلو اور
 سلوک کر کے رخصت کر دو۔“

خانہ زاد خان نے درویش کو اندر بلوایا جب وہ سامنے آیا تو شاہ نعمت اللہ تعظیماً کھڑے
 ہو گئے صوبے دار نے بھی آپ کی اتباع کی اور دست بستہ کھڑا ہو گیا اور پوچھا ”حضور کی تعریف“
 عیار درویش نے جواب دیا ”فقیر کو نعمت اللہ کہتے ہیں“
 صوبے دار نے ہاتھوں کو بوسہ دے کر دریافت کیا ”حضور کا کیسے آنا ہوا؟“
 درویش نے جواب دیا ”فقیر نے فیروز پور میں خانقاہ بنوائی ہے اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔“
 صوبے دار نے دوسواشر فیاں درویش کے حوالے لے لیں اور عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔
 ایک دن آپ نے خلاف معمول خانہ زاد خان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، جس میں ایک
 شعر یہ بھی تھا۔

من مد ہدایت الے کل خنداں چو غریب زبا الے تو بنو بہار نما شاہے دیگر اراں
 اس شعر میں صوبے دار کے کان کھڑے ہوئے اور اسی وقت متصدیوں (منشیوں) کو حکم دیا
 کہ یہ شعر لکھو، اب ہمارے یہاں قیام ناممکن ہے شاید آج ہی کل میں بادشاہ سلامت یہیں طلب فرمانے
 والے ہیں۔

اور بالکل ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر ہی بادشاہ کا فرمان پہنچا جس میں خانہ زاد خان کو
 اکبر آباد کی حاضری کا فوری حکم دیا گیا تھا۔

یہ عجیب غریب بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اتنے تفصیلی حالات مل جانے کے
 باوجود ان کے سن و فوات اور مزار کا صحیح پتہ نہیں چلتا ان کے پیرومشر نے انہیں فیروز پور
 روانہ کیا تھا ہو سکتا ہے ان کا دصال فیروز پور ہی میں ہوا ہو، واللہ اعلم بالصواب



حضرت حاجی امداد حسین مہاجر مکیؒ

سکھاپور کے قصبے نازتہ میں ۳ جنوری ۱۸۱۵ء میں ایک پچھڑا پیرا ہوا
 باپ نے اس کا نام امداد حسین رکھ دیا۔ ابھی یہ سات سال کے تھے کہ ماں نے سفر آخرت اختیار
 کیا۔ نزع کے وقت ماں نے اپنی دوسری اولادوں کے مقابلے میں امداد حسین کو زیادہ اہمیت
 دی انہوں نے خاندان کے ذمہ دار حضرات کو آبدیدہ نظروں سے دیکھا اور نحیف اور
 غمزدہ آوازیں وصیت کی۔ ”لوگو! میں جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لئے۔ مرنے سے پہلے
 ایک وصیت کرنا چاہتی ہوں، کیا آپ لوگ میرے بعد اس پر عمل پیرا رہنے کا وعدہ فرمائیں
 گے؟“

ایک بزرگ عورت روتی ہوئی جاں بہ لب مریضہ کے پاس پہنچی اور وعدہ کیا۔
 ”وہیں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری وصیت پر صرف بحر حق عمل کیا جائے گا“ اپنی وصیت سے
 مجھے آگاہ کر دو۔“

مریضہ نے اپنے بیٹے امداد حسین کا ہاتھ اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا اور
 سوگوار لہجے میں کہا ”میرے اس بچے کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ اس کی
 غلطیوں اور خطاؤں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، اسے مارتا تو مار بھر کیوں تک سچا یا جائے؟“
 بزرگ عورت نے امداد حسین کو اپنے سینے سے لگالیا اور روتے ہوئے وعدہ
 کیا ”تمہاری وصیت پر پوری طرح عمل کیا جائے گا بہن! تم بے فکر رہو، اس کی مجال
 ہے کہ تمہارے امداد حسین کو ترچی نظروں سے دیکھنے کی جرات کرے۔“

ماں کا انتقال ہو گیا اور بیٹا اس ناز و نعم سے پرورش پانے لگا کہ زندگی کے
 ہر معاملے میں اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کچھ بھی کرے کوئی اسے ٹوک نہ سکتا تھا
 یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام جن کا اختیار کرنا انجام دینا ضروری ہوتا، کوئی زبان
 بند لاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ بچے کی دل جوئی کے شدید احساس اور پاسِ خاطر کبے نے

پناہ خیال نے لوگوں میں ایک طرح کی بے نیازی پیدا کر دی اور امداد حسین کو لوگوں کی عدم
توجہ اور تغافل کا شکار ہو جانا پڑا۔ لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ نہ دی۔
کیونکہ اس میں یہ امکان موجود تھا کہ کہیں کسی جگہ جبر سے کام لینا نہ پڑ جائے جس سے
امداد حسین کی دل آزاری ہو اور ان کمالات کی روح کرب میں مبتلا ہو جائے۔ انہیں خود ہی
پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ سن شعور میں پہنچ
کے دہلی گئے اور مولانا نصیر الدین دہلوی کے حلقہ درس میں بیٹھ گئے مولانا کا تعلق سید احمد
شہیدؒ کی تحریک سے رہ چکا تھا اور یہی ذات میں بہت ساری خوبیاں رکھتے تھے عالم دین،
صوفی اور لائق سیاست داں۔ یہ اپنے طلبہ کو وہی درس دیا کرتے تھے جو تقریباً ایک سو سال
پہلے شاہ ولی اللہ دہلویؒ پوری قوم کو دے چکے تھے اور ۱۸۳۱ء تک سید احمد شہیدؒ
دیتے رہے تھے۔

نوجوان امداد حسین گہری نیند سوئے ہوئے تھے صبح قریب تھی۔ کاروانِ شب کے
آخری مسافر رخصت ہونے کو تھے اس وقت امداد حسین رسول مقبولؐ کے دربار میں حاضری
تھے رسول مقبولؐ کے آس پاس ان کے اصحاب موجود تھے امداد حسین پر اتنا رعب طاری تھا
کہ پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے گردن جھک گئی اور آنکھوں میں تاب نہ رہی۔ اسی
عالم میں کسی نے امداد حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور حکم دیا ”یہاں کیوں کھڑے ہو گئے بڑھ،
ہوش میں آ“

یہ ادا کسی آشنا کی تھی، گردن اُپر جو اٹھائی تو دیکھا دادا سامنے کھڑے ہیں
امداد حسین نے گردن اُپر اٹھانے کے سوال کیا ”دادا جان! اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں ہوں اور
میری ہمت جواب دے گئی ہے“

”تو میرا ہاتھ پکڑ!“ دادا نے کہا ”میرے ساتھ چل، میں تجھے رسول اللہؐ
کے پاس لیے چلتا ہوں، ان سے میری ملاقات کرا تا ہوں، پریشان نہ ہونا“
دادا جان نے امداد حسین کی انگلی پکڑ لی اور رسول اللہؐ کے دربار پہنچا دیا۔ دادا
جان نے امداد حسین کا ہاتھ رسول اللہؐ کے ہاتھ دیتے ہوئے کہا ”حضور! اسے میں آپ کے
حوالے کرتا ہوں آپ جیسا بھی مناسب سمجھیں اس کے لیے....“

رسول اللہؐ نے امداد حسین کا ہاتھ ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دیا اور فرمایا
”یہ امداد حسین ہے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے“

امداد حسین نے ان بزرگ کو غور سے دیکھا اور ان کی شکل و صورت حافظے میں محفوظ کر لی۔ جب میدان پہنچے تو ان پر عجیب حیرت و انتشار کی کیفیت طاری تھی لاکھ حافظے پر زور دے کر پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچاننے نہ جاتے۔ اسی حیرت و انتشار میں کچھ دن گزر گئے۔ امداد حسین نے مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا تھا اس پریشانی اور انتشار میں ان کی ملاقات اپنے اُستاد محدث جلال آبادی سے ہو گئی۔ اُستاد نے پریشان اور کھوٹے کھوٹے چہرے کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”امداد حسین! تم پریشان کیوں ہو؟ وجہ؟“

- امداد حسین نے آبدیدہ نظروں سے اُستاد کو دیکھا اور رقت زدہ لہجے میں اپنا خواب بیان کر دیا۔ بولے۔ ”جب سے یہ خواب دیکھا ہے میں ان بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کے ہاتھ میں رسول اللہؐ نے میرا ہاتھ دیا تھا“
- محدث جلال آبادی مسکرائے، بولے۔ ”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“
- امداد حسین نے آزر دگی سے جواب دیا۔ ”جب تک ان بزرگ سے میری ملاقات نہیں ہو جاتی۔ میں خود کو ناقص و نامتکمل محسوس کرتا رہوں گا اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کرتا رہوں گا۔“
- اُستاد نے کہا۔ ”موضع لوہاری یہاں سے قریب ہی واقع ہے وہاں چلے جاؤ لوہاری میں کسی سے بھی میاں جی نور محمد کا پتہ معلوم کر لینا جا کر ان سے مل لو۔ یہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری پریشانی اور انتشار کا حتمی علاج کر دیں گے۔“

امداد حسین نے اُستاد کو متشکرانہ نظروں سے دیکھا اور اسی وقت پا پیادہ لوہاری روانہ ہو گئے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے ان کے پیروں میں آبلے پڑ گئے وہ پھوٹنے لگے اور ان سے پانی جاری ہو گیا۔ لوہاری پہنچ کر لوگوں سے میاں جی نور محمد کا پتہ پوچھا تو انہوں نے امداد حسین کو اس مشہور بزرگ کے آستانے پر پہنچا دیا۔ آستانے میں داخل ہوتے ہی کسی نے میاں جی نور محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہیں حضرت میاں جی نور محمد مدظلہ“

امداد حسین نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں رسول اللہؐ نے جن کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا تھا یہ ذرا آگے بڑھے اور انہیں پُر شوق نظروں سے دیکھنے لگے پھر خود فتگی سے آگے بڑھے اور میاں جی نور محمد کے قدموں میں گر گئے میاں جی نے انہیں قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنے خواب پر یقین کا سہل

اور اعتبارِ اُلوق ہے؟

امداد حسین نے جواب دیا: ”حضرت! ایک ایسا خواب جس میں رسول مقبولؐ موجود ہوں شک و شبہ سے بالا ہوتا ہے میں اپنے خواب پر شک کس طرح کر سکتا ہوں اس کی صداقت پر مجھے پہلے بھی یقین تھا اب بھی یقین ہے۔“

میاں جی نور محمدؒ نے پوچھا: ”رسول اللہؐ نے تمہارا ماتھ کس کے ہاتھ میں دیا تھا؟“
”اے آپ کے ہاتھ میں؟“ امداد حسین نے جواب دیا: ”اپنے خواب کی صداقت پر یقین تھا ہی لیکن آپ نے جس طرح میرے خواب کا ذکر کیا ہے اس سے مجھے خود آپ کی ذات بابرکات میں فیض و کمالات کا بھی یقین ہو گیا ہے ورنہ ایک ایسا خواب جس کا آپ کو کوئی علم نہیں ہونا چاہیئے آپ اس سے واقف ہیں اور میرے بتائے بغیر آپ بتائے ہیں۔ یہ ایک ایسی کرامت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔“

میاں جی نے کہا: ”اچھا تم میرے پاس ہی رہو۔ میں رسول اللہؐ کا ادنیٰ غلام ہوں میں تمہاری مادی اور روحانی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔“

امداد حسین میاں جی کے ساتھ رہنے لگے اور ایک مدت ہی خرقہ خلافت حاصل کیا اس موقع پر میاں جی نے پوچھا: ”اب تاؤ تم کی چاہتے ہو؟“
امداد حسین نے جواب دیا: ”وہی جو خدا پسند کرتا ہے۔“

میاں جی نے کہا: ”جواب واضح ہونا چاہیئے، تسخیر کے طالب ہو یا کیا چاہتے ہو؟ جو چاہو طلب کرو، تمہیں بخش دیا جائے گا۔“

امداد حسین نے لگے کہا: ”میں نے دنیا کے لئے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے میں خدا کو چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے عظیم خدایات لے، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے۔“

میاں جی نے انہیں سینے سے لگایا۔ بولے: ”میں تمہاری علو پرستی کی داد دیتا ہوں، جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور خدا تمہیں مایوس نہیں کرے گا جو چاہتے ہو وہی ملے گا۔“
امداد حسین یہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچے تو اللہ اللہ کرنے لگے۔ ایک رات پھر خواب میں دیکھ کہ رسول اللہؐ انہیں یاد فرما رہے ہیں امداد حسین نے پوچھا: ”اب اس ناچیز کے لئے کیا حکم ہے؟“

رسول اللہؐ نے فرمایا: ”تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ ہمیں تمہارا انتظار ہے۔“

جب یہ جاگے تو فوراً سفر کی تیاری کر دی اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے وہاں ان کی ملاقات مولانا شاہ محمد اسحقؒ سے ہو گئی یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کے نو سے تھے انہوں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک چلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پورے برصغیر میں ایک پھیل چلائی تھی لیکن انہوں اور غیروں کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں نے انہیں ناکام بنادیا تھا اسی جہد و جد میں سید احمد شہید ہو گئے تھے شاہ محمد اسحقؒ کی تحریک کی ناکامی کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ وہ یہیں سے برصغیر کی قیادت فرما رہے تھے۔

انہوں نے نوجوان امداد حسین سے دریافت کیا: تمہارا نام کیا ہے؟
جواب ملا: امداد حسین!

شاہ اسحقؒ نے کہا: ”نہیں آج سے تم امداد حسین نہیں ہو، امداد اللہ کہلاؤ گے“
انہوں نے جواب دیا: بس روچشم، مجھے منظور ہے۔
شاہ اسحقؒ کی صحبت نے تو ان کی کامیابی پلٹ دی۔ انہیں یہاں سے جو تعلیم تھیں
میں وہ نہایت عجیب و غریب اور منفرد تھیں۔

شاہ اسحقؒ نے دریافت کیا: ”برصغیر کی کیا حالت ہے؟“

امداد اللہ نے جواب دیا: بہت بری حالت ہے مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت ہے۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام تاجرانہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ اب کئی کوچوں اور بازاروں میں شاہی منادیوں آواز لگاتا ہے ”سخلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا“، فسق و فجور عام ہے ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے کفار چاق و چوبند ہیں اور مسلمان تغافل اور تفاخر میں مبتلا ہیں۔
شاہ اسحقؒ نے کہا: ”تم ہندوستان واپس جاؤ گے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک اگے بڑھاؤ گے۔“

امداد اللہ نے پوچھا: شاہ ولی اللہ کی تحریک کی نصب العین کیا ہے اور وہ ہندوستان میں کیا انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے؟

شاہ اسحقؒ نے جواب دیا: ”تم نہیں شاہ صاحب کی تحریک کے نصب العین سے اچھی طرح باخبر کر دیں گے اور یہ تحریک کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے ان تدابیر پر بھی روشنی ڈالیں گے۔“
امداد اللہ شاہ اسحقؒ کے پاس رہنے لگے۔ انہیں یہ خیال بھی سنا تھا کہ رسول اللہؐ نے

انہیں طلب فرمایا ہے اور وہاں حاضری دینا ضروری ہے لیکن انہوں نے سوچا کہ پہلے شاہ صاحب کی تحریک اور اس کا نصب العین سمجھ لیا جائے کیونکہ اس تحریک بھی رسول اللہ کی منشا اور غایت ہی سے ہوگا۔



شاہ اسلمی نے ہندوستان کی بربادی اور تباہی کے دو سبب بتاتے ہوئے کہا۔
 ”شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی زبوں حالی کے دو بنیادی سبب معلوم کر لیے تھے پہلا سبب یہ ہے کہ ملک میں خاص خاص طبقے اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے کسی خاص امتیاز کی بنا پر مراعات حقوق کے مستحق قرار پائیں۔ یہ لوگ قاری، عالم، شاعر اور وہ سجادہ نشین درویش ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے پاتے ہیں ان کا مطیع نظر ملک اور قوم کی خدمت کرنا نہیں محض دریوزہ گری ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھیک کے نئے نئے ڈھنگ نکالتے ہیں مختلف جیلے بہانوں سے بادشاہ اور امراء سے رقیں وصول کرنا اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے ان مہذب دریوزہ گردوں کا ایک گروہ جاتا ہے تو دوسرا نازل ہو جاتا ہے یہ لوگ ملکی باشندوں کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک اور قوم پر بارگراں بنتے جاتے ہیں۔“

خرابی اور بربادی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، سودا گروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری محصول لگائے گئے ہیں اور ان کی وصولیابی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جبر و تشدد اور جھوک اور افلاس میں مبتلا و نادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے اس بغاوت کو دبانے کے لئے غیر معمولی فوجی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے اور اس غیر معمولی فوجی قوت کے مصارف بھی رعایا ہی سے جبر و تشدد سے حاصل کئے جاتے ہیں مہذب دریوزہ گردوں کی پرورش اور فوجی قوت کے غیر معمولی مصارف نے ملک اور قوم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔“

املا اللہ نے ملکی اور قومی تباہی اور بربادی کا یہ دل نشین اور پُر اثر تجزیہ متوجہ بنائی ہو گئے، پوچھا۔ پھر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کن باتوں پر منحصر ہے؟
 شاہ اسلمی نے جواب دیا۔ ”ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں محصول کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدر ضرورت صرف کیا جائے اور حالات ایسے پیدا کئے جائیں

کہ اندرونی تفاوت کا سامنا نہ کرنا پڑے ۵

یہ اتنا بڑا انکشاف تھا کہ اس کے بوجھ نے امداد اللہ کو گم صم کر دیا اور وہ اس مختصر تقریر پر گھنٹوں غور کرتے رہے۔ اُس وقت پورا ہندوستان اس کے سامنے تھا۔ پورا ہندوستان اور اس کا گھن لگنا معاشرہ اینسبقات کے ساتھ ایک ایک کر کے ان کے عرصہ خیال سے گزرنے لگا امر، شعرا، دنیا دار، سجادہ نشین، خانقاہوں کے مجاور، خود غرض اور زمانہ ساز علماء، یہ سب گدھوں کی طرح ملک اور قوم کے نیم جاں جسم سے چمٹے ہوئے نوپھنے کھانے میں مصروف دکھائی دے۔ ملک اور قوم کا نیم جاں جسم کاشت کاروں، دست کاروں، تاجروں اور مزدوروں کا تھا امداد اللہ نے سوچا کہ وہ تو ایک ایسی سمت میں جانے والے تھے جہاں دنیا اور اہل دنیا کی نفی ہو جاتی تھی لیکن خدا انہیں دنیا والوں کی طرف لے جا رہا تھا پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنے پیروں و مرشد حضرت میاں جی نور محمد سے طلب بھی تو یہی چیزیں کی تھیں۔ انہوں نے حضرت میاں جی سے کہا تھا میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے کوئی عظیم کام لے ایسی عظیم خدمات، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیضیاب ہو، فائدہ اٹھائے انہوں نے خیال کیا کہ ان کی خواہش پوری کی جا چکی ہے اور خدا ان سے جس نوع کی خدمات لینا چاہتا ہے وہ وہی ہیں جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی اور جن سے خدا کی مخلوق عظیم فائدہ اٹھائے گی۔ اب ان کا شاہ اسختی کی صحبت میں رہنے اور ان کی تقریریں سننے میں آنا بھی لگنے لگا کہ ہر وقت یہی جی چاہتا ہے کہ شاہ اسختی بولتے رہیں اور وہ سنتے رہیں۔

ایک دن شاہ اسختی نے کہا: ”کیا تم واقف ہو کہ رسول اللہ اس دنیا میں کیوں

تشریف لائے تھے؟“

امداد اللہ نے جواب دیا: ”واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو غرض و غایت آپ بتائیں گے وہ زیادہ حقیقی اور اعلا وارفع ہوں گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے جواب کے بجائے خودی اس سوال کا مفصل اور مشروح جواب غایت فرمادیں۔“

شاہ اسختی نے جواب دیا: ”رسول اللہ کی تشریف آوری کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ دنیا عیش و عشرت میں بُری طرح مبتلا تھی اور سلمانہ تکلفات کا مرض اقتصادی توازن کو دیکھ کر طرح چاٹ چکا تھا ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس کا ایسا علاج کریں کہ مرض بھی ختم ہو جائے اور اس کا زہر یلادہ بھی فنا ہو جائے چنانچہ

آپ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے ان مرض کے جراثیم نشوونما پاتے ہیں پھر آپ نے ان کا علاج کیا اور ایک صالح گروہ پیدا کر دیا۔

امداد اللہ نے بے بسی سے کہا: ”حضرت! آپ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں معیشت اور اقتصادیات پیش پیش ہیں آپ روحانیات کا ذکر بھی تو فرمائیں۔“

شاہ اسحق نے جواب دیا: ”تباہ حال معیشت اور بُری اقتصادِی حالت جسم اور روح دونوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اس لئے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کسی حال میں اور کسی وقت بھی۔“

اس دن شاہ اسحق نے انہیں جو تعلیم دی اور تلقیہ کے ذریعے جو کچھ بتایا وہ شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ سے لیا گیا تھا۔ شاہ اسحق نے شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

”اربابِ حکومت کا ٹھانڈا اور تفاخر ایک کا دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا (مرض) معاشرے کا مزاج بگاڑ دیتا ہے اس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگتا ہے زمیندار اور جاگیردار کا شت کاروں کا خون چوسنے لگتے ہیں اور جنھیں غریب مزدوروں اور دست کاروں پر اختیار ہوتا ہے وہ ان کے استیصال میں لگ جاتے ہیں اور بالآخر ماتحت طبقے اُترنے کر جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اور معیارِ زندگی کھیت جو تنے والے میلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں اور گھوڑوں کے مانند ہو جاتی ہے زرخشی اور زراعت و زری کے نئے نئے قانون بننے لگتے ہیں انسان کی پیالائش کا حقیقی مقصد انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ حد سے بڑھی ہوئی عیش اور دولت کی ہوس میں مبتلا ہو کر عقل و فکر کی چمک سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں رہتا ہے کہ ذکرِ فردا نام کی کوئی شے اس کے سامنے باقی نہیں رہتی اور اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک اور قوم کی تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ان چند افراد کا سربراہ بادشاہ ہوتا ہے۔“

امداد اللہ حیرت زدہ اور مبہوت پلک بھیپکائے بغیر شاہ اسحق کی تقریر سن رہے تھے یہ عجیب و غریب علم تھا عجیب انکشافات تھے۔ ان کے دل و دماغ پر انکار کا بوجھ کسی پہاڑ کی طرح گر رہا تھا اور وہ غمو کو اس میں دبا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ شاہ اسحق کی تقریر جاری

تھی وہ کہہ رہے تھے : اقتصادى عدم توازن اور طبقہ اعلا کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرے طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ طبقہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ ہے جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے رقیب وصول کرتا رہتا ہے ان میں خالقہ انشین اور شعرا بھی شامل ہیں۔ بھانڈے اور مسخرے بھی انہی میں شمار کئے جاسکتے ہیں فنون لطیفہ کے لوگ بھی انہی میں شامل ہیں فنون لطیفہ اور ادب اور شاعری کے لوگ بادشاہ کو ہمیشہ یاد رکھتے رہتے ہیں کہ شان و خرد کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔“

امداد اللہ نے سہم کر دریافت کیا : ”حضرت! اور کچھ؟“

شاہ اسحٰق نے کہا : ”ایسے تمام لوگ جنہیں لازماً تمدن مانا جاتا ہے درحقیقت مفت خوئے ہیں اپنے فانی خواہش کیوں سے بادشاہ کو خوش کرنا کوئی مقصد نہیں یہ مٹھی بھر لوگ مزدوروں اور کانون پر بار بن گئے ہیں اور اس طرح خدا کی بیشتر مخلوق روز بروز افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر مادی اور روحانی فلاح و بہبود سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور پورے ملک میں تمہیں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جسے عاقبت کی فکر ہو امداد اللہ! ذرا اس قوم کا قصہ تو کرو جس کی گردن پر بلوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ داری کا جھوٹا سوار ہو چکا ہو۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہو گی جسے دن رات پیٹ کی فکر رہتی ہو اور یہ جہنم ہے کہ بھرنے کا نام ہی نہ لے۔“

اسی طرح شاہ اسحٰق انہیں ہر روز تعلیم دیتے رہے اور امداد اللہ اسے ذہن و طبیعت میں محفوظ کرتے رہے۔ جب وہ ان امراض مزمنہ کے پیش نظر تحریر کیا اور اس کی کامیابی پر غور کرتے تو دل اُلجھ جاتا۔ کام بہت بڑا تھا اور اسے کامیابی سے چلانا نہایت غیر معمولی کام تھا کیونکہ اتنے بہت مائے امراض کا علاج کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، قوم اور ملک کے جسم میں جو امراض موجود تھے۔ ان میں بہت تو ایسے تھے جو درمضوں یا کسی مرضوں کے ٹل اور رد عمل سے پیدا ہوئے تھے اور ان میں ایک مرض کا علاج دوسرے کیلئے نہایت تھا ان پیچیدہ امراض کے علاج میں وہی مشکل درپیش تھی جو ایک معالج کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ مایوس اور بخار میں مبتلا کسی مریض کا علاج کرتا ہے

اگر محل لبح بخار کے فساد سے بچنے کے لئے ترک غذا کا حکم دیتا ہے تو ترک غذا سے مایوسیا میں شدت پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح مایوسیا کو زائل کرنے کے لئے اگر رمیض کو ابھی ابھی غذائیں کھانے کا مشورہ دیتا ہے تو بخار سے نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ اسحق کی صحبت اور تقریروں نے امداد اللہ کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی وہ جلد از جلد مدینہ منورہ جانے کے لئے بے چین تھے راستے میں خوش تھے اور راہ میں لٹ جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ امداد اللہ نے خوف و خطر کو دل سے دور کیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے مدینہ میں رسول اللہ ص کے آستانے پر حاضری دی اور جو درمہ داریاں اور فرائض انہیں سونپے جا رہے تھے اُن سے عہدہ برآ ہونے کی دعا مانگی۔

اس کے بعد آپ ہندوستان واپس گئے۔ اب ان کے زیر مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی جرحۃ اللہ الباقی تھی جس میں دیہی تعلیمات بالتفصیل موجود تھیں جو شاہ اسحق تقاری کی شکل میں دسے چکے تھے اس کتاب میں تکمل نظام، کی دعوت دی گئی تھی تکمل نظام کا مطلب تھا۔ ہمگیر انقلاب۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب اور اس انقلاب کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ فوجی طاقت سے برپا کیا جائے آپ نے جس جگہ قیام کیا تھا وہاں حسن علی شاہ نامی ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے امداد اللہ کو دیکھتے ہی انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور دوسری جگہ چلے گئے امداد اللہ کو یہاں یکسوئی سے بیٹھ کر ایک عظیم الشان منصوبہ بنانا تھا امداد اللہ کی تیز نظریں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ معنوی اور سیاسی زندگی کا ہر شعبہ اتنا داغدار تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں کہاں پھرایا رکھا جائے امداد اللہ جس جگہ قیام فرماتے تھے۔ حضرت میاں جی نور محمد ملاقات کو پہنچے اور مل کر بہوش ہوئے۔ پروس میں ایک ایسا خاندان بھی رہتا تھا جو اس جگہ کی ملکیت کا دعویدار تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ یہ جگہ حکومت اسے دے۔ میاں جی نور محمد کی بڑا بڑا شہرہ تھا وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی۔ حضرت آپ خلد سے جا کر کہ یہ جگہ سرکار میرے نام کر دے۔ آپ سبحان الدعوات ہیں خدا آپ کی دعاؤں سے کئے گئے، میاں جی نے فرمایا۔ ہم ایک شرط پر دعا کرنے کو تیار ہیں۔ اس شخص نے کہا۔ ارشاد میں ہر ممکنہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔

میاں جی نے کہا ”ہمارے امداد کو بیٹھنے کی تکلیف ہے اگر تم بعد قبضہ اس جگہ
ایک سہ درہ بنوانے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے حق میں دُعا کریں گے اور اس سہ درہ میں امداد اللہ
دیں گے“

اس شخص نے وعدہ کر لیا ”مجھے منطوق ہے آپ دُعا فرمائیں“
میاں جی نے جاتے جاتے کہا ”ہم دُعا کرتے ہیں، تم سہ درہ کی تعمیری کا بندوبست کرو“
کچھ عرصے بعد یہ شخص میاں جی کے پاس پہنچا اور انہیں حکومت کا وہ پروانہ دکھایا جس میں
سرسری طور پر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت نے اس کے حق ملکیت تسلیم کر لیا ہے اس شخص
نے خوش ہو کر کہا ”یہ سب کچھ آپ کی دُعا سے ہوا ہے“

میاں جی نے پوچھا ”لیکن تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟“
اس شخص نے ذرا منہ بنا کے جواب دیا ”جی ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن ایک
مشکل پیش آگئی ہے جس نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے“
میاں جی نے پوچھا ”کیسی مشکل؟ کچھ ہیں بھی بتاؤ“

اس شخص نے جواب دیا ”حضرت آپ سے کیا چھپانا، بات دراصل یہ ہے کہ میری مالی
حالت کچھ اچھی نہیں ہے اُس وقت میں نے آپ سے سہ درہ بنانے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب
جو اپنی مالی حالت پر غور کرتا ہوں تو خود کو اس کا اہل نہیں پاتا“

میاں جی نے بے نیازی سے پوچھا ”پھر اب کیا ارادہ ہے؟“
جواب ملا ”میں جزوی وعدہ پورا کر دوں گا یعنی پوری سہ درہ کی جگہ نصف تعمیر

کر دوں گا“

میاں جی نے لاپرواہی سے کہا ”اچھا آدھی ہی سہی، جیسی تمہاری مرضی“
یہ شخص واپس گیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ حاضر ہوا، اب اس کے ہاتھ میں حکومت
کا ایک اور کاغذ تھا اس نے یہ کاغذ میاں جی کی طرف بڑھا دیا۔ بولا ”حضرت غضب ہو گیا، ستم
ہو گیا، ذرا سے ملاحظہ تو فرمائیے“

میاں جی نے یہ کاغذ لے لیا اور پڑھنے لگے اس میں حکومت نے اس شخص کو اپنے
فیصلے سے مطلع کیا تھا کہ حکومت نے اس زمین کے مالک کے باپ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک
تم زندہ رہو گے اس زمین کے مالک ہو گے لیکن مرنے کے بعد اس کا حق ملکیت حکومت کو واپس

چلا جائے گا وہ جسے مناسب سمجھے گی دے دے گی ۔“

میاں جی نے پوچھا ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

اس شخص نے تقریباً روتے ہوئے کہا ۔ ”حضرت! آدمی جو محنت و مشقت کر کے جائیداد بناتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کی اولادیں یا متعلقین اس سے محروم رہیں آپ کو میرے معاملے میں ایک بار اور دُعا کرنا پڑے گی ۔“

میاں جی جواب دیا ”ہم دُعا کیا خاک کریں، تو نے تو خود ہی اُدھا کر دیا تھا۔ اب یہ شکایت کس بات کی؟“

اس شخص کی سمجھ میں معاملہ اُگیا بولا ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری سہ دری بنادوں گا، میں قول سے پھر جلنے پر نادم ہوں“

میاں جی نے کہا ”اچھا اب واپس جاؤ اور امداد اللہ کے لئے سہ دری بنوانے کی تیاری کرو۔“

چند دنوں بعد اس شخص کو حکومت کی طرف سے یہ اُطلاع موصول ہوئی کہ زمین کی ملکیت موروثی قرار پائی ۔ اس نے خوش ہو کر امداد اللہ کے لئے سہ دری تعمیر کرا دی ۔



امداد اللہ نے اپنے حصے کی جائیداد بھی بھائیوں کو دے دی اور خود عصرت اور تنگ دستی میں گزار کرنے لگے آنے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ان میں نہایت پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے ان پڑھے لکھے لوگوں سے ایک ایسی فہرست تیار ہونے لگی جو ہمہ گیر انقلاب میں ان کے ساتھی بننے والے تھے ۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمد رمضان اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرفہرست تھے ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے موضوع پر گفتگوں بحثیں ہوتیں اور ایک شاندار فوجی انقلاب لانے کی تدابیر زیر بحث آتیں ۔ آنے والوں میں ایک میر عبد الغنی بھی تھے ان کی آمد و رفت اچانک موقوف ہو گئی ۔ امداد اللہ نے کسی سے دریافت کیا ۔ ”کیا بات ہے کئی دن سے میر عبد الغنی نظر نہیں آئے“

کسی نے جواب دیا ”حضرت ان کا نہایت حسین و جمیل مکان انتقال کر گیا ہے اس مدے نے انہیں پاگل کر دیا ہے وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں بخوبی الحواس ہو گئے“

ہیں۔ ایں تو یوں بکرائیں۔“

آپ نے کہا: ”بھئی انہیں ایک بار ہمارے پاس تو لاؤ، ہم انہیں درست کریں گے۔“
جواب ملا: ”کوشش کریں گے۔ اگر آگئے تو آگئے ورنہ زبردستی لانا بہت مشکل ہے۔“
”بہر حال لانے کی کوشش کرو۔“

انتظار میں کئی دن گزر گئے اور میر عبد الغنی کو نہیں لایا جاسکا۔ ایک دن راہ میں
امداد اللہ کی ان سے ملاقات ہو گئی آپ نے جمبوظا الحواس میر عبد الغنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر ارشاد فرمایا: ”عشق بر مردہ نباشد پائیدار۔“

میر عبد الغنی نے بھر بھری لی اور ہوش میں آگئے بے اختیار سینے سے
لگ کر رونے لگے۔

اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ ان کا یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی
احوال کا جائزہ لیتے رہیں۔ اسی دوران شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف نے کچھ اور انکشافات
کئے، ایسے انکشافات جس سے دل و دماغ لرز جائیں اور جن کی صداقت ابدی تھی۔ شاہ ولی اللہ
اپنی کتاب میں یہ اصرار کر رہے تھے ”زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے لیکن ظاہری نظام کے لحاظ
سے مملکت ہے یا شاہ رکان ملک کی حیثیت کسی مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے مسافروں
جیسی ہے۔“

سائے انسان برابر ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ خود کو دوسرے
انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

ملک کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے سربراہ
وقف کے متولی کی طرح اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ ملک کے عام باشندے کی طرح زندگی گزار سکے۔
شاہ ولی اللہ کی اس کتاب میں اقتصادی اصول بھی موجود تھے یہ بھی اپنی نوعیت
اور تعریف کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب تھے ان میں وہ حقائق بیان کئے گئے تھے
جو عام فہم نہ تھے اور قبل از وقت تھے جن کے رواج کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے انسانوں میں
ذہنی انقلاب برپا کیا جاتا اور جو مستقبل کی قسمت تھے۔ مزدور اور کاشت کار جن کا
مرد شرے میں کوئی مقام نہ تھا ان کے لئے شاہ ولی اللہ نے یہ کھچا تھا۔

”دولت کی اصل بنیاد محنت ہے مزدور اور کاشت کار قوت کا سہ ہیں جب تک

کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے بلکہ کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔
مزدور اور کاشت کار اور وہ لوگ جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت
کے اصل مستحق ہیں، ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے جو نظام
ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لئے خطرہ ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر
بھاری محصول لگائے قوم کا دشمن ہے اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔
ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی قیمت
نہ ادا کی جائے جو مبادیہ باہمی کے اصول پر لازم آتی ہے۔

کام کے اوقات محدود کیے جائیں اور مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیئے کہ
وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت
پیدا ہو سکے۔

وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محصور کر دے، ملک کے
لئے تباہ کن ہے۔

روٹی، پکڑاؤ، مکان اور ایسی استطاعت کہ آدمی شادی کر سکے اور بچوں کو تعلیم
و تربیت دے سکے، بلا لحاظ مذہب، نسل، ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔
وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کی
وجہ سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو رہا ہو، اس کا ختم ہونا چاہیئے کہ اس کو جلد از جلد
ختم کر دیا جائے تاکہ عوام کی مصیبت ختم ہو جائے اور ان کو مساویانہ نظام زندگی کا
موت ملے۔

فوجی تیاریوں کو جہاد کا نام دیا گیا اور طے یہ پایا کہ پہلے مغل فرماں روا کو حمایت و
تائید میں لیا جائے اس کے بعد ملک کی سب سے بڑی قوت انگریز کے خلاف جنگ چھیڑ دی
جائے اور انہیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ایک فوجی تنظیم قائم کی گئی اور اس تنظیم
کا امیر امجد اللہ کو دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ
ضامن اور مولانا محمد مسعود کو فوج، حفاظت، عدل و قانون وغیرہ کے شعبے دیے گئے
اور یہ طے پایا کہ مغل تاجدار کو بھی اس تنظیم میں شامل کیا جائے۔ بادشاہ کے مندرجہ ذیل نواب

شبیر علی مراد آبادی کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ اس انقلابی تنظیم کے اغراض و مقاصد سے بادشاہ کو اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ انگریز بھی اس تنظیم سے غافل نہیں تھے اسی دوران رئیس تھانہ بھون قاضی غایت علی کے بھائی عبدالرحیم سہارنپور ہاتھی خریدنے تشریف لے گئے۔ سہارنپور کے انگریز مجسٹریٹ (اسپیکٹی) نے انہیں گرفتار کر لیا اور پچاسی پر لٹکا دیا۔

جنرل بخت خان دہلی میں فوجوں کی قیادت کر رہے تھے اور جنرل بخت خان کی نگرانی مولانا سر دار علی کر رہے تھے یہ مولانا بھی اسی تنظیم کے آدمی تھے اسی دوران امداد اللہ بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی پہنچ گئے انہوں نے جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا بادشاہ میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کرتا۔ ایک طرف تو وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا دوسری طرف وہ امداد اللہ کی تنظیم کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ بادشاہ میں قوت فیصلہ تھی ہی نہیں۔ جو سامنے آتا وہ اسی کے ساتھ ہو جاتا۔ اس کمزور دل اور مرغ بادشاہ کی طرح سمتیں بدلنے والے بادشاہ کی تائید سے اس انقلابی تنظیم کو یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی کہ دہلی میں صالح نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی ہے علامہ کرام نے اپنی طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا اور امیر تنظیم امداد اللہ پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ بھی فتوے کی توثیق کر دیں اس مقصد کے لیے ایک مجلس بلٹی اور معاملات مذکور زیر بحث آئے اس مجلس کا ایجنڈا تھا: "اعلان جہاد"۔

اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام (جہاد) کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی نے مخالفت کی۔ مولانا محی قاسم نانوتوی نے شیخ محمد کو مخاطب کرتے ہوئے ادب سے عرض کی: "حضرت! کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین (انگریزوں) پر جہاد کو فرض بلکہ جائز تک نہیں قرار دے رہے؟"

مولانا محمد محدث نے جواب دیا: "اس لیے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد موجود نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔"

مولانا قاسم نانوتوی نے کہا: "کیا ہمارے پاس اتنا سامان بھی موجود نہیں جتنا کہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا؟"

مولانا محمد محدث نے کہا: "اگر آپ کی تمام جھٹیں اور باتیں مان لی جائیں تو سب بڑی

مشروط جہاد نصب امام کی ہے وہ شخص کہاں ہے جسے امام بنا کر، اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟
 مولانا قاسم، امداد اللہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے ”نصب امام میں کتنی دیر لگتی ہے
 مرشد بیعت حضرت حاجی امداد اللہ ہم میں موجود ہیں انہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔“
 شریک مجلس اور جنگی امور کے نگران مولانا فاضل نے کہا ”مولانا سب سے پہلے بات سمجھ
 میں آگئی۔“

اس کے بعد مجلس کے سبھی حضرات، امداد اللہ کی طرف بڑھے اور آپ کے ہاتھ پر
 بیعت کرنے لگے اس کے بعد سرفروشنوں کا قافلہ شاملی (منظر منظر) کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں
 کا راجا پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ حاجی امداد اللہ تو
 امام تھے اور مولانا قاسم ناٹو توسی سپہ سالار۔ مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی۔ مولانا منیر اور
 حافظ ضامن مینہ اور میسرہ کے افسر تھے ان لوگوں کے اس پاس لوگ جمع ہونے لگے
 اور بہت جلد اتنی طاقت ہو گئی کہ تھانہ بھون کے اس پاس سے انگریزوں کے ماتحت حکام
 نکال دیے گئے اور ان حضرات نے یہاں کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اسی دوران میں انھیں
 خبر ملی کہ انگریزی توپ خانہ حرکت میں آچکا ہے انگریزی توپ خانہ جدید اسلحہ سے
 لیس تھا اس کے برعکس ان حضرات کے پاس تلواریں تھیں توڑے دار بند و قیں تھیں اور
 برہمچے تھے۔ توپ کسی کے پاس بھی نہ تھی جب انگریزی توپ خانہ ایک باغ کے کنارے سے
 گزر رہا تھا۔ تو باغ میں چھپی ہوئی جمعیت نے اس پر جانک حملہ کر دیا اور سراسیمہ اور
 بدحواس انگریزی توپ خانے والوں کو شکست دے کر سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شاملی
 پر بھی قبضہ کر لیا گیا یہ مقابلے جاری ہی تھے کہ حافظ ضامن شہید ہو گئے کہتے ہیں انگریزوں
 کے خلاف معرکہ آرائی میں شہید بزرگ حضرت فضل الرحمن گنج مراد آبادی بھی شریک تھے
 میں جنگ کے دوران یہ انگریزوں کے مقابلے سے ہٹ گئے اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے
 ایک طرف روانہ ہو گئے، کسی زمانے سے سوال کیا ”حضرت! آپ کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟“
 مولانا فضل الرحمن نے جواب دیا ”انگریزوں سے جنگ کرنے کا فائدہ؟ میں نے
 ان کی صفوں میں خواجہ خضر کو دیکھا ہے تم لوگ ناکام رہو گے۔“

اسی عالم میں یہ معلوم ہوا کہ دہلی پر انگریز قابض ہو گئے اور مغل بادشاہ گرفتار کر لیا گیا
 دہلی کے تسلط کے بعد انگریزوں نے قرب و جوار کو سر کرنا شروع کر دیا۔ شاملی، سہانپور

اور مظفر نگر کی باری بھی اگنی حاجی امداد اللہ کی جماعت نے انگریزوں کو لوٹنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے تحریک کے بنیادی ارکان ادھر ادھر اور پھیل چکے انگریزی حکومت نے ان کے نام وارنٹ جلدی کر دیے حاجی امداد اللہ پنچلاسہ (انبالہ پنچ گتے یہاں کارٹیس راؤ عبداللہ خان آپ کا بہت معتقد تھا۔ انگریزوں کا وفادار لیکن آپ کا ارادت مند۔ کوئی دوسرا ہوتا تو حاجی امداد اللہ جیسے باغی کو اپنے گھر میں ہرگز پناہ نہ دیتا۔

راؤ عبداللہ خان آپ کو تخیلے میں لے گیا اور آہستہ سے سوال کیا۔ حضرت رات کی تاریکی میں بیان تک آتے ہوئے آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟
آپ نے جواب دیا۔ راؤ عبداللہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ ہم تمہارے گھر میں نہیں آئیں گے، راؤ نے عقیدت سے کہا۔ پنچلاسہ میری جاگیر ہے اس جاگیر میں میرے ہوتے ہوئے آپ کہیں اور نہیں بٹھر سکتے۔

آپ نے فرمایا۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ تمہارا گھر میں نہیں رہیں گے کیونکہ فرنگی ہیں ہمارے نقش پا کے سہاگے ڈھونڈتے چلے آ رہے ہیں۔

راؤ ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا بولا۔ "حضرت! میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا۔"
آپ نے جواب دیا۔ ہم تمہارے اصرطیل کی اس کوٹھری میں رہ لیں گے جس میں تم اپنے مویشیوں کا چارہ وغیرہ رکھا کرتے ہو۔

راؤ کو آپ کی بات سے دکھ پہنچا بولا۔ "یہ میں کس طرح گوارا کر سکتا ہوں کہ آپ میری موجودگی علم اور جاگیر داری میں ایسی بُری جگہ اقامت فرمائیں۔"

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "جو ہم کہتے ہیں اس میں تم دخل مت دو کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اور تمہاری بہتری اسی میں ہے۔"

راؤ نے ہر طرح پر کوشش کی کہ حاجی امداد اللہ اپنی اقامت کے لئے کوئی اور جگہ پسند فرمائیں لیکن یہ نہیں ملنے اور مجبوراً آپ کی جائے نماز، لوٹا اور ایک چوکی انویشیوں کے چارے گھاس کی کوٹھری میں پہنچا دی گئیں۔



فجر کی نماز سے فارغ ہو کر راؤ عبداللہ خان کوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے حاجی صاحب کی کوٹھری میں پہنچا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا اور حاجی صاحب نماز اشراق اور آواز

تھے راؤ عبداللہ خان انہیں نمازیں مشغول دیکھ کر فاپس آگئے یہ ابھی اپنی جویلی کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی سپاہ کی ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ انگریز کلکٹر آگے آگے ہتھیار کھینچے ہوئے ساتھ ہی مجسٹریٹ ضلع بھی تھا۔ راؤ عبداللہ خان اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر کھٹکا اور خطرے کی بوجھوس کرنے لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ جو نہا ہے ہو کر رہے گا عاجز اور بے بس انسان کا مشیت ایزدی میں کیا دخل، ہمت کر کے مجسٹریٹ کے استقبال کو آگے بڑھا اور سلام دعا کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا: ”جناب والا! نہ ہے نصیب۔“ کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ خوش قسمتی۔ بلند طالعی، آئیے تشریف لائیے اس وقت صبح نہت نعمت فرمائی کا کوئی تو مقصد ہوگا، براہ کرم اس سے مطلع فرما کر اس ناچیز کو خدمت گزاری کا موقع عطا فرمائیں۔“

”مجسٹریٹ راؤ کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوا۔ کہاں تو یہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ: ”اچانک چھاپہ مگر حاجی امداد اللہ کو برآمد کر کے کالین راؤ کے اطمینان، اعتماد اور خوش اخلاقی نے اسے تذبذب کر دیا۔ اسے جس مخبر نے خبر دی تھی اُس نے یہاں تک بتا دیا تھا کہ حاجی صاحب اصطبل یا اس کے اس پاس موجود کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں روپوش ہیں مجسٹریٹ کو یقین تھا کہ وہ حاجی صاحب یہیں کہیں سے برآمد کر لے گا۔ راؤ عبداللہ خان کی خوش اخلاقی کا پُر جوش خوش اخلاقی سے جواب دیا۔“ راؤ صاحب! ہم نے یہ سن رکھا ہے کہ آپ کے اصطبل میں بڑے پچھلے پچھلے اور اعلا نسل کے گھوڑے موجود ہیں اور ان میں ایک ایسا گھوڑا بھی موجود ہے جس کی دور دور تک کوئی مثال نہیں ملتی ہم تمہارا اصطبل دیکھنا چاہتے ہیں اور خاص کر وہ گھوڑا بھی، جس کا دور دورہ شہر ہے۔“

راؤ عبداللہ خان ستائے میں آگیا لیکن اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا: ”جو کچھ آپ نے سنا ہے ممکن ہے سچ ہی ہو۔ اگر آپ کو ہمارے اصطبل کا کوئی گھوڑا پسند آگیا تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اور ہم وہ گھوڑا بخوشی آپ کی نذر کر دیں گے، آئیے ہمارے ساتھ تشریف لائیے اور اصطبل کے گھوڑے ملاحظہ فرمائیے۔“

مجسٹریٹ راؤ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے اصطبل میں داخل ہو گیا۔

راؤ عبداللہ خان نے ایک ایک کر کے اصطبل کے تمام گھوڑے دکھائیے مجسٹریٹ گھوڑوں کے ساتھ ساتھ راؤ کے چہرے کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا وہ راؤ کے چہرے پر غور

یا تشریش کے آثار دیکھنا چاہتا تھا لیکن راؤ میں ذرا بھی گھبرائٹ نہ پائی جاتی تھی مجسٹریٹ کو اس خبر پر غصہ آنے لگا جس نے اسے یہ جھوٹی خبر دی تھی کہ حاجی امداد اللہ راؤ عبداللہ خان کے اصطلیل وغیرہ میں کہیں روپوش ہیں مجسٹریٹ اصطلیل کے گھوڑوں کو دیکھتا تھا لا اس کو ٹھہری کے دروازے پر بھی پہنچ گیا ۔ جہاں حاجی صاحب واقعی روپوش تھے ۔

مجسٹریٹ نے راؤ سے پوچھا ” اور اس میں کیا ہے ؟ “
راؤ نے جواب دیا ” یہ اصطلیل نہیں ہے اس میں گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا رکھا جاتا ہے “

مجسٹریٹ نے پیشانی پر تردد کی سکین ڈالیں بولا ” گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا کیا مطلب ؟ کیا مویشی گھاس کے علاوہ بھی کچھ کھاتے ہیں ؟ “

راؤ نے جواب دیا ” جی ہاں، دالیں، کھلی، چوکر، کرنی، اسی طرح کی اور بہت ساری چیزیں “
مجسٹریٹ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا ” ذرا کھلوانا تو، ہم بھی تو دیکھیں کہ مویشی کون کون سی چیزیں اور کھاتے ہیں “

راؤ کا دل دھک دھک کرنے لگا اللہ کا نام لے کر یہ کوٹھری بھی کھلوا دی ۔ جب کوٹھری کے دونوں پہل کھلے تھے تو راؤ کے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی کوٹھری کے دونوں پہل کھل گئے خالی چوکی، چوکی پر بچھا ہوا مصلّا، کنا سے لٹا رکھا تھا اور چوکی کے نیچے کی زمین تر تھی گویا ابھی ابھی وضو کیا تھا یہ تمام چیزیں موجود تھیں لیکن حاجی امداد اللہ کا کہیں پتہ نہ تھا ۔

مجسٹریٹ نے اپنے آدمیوں کی مدد سے کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن حاجی امداد اللہ کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا مجسٹریٹ چوکی، مصلّا اور لوٹے کی موجودگی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا ۔
دریافت کیا ” راؤ صاحب یہ سامان یہاں کیوں رکھا ہے ؟ “

راؤ نے جواب دیا ” جناب میں یہاں نماز پڑھتا ہوں “

مجسٹریٹ نے گردن اچکائی اور قہر سے منہ میڑھا کیا ” آپ اس اصطلیل میں مویشیوں کے چارے کی کوٹھری میں نماز پڑھتے ہیں ؟ عجیب سی بات ہے حالانکہ ہم نے یہ سنا ہے کہ مسلمان لوگ مسجد میں نمازیں پڑھتے ہیں “

راؤ نے جواب دیا ” آپ نے بھی درست ہی سُن رکھا ہے ہمارے مذہب میں نمازوں کی بابت یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان فرض نمازیں تو مسجد میں ادا کرے لیکن تقلید چھپا کر کسی چوری کی

جگر پر پڑھنی چاہئیں اور اس حکم خداوندی کی تائید اور تعمیل میں ہم لوگ اشراق اور نفل نمازیں یہیں پڑھ لیا کرتے ہیں ۔

لاجواب مجسٹریٹ یا یوس ہو کر باہر نکلا اور اپنی راہ لینے سے پہلے آخری بار کہا ۔ ”راؤ صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہارا اتنا وقت برباد کیا ہے اس کا ہمیں نہ احساس ہے گا۔“
 راؤ نے انکار سے جواب دیا ۔ ”آپ قطعی افسوس نہ کریں کیونکہ آپ کو کسی اعلان کے گھوڑے کی تلاش تھی جو بد قسمتی سے ہمارے یہاں نہ نکل سکا لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی مطلوبہ شے نہ پاسکیں ۔ آپ مجھے ایک ذرا ساموئیل غایت فرمائیں ۔ میں آپ کی خواہش کسی بھی طرح پوری کر ادوں گا۔“

مجسٹریٹ نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور چلا گیا ۔ راؤ دوبارہ اسی کوٹھری میں داخل ہوا دیکھا ، حاجی امداد اللہ نماز پڑھ رہے ہیں اس کی عقل جگر آگئی ۔ وہ کوئی سوال بھی نہ کر سکا اور اسے ان کی کرامت پر محمول کیا ۔

حاجی امداد اللہ کی طرف سے مولانا رشید گنگوہی بہت بے چین اور مضطرب تھے انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ حاجی صاحب کہاں روپوش ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں آزادی سے کہیں ملاش بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا وارنٹ گرفتاری بھی کٹ چکا تھا اور وہ بھی انگریزوں کے مطلوب تھے اسی افراتفری میں کسی نے مولانا رشید احمد کو یہ خبر دی کہ حاجی امداد اللہ انبالہ کی جاگیر پنجلا سے میں راؤ عبداللہ خان کے مہمان ہیں ۔ یہ چھپتے چھپاتے پنجلا سے کے قریب پہنچ گئے اور بڑی قوت تمام ملاقات کر لیں کامیاب ہو گئے یہ بہت بڑے اور دھیان والے تھے ۔
 ”حضرت! اب کیا منصوبہ ہے؟“

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا ۔ ”مشیت کو ابھی وہ سب منظور نہیں شاید جو ہم چاہتے ہیں اور وہ یہی کام شاید کسی اور سے لینا چاہتی ہے۔“

مولانا گنگوہی نے سوال کیا ۔ ”حضرت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا ۔

”ہماری باتوں کا جو مطلب ہے وہ بہت صاف ہے ہم ایک معتمد جا رہے ہیں اور وہیں سے اپنی تحریک جاری رکھیں گے۔“

مولانا گنگوہی نے پوچھا ۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

حاجی صاحب نے جواب دیا: ”تم یہیں ہندوستان میں رہو گے۔“
 مولانا گنگوہی نے اضطراب سے پوچھا: ”میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں کیا کروں گا؟“
 حاجی صاحب نے جواب دیا: ”قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسی لئے ہم یہ
 چاہتے ہیں کہ تم یہیں رہو اور فرمان خداوندی کا انتظار کرو۔“
 مولانا گنگوہی کا دل بھر آیا اور وہ آنسو برسانے لگے حاجی صاحب نے پوچھا: ”تم روئے کیوں

ہو؟

مولانا گنگوہی نے جواب دیا: ”آپ کی مفارقت کا غم ایسا نہیں ہے کہ آسانی سے جھیل یا
 جاؤں، بہر حال آپ فرماتے ہیں تو ہم یہیں ہندوستان میں رہیں گے اور وہ کام انجام دینے کی کوشش
 کریں گے لیکن ایک بات طے ہے وہ یہ کہ جلد یا بدیر انگریز نہیں گرفتار کر لے گا اس وقت آپ سے
 ملاقات کی کیا سیل ہوگی؟“

حاجی صاحب نے جواب دیا: ”تم واقعی گرفتار کر لئے جاؤ گے لیکن ہم بھی یہ وعدہ کرتے
 ہیں کہ جانے سے پہلے تم سے ملیں گے ضرور۔“
 مولانا گنگوہی واپس گئے اور گرفتار کر لئے گئے۔

حاجی امجد الدہ کو ایک بار پھر انگریزی دوا کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی صاحب جن مکان میں
 قیام فرماتے تھے پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت حاجی صاحب مکان کے کھلے حصے میں چارپائی پر
 دراز تھے۔ یہ مکان ایک زمیندار کا تھا سپاہیوں کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر زمیندار
 نے نوکروں کو حکم دیا: ”تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ
 لوگ آئے ہیں ان کی مدد کرو اور مکان کے اندر اور باہر ان کی رہنمائی کرو،“ پھر حاجی صاحب کے
 اوپر لماف ڈال دیا۔ اور ڈانٹ کر ملازمین کو حکم دیا: ”اس بڑھے کو کھیت میں ڈال دو، اس
 نے کھانسی کھانسی کے اور تھوک تھوک کے ساتھ گھر کو گندا کر رکھا ہے۔“

ملازمین نے سپاہیوں کی موجودگی میں حاجی صاحب کی چارپائی کو سرہانے اور پائنتی
 سے پکڑ کر اور کھیت میں ڈال آئے سپاہیوں نے انہیں گھر کے کونے کونے میں چھان مارا اور
 بے نیل و دمرا واپس گئے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مظفرنگر کی گڑھی پختہ میں بھی پیش آیا تھا اس زمانے میں گڑھی
 پختہ سہارنپور میں داخل تھی۔ یہاں کے رئیس نے حاجی صاحب کو پناہ دی۔ لیکن خبروں نے

جھڑیل صلح کو مطلع کر دیا اور پولیس کپتان گارڈ لے کر رئیس کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ اس علاقے کے تھانے دار خواجہ احمد حسین تھے انہیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے حلقے میں، اس علاقے کے جس رئیس کی حویلی میں چھاپہ پڑ رہا ہے وہ حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کی کوششوں سے تعلق رکھتا ہے حویلی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غالباً حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے لیکن اب معاملہ بہت آگے پہنچ چکا تھا اور نیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ذہن کو ایک عجیب غریب سوچ گئی۔ انہوں نے حویلی کے دروازے پر ہی سے چلا نا شروع کر دیا۔ حویلی کے رئیس کا نام لے لے کر گایاں دینا شروع کر دیں اور دھونس دیتے ہوئے کہا: ”کہہ رہے اوٹک حرام۔ ذرا باہر تو نکل، سرکار کے باغیوں کو اپنی حویلی میں پناہ دیتا ہے خدا کی قسم آج دیکھنا ہے کہ تو کس طرح بچتا ہے اس جرم میں اگر تیرا علاقہ ضبط نہ کر لیا ہو تو خواجہ احمد حسین نہیں، بھسکی کہلا ناپسند کر دوں گا“

رئیس کے کانوں میں یہ آواز جو پڑی تو اس نے فوراً حاجی صاحب کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور چھاپہ بھی ناکام رہا۔



مولانا گنگوہی قید خانے میں اذیتیں بھیل رہے تھے انہیں حاجی صاحب کی انتظار تھا وہ پریشان تھے کہ حاجی صاحب ان سے کس طرح ملاقات کریں گے اگر وہ یہاں حسب وعدہ ملنے آئے بھی تو فوراً گرفتار کر لیے جائیں گے اور مولانا گنگوہی کو یہ منظور نہ تھا کہ حاجی صاحب گرفتار کر لیے جائیں۔

ایک دن عصر سے کچھ پہلے مولانا گنگوہی نے نیم غنودگی میں دیکھا کہ حاجی صاحب ان کے سامنے کھڑے ہیں اور کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔

مولانا گنگوہی نے حیرت سے پوچھا: ”حضرت! یہ آپ! یہاں تک کس طرح پہنچ گئے کیا باہر پہرے دار موجود نہیں ہیں؟“

حاجی صاحب نے جواب دیا: ”وہ موجود ہیں لیکن ہم نے تم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ملاقات ضرور کریں گے چنانچہ اپنا وعدہ پورا کرنے آگئے ہیں اب ہم سرزمین حجاز جا رہے ہیں“

مولانا گنگوہی اس ہو گئے بولے: ”لیکن پہرے داروں نے آپ کو یہاں تک

جسٹریٹ ضلع کو مطلع کر دیا اور پولیس کپتان گارڈس لے کر رئیس کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ اس علاقے کے تھانے دار خواجہ احمد حسین تھے انہیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے حلقے میں، اس علاقے کے جس رئیس کی حویلی میں چھاپہ پڑ رہا ہے وہ حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کی کوششوں سے تعلق رکھتا ہے حویلی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غالباً حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے لیکن اب معاملہ بہت آگے پہنچ چکا تھا اور تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ذہین کو ایک عجیب غریب سوچھ گئی۔ انہوں نے حویلی کے دروازے پر ہی سے چلا نا شروع کر دیا۔ حویلی کے رئیس کا نام لے لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں اور دھونس دیتے ہوئے کہا۔ ”کدھر ہے اونٹک حرام۔ ذرا باہر تو نکل، سرکار کے باغیوں کو اپنی حویلی میں پناہ دیتا ہے خدا کی قسم آج دیکھنا ہے کہ تو کس طرح بچتا ہے اس جرم میں اگر تیرا علاقہ ضبط نہ کر لیا ہو تو خواجہ احمد حسین نہیں، بھنگی کہلا پائند کروں گا۔“ رئیس کے کانوں میں یہ آواز جو پڑی تو اس نے فوراً حاجی صاحب کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور چھاپہ بھی ناکام رہا۔



مولانا گنگوہی قید خانے میں اذیتیں کھیل رہے تھے انہیں حاجی صاحب کی انتظار تھا وہ پریشان تھے کہ حاجی صاحب ان سے کس طرح ملاقات کریں گے اگر وہ یہاں حسب وعدہ ملنے آئے بھی تو فوراً گرفتار کر لیے جائیں گے اور مولانا گنگوہی کو یہ منظور نہ تھا کہ حاجی صاحب گرفتار کر لیے جائیں۔

ایک دن عصر سے کچھ پہلے مولانا گنگوہی نے نیم غنودگی میں دیکھا کہ حاجی صاحب ان کے سامنے کھڑے ہیں اور کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔

مولانا گنگوہی نے حیرت سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ! یہاں تک کس طرح پہنچ گئے کیا باہر پہرے دار موجود نہیں ہیں؟“

حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ”وہ موجود ہیں لیکن ہم نے تم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ملاقات ضرور کریں گے چنانچہ اپنا وعدہ پورا کرنے آگئے ہیں اب ہم سرزمین حجاز جا رہے ہیں۔“

مولانا گنگوہی اس ہو گئے بولے۔ ”لیکن پہرے داروں نے آپ کو یہاں تک

کس طرح آنے دیا ہیکل واپس جاتے ہوئے آپ کو گرفتار نہیں کر لیں گے ؟
 حاجی صاحب واپس جاتے ہوئے بولے ”ہم جس طرح آئے ہیں اسی طرح واپس بھی چلے
 جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو“

مولانا گنگوہی نے پوچھا ”حضرت! میرا کیا انجام ہوگا؟“
 حاجی صاحب نے جواب دیا ”تم فکر نہ کرو“
 اس کے بعد حاجی صاحب پاک پٹن چلے گئے کچھ دن وہاں رہے یہاں سے حیدرآباد
 سندھ میں داخل ہو گئے اور حیدرآباد سندھ سے رخصت ہو کر کراچی میں قیام کیا، کراچی سے
 مکر معظمہ چلے گئے۔

اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آپ منارک حج ادا فرما رہے تھے کہ یکایک اپنے ایک
 ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے اور افسردگی سے فرمایا ”کچھ اور سنا مرنے؟ آج تو غضب
 ہو گیا۔“

ساتھی نے گو مگو جواب دیا ”کیا ہوا حضرت! میں نے تو کچھ بھی نہیں سنا“
 آپ نے گردن جھکائی اور افسوس کہا ”رشید احمد کو پچھانسی کا حکم ہو گیا۔ بہت برا ہوا“
 ساتھی نے پوچھا ”کس نے بتایا؟“

آپ نے جواب دیا ”بتائے گا کون، بس ابھی ابھی پتہ چلا ہے“
 ساتھی حیرت سے صورت دیکھتا رہا کہ آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا ”بہر حال
 ہم پچھانسی نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں اتنی دور سے جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔“
 ساتھی کی سمجھ میں یہ باتیں تو آہی تھیں لیکن وہ اس کی تفصیل جاننے کا خواہش مند تھا۔
 اس بات کو ٹھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ اٹھے اور مولوی ولایت حسین اور مولوی
 مظفر حسین کا ندھلوی کو اپنے ساتھ لیا اور شہر سے باہر چل پڑے بارش شروع ہو چکی تھی
 پانی سے دھل کر سبزہ جوان ہو گیا تھا۔ اپنے دونوں ہمراہیوں کو لے کر آپ بڑے پریشانی سے اور
 گردن جھکا کر خاموشی اختیار کی۔ دونوں ساتھی چہرے کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتے رہے۔
 پھر سر اٹھایا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لکھیل رہی تھی، بولے ”چلو اٹھو واپس چلیں کام ہو گیا“

مولوی ولایت نے سوال کیا ”کیسا کام؟ کس کا کام؟ کہاں ہو گیا کام؟“
 حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، بولے ”رشید احمد کو اب پچھانسی نہیں دی

جاٹے گی۔ پھانسی کا حکم مل گیا۔
 کچھ دنوں بعد مولانا گنگوہی کی سزائے موت اور اس کی منسوخی کی خبر اسی ترتیب سے
 موصول ہو گئی۔

مکتہ معظمہ میں امیر احمد رامپوری بھی قیام فرماتھے۔ یہ صاحب بھی انگریزوں کو درکار
 تھے گرفتاری کے ڈر سے وطن جانے کا خیال تک دل میں نہ لاتے تھے ایک دن گھر کی
 یاد آگئی اور یہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے، حاجی صاحب نے صوت دیکھتے ہی
 کہا: ”ہندوستان جانا چاہتے ہو؟ جاؤ لیکن گرفتار ہو جاؤ گے۔“

امیر احمد نے خاموشی اختیار کر لی لیکن ایک دن پھر حاضر ہوئے اور اپنا پُرانا جملہ
 ایک بار پھر دھرایا۔ حاجی صاحب کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں اور آپ نے ترش لہجے میں کہا۔
 ”کیا تم گرفتار ہونا چاہتے ہو؟ اگر جی گرفتاری پر مائل ہے تو تم اسی وقت ہندوستان چلے جاؤ۔“
 امیر احمد نے جواب دیا ”حضرت! کون ہے وہ شخص جو اپنی گرفتاری سے خوش ہوگا۔“
 آپ نے کہا ”تو خوش ہوگا، ہمیں معلوم ہے تو خوش ہوگا، جا چلا جا اور دیکھ کر کیا چیز

ظاہر ہوتی ہے۔“
 کسی شخص نے امیر احمد سے تخیل میں کہا ”جناب! آپ ہندوستان فوراً روانہ ہو جائیں
 قبلہ حاجی صاحب جیسا فرماتے ہیں انشاء اللہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوگا۔“

امیر احمد رامپوری اللہ کا نام لے کر ہندوستان میں داخل ہو گئے دہلی پہنچ کر
 ایک مسجد میں قیام کیا۔ سکون اور اطمینان کا سبب یہ تھا کہ حضرت مبہم لفظوں میں رہائی
 کا حکم فرما چکے تھے امیر احمد نے چند دن حجرے میں رہ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش
 کر دیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ دانت پلس پلس کر رہ جانا اور یہی کہتا کہ ”امیر احمد! میں
 تمہیں داریہ نہ پٹرھاؤں تو میرا نام نہیں۔“

امیر احمد نے تحارت سے جواب دیا ”کیا تم پاگل ہو؟ کیا اوٹ پٹانگ حرکتیں کر
 رہے ہو؟“

مجسٹریٹ نے کہا ”پاگل ہم نہیں، تم ہو گئے ہو۔“
 اس کے بعد انہیں جیل بھیج دیا گیا اور مقدمات چلنے لگے آخر کار انہیں تمام مقدمات
 سے بری کر دیا گیا اور یہ اپنے گھر رامپور چلے گئے۔

میرٹھ کی نواحی آبادی کے ایک صاحب حج کے لئے جا رہے تھے انہیں حاجی امداد اللہ سے غائبانہ اور والہانہ عقیدت تھی۔ انہوں نے حاجی صاحب کا نام ہی نام سنا تھا، صوت نہیں دیکھی تھی۔ ان صاحب حج پر روانگی سے پہلے حاجی امداد اللہ کے لئے ایک کلمی تیار کرائی اور اسے دوسرے سامان کے ساتھ لے کر حج کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب ان کا جہاز سمندر میں پہنچو لے کھاتا جہاز کے طرف بڑھ رہا تھا کہ یہ یکایک طوفان میں پھنس گیا، مسافروں پر اتنی دہشت اور بدحواسی طاری ہوئی کہ بے معنی شور مچا کرنے لگے عجیب اذیت فوری اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ انسانی فطرت کا تضاد جہاز پر ہر سونظر آ رہا تھا کچھ خوف سے موت کا استقبال کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے آس پاس موجود اپنے عزیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور موت اور اپنی ذات کے سوا انہیں کچھ نظر ہی نہ آ رہا تھا کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو موت کا استقبال اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ خوش دلی سے کرنا چاہتے تھے حاجی امداد اللہ کا پرستار اور معتقد جہاز کے ایک کونے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ مایوسی اور دل شکستگی نے دل کا بیج جال کر رکھا تھا وہ جہاز سے پہلے ہی دم بہ دم ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں ذرا غفلت سی طاری ہو گئی۔ اس غفلت میں اس شخص نے دیکھا کہ کوئی صاحب سامنے کھڑے اس سے کہہ رہے ہیں کہ: حاجی امداد اللہ کی کلمی کہاں ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: ”حضرت! آپ دیکھ نہیں رہے کہ جہاز طوفان میں پھنسا ہوا ہے

ذرا دیر بعد ہم سب اور یہ جہاز کلمی سمیت سمندر کی تہ میں چلا جائے گا“

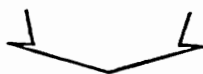
ان بندگان نے متبسم ہو کر فرمایا: ”پریشان مت ہو، اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ کون کہتا ہے کہ یہ جہاز ڈوب جائے گا، تھوڑی ہی دیر بعد موافق ہوا میں چلنے والی ہیں اور یہ جہاز طوفان سے بچنے لگے گا، اس کے بعد کہا: ”لاؤ وہ کلمی تو دے دو مجھے“

یہ شخص گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ کلمی ان صاحب کے حوالے کر دے لیکن جب ہوش و حواس ذرا بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ سامنے وہ شخص موجود ہی نہیں ہے اس واقعہ کو خواب یا رویائے صادقہ کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا تھا اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب جہاز طوفان میں نہیں ڈوبے گا اس شخص نے اس واقعہ کا ذکر کیے بغیر جہاز کے تمام مسافروں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ جہاز نہیں ڈوبے گا۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ شخص موت کے خوف سے پاگل ہو گیا ہے اور جو کچھ بشارت دے رہا ہے دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن نیول نے کاش بشارت حرف

ایک انسانی کردار جو زندہ ہو گیا تھا۔
 ایک حیرت انگیز تجربہ جو اپنی اہمیت بدل سکتا تھا۔
 ایک مہول سا آدمی جس کے پاس پچاس ملین ڈالر کا نقشہ تھا۔
 وہ شخص جس نے حیاتِ ابدی کا راز پایا تھا۔
 ایک پراسرار پرندہ جس کے پاس مادرِ امانی خاتیس تھیں۔
 ایک فلم جس کے اندر ایک جن جنم تھا۔
 وہ شہنشاہی مجرم جس نے زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا تھا۔



عجیب کہانیاں — فطین کہانیاں — زہریلی کہانیاں —



مالی کہانیاں

- جرائم
- برادو
- ارداح
- شیطانِ بازم
- ذہانت
- فطانت
- اسرار
- طنز و مزاح

خوش سلیقہ اور تیز دماغی کہانیاں (۱۵) سیریاں

قیمت
 ۱۲/۴ روپے

قریبی کشمال سٹور میں یا براہِ راست منگو ہیں



بحرف سچ نکلی اور جہاز طوفان سے بچ نکلا۔

مکے میں داخل ہوتے ہی یہ شخص تلاش کرتا ہوا حرم کعبہ میں داخل ہو گیا وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے یہ ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک مالکی مسئلہ کے قریب ایک شخص کو کھڑے دیکھ کر دس گیا یہ شخص مکہ لے کر آگے بڑھا اور مکہ کو ان کے قدموں میں ڈال کر بولا۔ ”حضرت! اگر میں دھوکا نہیں کھاتا تو یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ حضرت کا نام نامی اسم گرامی حاجی امداد اللہ ہے“

مخاطب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سوال کیا۔ ”تم نے کس طرح پہچانا؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں آپسے جہاز پر ملاقات کر چکا ہوں۔ جہاز کے حیلے اور موجودہ حیلے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس وقت آپ تہمد زیب تن فرماتے ہوئے تھے اور اس وقت پیاجے میں ملبوس ہیں“

آپ نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی اور نے جواب دیا۔ ”طغیانی اور پانی کے لیے تہمد ہی مناسب رہا تھا۔ مناسب اور موافق ہواؤں کے حوالے کرنے میں حاجی صاحب کو بڑی محنت یا پڑی تھی“

یہ کس نے۔ اب دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک آواز تھی جسے کانوں نے تو سن لیا لیکن آنکھیں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔



پچاس سال کی عمر تک حاجی صاحب مجھ رہے تھے پھر اشارت غیبی سے یہ تنبیہ ملی کہ کہ ایک عارف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شادی جیسی سنت نبویہ سے محروم ہے آپ نے اس اشارت غیبی پر پی بی خدیجہ بنت شفاعت رام پوری سے نکاح فرمایا۔

آپ چوراسی سال تین ماہ بیس روز زندہ رہے اور ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۱۴ھ بروز شنبہ صبح فجر کی اذان کے وقت اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) میں مدفون ہوئے۔